میری کہانی میری زبانی

سیّد ہمایوں میرزا



مولوی سید ہمایون مرزا صاحب کی خودنوشتہ سوانح عمری

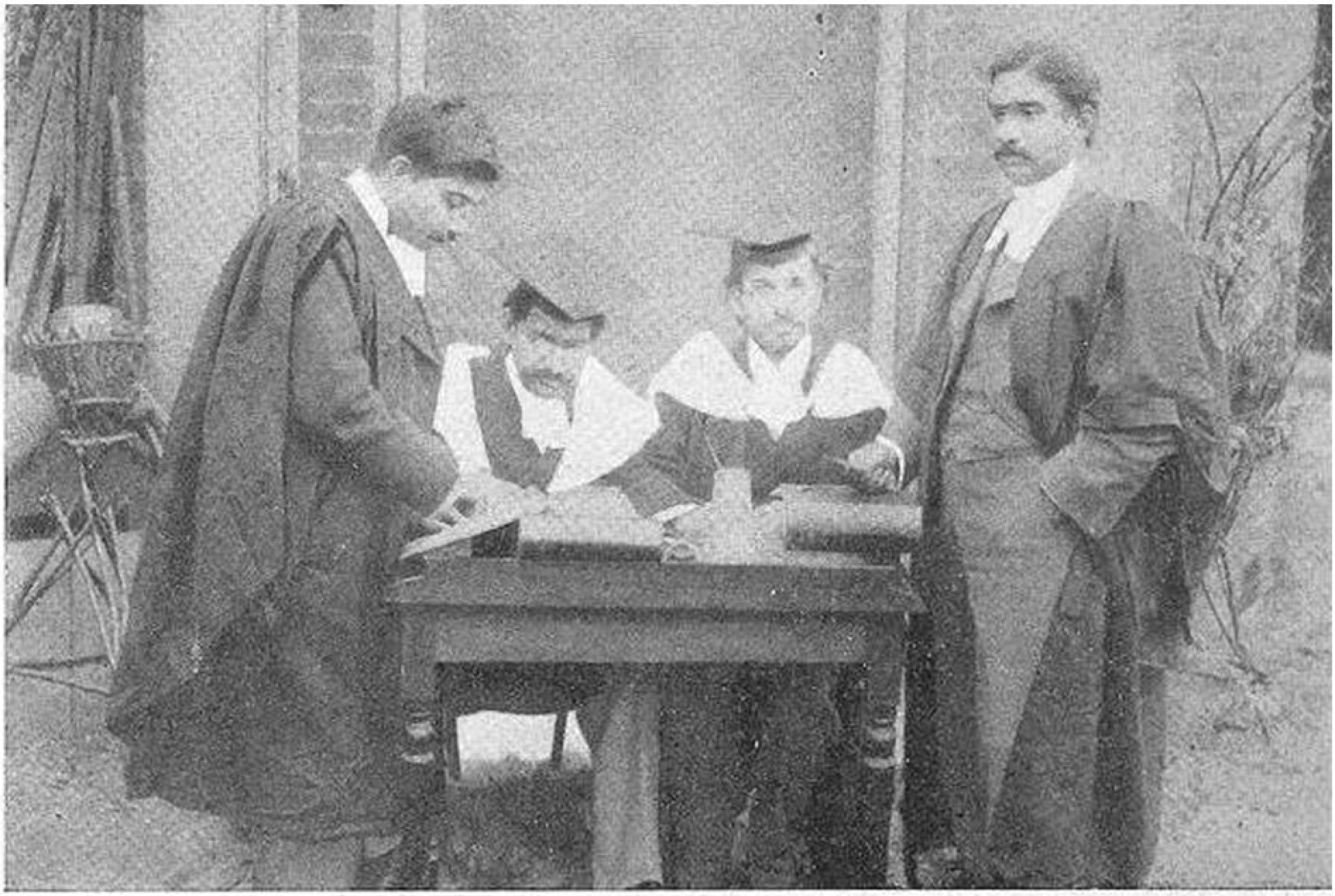
موسوم بہ

میری کہانی میری زبانی

جسکو

صغرا بیگم ہمایون مرزا نے شایع فرمایا

سنہ ۱۹۳۹ عیسوی



رفعت یار جنگ مرحوم۔ دیپ نارائن سنگھ کے والد۔ سر نظامت جنگ بہادر
سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم مغفور

ذکر ہمایون

سلطان سابع

از عالیجناب نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل استاد حضرت اقدس و اعلیٰ خسرو دکن

مولوی سید ہمایون مرزا صاحب بیرسٹر مرحوم کو دنیائے ناپائیدار سے رخصت ہوئے ابھی قلیل عرصہ گزرا ہے۔ ان کی علمی قابلیت ان کے اسلامی اخلاق و تہذیب ایثار نفس۔ ہمدردی۔ اعانت محتاجین۔ قومی درد۔ مصروفی اشاعت تعلیم نسوان کو ممالک محروسہ سرکارعالی کا کون ایسا شخص ہے جو یاد نرکھتا ہو اور کس کے دل سے اُن کے یہ صفات حسنہ فراموش ہوسکتے ہیں۔ وہ مشرقی و مغربی تعلیم کے فاضل یگانہ اور آزادی کے شیدا تھے۔ اور کسی قسم کی ایسی پابندی گوارا نہ کرتے تھے جس کی وجہ سے اُن کے علمی و معاشرتی اور قومی خدمات کے مصروفیت میں خلل واقع ہوسکے۔ علاوہ تمامتر قابلیتوں کے وجاہت خاندانی کی وجہ سے بھی ممتاز طبقہ میں ہر دلعزیز تھے، چاہتے تو نہایت آسانی سے عدالت و مال کی انتہائی درجہ کی ملازمت حاصل کرسکتے تھے مگر انہوں نے کبھی منظور نہ کیا۔ وہ اُفتاد طبیعت سے مجبور تھے کہ اپنے آپ کو کسی پابندی میں مبتلا نہ کریں تاکہ آزادی کے ساتھ قومی۔ معاشرتی۔ علمی مجلسی تحریکات میں حصہ لے سکیں۔ یہ مرحوم کی قانونی اور علمی قابلیت ہی تھی کہ پیشۂ وکالت ہی کی انجام دہی میں سرکارعالی کے مُلک میں بلند شہرت کے مالک ہوئے اور اپنا ممتاز درجہ طبقۂ وکالت پیشہ میں حاصل کرلیا۔ اُن کے اخلاق و عادات اُن کی شگفتہ مزاجی ان کی متانت اُن کا ذوق علمی ایسا تھا جس نے اُنکو اہل علم کے زمرہ میں بھی ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ شعر و سخن کے لئے نہایت پاکیزہ طبیعت پائی تھی اور ابھی تو چند دنوں ہی کی بات ہے کہ مرحوم ہم میں موجود تھے انکی ہر ایک بات ہر ایک کے دل میں موجود ہے اُنکا ذکر اُن کے ملنے والوں میں بار بار آتا ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ ان کا کارنامۂ حیات جسکا قلمبند ہوکر شائع ہونا ایک بہترین کام تھا اُن کی اہلیۂ محترمہ سیدہ صغرا ہمایون مرزا کے ہاتھ سے تکمیل کو پہونچ گیا، یعنی اُنہوں نے اپنے نامدار شوہر مرحوم کی خود نوشتہ سوانح عمری شائع کرائی ہے جو ایک پائیدار یادگار اور نہ مٹنے والی نشانی مرحوم کی ہے۔ اس کتاب میں زندگی کے ہر ایک منزل کی کلّی و جزوی صراحت کی گئی ہے کہ ایک پہلو ہی ترک نہیں ہوا۔ سیّد محترمہ نے یہ کام ایسا کیا ہے کہ جسطرح اللہ تعالےٰ نے زندگی میں دونوں کو ساتھ رکھا اُسی طرح رہتی دنیا تک دونوں ایک ساتھ یاد کئے جائیں گے فقط

خاکسار

فصاحت جنگ جلیل کان اللہ لہٗ

۱۷ر آذر ۱۳۴۹ف

سنہ ۱۳۵۰ھ ۱۶ر جمادی الثانی میں حضرت استادی نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل نے یہ اشعار جناب سید ہمایون مرزا صاحب کے نام تحریر فرمائے تھے

بلند اندر جہاں نام ہمایوں میرزا باشد
ہمائے بخت در دامِ ہمایوں میرزا باشد
ہمایوں میرزا سرمست جامِ ساقیِ کوثر
زمانہ مست از جامِ ہمایوں میرزا باشد

دیباچہ

سید ہمایون مرزا صاحب مرحوم کی سوانح عمری کا دیباچہ لکھنے قلم اُٹھایا تو ہے ۔ لیکن آنکھوں میں آنسو بھر آئے قلم تھرا رہا ہے دِل دھڑک رہا ہے دِل میں عجیب عجیب خیالات موج زن ہیں ۔ میں سوانح عمری لکھنے پر بیرسٹر صاحب کو مجبور کیا کرتی تھی ۔ اور وہ کہتے جاتے تھے کہ میرے حالات ہی کونسے ہیں جو تم مجھے لکھنے پر مجبور کرتی ہو ۔ بیرسٹر صاحب کے انتقال کو چار ماہ ہو گئے ۔ لیکن میرا زخم تازہ ہے ۔ بلکہ روز بروز بیرسٹر صاحب کی یاد اور زیادہ ہوتی جاتی ہے ۔ مرنا تو سب کو ہے وہ عمر رسیدہ بھی تھے مگر ان کی تکلیف یاد آیا کرتی ہے ۔ ۱۹۱۸ء میں ہم لوگ پُونا گئے تھے ۔ وہاں بیرسٹر صاحب کو بخار آیا ڈاکٹر بلایا گیا ۔ ڈاکٹر نے کہا آپ کا دِل بہت کمزور ہے ایک بیک ٹھہر جائیگا ۔ علاج کرنا چاہئے ۔ اور آپ آرام لیں زیادہ چلنا پھرنا نہیں چاہئے ۔ بس یہ سُننا تھا بیرسٹر صاحب کے دِل و دماغ میں یہ خیال جم گیا کہ میرا دِل ایک بیک ٹھہر جائے گا ۔ حیدرآباد آنے کے بعد ڈاکٹروں کو بتایا سب نے یہی کہا دِل کی حالت بہت خراب ہے ۔

۱۹۲۴ء میں یورپ گئے جرمنی میں دو ماہ رہ کر علاج کروایا مزاج درست رہا ۔ پھر جب خراب ہوا تو ۱۹۳۵ء میں بمبئی علاج کیلئے گئے مدراس گئے جہاں جاؤ اُن کے دِل میں وہی خیال رہتا تھا ۔ دِل ٹھہر جائیگا ۔ ایسی حالت میں اُنہوں نے میرے اصرار پر سوانح عمری لکھی ۔ جب لکھتے تو مجھ سے کہتے دیکھو میں نے آج کتنے صفحے لکھ ڈالے یہ تمہاری وجہ سے لکھ رہا ہوں ۔ میں حیران تھی کہ پچاس سال قبل کی باتیں اُن کو یاد کس طرح سے رہیں وہ بھی لفظ بلفظ ۔ عجیب حافظہ تھا ۔ مرحوم کا حافظہ غیر معمولی تھا اگر کسی مشہور شخص کا نام اُن سے کہا جائے تو اُس شخص کے پورے خاندانی حالات کہہ دیا کرتے ۔ چاہے وہ شخص حیدرآباد کا ہو یا عظیم آباد کا یا دہلی کا ہو یا لکھنو کا ۔ تاریخ پر جب گفتگو ہوتی جس بادشاہ کا ذکر آتا اُس کے پورے حالات سنا دیتے تھے

جس شہر یا ملک کا ذکر آیا بس انھوں نے دریا بہائے۔ سلسلہ گفتگو گھنٹوں جاری رہتا جو معلومات سے پُر ہوتا تھا۔ مذہب کا ذکر آیا تو جس مذہب کا ذکر کرو اوس کی پوری کیفیت سُن لو۔ صرف وہ بیرسٹر ہی نہیں تھے بلکہ شاعر اور مذہبی عالم بھی تھے۔ بڑے پایہ کے درویش صفت تھے اِس کے ساتھ گاتے بہت اچھا تھے۔ نہایت شیریں آواز تھی۔ طبلہ بجاتے تھے۔ موسیقی پر ایک کتاب گلشنِ ترنم لکھی ہے۔ صرف اِس کا دیباچہ پڑھنے سے ہندوستانی موسیقی کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔ جب گفتگو کرتے اکثر مثال کے طور پر ایک دو شعر ضرور سُنا دیا کرتے تھے۔

مذہب کے بہت پابند تھے گو نماز کبھی کبھی پڑھتے۔ لیکن رات کے بارا بجے یا دو بجے بیدار ہو کر پلنگ ہی پر عبادت کرتے۔ گھنٹوں سر تکیہ پر جھکائے وظیفہ پڑھا کرتے نیکی کرنا تو اُن کے لئے واجبات سے تھا۔ سیکڑوں آدمیوں کو سفارش کر کے نوکری دلوا دی سیکڑوں مقدمے مفت کئے۔ بعض لوگوں کو پانچ پانچ سو روپیہ مفت دئے کہ وہ ہائی کورٹ میں شریک ہو کر وکالت کی اجازت حاصل کریں آج کے دِن وہی لوگ بڑے عہدہ دار ہیں۔ غرض جو کچھ اِن سے ممکن تھا وہ ہر وقت اور ہر حالت میں دوسروں کی مدد کے لئے تیار رہتے تھے۔

عورتوں کی ترقی کا بہت خیال تھا۔ میری شادی سے قبل ترقی نسواں کے نام سے ایک انجمن قایم کی تھی۔ ایک بڑی زمین مدرسۂ نسوان صفدریہ کو دیدی کہ زنانہ اسکول کو پانچ چھے ہزار روپئے کے قریب میں نے دئے۔ میں نے جو کچھ خدمت ملک و قوم کی اِنہی کی اجازت سے۔ مجھے ایک لڑکی ۱۹۰۴ء میں ہو کر گزر گئی میں نے بار ہا کہا آپ دوسرا عقد کر لیجئے اگر کہو تو میں آپ کے لئے لڑکی ڈھونڈوں یہ سُن کر حیرت سے میرا مُنہ دیکھتے اور کہتے کیا تم دِل سے کہہ رہی ہو کیا تم کو مجھ سے یہ اُمید ہو سکتی ہے۔ نہیں بیگم (مجھے وہ ہمیشہ بیگم پکارا کئے) یہ نہیں ہو سکتا جو خُدا کو منظور ہے۔ وہی ہو گا اگر اولاد خدا کو دینا ہو گا تو تم سے ہی دے گا۔

مرحوم نہایت نرم دِل تھے کسی کی تکلیف دیکھ نہیں سکتے تھے۔ کبھی بکرا یا مرغ ذبح نہیں کیا۔ ایک چڑیا بھی ذبح نہیں کی وہ کہتے جانور کو ذبح کرتے مجھے

سخت تکلیف ہوتی ہے۔

مہمان نواز تھے مہینوں ہمارے گھر مہمان رہے۔ (مولانا شبلی نعمانی۔ خواجہ حسن نظامی وغیرہ وغیرہ) جب کوئی معزز مہمان دوسرے شہر سے حیدرآباد آتا تو اسکے لئے ایٹ ہوم بہت دھوم سے دیا جاتا تصویر لیجاتی۔ میرے عزیزوں کے ساتھ انکا سلوک بہت اچھا تھا۔ میرے عزیزوں کو مثل اپنے عزیزوں کے خیال کرتے۔ میرے بھائی بہن کو مثل اپنے بچوں کے خیال کرتے۔ (جب میرے والدین کا انتقال ہوا میرے بھائی بہن سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ ایک تو انیس[19] دن کا تھا۔ ان سب کی شادیاں ہمارے گھر میں ہوئیں۔ انکی دکھ بیماری میں وہ سخت پریشان ہوجاتے خود جاکر ڈاکٹر کو بلالاتے رات رات بھر میرے ساتھ ان لوگوں کی بیماری میں جاگا کرتے۔

چونکہ ان کا دل کمزور تھا اسلئے جب میں کوئی کام کرتی جب اسکول صفدریہ قایم کیا اسوقت انہوں نے کہا یہ جنگل میں اسکول نہیں چلسکتا۔ بے کار روپیہ خرچ کررہی ہو انکو علم زیادہ تھا ہمت کم اور میرا علم کم ہمت بہت میں اپنی ہمت سے بڑے سے بڑا کام کرگزرتی میرے سامنے ہمیشہ روشنی اور ترقی رہی ان کے خیالات اسکے خلاف۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس خیال سے نہیں کہ وہ میرے شوہر تھے۔ یا اس خیال سے نہیں کہ ہم مردہ پرست ہیں۔ جب کوئی مرتا ہے اُسکی تعریف شروع ہوجاتی ہے ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ایک فرشتہ صفت انسان کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ چونکہ مجھے ہمیشہ مختصر لکھنے کی عادت ہے اسلئے مختصر لکھا ورنہ ان کی تعریف میں ایک کتاب لکھ سکتی ہوں۔ دعا کرتی ہوں کہ مرحوم کو خدا اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھے۔ اُنھوں نے ایثار بہت کیا اونکا ایثار انکے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیگا۔ ان کے مزار پر ہمیشہ پھول برستے رہیں گے۔ حضرت علیؑ کے نام پر وہ عاشق تھے۔ اُنہوں نے ایک کتاب شاہ راہ نجات بہت جوش سے لکھی ہے۔

۱۹۳۵ء / ۱۳۵۴ھ میں فالج گرا ڈھائی سال تک وہ چت پڑے کے پڑے رہے کروٹ تک نہیں ہوسکتے تھے ڈھائی سال وہ پرہیزی کھانا کھاتے رہے۔ میں نے بھی وہی کھانا کھایا جو وہ کھاتے تھے۔ ڈھائی سال میں ایک رات بھی ایسی نہیں گزری جو میں پوری رات سوئی ہو۔ بار بار بیدار ہوکر ان کے پاس آتی تین آدمی رات تمام بیٹھے رہتے۔ کمپونڈر رہتا مگر میں اپنی نگرانی ہر وقت رکھا کرتی افسوس کچھ نہ ہوا آخر ۱۴ر رمضان ۱۳۵۶ھ بروز دوشنبہ سات بجے شام کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ میں دودھ پلاکر لٹارہی تھی کہ میرے ہاتھوں میں آخری سانس لی اور ختم ہوگئے

حضرت علیؑ کی شہادت کے روز وہ رخصت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
انکے تصنیفات کرشمہ تقدیر۔ شاہ راہ نجات۔ گلشن ترنم۔ آثار صنادید دکن۔ ابن رشد وغیرہ
وغیرہ ہیں وہ شاعر تھے۔ حقیر تخلص کرتے تھے اِن کا دیوان تیار ہے انشا اللہ چھپا دوں گی۔
حضرت اقدس و اعلیٰ نے انکے انتقال کے بعد میرے لئے فرمان عنایت کیا خاصہ بھیجا۔ مرحوم کی تاریخ وفات
سرفراز کی "در جنت ہمایون ہم برفت" ہائی کورٹ کو تعطیل ہوئی۔ محکمۂ فوجداری انتقال کے
روز بند ہوا۔ بہت سے لوگوں نے تاریخیں لکھیں چند تاریخی لکھتی ہوں۔ محکمۂ صفائی۔ ہائیکورٹ
وغیرہ میں جلسۂ تعزیت ہوئے۔ انجمن خواتین دکن کی جانب سے تعزیتی جلسہ ہوا۔ جالنہ میں
اور دوسرے شہروں میں بھی جلسۂ تعزیت ہوئے۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ والوں نے جلسۂ تعزیت
کیا۔ آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کی جانب سے رزولیوشن پاس ہوا۔ چند تاریخیں لکھتی ہوں

بشوق جلوہ ہائے قدسیاں شد ہمایون مرزا چوں داخل خلد
دل من گفت تاریخ وفاتش شدہ مرزا ہمایوں داخل خلد

۱۹۳۸ء حفیظ ہوشیارپوری

در ہوائے عالم نیرنگ بود سید والا ازیں عالم برفت (از لاہور)
گفت تاریخش شہنشاہِ دکن جانب جنت ہمایوں ہم برفت

۱۳۵۷ھ حفیظ ہوشیارپوری

از یاور علی صاحب ناظم کورٹ آف وارڈز

سید نیک سیر نیک عمل نیک خصال مصدرِ علم و ہنر شیفتۂ آلِ عبا
ماہر علم تواریخ ذکی بیرسٹر منبع خلق و کرم صاحب اعزاز و صفا
برکتِ ماہ صیام اور نسب کا ہے اثر عاشق روئے علی خلد بریں کو جو گیا
روز دوشنبہ تھا اکیسویں تاریخ تھی آہ موت کے پردے میں حاصل ہوا دیدارِ خدا
سالِ رحلت یہ دم فکر کہا یاور نے شاد و کام آج ہیں جنت میں ہمایوں مرزا

اور بہت سی تاریخیں ہیں جو ان کے مقبرے میں لگائی گئی ہیں۔ ہمایون نگر میں مدرسہ صفدریہ
کے قریب دفن ہوئے۔ سوانح عمری چھاپنے اور دیباچہ کو دیکھی تھی اُسوقت مقبرہ بن رہا تھا شکر ہے
اب تیار ہوگیا۔ مقبرہ کی تصویر بھی دیجارہی ہے۔

صغرا ہمایون مرزا تخلص حیا
۱۵ ر جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ

۷۸۶

معنون

میں اپنی آٹو بیاگرافی (خود نوشتہ سوانح حیات) موسوم بہ میری کہانی میری زبانی کو بہ صدق دلی و محبت قلبی اپنی رفیق حیات صغرا بیگم (بنت مستغنی عن الالقاب صوفی طریقت عالیجناب حاجی ڈاکٹر صفدر علی مرزا صاحب علی اللہ مقامہ سابق سرجن کیپٹن افواج باقاعدہ سرکار عالی) کے نام کے ساتھ اس لئے معنون کرتا ہوں کہ وہ میرے علمی مشاغل میں ہمیشہ میری معین و محرک رہیں اور تالیف ہٰذا کے سیکڑوں صفحے باوجودیکہ کچھ عرصہ سے عارضۂ ضعف قلب میں مبتلا ہوں انھیں کی تحریک و تشویق نے مجھ سے لکھوائے۔ مجھے اپنی زندگی کے حالات کو حوالۂ قلم کرنے کا مطلق خیال نہ تھا کیونکہ میرے خیال میں میرے کارنامہ ہائے حیات نمایاں اور قابل نمونہ و تقلید نہیں ہیں مگر اپنی اہلیہ کی ترغیب پر میں نے یہ کام شروع کیا یہ تالیف علاوہ میری زندگی کے حالات کے مرقع تمدن ہند پچاس سال قبل و نیز دیگر مفید معلومات عامہ پر مشتمل ہے جس کی وجہ سے مجھے اُمید ہے کہ قارئین کرام اس کے مطالعہ سے محظوظ و مستفید ہوں گے میرے اور محرک تالیف ہٰذا کے حق میں دعائے خیر فرمائیں گے۔

الراقم

سید ہمایوں مرزا (بیرسٹر ایٹ لا)

آذر ۱۳۴۳ف مطابق ۱۹۳۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

قبل اس کے کہ میں اپنی زندگی کے حالات لکھوں مناسب خیال کرتا ہوں کہ اپنے پیارے وطن صوبہ بہار اور اُس کے دار الحکومت پٹنہ عظیم آباد کی جہاں میری ولادت ہوئی کچھ جغرافیائی حالت اور اُس کی مختصر تاریخ ہندوں اور مسلمانوں کے زمانہ کی اور کسی قدر بعید العہد اور قریب العہد متفرق حالات ضبط قلم کروں۔

واضح ہو کہ زبان سنسکرت میں بہار دار العلم دین کو کہتے ہیں ہندوں کے قدیم زمانہ میں بدھا کی پیدائش کے پیشتر اس قطعہ اراضی کی راجدھانی راجگراھ تھی جو متصل قصبہ بہار ہے اور اب راجگیر کے نام سے مشہور ہے حال کے زمانہ میں چھوٹی سی بستی رہ گئی ہے تاہم پتھر کے نشانات دور تک سڑکوں اور عمارتوں کا پتہ بتاتے ہیں کہ یہاں بڑا شہر آباد تھا۔ چند سال پیشتر راجگیر سے کچھ فاصلہ پر جو کھدائی کی گئی تو اندر سے بہت سی کہنہ عمارتیں نکلی ہیں۔ بڑے بڑے بال بدھا کا بت بر آمد ہوا کھدائی جاری ہے۔ یہ آثار قدیمہ بودھ مذہب والوں کے زمانہ کے ہیں مگر بدھ مذہب کی بناء و اشاعت کے قبل خاص راجگیر میں عظیم الشان پاٹ شالا تھا جہاں تقریباً ایک ہزار حکما و علما براہمہ مختلف اقسام کے علوم و فنون پڑھاتے تھے اور سارے ہندوستان کے برہمن طالب العلم یہاں آ کر ہر قسم کے علم و فن میں مہارت تامہ حاصل کرتے اور سندیں لے کر مختلف اقطاع ہندوستان میں پھیلتے۔ اساتذہ بھی برہمن تھے اور طلبا بھی برہمن تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہزاروں سال کے قبل ہندوں میں ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام منو تھا۔ ہندو اُسے بہت بڑا رشی (ولی) اور بڑا مقنن سمجھتے ہیں اس میں کلام نہیں کہ اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے یہ شخص ایک غیر معمولی دماغ رکھتا تھا وضع قانون کا اچھا خاصہ مادہ رکھتا تھا اس نے وسط ایشیا سے آئے ہوئے لوگوں کو چار ورن (ذات) پر تقسیم کی تھی برہمن۔ چھتری۔ ویش۔ شدر۔ سب میں بڑے برہمن اس کے بعد چھتری پھر ویش اخیر میں شدر اور یہ چاروں ذات کے لوگ ویدک ہندو کہلاتے ہیں۔ یعنی چار وید یجر وید شام وید اتھر وید وغیرہ جو آسمانی کتابیں سمجھی جاتی ہیں انھیں کے لئے نازل ہوئیں اور انھیں کتابوں کے لحاظ سے ان کے مدارج و فرائض بتلائے گئے ہیں لیکن لوگ جس کی پرچار گاندھی جی کرتے ہیں وہ وید سے باہر ہیں یعنی چوتھے درجہ کے جو شدر ہیں اُن سے

بھی بدتر اور لوگ قدیم باشندگان ہند ہیں مثلاً سونتال بھیل دُرو یدین وغیرہم جو نجس و ناپاک ہیں بہرحال جو چار ذات والے ہیں اُن کے متعلق یہ تبلایا کہ برہمن وید وغیرہ پڑھیں گے پڑھائیں گے دان دیں گے دان لیں گے وغیرہ وغیرہ برہمنوں کے چھ کرم تبلائے ہیں اور چھتریوں کا فرض لڑنا بھڑنا راج کرنا اس لیے ان کو راجپوت بھی کہتے ہیں ویشوں کا فرض یہ ہے کہ ڈنڈی ترازو لے کر تجارت کریں جو بنئے بقال ہیں اور شُدر یعنی چماروں کا فرض سیوا ٹہل یعنی خدمت کرنی۔ اسی واسطے اس پاٹ شالے میں برہمن ہی پڑھاتے اور برہمن ہی پڑھتے تھے۔ یہی طبقہ پڑھا لکھا تھا باقی ورن کے لوگ پہلے عرصہ دراز تک جاہل رکھے گئے جو کچھ خوبی دینی و دنیاوی تھی۔ وہ برہمنوں میں تھی۔ اس پاٹ شالا میں بہت بڑا عظیم الشان دارالاقامہ تھا کل طلاب و اساتذہ ہزاروں کی تعداد میں کھانا کپڑا اور زرِ نقد پاتے تھے اور اپنی سعادت سمجھ کر ہندوستان کے کل راجگان چھتری لوگ اس پاٹ شالا کی مالی امداد کرتے کتب خانہ بھی بڑا عالیشان تھا تقریباً دو لاکھ کتابیں مختلف علوم و فنون کی یہاں جمع تھیں یہ سب سنسکرت زبان میں تھیں اس لئے سارے صوبہ کا نام بہار ہوگیا۔ قبل اس کے قدیم زمانہ میں ہزاروں میل کا رقبہ اس طرف کا دو ناموں سے مشہور تھا مگھا دیس اور میتھلا دیس۔ گنگا کے اس پار جانب غرب بنارس کے بعد سے کرم ناسہ ندی کے اس طرف بکسر آرہ۔ پٹنہ اور جانب جنوب گیا راجگیر قصبہ بہار وغیرہ اور شرق میں باڑہ۔ مونگیر۔ بھاگلپور تک مگھا دیس کہلاتا تھا۔ اور گنگا کے پار پٹنہ کے جانب شمال مظفرپور دربھنگہ وغیرہ میتھلا دیس مشہور تھا جس میں جنک پور بھی واقع ہے جہاں راجہ رامچندر کی شادی راجہ جنک کی بیٹی سیتا سے ہوئی تھی مگر اب یہ سب مقامات مختلف اضلاع پر اور تین کمشنریوں۔ پٹنہ۔ مظفرپور۔ بھاگلپور پر منقسم ہیں اور یہ صوبہ بہار کہلاتا ہے۔ معلوم زمانہ میں یعنی بودھ مت (جس کی بنیاد گوتما بدھ نے ڈالی) کے پھیلنے کے قبل راجہ پاٹلی نامی اودھ کے راجہ کے بھائی نے بہار پر لشکرکشی کی اور فتح پائی اس وقت تک اس مقام پر جہاں اب پٹنہ آباد ہے جھاؤ کا جنگل تھا اور برسات میں تین چار ندیوں کا یعنی گنگا۔ گنڈک سوہن سکا اور پُن پُن کا سیلاب اس سرزمین کو دور تک سمندر بنا دیتا تھا۔ راجہ پاٹلی کو اپنا دارالسلطنت بنانے کے لیے یہی جگہ پسند آگئی دس برس کی لگاتار کوششوں سے ان سب ندیوں کی رد کو قلعہ بنا کر روک دیا جب اطمینان ہوا تو ایک شہر آباد کیا جس کا نام پاٹلی پوتر رکھا۔ سیکڑوں سال کے بعد اسی خاندان کے ایک راجہ نے جس کا نام پٹنی تھا اس شہر کا نام پٹنہ رکھا۔ یہ بھی میں نے والد مرحوم سے جو بے مثل مورخ تھے سُنا تھا کہ کسی زمانہ میں پٹنہ کا نام کسم پور بھی تھا۔ مگر اس نام کو زیادہ شہرت نہیں ہوئی اس کے بعد اس شہر کا نام پدماوتی ہوا اس نام کو بھی شہرت نہیں ہوئی ہندوؤں کے زمانہ کے ناموں میں پٹنہ کو وہ شہرت ہوئی کہ دنیا بھر میں آج تک زبان زد خاص

عام ہے۔ گاوتم بودھ جو ایک راجہ کا بیٹا تھا ترک دنیا کر کے راج گیر کے پاٹلی پتر نالا[1] میں آیا اور علوم دین پڑھ کر گیا کے پہاڑوں میں بارہ برس ریاضت کی قدیم ہندوں کے ویدک مذہب کے خلاف ایک مذہب نکالا جس کا لب لباب یہ ہے کہ منو نے جو چار ورن نکالے اُن کا استیصال بڑی حد تک کیا ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند — کہ در آفرینش زیک جوہر اند

کے اصول کے لحاظ سے انسانوں میں مدارج کی تفریق مٹا ئی مساوات قایم کیا۔ گاوتم بدھا کامسلک دانا اور کرماتھا۔ اس زمانہ میں راجہ چندر گپت یہاں کا راجہ تھا جس کے پاس ایک لاکھ جنگلی ہاتھی تھے اس نے بودھ مت قبول کیا بعد کو اس کے بیٹے راجہ بھیم سین نے بھی یہی مذہب اختیار کیا پرانے مت والوں اور بودھ مت والوں سے جنگ عظیم ہوئی جس کی وجہ سے راجگیر کا پاٹلی پتر نالا کتب خانہ عمارتیں جلا ڈالی گئیں بودھ مت والوں کو فتح ہوئی اور تقریبا چار سو سال تک بودھ مت کی حکومت رہی راجہ اسو کا سکندر اعظم نے جس سے جنگ کی تھی بودھ مت کا راجہ تھا حساب لگانے والوں نے حساب لگا کر بتلایا ہے کہ پٹنہ کو آباد ہوئے پانچ ہزار سال ہوئے۔ یہ دلی سابق ہستنا پور سے بھی قدیم تر شہر ہے۔ انڈیا میں بلحاظ قدامت کوئی شہر اس کے مقابلے اور لگنے کا نہیں ہے۔ بودھ مت بہت دور دور انڈیا کے باہر بھی جنوب میں سری لنکا (سیلون) شمال میں چین تک پھیلا تو چین سے ایک جاتری فاہیان نامی یہاں آیا اس نے سفرنامہ لکھا ہے وہ کہتا ہے کہ عین رتھ جاترہ (ہندوں کا تہوار) کے دن میں پٹنہ میں داخل ہوا میں نے وہاں سیکڑوں رتھیں (بیلوں کی گاڑی) ٹھوس سونے کی دیکھیں جن پر جواہرات کی مورتیں نصب تھیں۔ اسی سے اس وقت کی بے انتہا دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ذکر اگلا ہندوں کے زمانہ کا ہے۔

مسلمانوں کے حالات بھی مختصراً بیان کرتا ہوں جب ملک بختیار نے صوبہ کو فتح کیا تو پٹنہ کی جگہ قصبہ بہار کو دارالحکومت بنایا تو پٹنہ کی رونق جاتی رہی تھی ملک بختیار سپہ سالار شہاب الدین غوری شہنشاہ دہلی اور ملک بختیار کے ہمراہی میں جو بہار میں آئے سب ترک تھے اور خود شہاب الدین غوری ترک ہی تھا شہاب الدین غوری نے راجہ پرتھی راج اور اس کے ساتھ ڈیڑھ سو راجاوں سے جن کے تحت لاکھوں سپاہی تھے جنگ کر کے فتح پائی اور اسلامی سلطنت ہند میں قائم کی تھی غوری کا غلام قطب الدین ایبک تھا جس نے پرانی دلی میں قطب مینار بنایا اور ایبک کی نسل میں چند سلاطین ہوئے۔ ترکستان کے باشندوں کو ترک کہتے ہیں حال ترک بھی ترکستانی نسل کے ہیں۔ جب ترکوں نے بہار کو فتح کیا تو ہندوں نے سب مسلمانوں کو ترک کہنا شروع کیا ان ترکوں میں اکثر سادات بھی تھے جن کے اجداد بنی عباس کے ظلم سے بھاگ بھاگ کر ترکستان بھی چلے گئے تھے وہاں پناہ گزیں ہوئے۔ وہاں سے بہار آئے تھے۔ ملک ذات نہیں ہے خطابی

---

[1] درس گاہ

لقب ہے۔

بوجہ عدم تحقیقات ان ترکوں کے ساتھ آئے ہوئے سادات بھی ترک اور ملک کہلانے لگے چنانچہ قصبہ بہار میں بعض ایسے بزرگان دین کے مزارات ہیں جو ملک کہلاتے ہیں لیکن سید ہیں مثلاً ملک ابراہیم ملک بہتو رحمتہ اللہ علیہما یہ حضرات صاحب کشف و کرامات تھے بہار میں اور بھی بزرگان دین صاحب کشف و کرامات کے مزارات ہیں جب پٹھانوں نے ترکوں پر فتح پائی تو دارالحکومت راجگیر سے منتقل کرکے پٹنہ لائے۔ پھر پٹنہ کو رونق ہوئی مگر پٹھانوں نے بڑا ظلم یہ کیا کہ سیکڑوں پرگنے مواضعات و کثیر اراضیات ان کے جائز قابضوں سے بجبر چھین لیں اور آپس میں تقسیم کرلیں اس لئے ان کے عہد حکومت میں سوا پٹھانوں کے دوسرا کوئی خوش حال دکھائی نہیں دیتا تھا۔

جب ہندوستان پر سلاطین تیموریہ کا قبضہ ہوگیا تو شہنشاہ اکبر اعظم نے فوج کشی کرکے پٹھانوں کے اخیر حکمراں داؤد خاں سے صوبہ بہار چھینا۔ بحکم شاہی منعم خاں خانخاناں اور راجہ ٹوڈرمل نے یہ اشتہار دیا کہ پٹھانوں نے جس جس کے قبضۂ جائز سے پرگنے اور اراضیات وغیرہ بجبر چھین لی ہیں وہ دو برس کے اندر اپنے اسناد پیش کریں تاکہ اُن کی مملوکہ اراضیات ان کو واپس کردی جائیں ورنہ داخل خالصہ شاہی کرلی جائیں گی۔ چنانچہ بعد اخذ ثبوت بہت سی املاک عرصہ دراز کے بعد لوگوں کو واپس کی گئیں۔ اور جن اراضیات کے متعلق ثبوت کافی نہ مل سکا وہ داخل خالصہ ہوگئیں بہار و بنگال میں بحکم شاہی جس قدر اراضیات داخل خالصہ ہوئیں کسی اور صوبہ میں نہیں ہوئیں (ملاحظہ ہو تاریخ بحر مواج سیرالمتاخرین مآثر الامرا وغیرہ) ہزاروں پرگنے لاکھوں گاؤں ملک شاہی میں در آئے یہی سبب تھا کہ اکبر اعظم سے لے کر شاہ عالم تک جس امیر و عہدہ دار شاہی یا فقرا یا پنڈتوں یا کسی کو بطور آل تمغہ یا جاگیر یا نذر درگاہ پرگنے یا گاؤں یا زمین مزروعہ یا غیر مزروعہ عطا کی گئی ہیں کے خالصہ جات سے حال مہاراجہ دربھنگہ کے مورث اعلیٰ کو ایک پنڈت جوتشی کی حیثیت سے بطریق انعام بہت بڑا علاقہ مدد معاش کے طور پر دیا گیا تھا اور بہت سی مثالیں ہیں اس وقت مجھے یاد نہیں آتیں یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں اپنے حافظہ کی بنا پر سپرد قلم کررہا ہوں۔ عہد تیموریہ میں مختلف اوقات میں مختلف صوبہ دار مقرر کئے گئے۔ جن میں مشہور شائستہ خاں نواب سید حسین علیخاں بارہہ (جن کو بعد کو امام الملک امیر الامرا کا خطاب ملا تھا جو راقم کے اجداد میں تھے) نواب شجاع الدولہ۔ نواب مہابت جنگ نواب ہیبت جنگ و مہاراجہ شتاب رائے وغیرہم تھے۔ بعض شہزادگان تیموریہ بھی بطریق صوبہ دار یہاں مسکن گزیں ہوئے۔ موقع موقع سے مختصراً ان میں سے بعض کا ذکر کرتا ہوں۔ شاہجہاں بزمانۂ شہزادگی خود بھی بہار آیا تھا اور جب تخت پر بیٹھا تو اپنے منجھلے بیٹے سلطان شجاع کو بہار و بنگالہ کا صوبہ دار مقرر

کرکے بھیجا تھا وہ برسوں پٹنہ میں رہا اس کے زمانہ سکونت میں دہلی سے امرا مصاحبین شاہی بہت سے شاگرد پیشہ اور پیشہ ور اشخاص بھی دلّی سے آئے تھے ظاہر ہے کہ کیسے منتخب روزگار لوگ ہوں گے یہاں کے باشندوں کو ان کی صحبتوں کا کیا کچھ اثر نہ پہنچا ہوگا۔ اورنگ زیب عالمگیر اپنے باپ شاہجہاں کو قید کرکے جب تخت نشین ہوا جہاں اور بھائیوں دارا شکوہ وغیرہ کو قتل کردیا سلطان شجاع کو بھی مروا ڈالا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں اس کا منجھلا بیٹا محمد اعظم معہ خدم وحشم پانچ سال تک قلعہ میں جو نات شہر میں تھا رہتا تھا اس نے بھی مثل سلطان شجاع کے پٹنہ کی رونق بڑھائی پرانے شہر کی مرمت و آرائش میں برابر سرگرم رہا۔ محمد اعظم بہ حیثیت صوبہ دار کے یہاں نہ تھا بلکہ خوش باش کی حیثیت سے رہتا تھا اس زمانہ میں شایستہ خاں یہاں کا صوبہ دار تھا۔ ان دونوں میں عرصہ دراز کے بعد اَن بَن ہوئی تو شہزادہ دلّی بلا لیا گیا شایستہ خاں کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے اپنے پوتے شہزادہ عظیم الشان کو یعنی سلطان بہادر شاہ کے منجھلے بیٹے کو یہاں کی حکومت دے کر بھیجا۔ یہ اولوالعزم شاہزادہ تقریباً ۱۱۰۱ھ میں بڑے ساز و سامان کے ساتھ یہاں آیا اس نے پٹنہ کو دہلی کا نمونہ بنانا چاہا تھا اور کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی اس لئے پٹنہ کا نام تبدیل کرکے اپنے نام کی مناسبت سے عظیم آباد رکھا۔ اکثر محلّوں کے نام بدلے۔ مغلپورہ۔ دولت پورہ۔ محلہ کیوان شکوہ (عوام کی زبان پر کوا کھوہ) چونکہ یہاں شہزادہ کیوان شکوہ کا عالیشان قصر تھا حاجی گنج وغیرہ اسی کے رکھے ہوئے نام ہیں۔ عظیم الشان نے بھی بہت سے پیشہ وروں اور غریب شرفا کو دلّی سے بلاکر امداد مالی دے کر پٹنہ میں بسایا اس بلند حوصلہ و روشن خیال شہزادہ کا خیال تھا کہ عظیم آباد کی بہت کچھ رونق بڑھائے اور دلّی کا پورا پورا نمونہ بنائے مگر ایک تو مرشد قلیخاں صوبہ دار بنگال سے چشمک ہوگئی دوسرے اس کے دادا اورنگ زیب پیرانہ سالی اور اس سے اتنی دوری اور تیسرے باپ کی دلی کمزوری غرض پورے چار برس بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ اورنگ زیب کی بیماری کی شدت کی خبر نے شہزادہ کے دل و دماغ کو پراگندہ کردیا اس لئے اپنے عیال و اطفال کو یہیں چھوڑ کر معقول سامان کے ساتھ اورنگ آباد کے قصد سے جہاں اورنگ زیب علیل تھا روانہ ہوا جب قریب الٰہ آباد کے پہنچا تو اورنگ زیب کی رحلت کی خبر اور اپنے چچا محمد اعظم کا شاہی اُردو پر قبضہ پانے کی خبر اور باپ کا کابل سے بقصد محاربہ محمد اعظم سے روانہ ہونے کی خبر سن کر آگرہ کی سمت جو مرکز سلطنت تھا روانہ ہوا۔ محمد اعظم بھی معہ فوج و خزانہ اورنگ آباد سے روانہ ہوکر اکبرآباد یعنی آگرہ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بہادر شاہ کئی دن پہلے اکبرآباد پہنچ چکا تھا بھائیوں میں جنگ ہوئی اعظم شاہ معہ دو بیٹوں کے قتل ہوا اور بہادر شاہ اول شہنشاہِ ہند ہوا۔ عظیم الشان اس وقت سے پانچ چھ سال تک باپ کے ہمراہ رہا۔ جب بہادر شاہ نے لاہور میں رحلت کی تو اس کے چار بیٹوں میں آپس میں جنگ

ہوئی عظیم الشان اور اُس کے دو بھائی مارے گئے۔ اور سب سے بڑے بھائی سلطان معزالدین کو فتح ہوئی اور جہاندار شاہ کے لقب سے شاہنشاہ دہلی ہوا۔ عظیم الشان کا بڑا بیٹا سلطان کریم الدین جو باپ کے ساتھ تھا قید کیا گیا پھر جہاندار شاہ کے حکم سے قتل کیا گیا۔ یہ خبر عظیم الشان کے منجھلے بیٹے فرخ سیر اور بھائی عظیم الشان کو بہار میں جب پہنچی تو ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے اس وقت صوبہ بہار کے ناظم نواب سید حسین علیخاں بارہہ تھے جہاندار شاہ کا حکم صوبہ دار کے نام آیا کہ عظیم الشان کے عیال و فرزند وغیرہ کو قید کرکے دلی بھیجو یہ عجیب وقت تھا صوبہ دار نے یہ حکم جب اُن لوگوں کو سنایا تو ایک قیامت برپا ہوگئی نسوات کی خصوصًا فرخ سیر کی پانچ سالہ بیٹی ملکہ زمانی کی گریہ وزاری پر نواب سید حسین علیخاں کو رحم آیا اور شہزادہ فرخ سیر کی اعانت کا وعدہ کیا اس مقام پر مندرجہ ذیل واقعات لفظ بہ لفظ کتاب "حیات فریاد" مصنفہ خان بہادر سید علی محمد شاد سابق رئیس عظیم آباد سے نقل کرتا ہوں۔

"اسی زمانہ میں حسن اتفاق سے نواب سید محمد نصیر خاں (نصیر الملک) کے ایک بھائی سید شاہ سلام اللہ جو ابتدائے عمر سے کسی صاحب باطن درویش کامل کی توجہ پاکر تارک دنیا ہوکر کچھ عرصہ سے مفقود الخبر تھے۔ یک بیک اپنے بھتیجے میر فیض علیخاں (والد مرحوم کے حقیقی نانا نواب میر کلب علیخاں کے والد) برادر عم زاد سید حسین علیخاں سے ملنے کے لئے وارد عظیم آباد ہوئے چونکہ سید شاہ سلام اللہ صاحب، صاحب کشف و کرامات تھے نواب سید حسین علیخاں نے سید شاہ سلام اللہ صاحب سے اپنے مقصد کو ظاہر کرکے کہا کہ آپ دعا کیجئے کہ فرخ سیر کامیاب ہوں۔ شاہ صاحب نے مراقبہ کیا اور اُن کو یہ مشاہدہ ہوا کہ معزالدین (جہاندار شاہ) اور اس کے سپہ سالار کے جنازے رکھے ہیں۔ اور حسین علیخاں امیر الامرائی کا خلعت زیب تن کئے اور اُن کے بھائی سید عبداللہ خاں (بعد کو قطب الملک) وزیر اعظم بنے ہوئے ایک ہی ہاتھی پر آرہے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے مشاہدہ کی کیفیت نواب حسین علیخاں سے کہی۔ یہ سُن کر ان کو بڑی ہمت ہوئی حسین علیخاں نے عظیم آباد کے دولتمند ساہوکاروں سے روپیہ فراہم کیا اور فوج جو کچھ وہاں تھی اس میں بہت کچھ افزایش کی اور الہ آباد کی طرف فرخ سیر کو لے کر چلے اس وقت نواب سید عبداللہ خاں الہ آباد کے صوبہ دار تھے غرض دونوں بھائیوں کی جانفشانی سے خلاف قیاس معزالدین کو شکست فاش اور فرخ سیر کو فتح ہوئی۔ سید حسین علیخاں امیر الامراو سپہ سالار اور سید عبداللہ خاں وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ غرض یہ کہ سید شاہ سلام اللہ صاحب کو جیسا مکاشفہ ہوا تھا ویسا ہی وقوع میں آیا۔ فرخ سیر نے حضرت شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ دو پرگنے[۵]

---

[۵] یہ دونوں پرگنے راقم کے والد مرحوم کے نانا اور اُن کے بھائیوں کے قبضہ میں بعد وفات اُن کے پدر نواب میر فیض علیخاں مرحوم آئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک حیلہ سے ضبط کرلئے۔

ملکی بلیا ضلع مونگیر میں نذر دیئے لیکن شاہ صاحب جو تارک دنیا تھے دونوں پرگنے اپنے برادرزادہ نواب میرفیض علیخاں کر دوائے؛ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ فرخ سیر کے عظیم آباد سے روانہ ہونے کے پیشتر قلعہ شاہی میں نواب حسین علیخاں نے تخت پر بٹھایا اور شہنشاہ دہلی کے لقب سے مشتہر کیا تھا اسی اثنا میں حضرت سید شاہ سلام اللہ گیاوی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ یہ بھی عجیب واقعہ ہے کہ فرخ سیر تو والد مرحوم کے حقیقی نانا کے دادا نواب سید محمد نصیر خاں نصیر الملک کے بڑے بھائی سید شاہ سلام اللہ گیاوی کا مرید تھا۔ اور اس کا مخالف معز الدین جہاندار شاہ اور اسد خاں اور اس کے وزرا نواب اسد خاں دستور اعظم اور نواب ذوالفقار خاں امیر الامرا حضرت ابو المعالی پیر الملک کے مرید تھے۔ جہاندار شاہ نے اس زمانہ میں حضرت پیر الملک کے ہاتھ پر بیعت کی جبکہ حضرت پیر الملک اپنے مرید خاص نواب ذوالفقار خاں کے ہاں دہلی میں مقیم تھے۔ خود جہاندار شاہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا ایک دستار اور خرقہ دس ہزار اشرفیاں نذر کیں یہ زمانہ ناصر علی سرہندی کا تھا۔ واضح ہو کہ حضرت پیر الملک میرے والد مرحوم کے دادا کے نانا تھے۔ حضرت والد مرحوم ایک قصیدہ میں فرماتے ہیں ؎

گرچہ پدر بر پدر رہت بہ گیتی سمر | پایۂ فضل و ہنر منصب شایانِ من
مرجع شاہان بودند ملک پناہانِ بودند | فیض نگاہان بودند جملہ نیاگانِ من

پھر عاجزانہ یوں فرماتے ہیں :-

یک ازیں فخر و ناز کرد مرا بے نیاز | ذرہ سوز و گداز گنج فرادانِ من

غرض اسی خاک عظیم آباد سے کیا کیا گوہر نایاب پیدا ہوئے۔ نواب حسین علیخاں فرخ سیر کو لے کر الہ آباد کی جانب روانہ ہوئے تو اپنی جگہ پر بہار کا ناظم اپنے برادرزادہ نواب میرفیض علیخاں کو مقرر کر کے گئے تھے نواب میر حسین علیخاں فرخ سیر کی فتح کے بعد بلقب امام الملک و خطاب امیر الامرا دہلی میں رہنے لگے اور صوبہ بہار میں نواب میرفیض علیخاں ایک عرصہ تک ناظم رہے وہ جب فالج میں مبتلا ہوئے تو اپنے ایک دوسرے عزیز نواب میر نصرت خاں کو صوبہ کا حاکم بنا کر نواب حسین علیخاں نے دلی سے بھیجا نواب حسین علیخاں کے زمانہ میں بھی عظیم آباد کی رونق بہت بڑھ گئی تھی۔ محمد شاہ مشہور رنگیلے کے عہد میں مرشد قلیخاں صوبہ دار بہار بنگالہ و اڑیسہ تھے انھوں نے شجاع الدولہ اپنے داماد کو اڑیسہ کا صوبہ دار بنایا اور بہار میں فخر الدولہ کو جن کی مسجد عظیم آباد میں مشہور ہے بہار کا صوبہ دار بنایا۔ فخر الدولہ نے اچھی حکومت نہیں کی اور نہ شہر کو آراستہ کیا اسی اثنا میں شجاع الدولہ کے ایک عزیز مرزا بندہ دلی سے وارد اڑیسہ ہوئے۔ مرشد قلیخاں کی وفات کے بعد ان کے داماد شجاع الدولہ بہار و بنگالہ

واڑلیسہ کے خود مختار صوبہ دار ہوگئے۔ اور فخر الدولہ کو معزول کرکے مرزا بندہ کو بہار کا صوبہ دار بنایا اور شہنشاہ دہلی سے ان کو علی وردی خاں مہابت جنگ کا خطاب دلوایا یہ وہ زمانہ ہے کہ نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ علی وردی خاں مہابت جنگ نے عظیم آباد کو بہت آراستہ کیا تھا۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد مہابت جنگ عظیم آباد سے چلے گئے۔ اور مرشد آباد میں قیام کیا۔ اپنے بھتیجے اور داماد کو ہیبت جنگ کا خطاب دلی سے منگا کر دیا اور صوبہ بہار کا حاکم بنایا جن کا قیام عظیم آباد دارالحکومت بہار میں رہا۔ ان کے بعد سید ہدایت علیخاں اسد جنگ جو مہابت جنگ کے قدیم دوستوں میں اور قدیم دلی کے رہنے والوں میں تھے مرزا بندہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ بخشی الممالک و ناظم بنائے گئے انھیں کے فرزند نواب سید غلام حسین خاں مصنف سیر المتاخرین تھے۔ اخیر صوبہ دار مہاراجہ شتاب رائے دہلی کی برائے نام شہنشاہی کی جانب سے مقرر کئے گئے تھے جن کے یہاں شیخ المتاخرین شیخ علی حزیں بنارس روانہ ہونے سے پیشتر عظیم آباد میں کچھ عرصہ تک مہمان رہے تھے۔ اسی زمانہ میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں کا اثر و اقتدار روز افزوں تھا۔ شاہ عالم گویا خاتم خاندان تیموریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو صدر دیوان مقرر کیا تھا ابتدا میں صرف تحصیلدار بنایا تھا کہ مالگزاری وصول کرے رفتہ رفتہ پولیس رکھنے کی اجازت لی پھر فوج رکھنے کی من بعد عدالت دیوانی و فوجداری کے اختیارات حاصل کئے۔ میر قاسم خاں عالیجاہ کی جنگ سے جو فتح ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہوئی۔ تو قوت بہت بڑھ گئی دہلی کی شہنشاہی برائے نام تھی اکبر ثانی و عالی گوہر وغیرہ قلعہ معلیٰ دہلی میں انگریزوں کے قیدی کی حیثیت سے تھے۔ رزیڈنٹ بھی رہنے لگا اصل میں حکومت انگریزوں کی تھی یوں تو ۱۸۵۷ء کے غدر تک انڈیا کا برائے نام دہلی کا قیدی بادشاہ بہادر شاہ ثانی تھا جس کو غدر کے بعد جبکہ انگریزوں کا تسلط ہوا تو بادشاہ کے جوان بیٹوں پوتوں کو اس کی نظروں کے سامنے بندوق کا نشانہ بنایا اور بادشاہ پر مقدمہ الزام بغاوت کا چلایا خدا کی شان آقا باغی ہو۔ رنگون قیدی بنا کر بادشاہ کو انگریز لے گئے جہاں مصیبتیں سہہ سہہ کر رحلت کی اور مسلمانوں کی بادشاہی کا ہند میں خاتمہ ہوا۔

ہندوں کے زمانہ میں بھی بہار کی سرزمین سے بڑے بڑے باکمال پیدا ہوئے حکیم دھنتر کو یہیں کا بتاتے ہیں شطرنج کے موجد کو بھی بہار ہی کا مولد و متوطن بتایا جاتا ہے۔ کتاب انوار سہیلی در اصل سنسکرت میں تھی اس کا مصنف بھی سرزمین بہار کا تھا قدیم ہندوں کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیوتاؤں نے ایک کمیٹی کی تھی اور یہ ٹھہرایا کہ سارے ہندوستان میں سرزمین بہار ہی کو یہ صلاحیت ہے کہ علما و فضلا پیدا کرے اسی وجہ سے پاٹ شالہ بنایا گیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ جہاں سے بڑے بڑے پنڈت پڑھ کر نکلے

اور سارے ہندوستان میں پھیلے۔ علیٰ ہذا مسلمانوں کے زمانہ میں بھی بڑے بڑے علما فضلا شعرا سرزمین صوبہ بہار نے پیدا کئے۔ جن کا ذکر مجملاً حضرت شاد مرحوم نے کتاب "حیات فریاد" میں کیا ہے۔

راقم کے والد کے نانا کے بڑے بھائی حضرت علامہ سید شاہ کمال علی مصنف "کمالات الحکمت"، مرزا عبدالقادر بیدل و شیخ غلام علی راسخ مرزا احمد منشا ملا احمد سلجوقی سید علی محمد شاد و شوق نیموی وغیرہم و حضرت فریاد اعلی اللہ مقامہ سب عظیم آباد ہی کی خاک سے پیدا ہوئے تھے زمانہ حال میں شمس العلما نواب امداد امام اثر مصنف مصباح الظلم و مناظر المصائب وغیرہ مولانا فضل الحق آزاد وغیرہ موجود ہیں۔ مغربی تعلیم کی جانب جب ابنائے عظیم آباد نے توجہ کی تو اس میں بھی کمال حاصل کیا خدا غریق رحمت کرے عزیزی سر سید علی امام و سید حسن امام و سر فخرالدین وغیرہ کیسے کیسے گہرہائے نایاب و آسمان قانون دانی کے روشن تارے صوبہ بہار کی خاک سے پیدا و ناپید ہوئے اس وقت بھی سر سید سلطان احمد وغیرہ موجود ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کے اخلاق و اوضاع ایسے تھے کہ دہلی کی شہزادیوں کی تعلیم کے لئے عظیم آباد سے علما منتخب ہو کر جاتے تھے چنانچہ ملا مبارک کو جن کی مسجد حاجی گنج میں موجود ہے اورنگ زیب نے بلایا تھا اورنگ زیب عالمگیر سا بادشاہ جو اپنے سایہ سے بھڑکتا تھا یہ دعا کیا کرتا تھا کہ صوبہ کشمیر آباد رہے اور صوبہ بہار ویران ہو جائے جس کا مطلب یہ تھا کہ کشمیر آباد رہے گا تو وہاں کے لوگ وہیں رہیں گے ان کے اخلاق بد اُن کے ساتھ رہیں گے اور بہار کی ویرانی سے اہل بہار منتشر ہو کر دوسرے ملکوں میں جا کر اپنے اخلاق حسنہ کی خوشبو پھیلائیں گے۔

میرے بچپنے میں گئی گذری حالت پر بعض امرا کی ڈیوڑھیوں پر سنتری بندوق اور تلوار لئے اپنی وردی پہنے ٹہلا کرتے تھے اور ایک بڑا برنجی گھنٹہ پھاٹکوں پر بجا کرتا تھا دفتر کے کمروں میں لالہ متصدی کارپرداز مختار گماشتے وغیرہ صبح کے دس سے چار بجے تک کام کیا کرتے تھے۔ دیہاتوں سے جو غریب مسلمان بغرض تعلیم آتے تھے اُن کے رہنے اور کھانے کے لئے امرا اور خوش حال متوسط شرفا کے ہاں ضرور انتظام ہوتا تھا۔ ایک عالم معلم ہر ایک ڈیوڑھی میں صرف اسی غرض سے ملازم رہتا تھا کہ ان غریب مسلمان طلبا کو پڑھاتے اصطلاحاً طلبا کی جاگیر کہتے تھے۔ کسی کے ہاں بیس کسی کے ہاں تیس علیٰ قدر مراتب طلبا کی جاگیریں رہتی تھیں جن کو مفت تعلیم دی جاتی کھانا اور کپڑا دیا جاتا ارزانی کی یہ کیفیت تھی کہ گھی روپیہ کا دو سیر ملتا تھا بکرے کا گوشت روپیہ کا دس سیر باسمتی چاول دو روپے من یعنی ایک روپیہ کو بیس سیر اسی سے سب اشیار اجناس کا قیاس کر لینا چاہئے۔ ڈیوڑھی کے پیادوں کی تنخواہ تین چار روپیہ سائیس تین روپیہ اس میں مرنا جینا شادی بیاہ سب کچھ ہوتا شاگرد پیشوں کی تنخواہ چار روپیہ سفید اُجلے کپڑے سفید دستار سفید اچکن

پائجامے سفید کمر بند غرض سر سے پاؤں تک ہر وقت سفید پوش رہتے۔
اور یہ شاگرد پیشہ اس قدر ذہین ہوتے کہ اشاروں پر کام کرتے اور نہایت آداب داں ہوتے۔
غرض صوبہ بہار عجیب خطہ تھا جو ۱۹۳۴ء کی پندرہویں جنوری کو محشر انگیز زلزلہ کے ہاتھوں دو منٹ میں تباہ و تاراج ہوگیا۔ اور ایسا تاراج ہوا جس کی نظیر تاریخ عالم میں کم ملے گی۔
میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اور جن باکمالوں اور طبقہ امرا کے رئیسوں کو دیکھا وہ موجودہ اور آئندہ نسل کے لئے خواب و خیال تصور ہوگا۔
مقدمہ کتاب اس غرض سے لکھا ہے کہ ناظرین کو معلوم ہو کہ میں کس مردم خیز خطہ میں پیدا ہوا اور کن وگوں میں پرورش پائی۔

سید ہمایوں میرزا

نومبر ۱۹۳۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذکر پیدائش | بتاریخ ۲۴ ماہ رجب المرجب سنہ ۱۲۸۶ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۸۶۹ء بمقام شہر منیر سواد عظیم آباد عرف پٹنہ محلہ بوا گنج میں نماز صبح کے وقت کتم عدم سے عالم شہود میں آیا اذان والد مرحوم نے کہی میرے والد نظام الملۃ حضرت سید شاہ الفت حسین فریاد رحمۃ اللہ علیہ تھے اور والدہ مرحومہ نواب عفت آرا بیگم صاحبہ نور اللہ مرقدہا تھیں۔ سلسلہ نسب جدی و مادری کا ذکر بعد کو کروں گا۔ میری پیدائش کے دوسرے دن میری ولادت کی خبر مخصوص دوستوں کو یعنی نواب جعفر حسن خاں مرحوم اور مہاراجہ مہیپت سنگھ بہادر رئیس اعظم عظیم آباد کو والد نے لکھ بھیجی چنانچہ والد کا رقعہ پاتے ہی اسی دن دونوں حضرات تشریف لائے اور مبارکباد دی اور بہت سے رؤسائے شہر یکے بعد دیگرے ادائے تہنیت و تبریک کے لئے آتے گئے۔ مہاراجہ مہیپت سنگھ مہاراجہ شتاب رائے کے جو اخیر صوبہ دار بہار منجانب شہنشاہ دہلی تھے پوتے تھے یہ زمانہ انگریزوں کا تھا اور اس وقت صوبہ دار بہار کا لقب ریونیو ڈویزنل کمشنر ہو گیا تھا۔ کمشنر کے دربار میں یا لفٹنٹ گورنر بنگالہ پٹنہ جب آتا تو اس کے دربار میں مہاراجہ مہیپت سنگھ کی کرسی دوسری کسی حد پر نہ تھے۔ سب کے پہلے رہتی تھی۔ بہرحال مہاراجہ سے میرے والد نے فرمایا کہ آپ کا درباری جو جوتشی ہے اس کو بھیج دیجئے تاکہ وہ بہ مشورہ میر نواب نو مولود کا زائچہ بنائے۔ میر نواب دہلی کے متوطن اور میرے ہاں ملازم تھے یہ بزرگ رمل و جوتش دونوں کے ماہر تھے۔ چنانچہ میرا زائچہ انھیں دونوں نے مل کر بنایا تھا یہ زائچہ عرصہ دراز تک میرے پاس رہا اور حیدرآباد آتے وقت کلکتہ میں میرے اسباب اور میری کتابوں کے ساتھ جو بعد کو تلف ہوئیں یہ بھی رہ گیا تھا۔ میری ولادت کے تیسرے یا چوتھے مہینے میری والدہ کی رضاعت بند ہو گئی۔ خاندان کے اصول اور دستور کے مطابق انا گری کے لئے سیدانی کی تلاش ہوئی اور ایسی سیدانی جو صحیح النسب ہو۔ عجیب اتفاق بروقت کوئی دستیاب نہ ہوئی۔ اتفاقاً میرے ہاں کے سپاہیوں میں ایک شخص امیر خاں نامی پٹھان تھا اور اس کی اہلیہ بھی پٹھانی تھی اس کے ایک لڑکی اسی زمانہ میں پیدا ہوئی تھی وہ پٹھانی جو میری پہلی انا تھیں بلا لی گئیں۔ میرے والد مرحوم بہت ناراض ہوئے کہ کیوں پٹھانی کا دودھ میرے بچہ کو دیا جا رہا ہے۔ میری والدہ کے اور بھی چند اہل خاندان خواتین کے سمجھانے پر خاموش ہو گئے۔

ذکر عہد شیر خوارگی | مگر مجھے خوب یاد ہے اپنی کمسنی میں میں بہت مغلوب الطیش تھا اور غصہ کا جب

کبھی اظہار کرتا تو میری والدہ کو والد مرحوم طعنہ دیتے اور فرماتے اور پٹھانی کا دودھ پلاؤ۔ دیکھا پٹھانی کا دودھ پلانے کا یہ نتیجہ ہے میں نے ڈھائی تین ماہ سے زیادہ اپنی پٹھانی انا کا دودھ نہیں پیا کہ بہت جستجو کے بعد ایک شریف الخاندان سیدانی جن کی لڑکی میری ہم عمر بھی مل گئیں۔ کامل تین سال جن کا دودھ میں نے پیا میری انا ذرا ہکلاتی بھی تھیں۔ میں جب چھ سات سال کا تھا میں ان کے ہکلانے کی نقلیں کرتا اور وہ میری اس مہمل حرکت سے بہت خوش ہو ہو کر میری بلائیں لیتیں۔

ان کا نام مہدی بیگم تھا اور بہت گوری چٹی تھیں۔ ان کی اخیر بچی جو میری کوکی تھی پیٹ ہی میں تھی کہ ان کے خاوند کا یک بیک انتقال ہیضہ سے ہو گیا تھا وہ جز معاش آدمی تھے اس لئے ان کی بیوہ کو ضرورت ملازمت کی ہوئی تھی وہ آخر عمر تک میرے ہاں رہیں۔ میری کوکی جب جوان ہوئی تو میرے والد نے ایک منشی کے ساتھ شادی کر دی تھی میں جب ایک سال کا ہوا تو میری پہلی سالگرہ عظیم آباد میں بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ میری عمر جب سوا سال کی ہوئی تو والد مرحوم معہ متعلقین کلکتہ واپس تشریف لے گئے جہاں عرصہ دراز سے اقامت گزیں تھے۔ اس دفعہ ڈھائی سال کے قریب عظیم آباد میں قیام رہا تھا۔

ایک عجیب واقعہ

عظیم آباد سے جب روانہ ہونے لگے تو عجیب واقعہ پیش آیا وہ یہ کہ ٹرین کا جس میں کلکتہ جانے والے تھے ایک خانہ ریزرو یعنی مخصوص کر لیا گیا تھا سیکنڈ کلاس کا خانہ تھا (باصطلاح حیدرآباد ڈبہ) اس میں میری والدہ مرحومہ معہ مغلانی اور ایک پیش خدمت کے سوار ہو گئیں۔ میری انا کو بھی چاہئے تھا کہ مجھے لے کر اسی خانہ میں سوار ہو جاتیں مگر وہ مرد ملازموں کے ساتھ تھرڈ کلاس میں سوار ہو گئیں۔ میرے والد پلیٹ فارم پر ان اشخاص سے باتیں کر رہے تھے جو رخصت کرنے آئے تھے اور اس خیال میں تھے کہ جب سیٹی ہو گی تو مخصوص خانہ میں سوار ہو جائیں گے اتنے میں سیٹی ہوئی اور والد مرحوم ٹرین میں سوار ہوئے اور اپنے خانہ میں آ کر میری والدہ سے پوچھنے لگے بچہ کہاں ہے انھوں نے کہا تھوڑی دیر ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ انا بچہ کو لے کر آپ کے قریب برقعہ پہنے ٹہل رہی تھی۔ والد مرحوم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ اپنے خانہ میں سے دروازہ کھول کو دپڑے اور چاروں شانے چت گر پڑے لوگ دوڑے اور حضرت کو اٹھایا اور میری انا نے جو اپنے خانہ میں سے گردن نکالے جھانک رہی تھیں چیخنا شروع کیا۔ سرکار گرے سرکار گرے اللہ نے بڑی خیر کی کہ ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر جا رہی تھی گارڈ نے ٹرین فوراً روکی اس وقت میری انا کو جن کی گود میں میں تھا تھرڈ کلاس سے اتروا کر اپنے خانہ میں سوار کر کے خود سوار ہوئے یہ دلیل اس امر کی ہے کہ والد کو میرے ساتھ تعشق کا درجہ تھا۔ بعض اوقات اس واقعہ کا ذکر کر کے لوگوں سے فرماتے تھے کہ اس بچہ کی خاطر میری جان جانے میں کچھ باقی نہ تھا۔ اس کے لئے میں نے اپنی جان

تک عزیز نہیں کی۔ ان کو اللہ نے بیٹیاں دی تھیں، اولاد نرینہ کی بیحد آرزو و تمنا تھی کہ میں ان کے گھر پیدا ہوا۔

ذکر نسب

جس گھر میں پیدا ہوا اس کے حسب نسب کا تذکرہ مختصراً ذیل میں کرتا ہوں۔ میرے خاندان کے تفصیلی حالات مرحوم مغفور خان بہادر سید علی محمد متخلص بہ شاد سابق رئیس عظیم آباد نے حیات فریاد میں درج کئے ہیں جو باہتمام مسعود علی صاحب ندوی مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڈھ میں ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی اور وہیں فروخت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں میرے والد کے ہم عصر امراء کملائے صوبہ بہار کے حالات اور بھی مفید معلومات نکات شاعری وغیرہ کے متعلق درج ہیں بہت ہی دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ہے شائقین وہاں سے طلب کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے اس مقام پر ذکر نسب باختصار حوالہ قلم کرتا ہوں۔

امام ہمام حضرت موسیٰ کاظم صلوٰۃ اللہ علیہ وعلیٰ آبائہ وابنائہ الطاہرین سے مجھ تک بتیسویں ۳۲ پشت ہے۔ حضرت سید شاہ عین الدین علیہ الرحمۃ جو عربستان سے وارد ہندوستان ہوئے اور موضع سامانہ پنجاب میں اقامت گزیں ہوئے جن کی قدمبوسی کو خود محمد تغلق آیا اور حضرت کو نظام الملۃ کا گرانقدر خطاب دیا (دیکھو تاریخ نیر اعظم) میں ان کی پندرھویں پشت میں ہوں۔ تاریخ فیروز شاہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق بھی حضرت سید شاہ عین الدین کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا تھا اور خانقاہ کے لئے بہت سی جائداد نذر کی تھی۔ پھر حضرت سید شاہ داسم رحمۃ اللہ علیہ کو بزمانہ بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی کو سلطان وقت سے نظام الملۃ کا خطاب عطا ہوا تھا میں سید داسم علیہ الرحمۃ کی آٹھویں پشت میں ہوں اور خطاب نظام الملۃ نسلاً بعد نسلٍ ملا تھا۔ والد مرحوم کے جدی و مادری اجداد میں یا تو امرائے ذی احتشام یا مشائخین عظام تھے۔ والد مرحوم کے جدی اجداد میں دادا کے نانا حضرت ابو المعالی پیر الملک پیر و مرشد جہاندار شاہ خلف بہادر شاہ خلف اورنگ زیب عالمگیر علاوہ شہنشاہ کے حضرت پیر الملک کے مریدوں میں نواب اسد خاں وزیر اعظم اور نواب ذوالفقار خاں امیر الامرا بھی تھے۔ جدی اجداد میں حضرت جلال الملک پانی پتی حقیقی برادر حضرت بوعلی قلندر تھے۔ والد مرحوم کے دادا سید شاہ محب اللہ کی شادی قاضی سید منصور کی پوتی سے ہوئی تھی اور قاضی سید منصور حضرت ناصر اسمٰعیل ہمدانی کے پوتے تھے جن کا تذکرہ بجلالت قدر ملا جامی نے اپنی ضخیم کتاب سلسلۃ الذہب میں کیا ہے اور قاضی سید نور اللہ شوشتری شہید ثالث علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب مجالس المومنین میں بھی کیا ہے۔ علاوہ ان کے والد مرحوم کے دادھیالی بزرگوں میں حضرت سید احمد جاجنیری وغیرہ ہیں والد مرحوم کے نانا صاحب سید کلب علیخاں مرحوم تھے جن کے بڑے بھائی حضرت علامہ وقت سید شاہ کمال علی رحمۃ اللہ تھے یہ صاحب باطن اور اپنے نانا سید شاہ غلام علی قدس سرہٗ کے مرید تھے۔

حضرت سید شاہ غلام علی کا تذکرہ مثنوی بشارت الامۃ میں اور تاریخ سیر المتاخرین میں بہ طبقہ مشائخ عظام بہار نواب غلام حسین خاں مرحوم خلف نواب بخشی الممالک نواب اسد جنگ نے بتفصیل کیا ہے۔ سید شاہ غلام علی قدس سرہٗ حضرت سید شاہ جلالی مخاطب بہ جلال الملک پانی پتی حقیقی برادر حضرت بوعلی قلندر تھے۔ والد کے نانا سید کلب علیخاں کے چھوٹے بھائی نواب سید ذوالفقار علیخاں تھے۔ جن کو بادشاہ وقت نے نوابی کا خطاب دیا تھا۔ سید شاہ کمال علی و سید کلب علی خاں اور نواب ذوالفقار علیخاں جن کا بنایا ہوا ذوالفقار باغ محلہ گھمرا عظیم آباد میں ہے۔ باغیت تو باقی نہیں رہی ایک مسجد و مقبرہ رہ گیا ہے جہاں والد مرحوم مدفون ہیں۔ یہ تینوں بھائی نواب میر فیض علیخاں مرحوم سابق ناظم بہار کے فرزند تھے۔ نواب میر فیض علیخاں مرحوم نواب سید محمد نصیر خاں نصیر الملک یکے از وزراے ابوالحسن تانا شاہ کے فرزند تھے۔

نواب سید نصیر خاں کے حقیقی بھائی سید شاہ سلام اللہ گیاوی پیر و مرشد فرخ سیر شہنشاہ دہلی تھے۔ حضرت گیاوی کا مزار محلہ نذر گنج گیا میں ہے۔

سید محمد نصیر خاں نصیر الملک کے برادران عم زاد نواب سید عبداللہ خاں قطب الملک وزیر اعظم فرخ سیر اور نواب سید حسین علیخاں امام الملک امیر الامرا تھے۔ تاریخ میں یہ دونوں بھائی شہنشاہ گر مشہور رہیں کیونکہ ان کا اقتدار اس قدر تھا کہ چند سلاطین دہلی کو تخت پر بٹھایا اور ان کی نامعقول حرکتوں کی وجہ سے معزول کرتے گئے نواب سید محمد نصیر خاں کے اجداد میں نواب سید محمد فاضل خاں و نواب سید محمد قابل خاں دونوں حقیقی بھائی یکے بعد دیگرے وزرائے دار الانشائے شاہجہاں تھے اور یہ دونوں بھائی حضرت سید شاہ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی خلیفہ و جانشین سلطان الاولیا حضرت نظام الدین کی اولاد میں تھے۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز گلبرگوی چراغ دہلی کے خلیفہ تھے۔

والد مرحوم کی تصانیف میں سے ایک مثنوی دبستان اخلاق تتبع بوستان سعدی چھ ہزار اشعار آبدار پر مشتمل ہے جو تقریباً چالیس سال کے قبل مطبع و شائع ہوئی تھی اس مطبوعہ مثنوی کا ایک نسخہ حال میں مجھے بدست ہوا ہے وہ دوبارہ چھپ کر تیار ہو گیا۔ اس مثنوی میں بتقریب سپاس گزاری باری تعالیٰ اپنے خاندان کا تذکرہ مندرجہ ذیل اشعار میں والد نے فرمایا ہے۔

دو گوہر ز گنج عطائے بزرگ — عطا کرد ما را خدائے بزرگ
یکے گوہر پاک آبائے من — دگر جوہر طبع والائے من
ملاذ سر سروراں بودہ اند — بہ گیتی بنام و نشان بودہ اند

پدر بر پدر جملہ آبائے من — بزرگان ارشاد فرمائے من
پدر را نسب از سر آگہی — بموسیٰ ابن جعفر شود منتہی
علیؑ ابن موسیٰ جد مادری ست — کہ روشن دُر درج پیغمبری ست
بسے از بزرگان این دودہ اند — کہ کامل تریں اولیا بودہ اند
معظم تریں است محبوب[1] پاک — کہ فیضش بود از سمک تا سماک
نیابم یکے مرشد با نسبت — کہ گنجور گنجینہ معنوی ست
بدہلی بود شاہ روشن چراغ[2] — دو گیتی ز عطرش معطر دماغ
نیائے دگر بو الفرح بودہ است — کہ در خطۂ واسط آسودہ است
دگر آں جلال جلالت پناہ — کہ پانی پت[3] او را بود خوابگاہ
ولیکن بریں نسبت و اعتبار — نباشد مرا نازش و افتخار
نزیبد مرا این ناز بر جائے خویش — کہ نازند بر فضل آبائے خویش
در فخر بر روئے خود باز کرد — کہ بر جوہر ذات خود ناز کرد
متاع گر از خود نداری بدست — ز بیگانہ سودا چہ آری بدست

والد مرحوم کے دادھیالی اور نانیہالی بزرگوں کا ذکر میں نے بہت اختصار کے ساتھ کیا ہے بہت سے نامور بزرگوں کا ذکر بخوف طوالت چھوڑ بھی دیا۔ تاہم میری عالی نسبی کا اندازہ جس قدر میں نے لکھا اس سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ رہا میرا نانیہال جس کا تعلق نظامت مرشد آباد بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ناظم بہار و بنگالہ و اڑیسہ کے خاندان سے ہے اس خاندان عالی کے کارناموں سے جملہ سیر و تواریخ ہند خصوصاً تواریخ بہار و بنگالہ پُر ہیں اتنا لکھنا کافی ہے کہ اخیر ناظم جناب عالی نواب سید منصور علیخاں فریدوں جاہ کی ہمشیرہ زادی میری والدہ تھیں۔ اس قدر خاندان کا ذکر کرنے کے بعد والد مرحوم کے مشاغل زندگی وغیرہ کا تذکرہ مجملاً ضروری سمجھتا ہوں۔

ذکر والد مرحوم

والد مرحوم عالم متبحر عربی و فارسی کے تھے فارسی زبان کے شاعر وحید العصر اور مورخ تمام بلاد عالم کے یکتائے دہر تھے۔ آبائی معاش میں سے ان کے حصہ میں سالانہ چودہ ہزار آمدنی کی جائداد آئی تھی۔ والد مرحوم کے کمالات صوری و معنوی کی شہرت بہار و بنگالہ میں ہر طرف تھی حضور ہمایوں جاہ پدر فریدوں جاہ نے بطور خاص عظیم آباد سے مرشد آباد طلب فرمایا۔ مرشد آباد وارد ہونے کے قبل آبائی معاش کی وہ تفریق حضرت نے کی آٹھ ہزار سالانہ کی جائداد منجھلی بی بی یعنی اپنی منجھلی

[1] حضرت غوث اعظم
[2] نصیر الدین اودھی چراغ دہلی
[3] بو علی قلندر

بہن کے نام ہبانامہ کے ذریعہ سے ہبہ کردی اور چھ ہزار سالانہ کی جائداد بذریعہ وقف نامہ کے وقف کردی۔ رمضان کے اخراجات۔ محرم میں امام باڑہ کے اخراجات آبائی مقبرہ موقوعہ دھولپور عظیم آباد کے اخراجات مقامات مقدسہ کو بے استطاعت اشخاص کے جانے کے لئے بطور امداد دینے کے لئے کمی آمدنی موقوفہ جائداد کی وقف کی۔ مرشدآباد میں جب حضرت والدمرحوم حسب طلب ناظم بنگالہ سرہمایوں جاہ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کے۔ جی ۱۸۴۲ء میں جبکہ حضرت کا سن شریف اٹھتیس سال کا تھا پہنچے پہلی خدمت مرشدزادوں کی اتالیقی کی دی گئی۔ مرشدآباد میں اس وقت سرہنری ٹارنس رزیڈنٹ تھے ان کو والد مرحوم سے خاص عقیدت ومحبت ہوگئی یہ حضرت سے فارسی پڑھتے اور حضرت ان سے انگریزی پڑھتے اور آپس میں کبھی انگریزی میں گفتگو ہوتی اور کبھی فارسی میں تاکہ ہردو صاحبوں کو اپنی اپنی مطلوبہ زبانوں کی مشق ہو۔ رزیڈنٹ کے الطاف وعنایت کی وجہ سے گورنمنٹ آف انڈیا نے وہ تحریک منظور کرلی جو حضرت کو سفیر ونایب السلطنۃ مقرر کرنے کے لئے نظامت سے کی گئی تھی۔ چند سال اتالیقی کی خدمت ادا کرکے بعد حضرت کی قابلیت وذراست کے لحاظ سے اس سترگ ذمہ داری کا عہدہ جلیلہ حضرت کو دیا گیا۔ منجانب نظامت نیابت وسفارت کا عہدہ ملنے پر حضرت کا قیام کلکتہ میں قرار پایا تاکہ نظامت کے پولیٹیکل امور کا تصفیہ گورنرجنرل سے کلکتہ میں کرائیں تین گورنرجنرلوں کے زمانہ تک حضرت اس عہدہ جلیلہ پر رہے لارڈالنبرا کا اخیرزمانہ اور لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ منٹو کا پورا زمانہ آخرالذکر دو گورنرجنرلوں کے پوتے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۵ء تک وایسرائے ہند تھے۔ زمانہ اقامت مرشدآباد میں میری والدہ مرحومہ سے حضرت نے شادی کی۔

بزمانہ اقامت کلکتہ حضرت نے اخبار آئینہ گیتی نما ۱۸۴۲ء میں نکالنا شروع کیا۔ مشرقی زبان کا یہ پہلا اخبار تھا جو ہند سے نکلا۔ حضرت کی روشن خیالی کی بڑی دلیل ہے علاوہ اس کے مسلمانوں کی ترقی علمی وذہنی کے لئے ایک انجمن بھی قایم کی تھی اور بھی بہت سے مسلمانوں کی بھلائی وترقی کے کام حضرت نے کئے چونکہ حضرت کی سوانح عمری چھپی ہوئی ہے شائقین اس میں دیکھ سکتے ہیں اس وقت اس کا محل نہیں ہو بتفصیل ان امور کا ذکر خیر کیا جائے۔

ذکر عہد طفلی اب میں اپنے عہد طفلی کے حالات حوالہ قلم کرتا ہوں۔ ہمارے خاندان کے رواج ودستور کے موافق میری تعلیم کا آغاز ساتویں سال ہوا اُس وقت تک سوا کھیلنے کودنے کے میرا کوئی اور کام نہ تھا والدمرحوم فرماتے تھے کہ چھ سال کی عمر تک لڑکوں یا لڑکیوں کو تعلیم کی طرف رجوع نہ کیا جائے ورنہ ذہن کند ہوجاتا ہے اس زمانہ میں کنڈرگارٹن کے ذریعہ تعلیم کا چرچا نہ تھا اگر ہوگا بھی تو ممکن

لہ حیدرآباد دکن سے سب سے پہلا زنانہ پرچہ النساء میرے گھر سے میری بی بی نے ۱۳۳۸ھ میں نکالا۔ انجمن خواتین دکن بھی قائم کی۔

ہے پرورش رگوں میں ہوا البتہ میری تربیت کا خیال تا زمانہ شیرخواری سے بذریعہ اشاروں کے میری والدہ مرحومہ کو تھا۔ جو بہت روشن خیال اور بڑے گھرانے کی خاتون تھیں۔ جب میں تین چار سال کا ہوا اُس وقت سے والدہ مرحومہ نے بہت سی مفید باتیں باتوں باتوں میں میرے گوش زد کرنی شروع کیں۔ مثلاً نشست و برخاست کا طریقہ۔ بڑوں کا ادب۔ خوف خدا۔ آداب مجلس کے نکات۔ بڑوں کی برابر والوں کی اور اپنے سے چھوٹوں کی تعریف۔ یعنی بڑوں سے کیا مراد ہے۔ برابر والا کسے کہتے ہیں چھوٹوں سے کیا غرض ہے۔ ان سب سے مخاطبت کے جدا جدا طریقے بتلایا کرتیں۔ اصول دین فروع دین دوازدہ اماموں کے نام یاد کرواتیں۔ والدہ مرحومہ کو زباندانی کا بڑا خیال تھا۔ مذکر و مونث وحدت وجمعیت کا خیال ہمیشہ ان کو ملحوظ رہتا اور نہایت فصیح اردو بولتی تھیں اور جب میں چھ سات سال کا بلکہ اس سے بھی کم عمر کا ہوں گا کہ جہاں کوئی لفظ میری زبان سے غلط نکلا تو مجھ کو بتلاتیں کہ یوں نہیں اس کو یوں بولتے ہیں مثلاً واحد کی جمع یا جمع کی جگہ واحد اسی طرح مونث کو مذکر یا تذکیر کو تانیث جب میری زبان سے کوئی غلط لفظ نکلتا تو اس کی اصلاح فرما دیتیں۔ ان کو زباندانی کا اس قدر خیال تھا کہ میرے ہاں کی پروردہ چھوکریاں بھی شستہ اور صاف اردو بولتی تھیں مجھے خوب یاد ہے کہ چھوکریوں کو بھی ٹوکتی رہتیں۔ فرماتیں۔ اری یوں نہیں بولتے ہیں چھوکریوں کو خاصہ پزی کی تعلیم باورچی سے دلائی جاتی تھی اور کشیدہ کاڑھنا اور اقسام کے سینے پرونے کی تعلیم مغلانی دیتی تھی اور دو چھوکریوں کو موسیقی کی تعلیم دی گئی تھی۔ ایک سارنگیا اور ایک طبلیا مستقل طور سے ملازم تھا۔ ایک جوق رگارڈ (آٹھ سپاہیوں اور ایک حولدار) کا نظامت کی جانب سے متعین تھا۔ حولدار سید اور شریف آدمی تھے۔ میر حیدر علی نام تھا ان کو کارچوب کے کام میں بہت دخل تھا۔ چنانچہ کارچوب کا کام بعض چھوکریوں کو یہی میر صاحب سکھاتے تھے۔ ادگیاں وغیرہ گرگابی جوتوں کی کارچوبی کام کی والدہ مرحومہ کے اور میرے لئے جو بنائی جاتی تھیں وہ چھوکریوں سے ہی میر صاحب اپنی نگرانی میں بنواتے تھے۔ والدہ مرحومہ صوم وصلواۃ کی بہت پابند تھیں۔ صبح کی نماز بعض اوقات قضا پڑھتی تھیں لیکن ظہرین ومغربین بہت پابندی کے ساتھ پڑھتی تھیں اور ہر صبح منہ دھو کر وضو کرکے ضرور تلاوت قرآن شریف فرماتیں الا بحالت علالت۔ نماز تو بحالت علالت بھی بیٹھ کر پڑھتیں۔ باوجود باورچی مردانہ میں اور باورچن زنانہ میں ہوتے ہوئے اپنے سامنے انگیٹھیاں منگوا کر تقریباً روزانہ دو تین قسم کے سالن یا میٹھی چیزیں میرے والد کے مذاق کی خود پکاتیں۔

اخراجات روزمرہ کا حساب رکھنا منشی تصدق علی کے ذمہ تھا لیکن روزانہ صبح کے دس بجے ناشتہ

وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد منشی صاحب پس پردہ حاضر ہو کر گذشتہ روز کے حساب کی فرد پیش کرتے ماما مرادن عرض کرتی منشی صاحب حاضر ہیں۔ اس وقت نشست کے کمرہ سے اٹھ کر دوسرے کمرہ میں جاتیں وہاں ایک بڑے اوٹ یعنی اسٹینڈنگ اسکرین کے پیچھے منشی صاحب کھڑے رہتے۔ ماما مرادن کہتی حضور تشریف لائیں۔ اس وقت منشی صاحب سات تسلیمیں بجالاتے۔ ماما مرادن کہتی منشی صاحب آداب بجالاتے ہیں۔ والدہ فرماتیں دعا کہو اس کے بعد ماما مرادن منشی صاحب سے حساب کی فرد لے کر پیش کرتی شروع سے اخیر تک دیکھنے کے بعد جو کچھ پوچھنا یا کہنا ہوتا ماما مرادن سے فرماتیں وہ منشی صاحب سے کہتی جاتی۔ اس فرد پر دستخط کر کے واپس کر دیتیں۔ اُس کے بعد منشی صاحب پوچھتے کچھ فرمانا ہے۔ جب والدہ فرماتیں کچھ نہیں منشی صاحب پھر سات تسلیمیں بجا لا کر رخصت ہوتے اور دفتر میں جا کر بہی پر فرد دستخط شدہ کی نقل کر لیتے ہمارے ہاں علاوہ اوپر کے کام والی چار چھوکریوں کے میری نانی صاحبہ کے زمانہ کی تین بڑھی خواصیں تھیں[1] جن کو سوائے میرے والدین کے سارا گھر بوا کے لقب سے مخاطب کرتا تھا حتیٰ کہ میں بھی ان تینوں کو بوا کہتا تھا۔ چمپا بوا۔ بختاور بوا۔ اور جواہر بوا۔ یہ تینوں بھی بہت سے ہنر میں طاق تھیں۔ سینا پرونا کھانا پکانا رنگنا وغیرہ۔ واضح ہو کہ رنگنا بذات خود بڑا ہنر ہے خصوصاً اُس زمانہ میں جبکہ یہ ولایتی رنگ نہیں نکلے تھے۔ کُسم کے پھولوں سے شہاب نکلتا اور ہار سنگار کی ڈنڈیوں کو جوش دے کر اس سے رنگ نکالا جاتا تھا اور نیل۔ پھٹکری۔ کاغذی لیموں اور املی کے عرق کو چھان کر انھیں چیزوں کی آمیزش سے اقسام کے رنگ پیدا ہوتے تھے۔ غرض علاوہ مختلف ہنروں میں طاق ہونے کے ان بوؤں کے حوالہ مقررہ خدمتیں بھی تھیں۔ جواہر بوا کے حوالہ توشہ خانہ تھا۔ بختاور بوا کے علاقہ مودی خانہ تھا۔ چمپا بوا کے علاقہ لنگر خانہ تھا میرے والد مرحوم کی خوابگاہ کا کمرہ نیچے کی منزل میں تھا اور نشست کا کمرہ بھی نیچے کی منزل میں تھا۔ حمام کا کمرہ خوابگاہ کے ملحق تھا۔ غرض کل ضروریات و آسایش کا سامان نیچے کی منزل میں تھا وہ سیڑھیوں کے ذریعہ چڑھنے اترنے سے ذرا پرہیز کرتے تھے اور والدہ مرحومہ کی رہایش اوپر کی منزل میں تھی۔

یہ کوٹھی محلہ انٹالی میں تھی اور دو منزلی تھی۔ اس کے قبل والی کوٹھی بہت وسیع اور ایک منزلی تھی مولا علیؑ کی درگاہ جو کلکتہ میں مشہور زیارت گاہ و مرجع خاص و عام ہے اس کے قریب تھی۔ خوابگاہ کے کمرہ میں بہت بڑا اور اونچا چاندی کا چھپر کھٹ تھا اتنا اونچا تھا کہ دو زینہ کی چھوٹی سی چوبی سیڑھی لگی رہتی تھی جس کے ذریعہ سے پلنگ پر جاتی اور اترتی تھیں۔ اس کے تھوڑے فاصلہ سے میری

[1] حیدرآباد کی اصطلاح میں خواصیں وہ چھوکریاں کہلاتی ہیں جو صاحب خانہ کے استعمال میں آتی ہیں مرشد آباد اور عظیم آباد میں ایسی چھوکریوں کو حرم کہتے ہیں۔

چاندی کی پلنگڑی تھی۔ اس کمرہ میں ایک دیوار سے لگا ہوا ایرن سیف بہت بڑا حیدرآباد کی اصطلاح میں جسے تجوری کہتے ہیں رکھا تھا۔ جس میں زیورات وزر نقد رہتا تھا باقی جواہرات اور ملبوسات وغیرہ توشہ خانہ کے کمرہ میں مقفل رہتے جس کو کھولنا بند کرنا۔ سینتنا جواہر بوا کا کام تھا۔ کنجیاں والدہ سے لے کر توشہ خانہ والی بوا حسب ضرورت کوئی چیز نکالیں یا رکھتیں۔ توشہ خانہ کا کمرہ خوابگاہ کے کمرہ سے ملا ہوا یعنی ملحق تھا۔ پلنگ کے کمرہ میں ایک جانب ایک بڑا سا تخت بچھا رہتا جس پر علاوہ شطرنجی و چاندنی کے گرمیوں میں سوتی سوزنی اور جاڑوں میں ایرانی قالین بچھتا۔ اسی تخت پر ایک جانب جانماز اور رحل پر کلام مجید رہتا۔ یہ تخت پلنگ کے سرہانے کی جانب تھا۔ مکہ معظمہ مدینہ طیبہ نجف اشرف اور کربلائے معلی کے نقشے آئینہ دار چوکھٹوں میں دیوار پر آویزاں تھے۔ پلنگ کے متصل ایک اونچی سی تپائی رہتی جس پر ایک گلدان رہتا روزانہ گلدستہ اس میں کا بدلا جاتا اور کچھ کتابیں رہتیں یہ بھی معمول تھا کہ ہر روز سب گلدان باہر مالی کے پاس بھیج دیئے جاتے اور باسی پھولوں کے گلدستے پھینک کر تازہ پھولوں کے گلدستے تیار کرکے بھیجتا اور شام کو اگر کی بتیاں روشن کی جاتیں خصوصاً ہر دو منزلوں کے نشست اور خوابگاہ کے کمروں میں اگردان رہتے۔ اب میں والدہ مرحومہ کا روزانہ دستور العمل یا نظام اوقات بیان کرتا ہوں۔

جاڑوں میں صبح سات بجے یا اس سے پیشتر بیدار ہوتیں چوکی پر جاتیں۔ حمام کا کمرہ خوابگاہ کے ملحق تھا حوائج ضروری سے فارغ ہو کر تخت پر آکر بیٹھتیں۔ ایک چھوکری سیلفچی اور آفتابہ لے کر پہلے سے آجاتی تخت کے ایک جانب زیر انداز بچھا کر سیلفچی آفتابہ اور منہ دھونے کے سامان کا مقابہ لاکر رکھتی جس میں منجن دان صابن دان بیسن دان آئینہ وغیرہ رہتا۔

چھوکری آداب بجالانے کے بعد منہ دھلانا شروع کرتی۔ منہ دھونے کے بعد چھوکری کے ہاتھ سے آفتابہ لے کر خود وضو کرتیں صبح کی نماز پڑھ کر کلام مجید لے کر بیٹھتیں بعد تلاوت دوسرے کمرہ میں جاتیں یہاں پہلے سے مامائیں چھوکریاں بوائیں مغلانی پیش خدمت میری انا میری کھلائی وغیرہ یعنی گھر کی کل عورتیں چھوٹی بڑی سب دست بستہ بر اجائے کھڑی اور منتظر رہتی ادھر میری والدہ اس کمرہ میں داخل ہوئیں کہ مغلانی پکارتی آداب بجالاؤ حضور برآمد ہوئیں۔ میرے والد کو سارا گھر سرکار کہتا اور والدہ کو حضور۔ سب کی سب بیک وقت سات تسلیمیں بجالاتیں۔ مجھے صبح خیزی کی عادت ڈالی گئی تھی۔ قبل اس کے کہ والدہ بیدار ہوں۔ میری آنکھ یا تو خود کھل جاتی یا باریداریوں میں سے کوئی مجھے بیدار کرتی نہایت آہستہ سے دبے پاؤں تاکہ میری والدہ جاگ نہ جائیں خوابگاہ کے کمرہ سے مجھ کو لے کر میرے حمام

کے کمرہ میں جہاں ایک جانب میری چوکی رکھی تھی مجھ کو چوکی پر بٹھا کر باہر جا کر دروازہ بھیڑ کر دروازہ پر کھڑی رہتی۔ میرے منہ ہاتھ دھونے کا سامان میرے باتھ روم میں رہتا۔ پھر وہی باری دارنی چوکی سے میرے فارغ ہونے کے بعد میرا منہ ہاتھ دھلاتی۔ واضح ہو کہ میری باری دارنیاں ایک اصیل یعنی ماما اور میری کھلائی تھی۔ شب کو میری پلنگڑی کے ایک طرف زمین پر اصیل اور دوسری طرف میری کھلائی اور باری باری تمام رات یہ دونوں جاگتیں۔ شب کے نو سے بارہ بجے تک ایک جاگتی اور بارہ سے صبح کے پانچ بجے تک دوسری جاگتی۔ اس لئے شب کو اس کا لقب باری دارنی ہوتا ان کو جاگتے وقت لیٹنے پوٹنے کا حکم نہ تھا صرف بیٹھے رہنے کا تھا۔ گرمیوں کے زمانہ میں ہاتھ کا پنکھا جھلا جاتا باوجودیکہ فراشی پنکھا بھی رات بھر کھینچا جاتا۔ جاڑوں کی رات کو باری دارنیاں صرف چوری ہلاتی رہتیں۔ بڑے سیلنگ فین کو فراشی پنکھا اس لئے کہتے تھے کہ اس کو فراش کھینچتا تھا وہ اس طرح کہ کمرہ کے ایک دروازہ کی اوپر کی چوکھٹ کے سوراخ میں سے بید کا کچھ حصہ ادھر ادھر اور کچھ اس طرف پنکھے سے سوتلی سے بید کو باندھتے بید کے باہر کی جانب کے حصہ میں بھی ڈوری بندھی رہتی جس کو فراش کھینچتا میرے ہاں بوض فراش کے گرمیوں میں چار کہار جسے حیدرآباد کی اصطلاح میں بھوئی کہتے ہیں ملازم رکھے لئے جاتے دو دن کے لئے دو شب کے لئے۔ گرمیوں میں دن کو علاوہ پنکھا کھینچنے کے خس کی ٹٹیوں پر پانی چھڑکنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ اس طرح چار کہار باہر کے لئے یعنی والد مرحوم کے لئے رکھے جاتے۔ گرمیوں میں بھی شب کو برآمدہ وغیرہ میں نہ میرے والد مرحوم آرام فرماتے اور نہ والدہ مرحومہ شب کو خوابگاہ کے کمروں کی کھڑکیاں کھول دی جاتیں اور پنکھے ہر دو کمروں میں شب بھر چلتے رہتے۔ گرمیوں میں صبح کے آٹھ نو بجے سے کھڑکیاں بند کی جاتیں دن کو بارہ سے چار تک پلنگ کے کمروں میں سب لوگ رہتے خس کی ٹٹیوں پر آبپاشی ہوتی رہی اور کہار باری باری پنکھے کھینچتے۔ صبح کو جس وقت والدہ مرحومہ خوابگاہ کے کمرہ میں سے دوسرے کمرہ میں تشریف لے جاتیں پہلے انار شیریں کا افشردہ نوش کرتیں تھوڑی دیر کے بعد وہاں دسترخوان تخت پر بچھتا مجھ کو لیکر ناشتہ کرتیں۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد نشست کے کمرہ میں والدہ مرحومہ چلی جاتیں۔ وہاں بہت سے تختوں کے چوکوں کا فرش اور دیوار کی جانب بیچ میں ان کی مسند رہتی۔ گرمیوں میں سوتی سوزنی اور جاڑوں میں قالین ایک مخملی سبز و سرخ رنگ کا گاؤ تکیہ اور چار گول مخملی سبز و سرخ رنگ کے پہلو کے تکیے دو ادھر دو ادھر رہتے۔ اس کمرہ میں دیواروں میں لگے ہوئے دو لمبے لمبے سونے رکھے تھے جن کو کوچ کہتے تھے نہ معلوم اس کی وجہ کیا تھی اور چند کرسیاں۔ چاروں طرف دیواروں میں دیوار گیریاں نصب تھیں جن کے کنول سبز و سرخ شیشوں کے تھے۔ اس میں تین جھاڑ سفید کنولوں کے اور چاروں طرف چار

ہانڈیاں رنگین شیشوں کی آویزاں تھیں کسی تقریب کے موقع پر ان سب میں مومی بتیوں کی روشنی ہوتی تھی آئے دن مومی بتیوں کے لالے اور مردنگیاں روشن ہوتی تھیں والدہ مرحومہ نشست کے کمرہ میں تھوڑی دیر بیٹھتیں اتنے میں کوئی آگیا تو اس سے باتیں کرتیں کبھی مٹیابرج سے کوئی بی بی آتیں۔ نواب امجد الدولہ کی بیوی بہو فلک الدولہ کی بیوی یا ذوالفقار الدولہ یا جلیس الدولہ کا زنانہ یا ٹالی گنج سے ٹیپو سلطان کے خاندان کی بیبیاں شہزادہ بشیر الدین وغیرہ کی بیگمات یا کولوٹولہ سے ایرانی خواتین میں مرزا مہدی یا حاجی کربلائی شیرازی ملک التجار کا زنانہ آجاتا۔ مسلمان خواتین میں انھیں لوگوں سے میل جول تھا ان میں کوئی یا تو صبح کے دس بجے آجاتا یا تیسرے پہر کو علاوہ ان کے چند انگریزنیں بھی آتی جاتی تھیں مجھے یاد نہیں یہ کون تھیں۔ ایک کرنل کی بیوی سبزہ گھوڑوں کی جوڑی لگی ہوئی مشین چرٹ گاڑی میں اکثر شام کو آیا کرتی جس کو میری والدہ اپنی بردم گاڑی میں ساتھ لے کر کبھی کبھی ہوا خوری کو لے جاتیں۔ محلہ کی بھی دو تین انگریزنیں جو متصل کوٹھیوں میں رہتی تھیں آجایا کرتی تھیں انگریزنیں جب آتیں تو کرسیوں پر بیٹھتیں مسلم خواتین تختوں کے فرش پر بعض کے لئے خود لب مسند آکر بیٹھتیں بعض کو مسند پر اپنے قریب بٹھاتیں جن کی وہ سرو قد تعظیم بھی کرتیں۔ صبح کو یا تیسرے پہر کو اگر کوئی آگیا اگر مسلمان بی بی ہوتیں تو مغلائی گلوریاں بنا کر خاصدان سامنے لاکر رکھتی بعض کے لئے جس کو اپنی مسند پر وہ جگہ دیتیں اپنے خاصہ کا خاصدان پانوں کا سامنے بڑھا دیتیں۔ جب مہمان بی بی رخصت ہوتیں تو تختوں کے لب فرش تک آتیں بعض کو رخصت کرتے وقت اپنی مسند پر کھڑی ہو جاتیں۔ والدہ مرحومہ کو اپنی زی وشن کے تحفظ کا بہت خیال تھا۔ والد مرحوم کو بھی رکھ رکھاؤ کا بڑا خیال تھا عموماً روزمرہ کا دستور العمل یہ تھا کہ صبح کو مہمان کے رخصت ہونے کے بعد نشست کے کمرہ کے ملحق عقبی برآمدہ میں بھی تختوں کا فرش تھا وہاں بیٹھتیں اور انگیٹھیاں آتیں اور ایک بڑی سینی میں رکابیوں میں مختلف مسالے اور مچھلی یا مرغ صاف کیا ہوا آتا دیگچیاں آتیں دو چھوکریوں کو بلوا کر ترکیب بتائی جاتیں اور سالن پکواتیں یا کسی دن شیریں چیز پکانے کا سامان سینی میں یا کشتیوں میں آتا یا کسی قسم کا مربہ وا چار وغیرہ اپنے سامنے بنواتیں۔ اس کے بعد دوپہر کے خاصہ کا وقت آتا پلنگ کے کمرہ کے برابر والے چھوٹے کمرہ میں جہاں صبح کو ناشتہ ہوتا تھا وہیں دوپہر اور شب کے آٹھ بجے کا خاصہ تناول فرماتیں میں بھی ساتھ کھاتا جس دن والد مرحوم باہر خاصہ تناول نہیں کرتے یہیں آجاتے۔ خاصہ سے فارغ ہونے کے بعد اپنے اپنے خوابگاہ میں میرے والدین چلے جاتے گرمیوں میں دوپہر کے سونے کے لئے میں بھی مجبور کیا جاتا۔ چار بجے کی چائے سے فارغ ہونے کے بعد تیسرے پہر کو ہم سب باغ چلے جاتے جو سکونتی مکان سے تین چار میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہ باغ

جو ۵ بیگہ کے رقبہ میں تھا اس میں تین تالاب تھے دو چھوٹے چھوٹے جن میں اقسام کی مچھلیاں پرورش کی گئیں تھیں بیچ میں ایک منزلی کوٹھی تھی۔ کوٹھی کے سامنے اور اطراف تھوڑی تھوڑی دور تک چمن بندی تھی۔ میووں کے بڑے درخت تھے کوٹھی کے سامنے کے چمن کے بعد بہت بڑا تالاب تھا جس کے چاروں طرف پختہ لمبی لمبی سیڑھیاں تھیں اور اس میں ایک کٹر تھا جس کو مختصر کشتی کہنا چاہیئے۔ جس میں ہم لوگ بیٹھ کر تالاب میں پھرتے تھے ایک مالی کھتا تھا کبھی میرے والد ڈانڑ مالی کے ہاتھ سے لے کر خود کھیلتے تھے تھوڑی دیر باغ میں ٹہلتے پھرتے۔ بڑا مالی ساتھ ساتھ رہتا اس کو والد یا والدہ کچھ ہدایتیں دیتے جاتے۔

اس باغ میں اقسام کے میووں کے درخت تھے۔ لونگ چھوٹی الائچی کے درخت بھی تھے۔ جو میں نے مدت العمر میں سوا اپنے باغ کے اور کہیں نہیں دیکھے۔ چونکہ آموں کا شوق والد مرحوم کو آبائی تھا اور ورثہ میں پہنچا تھا علیٰ ہذا مجھ کو بھی ویسا ہی ہے اس لئے اعلیٰ سے اعلیٰ اقسام کے تخمی اور پیوندی درخت سیکڑوں تھے سنترا لوسنبا ٹوپیچو بادام کابلی بادام ناریل گلاب جامن امرود زمرود۔ اقسام کے انار چھالیا ناریل کے بھی متعدد درخت تھے کرنل بڑہل بیل پھل دغیرہ وغیرہ کے خدا جانے کتنے درخت تھے۔ جیٹھ بیساکھ کی گرمیوں میں دو مہینے باغ ہی میں ہم لوگ رہتے تھے۔ جب باغ میں آ کر رہنا ہوتا تھا تو گارد کے سپاہیوں میں سے چھ کی تعیناتی باغ میں ہوتی تھی اور قبل روانگی کے چھرے بارود کارتوس وغیرہ سپاہیوں کو تقسیم کئے جاتے تھے۔ کیونکہ باغ غیر آباد مقام پر تھا۔ ڈاکہ وغیرہ کا خدشہ رہتا یہ باغ ایک انگریز تاجر سے خریدا گیا تھا۔ بعد کو بہت درخت اقسام کے خصوصاً آموں کے لگائے گئے تھے۔ سرشام باغ سے واپس آجاتے تھے والد مرحوم مجھ کو اپنے ہمراہ لے کر چمپارن گھاٹ کی ہوا خوری کرتے ہوئے شب کے آٹھ بجے تک گھر آجاتے تھے یا کسی شام کو مجھ کو اپنے ہمراہ لے کر جس دن تیسرے پہر کو باغ نہ جاتے اور گھر میں ہماری والدہ کے پاس کوئی بی بی مہمان آجاتیں تو والد مرحوم ہوا خوری کو ولایتی چکر اور چمپارن گھاٹ جاتے اور قلعہ کی طرف سے ہوتے ہوئے نواب فخر الملک مرحوم سے ملنے کو مہدی باغ تشریف لے جاتے اور شب کے آٹھ بجے واپس آتے میری والدہ مرحومہ اپنی مہمانوں یا مہمان کو لے کر گانا سنتیں پس پردہ سازندے بیٹھتے اور چھوکریاں پردہ کے اس طرف بیٹھ کر گاتیں۔ یہ شغل شب کے آٹھ بجے تک رہتا جب کوئی مہمان زنانہ میں نہیں رہتا تو والد مرحوم بھی ہوا خوری کو نہ جاتے تو والدہ کے پاس بیٹھ کر گانا سنتے۔ والد مرحوم کو موسیقی میں بہت دخل تھا ایک رسالہ بھی انھوں نے علم موسیقی پر لکھا تھا۔ چونکہ علامہ وقت تھے مختلف علوم سے ماہر تھے خود بھی فرماتے تھے کہ قاآنی کو حکیم کا خطاب اس وقت تک نہیں ملا جب تک اس نے موسیقی حاصل نہیں کی۔ آٹھ کے بعد نماز مغربین یعنی مغرب و عشاء کی نمازیں والد اپنے

کمرہ میں جا کر پڑھتے تھے اور والدہ مرحومہ اپنے خوابگاہ کے کمرہ میں آکر پڑھتیں۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد دسترخوان بچھتا تب لوگ کھانا کھاتے۔ والد مرحوم شب کو غذا نہیں فرماتے تھے صرف ایک مرغی کے جوزہ کی یخنی نوش فرماتے۔ والد مرحوم کا دستورالعمل یہ تھا کہ تہجد کی نماز کے وقت بیدار ہوتے۔ نماز تہجد پڑھنے کے بعد شب کی تاریکی باقی رہتی کہ کلام مجید پڑھتے پھر وظیفہ کرتے صبح ہوتے ہوتے چائے کی کشتی جاتی صبح کا ناشتہ ان کا یہ تھا دو انڈوں کی زردی کالی مرچ نمک چھڑک کر پی جاتے ایک ٹوسٹ نان پاؤ کا اور دو پیالیاں چائے کی بغیر دودھ کے نوش فرماتے پھر نماز صبح پڑھ کر ہواخوری کے لئے سوار ہوجاتے کسی صبح کو مجھ کو اپنے ہمراہ لے جاتے۔ جوزنگی میں پہنچکر گاڑی سے اُتر جاتے اور خراماں خراماں پیدل چلتے پیچھے پیچھے گاڑی آہستہ آہستہ آتی میں بھی پیدل تھوڑی دور چلتا اس کے بعد جو عصابردار ساتھ رہتا اس کو حکم ہوتا کہ مجھے گود میں اٹھالے یا گاڑی میں سوار کردے۔ آفتاب اُدھر نکلا کہ گاڑی میں سوار ہوجاتے پھر گاڑی تیز گھر تک آتی۔ گاڑی سے اُتر کر پلنگ کے کمرہ میں جاکر پوشاک بدلتے اور نشست کے کمرہ میں آکر اپنی مسند پر گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھتے۔ آدمی پیچوان حقہ لاکر رکھتا۔ اتنے میں لوگ آنا شروع ہوتے حلقہ درس میں لمبی ڈاڑھی والے سن رسیدہ لوگ بھی رہتے۔ والد مرحوم کو پڑھانے کا بہت شوق تھا اور لوگ بہت اصرار سے حلقہ درس میں شریک ہوتے پانچ چھ آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے۔ اس اثنا میں اگر کوئی ملنے والا آگیا تو جو سب سے زیادہ پڑھا ہوا شاگرد ہوتا اس سے فرماتے ان لوگوں کو سبق دے دو۔ اور خود باتوں میں مصروف ہوتے کوئی برابر والا حقہ پینے والا اگر آجاتا تو اس کے لئے دوسرا پیچوان آتا۔ اپنا حقہ وہ کسی کو نہیں دیتے۔ دس بجے تک دو ڈھائی گھنٹے درس و تدریس کی صحبت رہتی اس کے بعد برخاست کا حکم ہوتا طلبا سب سلام کرکے رخصت ہوتے اگر کوئی برابر کا ملنے والا ہوتا تو دو خود ہی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد چلا جاتا۔ بعض کو گاڑی تک پہنچانے جاتے ورنہ لب فرش تک آتے یہ وہ زمانہ ہے جبکہ حضرت والا ملازمت سفارت و نیابت سے سبکدوش ہوچکے تھے۔ طلبا کے چلے جانے کے بعد یا تو کتب بینی فرماتے یا تصنیف میں مصروف بارہ بجے تک رہتے۔ اس کے بعد خاصہ سے فارغ ہوکر آرام فرماتے اخیر زمانہ میں دن کے بارہ بجے خاصہ کے عوض تیسرے پہر کو چار بجے خاصہ نوش کرنے لگے تھے۔ دو بجے بیدار ہونے کے بعد نماز ظہرین یعنی ظہر و عصر کی نمازیں پڑھتے اس کے بعد جس زمانہ میں بارہ بجے خاصہ نوش کرتے تھے نماز سے فارغ ہونے کے بعد کتب بینی تھوڑی دیر کرکے یا تو باغ والدہ کے ساتھ جاتے یا ہوا خوری کو جاتے۔ جب تک میری بسم اللہ خوانی نہیں ہوئی تھی تو زیادہ وقت میرا کھیل کود میں صرف ہوتا۔ ماما مرادن کا لڑکا مجھ سے کچھ بڑا تھا اور میر حیدر علی کا ایک لڑکا تھا وہ بھی مجھ سے دو تین سال عمر

میں بڑا تھا انھیں لڑکوں کے ساتھ کھیلتا تھا مجھے پھول پتوں کا بچپنے ہی سے بہت شوق تھا۔ اپنے گھر کے چمن میں بہت زیادہ پھرتا رہتا صبح کے آٹھ بجے والد کے ہمراہ ہوا خوری کرنے کے بعد اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا دو تین آدمی علاوہ سائیس کے ساتھ رہتے خصوصًا نذر علی خواجہ سرا اور یہ دونوں لڑکے بھی رہتے تھوڑی دور ہوا خوری کو چلے جاتے گھر پر آکر بھی ٹٹو کے پیچھے پڑے رہتے۔ میرے گھر میں چند طالب علم بھی رہتے تھے جن کو دونوں وقت غذا ملتی تھی۔

والدہ مرحومہ کے حالات سے یہ دکھانا منظور ہے کہ اگلے زمانہ کی امیرزادیاں کس قدر سلیقہ شعار ہوتی تھیں ان کا کیا مذاق ہوتا تھا اُن میں کس قدر خدا ترسی پابند صوم وصلوٰۃ شوہر پرستی کا مادہ ہوتا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے ہنوز میری بسم اللہ خوانی نہیں ہوئی تھی کہ جہاں منشی خانہ اور گارڈ کے سپاہیوں کے حجرے تھے اس چھت پر دونوں چھوکروں کے ساتھ پتنگ اڑا رہا تھا۔ کلکتہ کی زبان میں گڈی کہتے ہیں پٹنہ میں پتنگی لکھنؤ میں کنکوا کہتے ہیں حیدر آباد میں اسی کو پتنگ کہتے ہیں پٹنہ میں پتنگ بہت بڑا ہوتا ہے اور تُلی سے بلند کرتے اور اڑاتے ہیں۔ بہر حال میں گڈی اُڑا رہا تھا۔ بڑا چھوکرا جس کو بلند کرنا آتا تھا وہ بلند کرکے میرے ہاتھ میں اُچکا کلکتہ کی زبان میں جس کو لٹائی کہتے ہیں دیدیتا پیچھے کے مکان سے ایک پتنگ میرے پتنگ کے قریب آگیا چھوکروں نے کہا صاحبزادہ پینچ لڑائیے ایک نے کہا اپنی پتنگ کی ڈور کو اس کی ڈور پر ڈال دیجئے یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ پیچھے کے پتنگ والے نے میرے پتنگ کی ڈور پر اپنے پتنگ کو غوطہ دے کر ڈال دیا۔ چھوکروں نے کہا صاحبزادہ کھینچتے ہوئے پیچھے جائیے میں کھینچتا ہوا پیچھے جو دوڑا تو نیچے گر گیا۔ حریف کا پتنگ کٹ گیا میرے ہاتھ سے لٹائی چھوٹی اوپر چھوکروں نے ڈور پکڑ لی۔ مجھ کو چوٹ خفیف سی آئی کیونکہ چھت بہت اونچی نہیں تھی اور محافظ حقیقی کی حفاظت شامل حال تھی مگر اندر سے باہر تک ایک ہنگامہ برپا ہو گیا لوگ اُٹھا کر اندر لے گئے میری انانے رونا شروع کیا میں خوش ہو ہو کے یہ کہہ رہا تھا میں نے گڈی کاٹی سر میں داہنی جانب خفیف چوٹ آئی اور ذرا خون بھی نکلا والد مرحوم باہر کے آدمیوں پر بہت خفا ہوئے۔ ایک آدمی دوڑا ہوا فیملی ڈاکٹر درگا چرن بنرجی کو بلا کر لایا، انھوں نے زخم کو دیکھ کر کہا کوئی خوف کی بات نہیں ہے۔ میں مرہم بھیجتا ہوں۔ جس وقت ڈاکٹر آئے میرے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالا جا رہا تھا اس طرز عمل سے انھوں نے اتفاق کیا۔ واضح ہو کہ ہمارے فیملی ڈاکٹر بابو درگا چرن بنرجی تھے جو سر سرنیدر ناتھ بنرجی ای۔سی۔ایس بنگالہ مشہور مقرر وقائد کے والد تھے اقسام کے صدقے آئے وہ فقیروں کو دیئے گئے۔ اس وقت سے میرا پتنگ چھت پر اوڑانا موقوف کیا گیا تاہم

پتنگ کا مجھے شوق عرصہ دراز تک چودہ پندرہ سال کی عمر تک برابر رہا۔ بہار و بنگالہ کا قاعدہ ہے جاڑوں میں پتنگ اُڑاتے ہیں۔ گرمیوں میں تمازت آفتاب کی وجہ سے ناممکن ہے۔ میں نے جس کرنل کی بیوی کا ذکر اوپر کیا ہے اس کا باپ بھی وظیفہ یاب کرنل تھا۔ جب والد مرحوم سے ملنے آتا تو اُس کے ساتھ ایک دو کتے ہوتے ایک روز ایک چھوٹا سا کتا اس قدر چھوٹا کہ بگی پر سے وہ کود نہ سکا تو کرنل نے اس کو دونوں ہاتھوں سے نیچے اُتارا میں برساتی کے قریب کھیل رہا تھا کہ کرنل نے مجھ کو دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے اُٹھا لیا اور پیار[1] کر کے چھوڑ دیا والد کے کمرہ میں جانے کے قبل اپنی اطلاع دی جب وہ اندر گیا تو میں اس کے ساتھ ہو لیا وہ کتا اس قدر چھوٹا تھا کہ بے اختیار میرا دل اس پر دوڑا اور اس کتے کی خاطر اندر گیا۔ میں نے والد سے کہا مجھے بھی ایک ایسا کتا منگوا دیجئے والد نے ذرا بُری نظر سے مجھے دیکھا مگر میں مطلب نہیں سمجھا اور فرمایا کہ جب تم ماشاءاللہ ذرا بڑے ہوگے تو منگوا دوں گا۔ میں باہر چلا گیا۔ کرنل کے جانے کے بعد والد نے مجھ کو بلوایا اور فرمایا کہ کسی کی کوئی اچھی چیز دیکھ کر اگر پسند آئے تو اُس کے منہ پر نہیں کہتے ہیں کہ مجھے ایسی چیز منگوا دیجئے بُری بات ہے دوسرا شخص تم کو ندیدہ سمجھے گا کہ انھوں نے کبھی ایسی چیز دیکھی نہیں اس دن سے مجھے کان ہوگئے مجھے کتنی ہی کوئی چیز کسی کی پسند آتی تو ہرگز نہ تعریف کرتا اور نہ ویسی چیز حاصل کرنے کی خواہش کرتا۔ اس کرنل نے تھوڑی دیر کے بعد ایک کتا تقریباً اتنا ہی بڑا ایک آدمی کی گود میں جس کے گلے میں پیتل کی پتلی خوبصورت سی زنجیر کا لریعنی پٹے میں لگی ہوئی تھی مع خط کے بھیجا۔ مجھ کو بُلا کر میرے والد نے فرمایا تم نے ناحق کو اس انگریز کے سامنے کہا کہ مجھے ایسا کتا منگوا دیجئے بہر حال وہ کتا مالی کے حوالہ کیا گیا والد نے فرمایا پہلے اس کو کچھ کھانے کو دو تا کہ تم سے ہلے ورنہ کاٹے گا میں اندر جا کر بہت سے بسکٹ لے کر آیا اس کو کھلاتا اور پیار کرتا رہا۔ والد نے فرمایا کتا ناپاک و نجس ہوتا ہے اس سے ہر وقت نہیں کھیلتے اور جب اس کو ہاتھ لگایا کرو تو ہاتھ دھو ڈالا کرو۔ مالی سے فرمایا اس کو لے جا کر باندھ دے اندر سے کھانا منگوا کر دونوں وقت دیا کرو۔ مالی نے کتے کو لے جا کر طویلے میں ایک طرف باندھ دیا۔ اب میں بیتاب ہوگیا کتے کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ والد کو کسی نے جا کر کہا کہ میں کتے کے پاس سے ہٹتا نہیں ہوں۔ وہ خود ٹہلتے ہوئے آئے۔ مجھ کو بلا کر اپنے ساتھ لے گئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے مجھے یاد نہیں وہ کیا باتیں تھیں تاکہ اس طرف سے میرا خیال ہٹے۔

دوسرے روز میں زنجیر سمیت اُس کو بالا خانہ پر والدہ کے پاس لیتا گیا کتے کے آنے کی اُن کو خبر ہو چکی تھی مجھ سے فرمایا۔ واہ واتمہارا کتا کس قدر ننھا منا سا اور کس قدر خوبصورت ہے مگر بابا اس کو اوپر نہ لایا کرو اور ہر وقت ساتھ نہ رکھو۔ کسی وقت جا کر اس سے کھیل لئے اور پھر ہاتھ دھو ڈالا کر میں نے کہا کرنل صاحب کے ساتھ ہر وقت کتا رہتا ہے۔ میں بھی اپنے ساتھ رکھوں گا فرمایا انگریزوں کی بات اور ہے انگریز عیسائی مذہب

[1] مرحوم کا کیا حافظہ تھا کب کب کی باتیں یاد ہیں۔ صغرا ہمایوں مرزا

کے ہوتے ہیں ان کے ہاں بہت سی چیزیں حلال اور پاک ہیں جو مسلمانوں کے نزدیک حرام و ناپاک و نجس ہیں تم جب ماشاءاللہ بڑے ہوگے تو سمجھوگے۔ اس کتے کی عادت کھلے رہنے کی تھی اور والد کا حکم ہوا کہ بند ہا رہے۔ صرف رات کو کھولا جایا کرے۔ اس غریب کتے کی جان پر بن گئی چیختے چیختے آواز بیٹھ بیٹھ جاتی میں جا جا کر کھلواتا اور وہ میرے پیچھے پیچھے خوش فعلیاں کرتا ہوا پھرتا۔ غرض مجھ سے بہت لاگو ہوگیا تھا۔ جب ہی سے مجھے کتوں کا شوق عرصہ دراز تک رہا حتی کہ کچھ کچھ اب بھی ہے۔ کسی زمانہ میں میرے پاس دس بارہ کتے اقسام کے چھوٹے بڑے بل ٹیریر اسکاچ اور آیرش ٹیریر جرمن پوڈل چائنیز پگ ایک لیپ ڈوگ نا یاب زمانہ میرے پاس تھا۔ بل ڈاگ جس کی خوفناک شکل اور سیرت بھی ویسی ہی ہوتی ہے میں نے کبھی نہیں پالا جس زمانہ میں بغرض تعلیم انگلستان گیا تھا اس وقت بھی میرے پاس دو کتے تھے وہاں کتوں پر ٹیکس بھی دینا ہوتا تھا یہ دونوں کتے دو انگریز دوستوں نے مجھ کو دیئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کتا عجیب جانور ہے۔ وفاشعاری اس کے آب و گل میں ہے۔ ذہین و فرہیں بھی بہت ہوتا ہے یوں تو اور بھی بہت صفتوں سے کتا متصف ہے قناعت و شب زندہ داری پہرہ داری چوکسی وغیرہ اسی لئے کسی کا کیا خوب شعر ہے جس کا پہلا مصرعہ اس وقت مجھے یاد نہیں ہے دوسرا یہ ہے۔ ع

خصلتیں مومن کی ہیں کتے میں دس

کسی زمانہ میں ایک ضخیم کتاب مسمی "ڈوگس ٹیلیڈ" یعنی کتوں کے قصے میں نے پڑھی تھی جس میں عجیب غریب کارنامے ان کتوں کے درج ہیں اس وقت سے کتوں کا شوق اور بھڑکا۔ جس قدر عمدہ اور اچھی نسل کا کتا ہوگا اسی قدر عمدہ اوصاف اس میں زیادہ ہوں گے جس طرح گھوڑوں کے خصوصاً عربی نجدی گھوڑوں کے نسب نامے ہوتے ہیں انگلستان میں کتوں کی پڈگری یعنی نسب نامے رکھے جاتے ہیں وہاں ڈوگس شوز جو ہوتے رہتے ہیں یعنی کتوں کی نمائش بارہا میں دیکھنے کے لئے گیا لندن میں تو دنیا کی چیزوں کی نمائش آئے دن ہوتی رہتی ہے جو نہایت سبق آموز اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ کتوں کی نمائشوں میں عجیب و غریب کتے دیکھنے میں آتے تھے۔ اسلام نے بوجوہ خاص کتے کو نجس قرار دیا ہے۔ ہندوستانی بچوں کو کہانیاں سننے کا جس طرح عموماً شوق ہوتا ہے میں مستثنیٰ نہ تھا بلکہ خصوصیت کے ساتھ میں بہت شایق تھا میری انا بیچاری کو سوا چڑے چڑیا کی کہانی کے جسے ہندوستان کی تقریباً ہر عورت جانتی ہے اور کوئی کہانی یاد نہیں تھی تو بہت غصہ مجھے آتا جو وہ میری فرمایش پوری نہ کرسکتیں۔ البتہ توشہ خانہ والی جواہر بوا کو بہت کہانیاں بعض بہت لمبی لمبی یاد تھیں بعض کہانیاں دو تین راتوں کو وہ کہتیں اور میں سنتے سنتے سو جاتا۔ اس لئے جواہر بوا کی میں بہت خاطر کرتا۔ میرے کھیلنے کی چیزوں میں اقسام کے کھلونے تھے چوبی گھوڑا وغیرہ

تھا۔ خوبصورت خوبصورت ٹین اور کاٹھ کی صندوقچیاں بھی تھیں ان میں سے ایک دبیز ٹین کا کیش باکس تھا وہ میرے خزانہ کا بکس کہلاتا تھا۔ بہت سی خوبصورت چھوٹی چھوٹی تھیلوں میں چونیاں دوانیاں بھردی جاتی تھیں تاکہ میں ملازموں کو جب میرا جی چاہے انعام دوں۔ میں جواہر لوا سے کہتا دیکھو ایسی اچھی کہانی کہو کہ جس سے سب کو ہنسی آئے۔ سب سے غرض یہ کہ سوتے وقت میرے پلنگ کے کمرہ میں جو موجود ہوتے یعنی دونوں باری دارنیاں اور میں والدہ مرحومہ بہت دیر کے بعد پلنگ کے کمرہ میں تشریف لاتیں جب تک میں سو جاتا۔ جواہر لوا کہتی مجھے اچھا سا انعام دیجئے گا نا۔ اچھے سے غرض یہ ہے کہ دو چار دوانیاں یا چونیاں پھر وہ کہتیں صبح کو جب آپ خزانہ کا بکس منگائیں تو مجھے مت بھولئے گا۔ وہ میری انا کی طرف اشارہ کرکے کہتیں یہ دینے بھی تو دیں۔ بعض وقت حقیقتاً میری انا کسی کو بار بار دینے پر روکتیں۔ میرے خزانہ کے بکس کی کنجی انھیں کے پاس رہتی تھی اس لئے خزانہ کا بکس جب میں منگاتا انھیں سے کنجی لے کر کھولتا ان کی موجودگی لازمی تھی۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ اپنی والدہ کے پاس بیٹھ کر انعامات تقسیم کرتا اور میری انا کہتیں بس صاحبزادے بس تو اس روکنے پر میری والدہ میری انا پر خفا ہوتیں۔ یہ فرماتیں کہ میری بچے کو بخیل بناؤ گی

ساتویں سال میری بسم اللہ خوانی ہوئی یہ تقریب بہت دھوم اور تکلفات سے منائی گئی۔ تمام احباب کو زنانہ اور مردانے میں پندرہ بیس روز پیشتر سے تورے تقسیم کئے جا رہے تھے۔ توروں میں ایک ندرت یہ کی گئی تھی کہ اقسام کے لڈو۔ مونگ۔ موتی چور۔ بندیا۔ چلغوزہ۔ پستہ۔ بادام۔ بھونے چنے۔ چین اور نہ معلوم کن کن چیزوں کے بڑے بڑے لڈو بنوائے گئے تھے ہر شخص کے لئے ایک ایک خوانوں کی بڑے بڑے خوان جن میں متعدد رکابیوں میں لڈو رکھ کر ورق نقرہ لگا دیا جاتا۔ ہر رکابی میں ایک قسم کا لڈو ہوتا عموماً تورے اقسام کے اغذیہ نمکین و شیریں اقسام کی روٹیاں۔ اقسام کے مربے۔ اچار وغیرہ چند خوانوں میں کم سے کم چار یعنی دو بہنگیوں میں شادی بیاہ یا اور خوشی کی تقریب میں امرا تقسیم کرواتے ہیں غمی کے موقع پر مرد کے بیسویں اور چہلم میں بھی تورے تقسیم ہوتے ہیں عموماً حلوا اور تنوری روٹیاں بعض امرا میووں کا تورہ بھی تقسیم کرتے ہیں میں نے جب جب دیکھا یعنی میرے ہاں جو لوگوں کے ہاں سے تورے آتے تھے تو اقسام بالا کے لیکن لڈوں کا تورہ میں نے کہیں سے آتے نہیں دیکھا اس لئے میں نے لفظ ندرت استعمال کیا ان لڈوں کے بنانے کے لئے ٹیا برج سے لکھنؤ کے دو رکابدار بلوائے گئے تھے جن میں سے ایک شاہی رکابدار مرزا منے نامی تھا۔

بسم اللہ خوانی | بڑے بسم اللہ خوانی کا باجا بھی تھا کئی مشہور طوائف کو ڈیرہ سے جہاں ان کا مخزن ہے بلوائی گئی تھیں۔ زنانہ میں لکھنؤ کی ڈومنیاں یعنی میراثنیں جو عید اور بقر عید کی تقریبوں میں بھی ہمیشہ مبارکباد دینے

اور انعام لینے کو آیا کرتی تھیں بلوائی گئی تھیں۔ مردانہ میں والد مرحوم کے احباب آئے تھے۔ بسم اللہ خوانی کی رسم مردانہ میں ادا کی گئی چلمنوں سے خواتین بھی دیکھ رہی تھیں۔ دوات و قلم اور تختی چاندی کی بنوائی گئی تھی ہمارے ہاں ایک قاری صاحب اکثر آیا کرتے تھے انھوں نے یہ رسم ادا کروائی نقر‌ئی چیزیں انھیں کی نذر کی گئیں۔ اور ایک کشتی میں ایک شال چادر اور کچھ روپیے بھی دیے گئے۔ باریک باریک سونے چاندی کے پھول بنوائے گئے تھے جو مجھ پر اوڑائے گئے یعنی نچھاور کئے گئے اور ملازمین نے لوٹے۔ میرا جوڑا بھی بہت بھاری بنوایا گیا تھا۔ ملازمین کو بھی جوڑے علیٰ قدر حیثیت تقسیم کئے گئے علاوہ نقدی انعامات کے اس دن میری والدہ مرحومہ مارے خوشی کے پھولوں نہیں سماتی تھیں دوسرے دن سے میں پڑھنے کو بٹھایا گیا۔ یہ رسم شب کے آٹھ بجے ہوئی تھی پہلے میرے ہاں جو منشی صاحب تھے منشی تصدق علی انھوں نے ابتدا کلام مجید سے کی۔ رفتہ رفتہ ایک مولوی صاحب ذری تلاش کے بعد حسب خواہش و پسند والد مرحوم مقرر کئے گئے جو شب و روز رہتے تھے ان کی حیثیت آتالیق کی بھی تھی اس لئے شب و روز ان کا قیام ضروری سمجھا گیا۔ چونکہ بہت منتوں اور مرادوں کے بعد دنیا میں میں آیا تھا۔ جب مجھے پانچواں سال تھا میرے داہنے کان میں گھر ہی کے امام باڑہ میں محرم کا زمانہ یعنی عشرہ اول کی کوئی تاریخ تھی کر دُر پہنایا گیا۔ اور میں سقہ درگاہ حضرت حسین علیہ السلام بنایا گیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ جب میری عمر دس سال کی ہوگی اس وقت زمرد اور موتیوں کا طلائی دُر جو کان چھید کر ڈالا گیا تھا بڑھایا جائے گا اور اسی سال سقہ بننا موقوف ہوگا سقہ ہر محرم میں پانچویں تاریخ بنایا جاتا تھا۔ سبز رنگ کے کپڑے میرے والدین اور میں محرم کا چاند دیکھتے ہی پہن لیتے تھے۔ پانچویں محرم کو میرے لئے خاص پوشاک سقہ بننے کے لئے بنائی جاتی تھی وہ بھی از سرتا پا سبز رنگ کی یہ رنگ سیادت کا مانا سمجھا جاتا ہے گھر میں چھوکریاں بوائیں سیاہ پوش رہتی تھیں محرم کا چاند دیکھتے ہی باستثنا چند ملازمین کے سارا گھر سیاہ پوش ہوتا تھا۔ شب کو مجلسیں ہوتی تھیں اندر سے باہر تک خوب روشنی کی جاتی تھی نہم تک برابر طعام داری ہوتی تھی شرکائے مجلس کو حصے تقسیم کئے جاتے تھے کسی دن فیرنی کی ٹھلیاں کسی دن قورمہ او نان آبی۔ دن کو روزانہ فقرا کو کھچڑا تقسیم کیا جاتا تھا اور شربت آٹھویں کو بہت دھوم سے حضرت عباس علیہ السلام کی حاضری مبارک ہوتی تھی۔ ایک بڑے قلعی دار تابنے کے طباق میں حاضری کی شیرمال قورمہ مٹی کے چھوٹے پیالہ میں اور فیرنی بھی مٹی کے چھوٹے پیالہ میں حلوا مٹی کی چھوٹی تشتریوں میں ایک مٹی کی رکابی میں پیاز پودینہ لیموں مولی گندھنا پنیر یہ سب چیز طباق میں رکھ کر شرکائے مجلس کو خواہ امیر ہو یا غریب معہ طباق کے دیدی جاتی تھیں۔ میں جس سال سے سقہ بنایا گیا پانچویں تاریخ سے خاص سبز جوڑا اور سبز پگڑی پہن کر چرمی چھوٹی سی مشک گلے میں ڈال کر ہاتھ میں چاندی

کا کٹورے کر شکر میں شربت بھرا جاتا تھا وہ انڈیل انڈیل کر اسی کٹورہ میں لوگوں کو مجلس کے بعد پلاتا تھا۔ ایک چھوٹی سے بیرق بھی میرے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یکم سے نویں تک اور پھر سوم کی مجلس کے بعد جسے پھولوں کی مجلس کہتے تھے یہ رسم ادا کرتا تھا۔ یہ منت میری والدہ مرحومہ کی تھی مگر افسوس ہزار افسوس کہ وہ منت بڑھانے نہ پائیں کہ خود دنیا سے جبکہ مجھے دسواں سال تھا رخصت ہوگئیں۔ دنیا بھر کی آرزوں تمناؤں بھرا دل لیکر اس جہان فانی سے بہ طرف ملک جاودانی انتقال فرماگئیں۔ جسد خاکی تو پیوند خاک ہوا مگر روح عالم ارواح میں منتقل ہوگئی۔

تقریب سالگرہ میری ایک سالگرہ والدہ مرحومہ نے بہت دہوم دہام سے کی تھی ناچ رنگ احباب کی دعوت ہوئی آدمیوں کو انعام واکرام خوب دیا گیا۔ اس سالگرہ میں اس دہوم دہام کی وجہ یہ تھی کہ میری عمر کا آٹھواں سال جس کو ہمارے ہاں کی مستورات اَن گنا سال کہتی ہیں اور وہ منحوس سمجھا جاتا ہے بخیر وخوبی ختم ہوا تھا اور نواں سال شروع ہوا تھا یوں تو عموماً عورتیں آٹھ اٹھارہ اٹھائیس اور تین تیرہ تیئیس عدد کو منحوس خیال کرتی ہیں۔ ان تاریخوں کو بھی منحوس سمجھ کر کوئی نیا کام نہیں کرتی ہیں۔ نہ سفر کرتی ہیں۔ اولاد پر سے تیسرا تیرہواں اور تیئیسواں اور آٹھواں اٹھارہواں اور اٹھائیسواں سال جب گذر جاتا ہے تو خصوصاً اوہام پرست عورتیں یہ خیال کرتی ہیں کہ بلا ٹلی اور ان سالوں کے ختم پر بہت خیر وخیرات کی جاتی ہے مجھے آٹھواں سال تھا جب ایک واقعہ ناگوار بلکہ پُر خطر پیش آیا کہ ایک دن میں والد مرحوم کے ہمراہ حسب معمول تیسرے پہر کی ہواخوری کو جارہا تھا کہ ایک مقام پر سڑک کی چوڑائی کم تھی اور ایک جانب عمیق گہری تھی ادہر سے کسی کی گاڑی آرہی تھی میرے کوچبان نے ٹکر لگنے سے گاڑی بچانے نے لئے جس طرف گہری تھی اس طرف گھوڑوں کی باگ کھینچی گاڑی گہری میں آدھی گر گئی ایک گھوڑے پر دوسرا گھوڑا گرا نیچے والا گھوڑا فوراً مر گیا میں اپنے والد پر اندر گرا ایک سائیس کی ٹانگ ٹوٹی فوراً لوگ جمع ہوئے گھوڑوں کا ساز کاٹ کر بڑی دقت سے ایک گھوڑا نکالدیا گیا۔ گاڑی کا ایک پہیہ بالکل چور ہوگیا مگر ہم لوگوں کو ذری چوٹ نہیں آئی۔ سائیس کو شفاخانہ کیا گیا جہاں اس کا ایک پیر کاٹا گیا۔ اس کو بعد صحت والد مرحوم گھر بیٹھے اس کی تنخواہ دیتے رہے اور جب تک ہسپتال میں رہا چوتھے پانچویں والد مرحوم اس کو جاکر دیکھا کرتے تھے اس واقعہ یا حادثہ کو میرے عمر کے آٹھویں سال کی نحوست پر محمول کیا گیا اور ہم لوگوں کو چوٹ جو نہیں آئی اسکا سبب یہ بتایا گیا کہ ایک گھوڑا جو مرا وہ ہم لوگوں پر سے صدقہ ہوا اور گاڑی ٹوٹی یہ بھی مالی نقصان رد بلا کا موجب ہوا یعنی جان کا صدقہ مال ہوتا ہے تاہم صدقہ اُتارا گیا۔ غرض آٹھواں سال جسے اَن گنا کہتے ہیں اس قدر منحوس سمجھا جاتا ہے کہ کوئی بھی اتفاقیہ افتاد یا حادثہ پیش آئے اُس کو آٹھویں عدد کی نحوست پر محمول ومنسوب کرتے

ہیں۔ ساتویں سال میری بسم اللہ کی رسم ہوئی تھی جب ہی سے میری تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں پڑھنے سے عرصہ دراز تک جی چراتا رہا کئی استاد بدلے گئے۔ جو معلم مقرر کیا جاتا وہ شب و روز گھر ہی پر رہتا۔ مگر صبح کو ڈیڑھ دو گھنٹہ میں کتاب کھول کر اس کے پاس بیٹھتا اور کچا پکا کچھ یاد کر لیتا حافظہ بہت تیز و قوی تھا ذری توجہ سے سبق یاد ہو جاتا مگر توجہ کرتا کون دل تو سارا کھیل میں رہتا والدہ مرحومہ کا لاڈلا باپ کا چہیتا بیٹا تھا معلموں کو تاکید کی جاتی کہ تشدد نہ کرے مارنا تو کجا بری آنکھ سے نہ دیکھے دبکی نہ دے ڈانٹے نہیں ایک استاد چاٹگام کے رہنے والے عربی و فارسی خوب جانتے تھے صرف چار یا پانچ روز وہ رہے وہ اس قصور پر وہ علیحدہ کئے گئے کہ میں نے جب سبق یاد نہیں کیا تو دو دن تک نیا سبق نہیں دیا اور عاجز آکر میرے کان زور سے ملے میں روتا ہوا اندر گیا منشی کو حکم ہوا کہ مولوی صاحب کا جو کچھ حساب ہے دے کر ان کو فوراً علیحدہ کر دو۔ ان کو طریقہ تعلیم معلوم نہیں ہے میں ڈیڑھ دو گھنٹے جو استاد کے پاس بیٹھتا تو استاد کو باتوں میں لگاتا اندر سے خشک میوے جیبوں میں بھر لاتا اور استاد صاحب کی نذر کرتا کہ وہ پڑھنے کو نہ کہیں۔ کتاب کھولے ہوئے بیٹھا ہوا باتیں بناتا۔ جب مولوی صاحب کی کوٹھی کی طرف سے کسی کو جاتے ہوئے دیکھتا تو زیادہ بلتا اور چیخ چیخ کر پڑھتا جو سبق یاد رہتا اسی کو دوہراتا۔ باوجودیکہ استاد میری مرضی پر مجھ کو چھوڑ دیتے اور مطلق سختی نہیں کرتے اس پر بھی دو گھنٹے ان کے پاس بیٹھنا بہت کھلتا اور ناگوار معلوم ہوتا جس روز استاد کے پاس جانے کو جی نہیں چاہتا اور کنکووں میں دل لگا رہتا تو والدہ سے کہتا میرا سر دکھ رہا ہے یا پیٹ دکھ رہا ہے تو وہ فرماتیں کہ آج مکتب میں نہ جاؤ اور کچھ دوا وغیرہ پلاتیں۔ بہت سی دوائیں ان کے پاس ہمیشہ موجود رہتی تھیں۔ دوا پینے کے تھوڑی دیر کے بعد دیدار بخش اور بدو کو لے کر کنکوے اڑانا شروع کرتا۔ مختصر یہ کہ تعلیم کی رفتار والدہ مرحومہ کی حیات تک اور کچھ دنوں بعد بھی بہت سست رہی۔ نجھے جب دسواں سال ختم ہونے کو تھا کہ داعی اجل کو میرے والدہ نے لبیک کہا دو سال کی پڑھائی جو برائے نام تھی اس میں کلام مجید ختم کیا کریا۔ ما مقیاں بعد حمد فارسی تہذیب النفوس یہ سب فارسی کی کتابیں ختم کیں۔ والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد بھی ڈیڑھ دو سال تعلیم میں بہت نرمی برتی گئی وہ اس خیال سے کہ والدہ کی وفات کا صدمہ مجھے بہت تھا میں بھڑک نہ جاؤں کوئی بات میری مرضی کے خلاف نہیں کی جاتی اور طرح طرح کے اسباب و سامان میری دل بہلائی و دلچسپی کے لئے پیدا کئے جاتے اور استاد کو تنخواہ اور کھانا گویا مفت دیا جاتا اگر کسی استاد کو نستعلیق لکھنا آتا تو اس سے والد مرحوم اپنی تصنیف کے مسودے صاف کرواتے۔ میں بھی تھوڑی دیر کتاب لے کر ان کے پاس جا بیٹھتا میری والدہ مرحومہ کے انتقال پر ملال کا صدمہ والد مرحوم کو بھی بے نہایت ہوا عرصہ دراز

تک وہ خود بھی میری تعلیم کی جانب مطلق متوجہ نہیں ہوئے کلکتہ کی اقامت اونکو دوبھر ہوگئی بہت سے ان کے قدیم دوستوں نے بھی راہ عدم اختیار کرلی تھی وہ اصحاب جن سے ان کی وابستگی ہوتی تھی وہ بھی جب نہ رہے تو والد بہت شکستہ خاطر و مغموم رہنے لگے اور پٹنہ سے اُن کے عزیزوں اور وہاں کے بچے بچائے دوستوں کے خط پر خط آنے لگے کہ وطن آجایئے۔ کلکتہ میں آپکا رہنا آپ کیلئے سوہان روح ہے وغیرہ وغیرہ والد مرحوم نے بھی یہ خیال کیا کہ اخیر زمانہ اپنے وطن اور عزیزوں میں گذاردینا چاہیئے اور اسی خیال سے والد مرحوم نے جہاں اڑتیس ۳۸ سال اپنی عمر گراں بہا کے صرف کئے ہمیشہ کیلئے کلکتہ کو خدا حافظ کہا اور عظیم آباد پٹنہ آگئے۔ یہاں بھی پہلی دفعہ جو معلم میرے لئے مقرر ہوئے وہ شب و روز گھر ہی پر رہتے تھے۔ فارسی کے ساتھ عربی بھی شروع کرائی گئی۔ باوجودیکہ چند کتابیں فارسی کی نکل چکی تھیں مگر اتبک مصدر فیوض جسے آمدنامہ بھی کہتے ہیں مجھے نہیں پڑھایا گیا تھا۔ پٹنہ کے پہلے معلم نے آمدنامہ شروع کروایا اور رقعات عالمگیری فارسی میں میزان عربی میں پڑھانے لگے۔ یہ مولوی صاحب زیادہ دن نہیں رہے نہ معلوم کیا سبب ہوا کہ وہ خود چلے گئے دوسرے استاد رکھے گئے اور یہ بہت دنوں رہے انکا نام مولوی الٰہی بخش تھا یہ خود بھی والد مرحوم سے عربی تھوڑی دیر پڑھتے تھے اور مجھکو بھی فارسی عربی کا درس دیتے۔ اُنہوں نے میزان الصرف ختم کرائی منشعب و تصریف وغیرہ پڑھائی صرف کے ساتھ ادب بھی شروع کرائی" درایت الادب و سلم الادب انھوں نے ختم کرایا۔ فارسی میں انوار سہیلی انشائے بینظیر وغیرہ بھی انہیں مولوی صاحب سے پڑھی تھی۔ اسی زمانہ میں مجھے کبوتروں کا شوق ہوا میرے لئے عمدہ اقسام کے کبوتر کچھ خریدے گئے اور والد مرحوم کے بعض احباب نے تحفتہً لالا کر دیے خصوصاً والد مرحوم کے شاگردوں نے بہت سے کبوتر نذر دئے کنکوؤں کا شوق اب بھی تھا۔ مگر نہ اسقدر جتنا کبوتروں سے شغف پیدا ہوگیا تھا۔ اسی زمانہ میں میں سٹی اسکول میں داخل ہوا۔ حسب دستور مولوی الٰہی بخش صاحب فارسی عربی پڑھاتے رہے میرے اسکول میں داخل ہونیکے ڈیڑھ دو سال کے بعد مولوی الٰہی بخش صاحب نے بقضائے الٰہی رحلت کی جسکا میرے والد کو بہت رنج ہوا ایک تو اسوجہ سے کہ وہ شاگرد بھی تھے اور والد فرماتے تھے کہ ایک ہونہار ذہین اور محنتی نوجوان دنیا سے اُٹھ گیا دویمش یہ کہ میرے بہت ہی شفیق و ہمدرد استاد تھے اور پڑھانے کا طریقہ اُنہوں نے والد مرحوم سے اچھی طرح اخذ کیا تھا جس سے میں مستفید ہورہا تھا اور وہ طریقہ اسقدر خوشگوار تھا کہ مجھے اُن کے پاس رہنا اچھا معلوم ہوتا تھا اس لئے میں بھی بہت افسردہ خاطر عرصہ تک رہا

ان کے انتقال کیوجہ سے میری عربی کی پڑھائی ناقص رہ گئی ۔ مولوی صاحب مرحوم کی وفات کے پانچ چھ ماہ بعد تک کوئی معلم رکھا نہیں گیا ۔ اب ماسٹر صاحب راگھو پرشاد نامی قوم کے ہندو کایستھ تھے اور جہانگیر گنج کے اسکول کے ٹیچر بھی تھے اسی لئے مقرر کئے گئے یہ صاحب صبح کے آٹھ سے سوا نو بجے ساڑھے نو تک اسکول کا سبق یاد کرواتے میرے والد مرحوم کے پاس ایک منشی میر خورشید حسین صاحب تھے انہیں عربی نہیں آتی تھی فارسی اچھی جانتے تھے مجھے اسوقت نام یاد نہیں ہے فارسی کی مشہور انشاء ہے غرض وہ انہوں نے شروع کروائی مگر قلت وقت کیوجہ سے چند ہی روز کے بعد فارسی موقوف کرائی گئی ۔ کیونکہ صبح کے ساڑھے نو تک تو ماسٹر صاحب پڑھاتے کھانا کھا کر دس بجے کے کچھ قبل اسکول جانا ہوتا ۔ اسکول جانے کے لئے ایک ٹٹوینی یا بو خرید اگیا تھا میں پون گھنٹہ میں اسکول پہنچ جاتا تھا ۔ میرا مکان محلہ گندری معصوم خاں میں تھا اور سٹی اسکول اسوقت گلزار باغ میں دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر تھا ۔ بہر حال چار بجے اسکول بند ہوتا ساڑھے چار کے قریب مکان پہونچتا ۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرتا پھر کبوتروں میں لگ جاتا ۔ شام کے ساڑھے چھے بجے اس سے فارغ ہو کر ادھر اُدھر ٹہلتا اور سات سے آٹھ تک سبق یاد کرتا شب کے ساڑھے آٹھ پونے نو تک شب کے کھانے سے فارغ ہو کر سو جاتا اسلئے فارسی پڑھنے کا وقت نہیں ملتا چندروز جو منشی میر خورشید حسین صاحب مرحوم نے پڑھایا تو شام کے سات سے آٹھ تک ۔ پھر بھی وقت اسکول کے کاموں کیلئے مقرر کیا گیا ۔ رفتہ رفتہ کبوتروں اور کنکوؤں کا شوق کم ہوتا گیا ۔ چند دنوں کے بعد بالکل غائب ہو گیا ۔ کرکیٹ کا شوق پیدا ہوا ۔ اسکول سے آکر ناشتہ سے فارغ ہونیکے بعد مدرسہ کے ہم سبق اور دوسری جماعت کے لڑکے بھی میرے ہاں آجاتے بعض تو میرے ہاں تیسرے پہر کا ناشتہ کرتے اور بعض اپنے گھروں سے کھا کر آجاتے اور شام تک میرے ساتھ کرکیٹ میں مصروف ہوتے ۔ اتوار کے دن کا بہت بڑا حصہ کرکیٹ میں صرف ہوتا کسی اتوار کو اسکول میں ہم سب جمع ہوتے جاڑوں میں دو کے بعد ہی سے کھیل شروع ہو جاتا ۔ میرے مکان کے متصل تقریباً دوڈھائی سو قدم کے فاصلہ پر ایک بہت بڑے رئیس محمد نواب صاحب مرحوم کا عالیشان مکان تھا ۔ ان کے فرزند سید ممتاز نواب مرحوم سے اور مجھے بہت محبت تھی وہ عمر میں مجھ سے دو سال زیادہ تھے اسکول میں میرے ہم جماعت تھے اونکو گھر پر درس دینے کو چند معلمین ملازم تھے منجملہ ان کے انگریزی کے استاد ایک صاحب مولوی تسیم الدین نامی تھے ۔ انہوں نے بمشورہ اور چند اصحاب جن میں زیادہ تر وہ طلاب تھے جو اس زمانہ میں میرے ہی اسکول میں انٹرنس کلاس میں زیر تعلیم تھے ایک انجمن قایم کی

اس کا نام انجمن مذاکرہ علمیہ رکھا ہر اتوار کو اسکا جلسہ محمد نواب صاحب مرحوم کے مکان میں ہوتا تھا۔ مقصد اس انجمن کا شوق و مشاغل علمیہ پیدا کرنا۔ کل آٹھ یا نو ممبر تھے۔ منجملہ انجمن کے چار پانچ کے نام مجھکو یاد ہیں۔ مولوی شیخ علی باقر مرحوم آباد۔ یہ صاحب (اوجی خان بہادر حضرت سید علی محمد شاد علیہ الرحمتہ کے جو علاوہ عزیز ہونے کے میرے والد علی اللہ مقامہ کے ارشد تلامذہ میں تھے) شاگرد رشید تھے۔ فارسی عربی کی کافی استعداد تھی۔ سید علی سجاد تخلص سجاد جو کسی زمانہ میں راجہ سر امیر حسن خان زمیندار محمود آباد (اودھ) کے پرایویٹ سکرٹری بھی رہے تھے اور محمود آباد کے اسکول کے غالباً ہیڈ ماسٹر یا سکنڈ ٹیچر تھے۔ جس زمانہ میں انجمن مذکور الصدر قایم ہوئی تھی۔ یہ صاحب ہمارے اسکول کے انٹرنس کلاس میں پڑھتے تھے۔ انکی تصنیف ایک ناول محل خانہ مشہور ہے۔ اور ایک صاحب سید اکرام حسین تھے یہ بھی ہمارے اسکول میں پڑھتے تھے۔ پھر علیگڈھ کالج میں تعلیم پائی ڈپوٹی کلکٹر بھی ہو گئے تھے۔ ارکین میں ایک صاحب سید حیدر عباس تھے وہ بھی شاعر تھے۔ ایک صاحب سید فرخ حسن تھے وہ بھی ہمارے اسکول کے طالب علم تھے۔ علاوہ ان اصحاب کے اور دو تین اشخاص تھے ہر اتوار کو بعد مغرب انجمن کا جلسہ ہوتا تھا۔ ہر جلسہ میں ایک مضمون منتخب کیا جاتا اور کسی ممبر کے ذمہ دیا جاتا کہ اسکی نسبت اپنے خیالات لکھ کر لائے اور پڑھے بقیہ ارکین میں سے جسکا جسکا جی چاہے مضمون کی تائید یا اختلاف میں مضامین لکھ کر لائے اور پڑھے یا جس کسی سے ہو سکے زبانی تقریر کرے جو زبانی کچھ بولتا وہ زیادہ سراہا جاتا۔ ممتاز نواب مرحوم کے کہنے سے میں بھی ممبری میں شریک کیا گیا سب سے کم عمر ممبر میں تھا۔ میں بھی کچھ لکھتا اور اپنے استاد سے جو انگریزی پڑھانے گھر پر آتے تھے۔ درست کروا تا اور بوقت جلسہ میں بھی پڑھتا یہ بات فطرتی تھی کہ میں مطلق مرغوب نہیں ہوتا اور بغیر جھجک کے اپنا مضمون پڑھتا زیادہ تر خیالات تو میرے استاد کے ہوتے تھے مگر تعریف میری ہوتی تھی۔ اس انجمن کی ساری کارروائی اردو میں ہوتی تھی تقریری و تحریری مضامین اردو ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں میری بڑی علاتی ہمشیر کے فرزند سید محمد حسین مرحوم کی جو عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے اور انکی ہمشیرہ کی شادی جو مجھ سے کچھ بڑی تھیں مظفر پور میں ہوئی۔ میر سخاوت علی صاحب مرحوم زمیندار کی صاحبزادی سید محمد حسین کو منسوب ہوئیں اور میر صاحب مرحوم کے بڑے فرزند سید سعادت علی کی شادی سید محمد حسین کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔ میر سخاوت علی کی زمینداری کی آمدنی اچھی خاصی اور معقول تھی لیکن میر صاحب کثیر الاولاد تھے ترکہ میں تھوڑی تھوڑی آمدنی سب کو شرعی حصص کے لحاظ سے

لی تھی ۔ سید سعادت علی مرحوم کو انکی حقیقی پھوپھی نے جو دولتمند مگر لاولد تھیں اپنا فرزند آغوشی بنایا تھا اس لئے مرحومہ کے کل املاک کے تنہا وارث ہو گئے اور اسوجہ سے ان میں شان امارت پیدا ہوگئی سولہ سترہ ہزار سالانہ کی بچت تھی ۔ اس ارزانی کے زمانہ میں اسقدر آمدنی کا آدمی بڑا رئیس سمجھا جاتا تھا چنانچہ ان کے پاس بہی جوڑیاں گاڑیاں متعدد تھیں اور شوقین آدمی تھے بہت ٹھاٹ سے رہتے تھے بہت ہی خلیق مہمان نواز و متواضع واقع ہوئے تھے ۔ دسترخوان بھی وسیع تھا ۔ گورنمنٹ کی جانب سے اعزاز بھی تھا ۔ اونریری مجسٹریٹ و میونسپل کمشنر وغیرہ بھی تھے ۔ مثل دوسرے رئیسوں کے صرف برائے نام یہ خدمتیں انجام بھی دیتے تھے ۔ بلکہ بہت دلچسپی لیتے تھے ۔ پہلے سید محمد حسین مرحوم کی ہمشیر کی شادی ہوئی ۔ مظفر پور سے بہت دہوم دھام سے برات آئی تھی سید سعادت علی مرحوم بعد عقد نکاح اور ادائی رسوم مروجہ جب اپنی دلہن کو مظفر پور لیگئے اس کے ایک ہفتہ یا عشرہ کے بعد سید محمد حسین مرحوم کی برات پٹنہ سے مظفر پور روانہ ہوئی اس زمانہ میں مظفر پور کی جانب ریل نہیں نکلی تھی ۔ اور نہ گنگا کا عبور و مرور بذریعہ اسٹیمر کے تھا بلکہ کشتیوں کے ذریعہ اور دریا پار ہونے کے بعد خشکی کا رستہ یا پیدل یا گھوڑوں اور بیلوں کی گاڑیوں کے ذریعہ طے ہوتا تھا ۔ دریائے گنگ کا پاٹ پٹنہ کے کسی گھاٹ سے اس پار تک کہیں دو میل کہیں تین میل موسم سرما میں اور گرمیوں میں اس سے کم لیکن موسم بارش میں تقریباً چھ میل ہو جاتا ہے ۔ اب تو بذریعہ اسٹیمر کے گھنٹہ سوا گھنٹہ میں اس پار سے اوس پار آدمی جاتا ہے ۔ کشتیوں کے ذریعہ تین سوا تین گھنٹے صرف ہوتے تھے ۔ اور اب بھی وہی حال ہے جب برات یہاں سے گئی تو متعدد زنانہ اور مردانہ ساتھ تھا ۔ زنانہ کے لئے رواج کے مطابق محافے پالکیاں اور میانے اور مردوں کیلئے بہلی گاڑیاں رتھ اور پالکی گاڑیاں گھوڑوں کی تھیں ۔ ایک پالکی گاڑی تو ہماری بہن کے ہاں کی تھی اور ایک پالکی گاڑی سید شاہ مقبول حسین صاحب کی تھی جو ہمارے رشتہ میں چچا ہوتے تھے ۔ یہ سب سر و سامان بڑی بڑی کشتیوں پر گنگا پار ہوا ۔ اور اس کے بعد پیدل کا راستہ لیا ۔ بہت ہی پر لطف سفر تھا ۔ یہ قافلہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور گھوڑے کی گاڑیاں بھی آہستہ آہستہ جا رہی تھیں ۔ بہت سے لڑکے بھی برادری کے ساتھ اور کچھ جوان حضرات جو ہمارے ہم عمر تھے وہ اور میں راستہ میں تھوڑی دور سواریوں سے اتر کر پیدل چلنے لگتے تھے اور وہ موسم گرمیوں کا تھا اور آم کے درختوں میں کیریاں آگئیں تھیں جہاں کوئی راستہ میں امرئی ملتی برائی اس کا ستیاناس کرتے ۔ ملازمین وغیرہ منع بھی کرتے

لیکن وہ سب کیریاں توڑ لیتے اور اس لوٹ مار میں زیادہ لڑکے اور ملازمین شریک ہوتے اور کچھ جوان لوگ بھی میرے بڑے بہنوئی میر سید علی صاحب مرحوم لاکھ منع کرتے لیکن اُن کی سنتا کون شب اعتبار خان کی سرا مشہور انوار خان کی سرائے میں بسر ہوئی شام کو ہم لوگ وہاں پہنچے اور دیگوں میں بہت کھانا ساتھ تھا۔ منوں شیرمالیں تھیں دیگوں میں قورمہ اور کباب پسندہ وغیرہ ساتھ تھے باوجود اس کے باورچی بھی ساتھ تھا اور اس نے بھی کچھ چیزیں رات کو پکائیں اور کچھ کھانے بھی گرم کئے گئے اور کیریاں جو راستہ میں لوٹی گئی تھیں ان کی خوب چٹنی بنی صبح کے چھ بجے حوائج ضروری سے فارغ ہو کر سب نے ناشتہ کیا اور یہ قافلہ چلا واضح ہو کہ جس مقام امتیاز خان کی سرائے ہے اس زمانہ میں غیر آباد مقام تھا صرف ایک سرائے اور دو چار کسانوں کی جھونپڑیاں تھیں اب وہاں ایک ریلوے اسٹیشن ہے اور بڑا قصبہ ہو گیا ہے۔ اور ابھی آبادی ہے شاید انوار خان کی سرا جنکشن ہے۔ برات کے اترنے کے لئے جو مکانات لے لئے گئے تھے ہم لوگ دوسرے دن چار پہر کو پہونچے اپنے قیام گاہ پر پہونچکر سب لوگ نہائے کپڑے بدلے اور پہلے سے میرے بہنوئی کے کسی دوست نے سب انتظام کر رکھا تھا اور باجے والے وغیرہ سب آ گئے باجوں اور جلوس کا انتظام کر لیا گیا تھا بعد مغرب برات روشنی کے ساتھ نکلی۔ میر سخاوت علی صاحب کے مکان پر شب کے آٹھ بجے برات پہونچی۔ تین طائفے بھی مقرر کر لئے گئے تھے عقد خوانی ہونے کے بعد محفل رقص و سرود ہوئی چوتھی وغیرہ ہونے کے بعد برات معہ دلہن کے اُسی شان اور اسی طریقہ سے واپس آئی۔ یہہ واقعہ میں نے اس واسطے لکھا ہے۔ تاکہ معلوم ہو کہ اس زمانہ میں سفر کا طریقہ کیا تھا۔ اس زمانہ کے اور واقعات بھی کچھ لکھتا ہوں جس سے اس زمانہ کے تمدن پر بھی روشنی پڑے۔ مثلاً رمضان مبارک اور عید بقرعید شب برات کے تہواروں کی کیفیت۔ شادی بیاہ کی حالت۔ امرا کی شادیوں میں یہ ہوتا تھا کہ چھ چھ سات سات دن کی محفلیں ہوتی تھیں اور بعض شادی میں پندرہ دن تک محفل ہوتی تھی پھر ایک خاص عظیم آباد کی ایجاد ہے کہ شادیوں میں ناچ گھر بنایا جاتا تھا بڑا پنڈال بنتا اور نہایت آراستہ کیا جاتا تھا۔ علی قدر حیثیت اس کے اندر جھاڑ فانوس شیشے کی ہانڈیاں آویزاں کی جاتیں اور کھمبوں میں دیوارگیریاں لگائی جاتی تھیں اور جن کو زیادہ تکلف کرنا منظور ہوتا وہ یہ التزام کرتے تھے کہ منڈوے میں جس رنگ کی چھت گیریاں ہوتی تھیں اسی رنگ کا فرش ہوتا تھا۔ اور اسی رنگ کے شیشہ آلات ہوتے تھے۔ صدر میں ایک اونچا مقام ہوتا تھا جس پر کارچوبی

مسند بچھائی جاتی اور چھوٹا زرین شامیانہ چاندی یا گنگا جمنی چوبوں کا نصب کیا جاتا جہاں دلہا کی نشست ہوتی تھی اور شامیانہ کے چاروں طرف توکیاں آویزاں کی جاتیں اور غلام گردش میں چاروں طرف چھوٹے چھوٹے تخت رکھے جاتے تھے اور دلہا کے سامنے بہت دور تک ایک مصنوعی چمن بنتا تھا لانبے لانبے شیشہ کے حوض یکے بعد دیگرے تھوڑی دور تک لگائے تھے۔ خوشنما چینی کے گملے حوض کے کنارے کنارے رکھے جاتے اور وہ حوض میں پھول ڈالے جاتے اور ایک فوارہ اس میں لگایا جاتا اس ترکیب سے کہ پانی اس کا اُچھل کر اُسی میں آئے اور پھر فوارہ سے نکلے اور جو امرا آتے تھے وہ غلام گردش کے تخت کے نیچے اون کے لئے مسندیں یہاں سے وہاں تک بچھائی جاتیں جاڑوں میں قالیں اور گرمیوں میں سوزنیاں بچھائی جاتی تھیں اور تختوں سے ملاکر بڑے بڑے گاؤتکئے لگائے جاتے۔ ہر امیر کا یہ خیال ہوتا تھا کہ میرے ساتھ جو لوازمے ہوں وہ دوسروں سے بڑھ جائیں چاندی کے گنگا جمنی کے بڑے بڑے تھال حقے اور اُس میں کلابتو کے کام کے پیچوان ہوتے تھے اور چنبر اور منہالیں۔ قفلیاں وغیرہ گنگا جمنی ہوتیں اور اگر تھال حقہ گنگا جمنی ہوتا تو منہال چلم کے نیچے کی عرق گیر سب چیزیں گنگا جمنی یعنے سونے چاندی کی ہوتیں اگر حقہ چاندی کا ہوتا تو یہ چیزیں بھی چاندی کی ہوتیں پیچوانوں میں جو دستگیر ہوتی وہ بھی کارچوبی ہوتی اور تھال حقہ کے نیچے زیرانداز بھی کارچوبی بچھایا جاتا۔ اگر تھال حقہ گنگا جمنی ہوتا تو پانوں کا خاصدان اُگالدان سب گنگا جمنی۔ الائچی چکنی ڈلی کی ڈبیہ اور لوٹیا یہ سب گنگا جمنی ہوتا۔ لوٹیا پانی کی اس واسطے رہتی کہ یہ خیال نفاسب گلوری کا اوگال پھینک کر کلی کرنے کے بعد پھر دوسری گلوری کھائی جاتی اور لوٹیا کے نیچے تھالی ہوتی وہ بھی اُسی چیز کی ہوتی جس کی کہ وہ لوٹیا اور لوٹیا کے اوپر ایک ڈھکنا ہوتا اُس میں ایک زنجیر لگی ہوئی ہوتی اور یہ عجیب سماں ہوتا تھا کہ سَو سَو ۲۵ سوا امیروں کے سامنے اسی طرح کا لوازمہ رہتا۔ اِن امرا کے ساتھ اون کے حقہ بردار بھی رہتے جو چلمیں بدلتے جاتے۔ عام لوگوں کے لئے جن کے ساتھ حقے نہیں ہوتے تھے اُن کے لئے صاحب خانہ کی طرف سے انتظام ہوتا تھا بعض وہاں ایسے آدمی تھے جو ٹھیکہ لیا کرتے تھے کہ تمام حقوں کی سربراہی ان کے ذمہ کردی جاتی گلوریاں پانوں کی صاحب خانہ کی طرف سے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے تقسیم ہوتیں۔ اسی زمانہ میں سگار اور سگریٹ کا رواج نہیں تھا امرا کے ساتھ جو حقے آتے تھے اس میں جو تنبا کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے دھوئیں سے دماغ معطر ہو جاتا تھا۔ علاوہ اس خوشبو کے

جا بجا اگر کی بتیاں اور عود بھی خاص ظرف میں روشن کیا جاتا۔ پھر ان لوگوں کے کپڑے میں جو عطر لگا ہوتا اس سے الگ دماغ معطر ہوتا۔ تھالی میں جو گلوریاں ہوتیں اس میں بھی ایک چاندی کا عطردان رہتا تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ مہمانوں کو شب کے آٹھ بجے کھانا کھلا دیا جاتا اس کے بعد نلچ گھر میں مہمان آجاتے۔ مہمان جب بیٹھ جاتے تو صاحب خانہ کی جانب سے گلوریاں پانوں کی۔ عطر اور پھولوں کے گجرے مہمانوں کو تقسیم کئے جاتے ان گجروں کی باس سے بھی محفل معطر رہتی۔ گرمیوں اور برسات میں اقسام کے خوشبودار پھول پھولتے ہیں مثلاً۔ بیلا موتیا مونگرا۔ بٹ مونگرا جو ایک ہی خاندان کے یعنی جنس کے پھول ہیں۔ مگر مختلف انواع ہیں۔ برسات میں جوہی اور چنبیلی شروع جاڑوں میں نواڑی اور کاکڑا گجرے موسمی پھولوں کے ہوتے۔ رنڈیوں کی یہ کیفیت تھی کہ ایک سے بڑھکر ایک کا زیور اور لباس ہوتا۔ ان رنڈیوں میں ایک حیدر جان طوائف تھی جس کے دروازہ پر ہاتھی جھولتا تھا اور وہ تیس چالیس ہزار کے جواہرات میں مغرق آتی تھی۔ اور پیشواز بھی دو ڈھائی ہزار سے کم کی نہیں ہوتی تھی جس میں تمام موتی لگے ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں ہر رنڈی کے ساتھ چار سازندے ہوتے تھے۔ دو سارنگیے ایک تبلہ نواز اور ایک جوڑی والا یعنی منجیرہ بجانے والا یہ چاروں ایک ہی وضع کی وردی پہنتے یعنی کمخواب کی اچکنیں بنارسی صافے ایک ہی رنگ کے مشروع یا سنگی یا اطلس کے گھٹنے (یعنی اور یب چوڑی دار پائجامہ) اور علاوہ اس کے جب حیدر جان ناچنے کو کھڑی ہوتی تو دو مہریاں پیچھے ہوتیں جو کارچوبی لہنگے پہنے ہوئے اور کامدانی کے ڈوپٹے ایک ہی وضع کے کپڑے جس کو ہم وردی یا ڈریس کہیں گے۔ یہ پیچھے کھڑی ہو جاتیں۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کی ڈنڈی کا پنکھا ہوتا اور اگر جاڑا ہوتا تو صرف چھوٹی سی چونری ہلاتی رہتی اور دوسری کے ہاتھ میں خاصدان اور اگالدان ہوتا جب توڑے لیتی ہوئی ناچتے ناچتے آگے بڑھتی تو یہ سازندے اور مہریاں ساتھ ساتھ نہیں جاتیں بلکہ وہیں کھڑی رہتیں یہ بھی طریقہ تھا کہ طائفہ بدلوانا ہوتا تو ناظر[1] ایک چھوٹی تھالی میں ایک پان کا بیڑا لیکر آتا اور دوسرا طریقہ جو اس کے بعد ناچنے اور گانے والا ہوتا وہ پیچھے آکر کھڑا ہو جاتا ناظر یہ بیڑا طائفہ کو دیتا جو گانے میں مصروف ہوتا بیڑا لیکر وہ طائفہ

---

[1] ایک شخص کا پیشہ یہ ہوتا ہے طائفئے منتخب شدہ کے ہاں جاکر بیعانہ دے آتا ہے وہی محفلوں میں طائفوں کے بدلنے کا انتظام کرتا ہے۔ اسی کو ناظر کہتے ہیں وہ طائفوں سے بھی اپنا کچھ حق لیتا ہے اور صاحب محفل سے بھی انعام لیتا ہے یہی شخص اور دو آدمیوں کے ساتھ پان عطر پھول تقسیم کرتا ہے۔

سلام کر کے ہٹ جاتا اور دوسرا طائفہ آجاتا اور چاروں طرف لوگوں کو فرشی سلام کرتا اس طرح جو طائفہ آتا پہلے سلام کرتا اور جاتے وقت بھی آداب بجا لاتا اگر چار روز کی محفل ہے تو مختلف طائفے مقرر کئے جاتے کم سے کم تین طائفے روزآنہ مقرر کئے جاتے جس طائفہ کا گانا زیادہ مرغوب ہوتا تو وہ طائفہ چار روز کے لئے مقرر کیا جاتا۔ شب کے آٹھ سے اور صبح ہونے تک یکے بعد دیگرے تینوں طائفوں کا گانا ختم ہوتا اور اس کے بعد پھر اسی ترتیب سے جس نے پہلے گایا وہ پہلے جو اس کے بعد گایا وہ اس کے بعد اسی طرح صبح کے پانچ سے گیارہ تک یہ طائفے گاتے مگر کھڑے ہو کر نہیں۔ بیٹھ کر گاتے اس کو مجرا کہتے ہیں۔ یعنی صبح کے وقت طائفہ بیٹھ جاتا اور سازندے بھی بیٹھ جاتے گیارہ بجے لوگ اپنے اپنے گھر چلے جاتے صبح کو چائے بسکٹ وغیرہ کا ناشتہ ان مہمانوں کو کرایا جاتا جو شب بھر محفل میں رہے۔ اور پھر سر شام محفل میں شریک ہوتے اور پہلے روز کے طریقے سے کھانے کے بعد محفل میں آتے۔ بعض حضرات بوجہ خرابی صحت کے یا عمر کے جو رات بھر نہیں جاگ سکتے وہ شب کے دو چار گھنٹے بیٹھ کر چلے جاتے۔ بعض ایسے بھی تھے کہ جو ہر شب شریک محفل ہوتے اور بعض ایسے تھے کہ پہلی محفل میں نہیں آئے دوسری محفل میں آئے۔ برات کی حالت یہ ہوتی کہ ایک میل ڈیڑھ میل لمبا جلوس ہوتا۔ جلوس اس طریقہ سے ہوتا کہ پہلے بیانڈ نواز گھوڑوں پر اس کے بعد پیدل کی پلٹن ہوتی اس کے بعد سوار کا ایک دستہ رہتا۔ اس کے بعد آرائش کے تختے ہوتے یعنی لکڑی کی کھپاچوں سے مستطیل تین چار ہاتھ لانبا اور دو ہاتھ چوڑا کشتی نما رنگین ایک چیز بنائی جاتی اور اس کے اوپر گلدستے دس بارہ کاغذ کے پھول کے یہ قطار چالیس پچاس تختوں کی ہوتی ایک ایک کہار کے سر پر ایک ایک تختہ رہتا۔ جہاں یہ قطار ختم ہوتی وہاں پھر بیانڈ نواز ہوتے اس کے بعد سو سوا سو[125] اسی طرح تختوں کے اوپر کاغذی پھولوں کے عوض رنگین کنول آٹھ آٹھ دس دس ایک ہی تختہ پر ہوتے جس میں روشنی رہتی اس کے بعد پھر بیانڈ نواز اس کے بعد کنولوں کا دوشاخہ سہ شاخہ یہ بھی کوئی سو کے قریب ہوتا اور اس کی دوہری قطار ہوتی اس کے بعد بیانڈ نواز ہوتے۔ اس کے بعد ہودوں اور عماریوں کے چند ہاتھی ساز و عراق سے درست ہاتھیوں پر کارچوبی جھولیں پڑی ہوتیں اور ہودے اور عماریاں چاندی کی یا گنگا جمنی ہوتیں۔ چاندی یا گنگا جمنی زیور ہاتھی کو پہنائے جاتے تھے اور یہ ہودوں اور عماریوں میں کنول لٹکتے ہوئے روشن رہتے بیس پچیس ہاتھیوں کی قطار ہوتی اس کے بعد تخت رواں پر ایک کسبن کھڑی رہتی اور اس چھت دار تخت رواں پہ چاروں طرف جھالریں لٹکی ہوتیں

اوراس میں کنول لٹکتے ہوئے اور دو لمبے لمبے بانسوں پر تخت رواں رہتا جس کو آٹھ کہار کاندھے پر لیکر چلتے جو رنڈیاں اپنے تئیں معزز سمجھتی تھیں وہ تخت رواں پر نہیں ناچتی تھیں بلکہ وہ معمولی طائفہ رہتا تخت رواں پر جو کسبن کھڑی رہتی اس کا منہ دولہا کی طرف رہتا اور اوسی جگہ پر شہنائواز (شہنائی والے عموماً یہ گیت شہانا راگنی میں بجاتے ۔ موری اچھی نیکی بنو سے بھعانا رے بنرا۔ بنراری بنڑی جاگ جاگ جیئے نوشاہ برخوردار۔) کا ایک غول دولہا کے گھوڑے کے قریب رہتا جس گھوڑے پر دولہا سوار ہوتا وہ نہایت ہی خوبصورت ہوتا چار جامہ بھی نہایت پُر زور مغرق اور گھوڑے کا ساز وسامان تمام چاندی کا دولہا کے گھوڑے کے اردگرد اس کے عزیز قریب اور احباب پیدل ہوتے ۔ بعض گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے چلتے عموماً بڑا بھائی ہوتا یا کوئی رشتہ کا بڑا ہوتا اس کے بعد ایک جھرمٹ عورتوں کا ہوتا جو شاہانہ گاتی ہوئی پیچھے پیچھے آتیں [1] ۔

عموماً یہ گھر کی اور عزیزوں کے ہاں کی وہ لونڈیاں ہوتیں جو بے گوشہ ہوتیں اس کے بعد دولہ کی ماں بہن اور عزیز بیبیاں میانوں پالکیوں پر ہوتی ہیں ۔ اوران میانوں اور پالکیوں کے اوپر بھی بانات کے پردے پڑے رہتے اُن کے پیچھے گھوڑے کی گاڑیوں کے قطار رہتی جوڑیاں بگھے جن میں جتے ہوتے وہ لوگ جو پیدل نہیں جاسکتے وہ اِن سواریوں میں ہوتے اور جو لوگ دلہا کے گھوڑے کے ساتھ ہوتے وہ بھی تھوڑی دور پر اپنی گاڑیوں میں آ بیٹھتے اور دوسرے لوگ دولہا کے گھوڑے کے پاس جاتے ۔ اور جلوس کے ساتھ سیکڑوں مشعلچی رہتے ایک ہاتھ میں مشعل اور ایک ہاتھ میں تیل کی کپی رہتی جو لوگ کہ جلوس کی مسل بندی کرتے وہ برابر اس امر کا خیال رکھتے کہ کہیں روشنی کم نہ ہونے پائے ان مشعلچیوں کو وہ برابر دیکھتے جاتے کہ کہیں وہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائیں اس طریقہ سے دولہن کے گھر یہ برات خراماں خراماں جاتی اس انداز سے یہ برات روانہ ہوتی کہ جلوس کی لمبان کس قدر ہے دولہن کے گھر کی مسافت کیا ہے یعنی ایسے وقت روانہ ہوا کہ تاروں کی چھاؤں میں دولہا دولہن کے گھر پہونچے وہاں پر دولہن کے ہاں دروازہ کے قریب بڑے بڑے دیو آتشبازی کے چاند تارے وغیرہ سب کاغذ کے نصب ہوتے اوران میں دولہا کے پہونچتے ہی آگ لگائی جاتی اور وہ آتشبازی چھوٹتی دولہا جب دروازہ پر پہونچتا تو وہ دروازہ

---

[1] جو گیت اسی موقع کے لئے بنائے گئے ہیں ان کو شاہانہ کہتے ہیں اور گاتے بھی شاہانہ راگنی میں ہیں ۔ مثلاً یہ گیت

آج ہے شہانی رات چندہ تم اگیو گھوڑے پر اگیو جوڑے پر اگیو جا بنی سے ینہا لگا ہے بنا مرا گھوڑے چڑھا ہے چندہ تم اگیو الخ

بند کیا جاتا اور سالا حقیقی یا رشتہ کا آکر بچھا تک پکڑ لیتا یا دولہ کے گھوڑے پر دولہ کی پشت پر آچک کر بیٹھ جاتا۔ درحالیکہ کوئی لڑکا صاحب اعلیٰ بنا ہوا دولہ کی پشت پر ہوتا۔ اور اندر نہیں جانے دیتا جب تک کہ وہ اپنا حق جسے نیگ کہتے ہیں علیٰ قدر حیثیت پچاس تا دو سو نہ قبول تا دولہا کو اندر نہ جانے دیتا دولہن کے گھر میں بھی نہایت عمدہ سامان محفل کا رہتا۔ دولہا تھوڑی دیر کے لئے زنانہ میں جاتا اور وہاں کچھ رسمیں ادا ہوتیں اس کے بعد باہر آتا جہاں براتی وغیرہ بیٹھے رہتے اور وہ جاکر اپنی مسند پر بیٹھتا اس وقت دولہا کے لئے شربت آتا اور سالا آکے شربت پلاتا۔ اب گانا شروع ہوتا۔ کچھ طائفے دولہن والے مقرر کرکے اور کچھ طائفے دولہا کے ساتھ جاتے پھر صبح کے سات بجے مولوی صاحب تشریف لاتے گانا موقوف ہوتا عقد خوانی ہوتی۔ اور کشتیوں میں چھوہارے بادام، مصری ہوتی اٹھ اٹھ جاتی۔ عقد خوانی کے بعد مبارکبادیاں اور سہرے جو اعزہ و احباب کہلاتے وہ پڑھے جاتے۔ ان سہروں میں سے ایک سہرا کسی خاص طائفہ کے ہاں پہلے سے یاد کرنے کے لئے بھیجا جاتا جو عقد خوانی کے بعد گایا جاتا اس طائفہ کو انعام ملتا بعض مفلس شاعر کو سہرا کہنے کے صلہ میں انعام دیا جاتا۔ اس کے بعد دودھ مالیدہ کھلائی[1] ہوتی یعنی سب براتیوں کو مالیدہ اور دودھ کھلایا جاتا۔ اور چائے بسکٹ وغیرہ سے تواضع کی جاتی جس میں دولہا والے اور دولہن والے سب شریک رہتے۔ بارہ بجے تک رقص و سرود کی صحبت رہتی۔ بعد دسترخوان بچھتے۔ پہلے دولہا والوں کو کھلایا جاتا۔ دولہا کا دسترخوان جس مسند پر وہ بیٹھتا اس کے متصل بچھایا جاتا اور نہایت پُر تکلف کھانے ہوتے اور دسترخوان بھی نہایت اچھی طرح سے گلدان وغیرہ رکھ کر آراستہ کیا جاتا۔ جو نقرئی سلفچی آفتابہ جہیز میں دیا جانے والا ہوتا اس سے دولہا کا ہاتھ دھلایا جاتا۔ اس کے بعد لوگ کچھ سو جاتے کچھ ادھر ادھر پھرتے تھے۔ جو کمرہ دولہا کی استراحت کے لئے معین کیا جاتا دولہا وہاں سے چلا جاتا سو جاتا یا اپنے احباب سے باتیں کرتا رہتا۔ چار بجے کے قریب سب جہیز باہر آتا دو فہرستیں مرتب ہوتیں دولہا کا کوئی عزیز دستخط کرکے ایک فہرست دولہن والوں کو دیتا اور ایک فہرست دولہن والوں کی طرف سے دولہا والوں کو دی جاتی۔ جہیز میں۔ چوبی، مسی، برنجی سامان ہوتا اور زیورات کی فہرست الگ ہوتی۔ شام کے سات بجے دولہا اندر جاتا۔ اس وقت آرسی مصحف اور جلوے وغیرہ کی رسمیں ہوتیں اور دولہن کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں یا تو دولہن کا باپ دیتا یا چچا یا کوئی بزرگ خاندان یا بڑا بھائی دیتا۔ اس کے بعد دولہا دولہن کو خود گود میں لے جاکر محافہ پر بٹھاتا۔ جس کے اندر بھی کارچوبی مسند رہتی

---

[1] ایک رسم کا نام۔

اور محافہ پر تخلی ۔ کارچوبی غلاف پڑا رہتا ۔ اس وقت کا سین اور سماں عجیب و غریب ہوتا جس وقت
دولہا دولہن کو لیجا کر محافہ میں بٹھاتا اس کو وداع یا رخصتی کا وقت کہتے ہیں اندر رونے کا کہرام مچتا
اور لونڈیاں اور مامائیں منڈھا گاتیں اس کو بابل گانا بھی کہتے ہیں ۔ اس مختلف الفاظ کا یہ گانا
ہوتا مختصر سا ایک مجھے یاد ہے جو میں لکھتا ہوں ۔ بابل مورا نیسر (میکا) چھوٹا جائے جب کہ دوارے
ڈُلیا لاگی اپنا پرایا چھوٹا جائے ۔ یہ منڈھا پندرہ سولہ عورتیں ملکر نہایت خوش الحان اور پُر درد
آوازمیں گاتیں جن کا سننے والوں پر بیحد اثر ہوتا اور بہت سے مرد بھی بیساختہ رو دیتے ۔ اسکے بعد
مختصر سے جلوس کے ساتھ یہ شب گشت روانہ ہوتی ۔ آگے تھوڑا جلوس اس کے بعد دولہا کا
گھوڑا پیچھے دولہن کا محافہ اور اس کے بعد زنانی سواراں رہتیں جن میں کہ دولہا کی والدہ
وغیرہ عزیز اقارب عورتیں باوجودیکہ چھ چھ سات سات دن کی مسلسل محفلوں میں اندر باہر
مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا مگر امراء کے ہاں کی شادیوں میں تورہ بندی
جدا ہوتی تھی ۔ شادی رچنے کے مہینوں پہلے سے محلہ وار تورے تقسیم ہوتے تھے دوست واحباب
عزیز واقارب کی تعداد کے لحاظ سے تورے بھیجے جاتے تھے جس کا سلسلہ ڈھائی ماہ تک رہتا
اس کا طریقہ یہ تھا روزانہ دو تین جگہ حصے جاتے ۔ تین چار بھنگی بر داروں پر حصے جاتے
ایک بہنگی[1] میں دو خوان ہوتے ایک خوان میں اقسام کے پلاؤ مثلاً دوگوشتہ مرغ پلاؤ قورمہ پلاؤ
یخنی پلاؤ ۔ فالسہ پلاؤ ۔ ترکاری پلاؤ ۔ نرگسی پلاؤ ۔ ماہی پلاؤ یہ سب بڑی بڑی مشقابوں میں
ایک خوان میں جما دیا جاتا ۔ دوسرے خوان میں اقسام کی روٹیاں مثلاً پنجہ کش ۔ شیرمالیں ۔
باقرخانی ۔ گاؤدیدہ ۔ گاؤزبان ۔ یہ اقسام تنوری روٹیوں کی ۔ ایک خوان میں درقی پراٹھے
دسترخوانی پراٹھے ۔ سنبوسے ۔ ورقی سنبوسے ۔ نان بادام ۔ بہرے چنے کے پراٹھے ۔ ایک خوان
میں اقسام کے میٹھے ۔ مزعفر ۔ پکیلا وہ زردہ ۔ سفیدہ (میٹھے چانولوں کی قسم ہیں) نان مصری ۔
ساق عروس ۔ در بہشت میووں کی شکل میں مٹھائیاں ۔ نان خطائی ۔ لوز بادام ۔ لوز پستہ اور اقسام
کی مٹھائیاں ۔ متنجن ۔ ایک خوان میں اقسام کے مربے ۔ مربہ سیب ۔ مربہ انبہ ۔ مربہ اناناس ۔ مربہ کریلہ
(جس میں کڑواہٹ نام کو نہیں) مربہ کرونده ۔ مربہ بہی ۔ اور طرح طرح کے مربے ۔ ایک خوان میں اقسام
کے کباب ۔ گولر کباب ۔ خطائی کباب ۔ شامی کباب ۔ سیخ کباب ۔ دو قسم کے پسے ہوئے گوشت کا
اور تکوں کا ۔ حسینی کباب ۔ تاس کباب ۔ آلو کباب ۔ مسلم مرغ کباب (بشرط موسم) ماہی کباب کی

---

[1] کہار کو کہتے ہیں ۔

قسم کے ایک خوان میں اقسام کے اچار سرکے کے اور پانی کے ۔ متعدد قسم کی چٹنیاں ۔ میٹھی کھٹی کھٹ میٹھی ۔ ایک خوان میں اقسام کے قورمے اور قلئے ۔ سادہ قورما ۔ کھڑے مصالحہ کا قورمہ ۔ زعفرانی قورمہ ۔ سہمنی کا قورمہ ۔ بادام کا قلیہ ۔ سیب کا قلیہ آلو وغیرہ مختلف ترکاریوں کا قلیہ ۔ واضح ہو کہ بغیر ترکاری ڈالے جو گوشت پکتا ہے اور جس میں ہلدی شریک نہیں کی جاتی ہے اُسے قورمہ کہتے ہیں اور ترکاری دار گوشت کو قلیہ کہتے ہیں جس میں ہلدی ضرور ہوتی ہے ۔ علاوہ قورمے قلئے کے گوشت کا قیمہ مختلف طرح کا پکا ہوا ۔ سیموں کے بیج کے ساتھ ۔ کچنال کی کلیوں کے ساتھ ۔ ہرے چنوں کے ساتھ (بشرط موسم)

اب نہ وہ خاصہ پزرہے نہ وہ نان پز نہ اور اعلیٰ درجہ کے رکابدار موجود ہیں ۔ بہنگی بردار کہار ہوتے ہیں ۔ ایک موٹی لکڑی میں دو خوان لٹکا کر کاندھے پر رکھ لیتے ہیں ۔ امرا کے بہنگی بردار بھی سُرخ باناتی وردیوں میں ہوتے تھے ۔ اچکن سُرخ بانات کی اور کف و کالر سبز رنگ کے بانات کے سر پر شالباف کی پگڑی یا منڈاسا ہوتا ۔ کہار پائجامے نہیں پہنتے وہ دھوتی بند ہوتے ہیں ۔ شالباف کو سالو اور گزینگا بھی کہتے ہیں ۔

ذکر عید اب میں عیدوں کا حال سپرد قلم کرتا ہوں ۔ مسلمان عام طور سے عیدین یعنی عید الفطر و عید الضحیٰ مناتے ہیں ۔ فرقہ اثنا عشری اور بھی چند عیدیں مناتے ہیں ۔ مثلاً عید غدیر ذی الحجہ کی اٹھارہویں کو اس واقعہ کی یادگار جبکہ رسولِ مقبول نے نفس نبیؐ رسد اللہ غالب علی ابن ابیطالب یعنی اپنے عم زاد برادر اور داماد کو ستر ہزار آدمیوں کے مجمع میں شتروں کے پالان کا ممبر بنا کر اوس پر کھڑے ہو کر پہلے فصیح و بلیغ خطبہ دیا ۔ اس کے بعد من کنت مولاہ فعلی مولاہ فرمایا اور فرمایا یا خدا تو دوست ہو اُس کا جو علیؑ کا دوست ہو ۔ اور دشمن ہو اُس کا جو علیؑ کا دشمن ہے اپنا وصی مقرر فرمایا حضرت علیؑ کو مخاطب کرکے فرمایا لحمک لحمی ۔ دمک دمی وغیرہ عید نہم ربیع الاول کی نہم کو ہوتی ہے ۔ عید نوروز[1] ہر سال اکیسویں مارچ کو ہوتی ہے ۔ عید ولادت صاحب الامر حضرت مہدی بارہویں امام کی چودہویں شعبان کو عین شب برات کو ہوتی ہے ۔ عید جناب امیر علیہ السلام ۱۳ رجب کو ہوتی ہے ۔

---

[1] یہ مجوسیوں کی عید نہیں ہے اہل تمن سلاطین ہند نے بھی یہ عید منائی ہے مثلاً غیاث الدین بلبن بادشاہ اور دکن کے متعدد بہمنیہ سلسلہ کے سلاطین نے یہ عید منائی دربار وغیرہ کئے دیکھو تاریخ فرشتہ شیعوں کے نزدیک تو بہت مبارک عید ہے حضرت نوح کی کشتی کوہ جودی پر اسی تاریخ ٹھہری ۔ خانہ کعبہ بت دوش رسولؐ پر چڑھ کر حضرت علی نے توڑے غدیر خم میں حضرت علیؑ اسی تاریخ وصی ہوئے جنوں کو مسلمان کرنے کے لئے حضرت علیؑ کو اسی تاریخ رسالتمآب نے بھیجا تھا ۔ آج تک پارسی عید نوروز مناتے ہیں ۔

چونکہ عظیم آباد میں زیادہ حصہ قدیم خاندانی امرا کا اثنا عشری تھا اس لئے آخرالذکر عیدیں بہت بارونق ہوتی تھیں۔ اس کا تعلق دولت وثروت وعقیدت سے ہے۔ اگلے امرا میں دونوں باتیں تھیں۔

کچھ کیفیت عیدوں کی بھی بیان کرتا ہوں۔ عیدالفطر سب سے بڑی عید عام مسلمانوں میں مانی جاتی ہے۔ اس کا پیش خیمہ ماہ صیام ہے اس کی بھی مختصر سی کیفیت اپنے گھر اور دیگر اثنا عشری گھرانوں کی لکھتا ہوں۔ والد مرحوم افطار زنانہ میں کرتے اس کے بعد مردانہ حصہ مکان میں تشریف لے جاتے۔ سحری کا سامان باہر بھیجدیا جاتا۔ سحری نوش کرکے دعائے سحر و نماز صبح سے فارغ ہونیکے بعد جاگتے رہتے وہی دستور العمل رہتا جو ہمیشہ کا معمول تھا۔

شب قدر جب آئی تو بعد افطار و غذائے شب والدہ مرحومہ اور میرے والد مرحوم دونوں مقررہ اعمال شب قدر میں دیر تک مصروف رہتے۔ اسی مہینہ میں حضرت علیؑ ابن ابیطالب علیہ السلام کی شہادت ایک ملعون عبدالرحمان ابن ملجم کے ہاتھوں ہوئی تھی تو شبوں کی مجلسیں ہمارے یہاں بھی ہوتی تھیں۔ ۱۹؍رمضان سے ۲۱؍رمضان تک ہم سب سبز پوش رہتے۔ دو مجلسیں ہوتی تھیں اور جس طرح محرم کے عشرہ اول میں پلنگ پر سونا چھوڑ دیتے تے اور ترک حیوانات کرتے یعنی گوشت اور مچھلی سے پرہیز کرتے اسی طرح ان دنوں بھی غم شیر خدا میں سوگوار ہوتے۔ بعض اثنا عشری گھرانوں میں علاوہ مجلسوں کے ایک دُلدل بھی نکالا جاتا۔ بوستان میں حضرت علیؑ کو دلدل سوار[1] کہا ہے۔

انتیسویں کو اگر مطلع صاف رہا چاند دکھائی دیا تو لوگ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے آنکھیں آسمان سے لگ جاتی ہیں۔ عید کے چاند کی خوشی بچوں اور بڑوں روزہ داروں کو بہت ہوتی ہے شیر خرمے پر ہاتھ ماریں گے۔ عید کے چاند کی اہمیت اس ضرب المثل سے ظاہر ہے کہ کوئی عزیز یا دوست کسی عزیز یا دوست کو زمانہ تک نہ دیکھئے تو ایک دوسرے سے کہتا ہے تم تو عید کے چاند ہو گئے ایک اور گروہ مسلمانوں کا ہے جو میوشی کا عادی ہوتا ہے لیکن ماہ صیام میں اور ماہ محرم کے عشرہ اول میں بلحاظ احترام اور معصیت سے بچنے کے لئے گو تھوڑے ہی زمانہ کے لئے سہی مے نوشی ترک کر دیتا ہے۔ اور

---

[1] حضرت کا دُلدل عجیب گھوڑا تھا جو کبھی اڑا نہیں اور نہ کبھی زخم خوردہ ہوا بے مثل جانور تھا جس طرح خدا نے بے مثل ذوالفقار دی اور بے مثل بیوی دی ویسا ہی یہ گھوڑا تھا کیا خوب یہ مصرعہ کسی نے کہا تھا۔ زن و شمشیر وفادار کہ دید۔ اسکا جواب مرزا غالب نے دیا۔

واللہ علیؑ دید علی دید علی دید

جب محرم کا عشرہ اول گذر جاتا ہے اور تیجہ (سویم) ہو جاتا ہے یعنی جبکہ حضرت سید الشہدا کے پھولوں کی مجلس ہو چکتی ہے۔ اور عید الفطر کا چاند دیکھا جا چکتا ہے تو اس طبقہ کی مسرت کی کوئی حد نہیں ہوتی چنانچہ کسی شاعر نے اسی موقع کے لئے یہ شعر کہا ہے۔

عید کا ذکر ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد ✽ کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

ہمارے ہاں معمول یہ تھا کہ ہر مہینے کا چاند دیکھنے کے بعد ملازمین میرے والدین کو چاند دیکھنے کا سلام کرتے اور جو عمر و رشتہ میں چھوٹے ہوتے۔ بچوں کی قید نہیں بلکہ زیادہ عمر والے بھی چاند دیکھ کر بڑوں کو سلام کرتے اور سوا ماہ محرم کے ہر مہینہ کا چاند دیکھ کر ماہ نو مبارک ماہ نو مبارک کی صدائیں بلند ہوتیں چاند دیکھنے کے بعد ہمارے ہاں ایک اور دستور بھی تھا سوائے ماہ محرم کے ہر چاندات کو کوزے کی مصری کے دو تین ٹکڑے اور ایک تتلی پنیسر کی میرے والد مرحوم زنانہ میں بچوں بوڑھوں عزیزوں کو ملازمین کو غرض جو موجود رہتا سب کو تقسیم کرتے اور تاکید ہوتی کہ چاند دیکھنے کے بعد یہ چیزیں کھائی جائیں۔ چاند اگر انتیس۲۹ کو ہوا تو بھی دوسرے روز اگر تیس۳۰ کا ہو تو بھی دوسرے دن عید ہوتی ہے۔ میں اپنے گھر کی عید کا ذکر کرتا ہوں۔ چاند دیکھنے کے بعد افطاری وغیرہ سے فرصت کرنے کے بعد میری والدہ مرحومہ بی مغلانی کو حکم دیتیں کہ صبح کو پہننے کے لئے جو نیا جوڑا میرے لئے تیار ہو وہ دست بقچہ میں حمام کے تولیہ کے ساتھ جامہ خانہ میں رکھا جائے اور توشہ خانہ کی بوا کو حکم دیتیں کہ چند جوڑے ان کے پہننے کے توشہ خانہ میں سے لے کر آئے ان میں سے ایک جوڑا جو مرغوب خاطر ہوتا رکھ لیتیں۔ اور اس کو بھی جامہ خانہ میں (حمام خانہ کے متصل کمرہ) ایک دست بقچہ میں اپنے حمام کے تولیہ کے ساتھ رکھنے کا حکم کرتیں۔ صبح ہوتے ہی پہلے مجھے حمام کے لئے بھیجتیں پھر خود حمام کرتیں۔ مردانہ میں والد مرحوم حمام سے فارغ ہو کر زنانہ میں آتے شیر خرمے پر جناب رسول خدا کی فاتحہ دیتے پھر دوگانہ عید کا ادا کرتے۔ مٹیا برج نماز کے لئے جاتے۔

جہاں مہر شاہ اودھ نظر بند تھے جانا ہوتا وہ مقام ہماری سکونت سے نو دس میل کے فاصلہ پر تھا۔ جب ہم لوگ کلکتہ سے پٹنہ عظیم آباد آ گئے تو عیدین کی نمازوں میں سہولت ہو گئی۔ اندرون شہر بھی مسجدوں میں علما عیدین اور جمعہ کی نمازیں پڑھاتے تھے۔ کلکتہ میں تو گھر ہی میں نماز عیدین پڑھتے تھے میں والد کے ساتھ کھڑا ہو جاتا تھا (مجھے نماز منشی تصدق علی مرحوم نے یاد کروائی تھی) اتنے میں نوبت بجانے والا عید کی مبارکباد دینے آتا تھوڑی دیر بجا کر اور انعام لیکر چلا جاتا

زنانہ میں سب مامائیں اصیلیں چھوکریاں بوائیں نہا دھو کر نئے نئے کپڑے پہنکر میرے والدین کو عید کا سلام کرتیں۔ خواجہ سرا نذر علیؒ کا سلام بھی زنانہ میں ہوتا۔ چھوکریوں کے لئے نئی پوشاکیں والدہ مرحومہ ہر عید و بقرعید و نوروز کے موقعوں پر ایک دن پیشتر تقسیم کر دیتیں۔ عید الفطر میں صبح کے دس بجے تک زنانہ کے باورچی خانہ سے سیویاں ابالی ہوئی، شیرہ کی سیویاں اور سیویوں کا مزعفر پکوا کر بڑی بڑی مشقابوں میں رکھ کر خوانوں میں لگا کر بی مغلانی والدہ مرحومہ کے پاس لیکر آتیں۔ جہاں جہاں حصہ بھیجنا ہوتا بی مغلانی کو معلوم ہوتا تھا تاہم پوچھ پوچھ کر بی مغلانی سیویاں تقسیم کرتیں۔ شب کے خاصہ کے لئے رومالی سیویوں کا پلاؤ۔ سیویوں کا متنجن بھی پکایا جاتا اور یہ حصے تقسیم ہوتے رہتے والدہ مرحومہ حسب معمول کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوتیں اور مردانے کے لوگ معہ گارڈ کے سپاہی عید کے سلام کو حاضر ہوتے صبح کا سلام بھی اسی کو سمجھنا چاہیئے۔

سلام لے کر آ کر مسند پر بیٹھتیں اتنے میں نذر علیؒ خواجہ سرا آ کر عرض کرتے کہ ڈومنیاں حاضر ہیں فرمائیں بلاؤ مٹیا برج سے چدن میراسن لکھنو کے باشندہ ہمیشہ بوقت ضرورت بلائی جاتی تھی۔ سب عیدوں میں بغیر بلائے آتی مبارکباد گا کر اور عیدی لیکر رخصت ہوتی۔ بعض گھرانوں میں میں نے دیکھا کہ جس فرش پر خواہ زمین کا ہو یا تختوں کے چوکوں کا ہو صاحب خانہ تو مسند پر بیٹھ جاتی ہیں اور سامنے میراسنیں گاتی ہیں۔ ہمارے ہاں یہ طریقہ تھا کہ تختوں کے چوکے کے سامنے زمین پر شطرنجی اور چاندنی بچھا دی جاتی جس پر ڈومنیوں کا طائفہ بیٹھ کر گاتا چدن کے ساتھ دو عورتیں سارنگی بجانے والی ایک طبلہ بجانے والی اور ایک جوڑی بجانے والی ہوتی۔

اور اس کی ایک بہن غالباً رشتہ ناتے کی تھی۔ اس کے ساتھ گاتی۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ یہ صحبت رہتی۔ آمد و رفت کا گاڑی کا کرایہ اور مقررہ انعام دیکر اس کو رخصت کیا جاتا فطرے کی گٹھریاں باہر منشی صاحب فقیروں کو تقسیم کرتے مردانہ میں لوگ والد سے ملنے آتے قریب عصر والد مرحوم بھی دو ایک جگہ جاتے پھر دوسرے اور تیسرے دن بھی خاص خاص لوگوں کے ہاں جاتے۔ اسی طرح والدہ مرحومہ بھی گنتی کی چند بی بیوں کے ہاں جاتیں زیادہ لوگ زنانہ مردانہ میں ہمارے ہاں خود آتے۔ مردانہ میں والد مرحوم اور زنانہ میں والدہ مرحومہ بروز عید تیسرے پہر کو سب کو انعامات مقررہ علیٰ قدر مراتب تقسیم فرماتیں۔ میں تو نماز کے بعد ہی اپنی عیدی اپنے استاد مولوی صاحب کی تصنیف کردہ منظوم عیدی پڑھکر (دو شعروں کا قطعہ ہوتا) والد سے الگ اور والدہ سے جدا لے لیتا اس طرح عید الفطر منائی جاتی۔ عید الضحیٰ کے موقع پر اسی طرح حمام وغیرہ ہوتا

نوبت بجتی میراسنیں آتیں انعامات تقسیم ہوتے ۔فرق اسقدر تھا کہ سیوں کے عوض بکرے تین قربانی کیئے جاتے اس کا گوشت تقسیم ہوتا ۔بقرعید کے کئی روز بیشتر سے کچھ بکرے ہمارے ہاں سے خاص خاص لوگوں کے ہاں بھیجے جاتے اور اسی طرح ہمارے ہاں خاص خاص لوگوں کے ہاں سے آتے ۔ نواب فخرالملک کے ہاں سے بہت سادنبے کا گوشت آتا اور ہمارے ہاں سے بکرا ایک دن بیشتر ان کے ہاں بھیجدیا جاتا ۔ پٹنہ عظیم آباد میں نواب بہادر نواب سرولایت علیخان کے سی ایس آئی ۔کے ہاں سے بہت سادنبہ کا گوشت آتا اُن کے ہاں پچاسوں دنبے پلے ہوئے رہتے جن کو صرف چنے کھانے کو دیے جاتے اس لئے گوشت لذیذ ہوتا ۔عید نوروز بھی دھوم سے ہوتی ۔چندروز بیشتر سے اقسام کی مٹھائیاں گھر میں بنائی جاتیں ۔شب کو ایک کمرہ میں جو بہت صاف ستھرا ہوتا دوروز بیشتر دھو دُھلا کر فرش کر دیا جاتا ۔ ایک دن قبل اس پر دسترخوان بچھا کر چھوٹی چھوٹی مٹی کی تشتریوں میں رنگ برنگ کے کاغذ کے پھول کتر کر بچھا کر اُس پر مٹھائیاں رکھی جاتیں اور رکابیوں میں کئی قسم کے ستو ۔اور تازے میوے اور انڈے ۔مصری بادام وغیرہ رکابیوں میں رکھ کر کمرہ بند کر دیا جاتا ۔صبح کو بروز نوروز تقویم کے لحاظ سے جو رنگ نوروز کا ہوتا پہلے سے اُسی رنگ کے اطلس کی اچکن (حیدرآبادی اصطلاح میں شیروانی) میرے لئے سلوائی جاتی وہ میں پہنتا ۔میری والدہ مرحومہ بھی اسی رنگ کا لباس زیب تن فرماتیں ۔ایک کاسہ میں عرق گلاب میں گلاب کے پھول ڈالدے جاتے اور دسترخوان والا کمرہ کھولکر دسترخوان کے قریب یہ کاسہ رکھا جاتا ۔ بوقت تحویل والد مرحوم دسترخوان پر نذر حضرت علیؑ مرتضیٰ کی دیتے اور دسترخوان کا تبرک ہم سب تھوڑا تھوڑا کھاتے میرے والدین ہاتھوں میں اشرفیاں رکھ کر پہلے یہ دعا پڑھتے اور مجھ سے فرماتے تم بھی ساتھ ساتھ پڑھتے جاؤ ۔

یامقلب القلوب والابصار یامدبر اللیل والنہار یامحول الحول والاحوال حول حالنا الے احسن الاحوال ۔

اکیسوا کیس مرتبہ پڑھتے پھر کھڑے ہو کر زیارت مرتضیٰ علیؑ پڑھتے من بعد دو رکعت نماز زیارت کی پڑھتے ۔مخصوص دعاؤں کے نقش زعفران ۔عرق کیوڑہ میں جو محلول ، کی ہوئی ہوتی اس سے رکابیوں میں لکھ کر ہم لوگوں کو دھو کر پینے کے لئے دیتے ۔اس سے فارغ ہونے کے بعد ملازمین کا سلام لے کر انعامات تقسیم کرتے ۔نوروز کی چھٹی مٹھائیوں کا (یعنی دسترخوان پر جو نذر دی ہوئی رہتی وہ نہیں) حصہ بعض جگہ بھیجا جاتا ۔

دسترخوان کی نذر شدہ چیزیں دسترخوان ہی پر کھائی جاتیں ہم لوگ کھاتے اس کے بعد

نذر علی خواجہ سرا اور منشی تصدق علی اور دو تین بوائیں جو نہائی ہوئی پاک صاف رہتیں وہ کھاتیں۔ چار بجے دو تین بی بیاں آئیں اور رنگ بھرے قمقمے یعنی وہی رنگ جو نوروز کا ہوتا ساتھ لاتیں۔ اور ہمارے ہاں بھی وہی رنگ تیار ہوتا اور آپس میں ایک دوسرے پر رنگ ڈالتیں میراثنیں نوروز گا کر انعام لے کر رخصت ہوتیں۔ عموماً تیسرے پہر کو جدن کا طائفہ آتا نوروز بہت گاتے ہوئے میں نے سُنتے مجھے دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔

لو آیا ہے نوروز دن ہے شہانہ ؎ رنگ میں ڈوبا ہے سارا زمانہ
مئے عشق حیدر جو پی لی ہے سب نے ؎ تو گاتے ہیں جن و ملک شادیانہ

عید غدیر میں بھی خوشیاں کی جاتی تھیں زنانہ مردانہ میں عورتوں اور مردوں کی دعوتیں ہوتی تھیں رنگ پاشی اس دن بھی ہوتی تھی قصائد خوانی مردانہ میں ہوتی۔

مرزا حسن ایک ایرانی تھے وہ مردانہ میں صبح کے دس بجے آکر قصیدے پڑھتے تھے۔ چند لوگ مردانہ میں رہتے تھے زیادہ ایرانی حضرات ہوتے تھے اور پس پردہ زنانہ کی نشستیں رہتی تھیں دو گھنٹے یہ صحبت رہتی تھی اس کے بعد مردانہ میں دسترخوان بچھتا۔ جب مردانہ کے مہمان فارغ ہو چکتے تو زنانہ میں دسترخوان بچھتا۔ زنانہ میں رنگ بھی کھیلا جاتا۔ رنگ کھیلنا اظہار مسرت کی دلیل ہے۔ عطر و پان تقسیم ہوتا۔ عطر بہت سے گھر کے تیار کئے ہوئے ہوتے۔ میرے والدین کو خوشبوؤں کا بیحد شوق تھا۔ والد مرحوم کے پاس لکھنو کا ایک عطر فروش ہمیشہ آتا اور اس سے وہ عطریات بنواتے۔ جاڑوں کے لئے مصالحہ کے مشکی حنا مرغوب سکندری شمامۃ العنبر سہاگ عطر عروس وغیرہ۔ چاندی کی چھوٹی چھوٹی دو تین پتیلیاں تھیں اتنی چھوٹی جتنی کہ لڑکیوں کی ہنڈ کلہیا پکانے کی ہوتی ہیں ان میں مشک ڈالکر موتیا اور حنا وغیرہ کا عطر پکاتے اسی قسم کے عطر موسم بارش میں بھی استعمال میں آتے گرمیوں کے لئے پھولوں کے عطر مثلاً جوہی چنبیلی، موگرا، بیلا وغیرہ پھولوں کا عطر بنایا جاتا علاوہ اس کے خس کی روح نکالی جاتی۔ مٹوں خس آتی عطر روح خس جو اصغر علی وغیرہ کے ہاں بکتا ہے اس سے بالکل جداگانہ یہ روح خس ہوتی۔ ٹی کی طرح اور بہت پائیدار خوشبو ہوتی۔ عطر فتنہ بھی گھر ہی میں بنتا تھا۔ جس طرح موم روغن جاڑوں میں چہروں کی خشکی دفعہ کرنے کے لئے موم اور چنبیلی کے تیل سے بناتے ہیں۔ عطر فتنہ میں بھی موم اور جس قسم کا عطر چاہتے مخلوط کرتے اور یہ عطر ڈبیاؤں میں رکھا جاتا۔ عطر مجموعہ بھی طرح طرح کا گھر میں درست کیا جاتا۔ مسالحوں کا الگ اور پھولوں کا جدا اس میں

بڑی نفاست و قوت ممیزہ و مدرکہ درکار ہے کہ کن پھولوں کے عطروں کو بلحاظ مناسبت مخلوط کرنا چاہیئے تاکہ خوش آیندگی پیدا ہو اسی طرح مسالہ کے عطروں کا مجموعہ۔ جس طرح عطر کا شوق تھا۔ اسی طرح پھولوں کا بھی میرے والدین کو بہت شوق تھا والد مرحوم کے سرہانے جس پھول کا موسم ہوتا اس کا ایک گجرا رکھا جاتا اور ایک پھولوں کی مہنال ان کے حقہ کے لئے روزآنہ بنتی الولد سِرٌ لابیہ کا مقولہ بہت صحیح ہے مجھے بھی عطر اور پھول اور ہر قسم کی خوشبو کا بچپنے سے شوق ہے غرض مہمانوں کو زنانہ اور مردانہ میں پان کی گلوریاں ایک نقرئی بڑے خاصدان میں رکھ کر اور نقرئی عطردان میں عطر ایک چاندی کی کشتی میں رکھ کر تقسیم ہوتا ہمارے ہاں کے خاصدان کی وضع و ترکیب بھی عجیب طرح کی اور خوشنما تھی اس وضع کا خاصدان میں نے کہیں نہیں دیکھا اس کو کمرخی وضع کہتے تھے نہایت خوبصورت تھا۔ علیٰ ہذا عطردان بھی غیر معمولی وضع و ترکیب کا تھا آم کی شکل اور چاروں طرف چھوٹے چھوٹے چاندی کے پتے بنے ہوئے۔ ہمارے ہاں چاندی کے ظروف وغیرہ کٹک کے سناروں سے بنوائے جاتے تھے۔ جڑاؤ اور سونے کے زیور بھی انہیں سناروں سے بنوائے جاتے۔ کٹک کے سنار بہت کاریگر و ہوشیار ہوتے ہیں بوجہ کٹک قریب ہونے کے کلکتہ میں بہت سے وہاں کے سنار رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہمیشہ ایک ہی سنار سے کام لیا جاتا تھا بہت طباع اور لائق اعتبار بھی تھا۔ مسلمانوں کے چند مذہبی تقریبوں اور تہواروں کا مجملاً ذکر کر دیا

ہندوؤں کے مذہبی تہوار

اب میں ہندوں کے بعض مذہبی تہواروں کا ذکر کروں گا۔ اور خاص خاص موسموں میں صرف ہندو ہی نہیں بلکہ عیش و عشرت کے دلدادہ جوانی کی امنگوں سے بھرے امیر طبقہ کے مسلمان بھی لطف اندوز ہوتے۔ تہواروں میں ہندو دوستوں کے شریک ہوتے ان کا ذکر کرتا ہوں۔ گو میں اصل مقصد سے دور ہو رہا ہوں۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ اپنی حیات کے کچھ سوانح لکھوں گو وہ مہتم بالشان اور قابل تقلید و نمونہ نہیں ہیں۔ مگر اپنی پیاری بیوی کے اصرار پر اور بعض دوستوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر لکھ رہا ہوں۔ لیکن ہندوں اور مسلمانوں کے تہواروں اور موسمی حالات وغیرہ کا تذکرہ لکھنے سے میرے مقاصد میں ایک تو یہ دکھانا منظور ہے کہ پٹنہ عظیم آباد میں دولت و ثروت کسقدر تھی اور ہندو مسلمانوں میں آپس میں کسقدر میل جول اور چولی دامن کا ساتھ تھا علاوہ ازیں اس وقت کا تمدن کس قسم کا تھا اور میں نے کس فضا اور صحبتوں اور ماحول میں ہوش سنبھالے۔ ہندوؤں کا سال اور مہینے شمسی ہیں اس لئے ان کے مذہبی تہوار جس جس مہینے میں روز ازل سے ہوتے آئے ہیں۔ اس باقاعدگی

کے ساتھ ابد تک جاری رہیں گے اس میں رد و بدل ناممکن ہے ۔ اور مہینوں کا تعلق موسم سے ہے اسلئے ہولی پھالگن کے مہینے میں ہوتی ہے وہ ہمیشہ پھالگن ہی میں ہو گی ۔ دیوالی آخر موسم برسات یعنی آسن ۱۴ بدی کو ہوتی ہے وہ آسن ہی میں ہو گی ۔ آسن مہینے کو اشوین بھی کہتے ہیں ۔ تل سنکرات جاڑوں میں پوس کے مہینے میں ہوتی ہے وسط جنوری میں یہ تہوار آتا ہے ۔ پوس اور ماگھ یہ دو مہینے چلون کے جاڑے کے ہیں ۔ پوس کی تشبیہ پھوس یعنی گھاس سے دیجاتی ہے پوس کا دن پھوس یعنے فوراً گزر جاتا ہے جس طرح پھوس کو آگ پر رکھو اور فوراً جل جاتی ہے یعنی بہت چھوٹا دن ہوتا ہے ماگھ کے مہینے کو تشبیہ باگھ سے دیتے ہیں ۔ یعنی شیر سے ۔ اس مہینے میں شمالی ہند میں سردی بلائی ہوتی ہے مثل شیر کے کاٹے کھاتی ہے ۔ اسی مہینے میں ۵ رشدی کو بسنت پنچمی ہوتی ہے ۔ سری رام نومی موسم بہار میں ۹ رچیت شدی کو ہوتی ہے ۔ ہر مہینے کے دو حصے ہیں ۔ پہلی سے ۱۴ تک اُجالی پکھ ہے اسی کو شدی بھی کہتے ہیں یعنے چاند کا عروج اور اس کے بعد کے پندرہ دن اندھیری پکھ کے ہیں جس کو بدی کہتے ہیں ۔ چاند کا زوال ۔ ہندوستان میں سال کے بارہ مہینے میں تین موسم ہوتے ہیں ۔ گرمی ۔ برسات ۔ جاڑا ۔ ہر موسم میں چار مہینے اور ہر موسم کے اخیر دو مہینے موسم کی شدت دکھاتے ہیں مثلاً گرمی کے چار مہینے پھاگن چیت بیساکھ جیٹھ ۔ ان چار مہینوں میں جیٹھ اور بیساکھ میں ناقابل برداشت شدت کی گرمی ہوتی ہے کہ چیل انڈے دیتی ہے اور ہرن کالے ہوتے ہیں ۔ یہ بھی قدرت کا تماشہ ہے کہ اسقدر تکلیف کے بعد برسات کا موسم شروع ہوتا ہے جان میں جان آتی ہے برسات کے چار مہینے اساڑھ ساون جس کو شرادن بھی کہتے ہیں ۔ بھادون اور آسن جس کو اشوین بھی کہتے ہیں ۔ اس میں کے دو مہینے ساون بھادون کے برسات کی شدت کے لئے مشہور ہیں ۔ ساون کی جھڑی بھادون کی بھرن یعنی لگاتار پانی برستا رہتا ہے پھر جاڑے صاحب تشریف لاتے ہیں ۔ اس کے چار مہینے کارتک ۔ مارگیسر ۔ پوس ۔ ماگھ اخیر کے دو مہینے چلون کے جاڑے کے مشہور ہیں ۔ حتیٰ کہ ماگھ کو باگھ سے یعنی شیر سے تشبیہ دی گئی کہ کاٹ کھانے کو آتا ہے دانت سے دانت بجتے ہیں ۔ بغیر انگیٹھی یا آتش خانوں کے گذر محال ہے ۔ چلون کے جاڑہ کی غرض یہ ہے کہ چالیس دن بہت سختی کے ہوتے ہیں ۔ مگر ساتھ ہی اس کے شمالی ہند کے جاڑے نہایت صحت بخش ہوتے ہیں بھوک خوب لگتی ہے کھانا ہضم ہوتا ہے ۔ مثل مشہور ہے ۔ جاڑے آئے کھانے کے دن آئے ۔ کھانے بھی کھارے اور شیریں دونوں لذیذ و اقسام کے ہوتے ہیں ۔

نمکین کھانوں میں ۔ کلّے پائے ۔ نہاری ۔ شب دیغ ہیں ۔ کشمیری بری دیگر پکاتے ہیں یہ نہایت مزیدار اور مقوی کھانے ہیں ۔ میٹھی چیزوں میں ۔ پتیسے کے لڈو جس میں مختلف اقسام کی بتیس بوٹیاں ہوتی ہیں اور مزاج بہت گرم ہوتا ہے ۔ سردی کی اصلاح ہوتی ہے ۔ سٹھورا یعنی بادام پستہ اخروٹ خوبانی ۔ چلغوزہ ۔ آبجوش یعنی منقع وغیرہ کا حلوا ۔ تل کے لڈو تلکٹ وغیرہ آرد کا حلوا یہ حلوا تل اور تال مکھانوں سے بنایا جاتا ہے ۔ گھیکوار کا حلوا ہلدی کا حلوا جس میں ہلدی کی بو نہ رہے ۔ لہسن کی کھیر ان سب چیزوں کا مزاج گرم ہے ۔ وہاں کی سردی کے لئے گرم چیزوں کا استعمال بہت مفید ہوتا ہے۔ وہاں کے جاڑوں میں رطوبت نام کو نہیں خشک سردی ہوتی ہے ۔ اسی وجہ سے صحت آور ہے ۔ برسات میں بھی مختلف قسم کے مخصوص کھانے ہوتے ہیں ۔ اسی طرح گرمی کے موسم میں ہلکی اور ٹھنڈی خاص قسم کی غذائیں کھائی جاتی ہیں ۔ موسم وغیرہ کی کیفیت لکھنے سے میرا یہ مطلب ہے کہ صحت بخش موسموں کا اچھا اثر قوائے دماغی وجسمانی پر پڑتا ہے خون کی تولید خوب ہوتی ہے جس کی وجہ سے چستی چالاکی آتی ہے ۔ طبیعتوں میں جوش اور اُمنگیں ہوتی ہیں لوگ اس لئے ہر موسم کے مزے لوٹتے ہیں اور عیش و تفریح کے سامان فراہم و مہیا کرتے ہیں ۔ موسم گرما کا پہلا مہینہ پھالگن ہے ۱۳ سدی کو شب کو آگ جلتا ہے اور ۱۴ سدی کو دھولنڈی ہوتی ہے ۔ تہوار تو ایک دن ۱۴ سدی کو ہوتا ہے جس میں امرا جلسے ناچ رنگ کے کرتے ہیں اور مسلمان دوستوں کو بھی اس زمانہ میں (اب کا حال خدا جانے) ضرور مدعو کرتے تھے ۔ ہنادؤں میں راجہ سلطان بہادر کے ہاں اور مسلمانوں میں حجو نواب صاحب مرحوم کے ہاں ہولی کے جلسوں میں میں نے شرکت کی تھی اور سابق راجہ صاحب ٹکاری کی ہولی کی دعوت میں شرکت کی تھی ۔ ہندو مسلمان آپس میں قمقموں اور پچکاریوں میں رنگ بھر کر ایک دوسرے پر ڈالتے ۔ عبیر و گلال اُڑاتے مے نوشی کے بھی جلسے ہوتے ہندو عوام کبیر بازاروں میں گاتے جس میں فحش بہت ہوتا ۔ جو ہندو جینی وغیرہ مذہب والے ہیں ۔ چونکہ شراب نہیں پیتے ہیں ۔ اس لئے وہ ٹھنڈائی یعنی بھنگ کا شربت پیتے اور اپنے ہم رنگ مسلمانوں کو بھی پلاتے اگر کوئی انکار کرتا تو دھوکہ دے کر مٹھائی کھلانے کے بہانہ سے بھنگ ملی ہوئی بالائی کی برفی کھلا کر تماشہ دیکھتے ہیں ۔ اس برفی کا نام فلک سیر بھی ہے ۔ وہ اسلئے کہ بھنگ کے استعمال سے خواہ کسی شکل میں ہو چرس یا ٹھنڈائی یا فلک سیر میں نے سُنا ہے کہ اس کے اثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر کوئی لے گیا اور وہاں سے ٹپکا اور استعمال کرنے والا بہکی بہکی باتیں بھی کرتا ہے ۔ حکیم نواب مرزا شوق لکھنوی مرحوم کی چار مثنویاں لذت عشق ۔ بہار عشق ۔ زہر عشق

بہت مشہور ہیں آخرالذکر بہت پُر تاثیر و درد انگیز ہے۔ بہر حال بہار عشق کا یہ ایک شعر ہے

باتیں کرتا تو باد ہوائی ہے ٭ کیا فلک سیر تونے کھائی ہے

ہولی کے دن ہندو عام وخاص سب ہی ہولی کھیلتے اور بہت سے رنگیلے مسلمان بھی کھیلتے
ایک زمانہ سے چولی دامن کا ساتھ ہندوؤں سے اور آپس میں اخلاص بھی تھا تو جس طرح ہندو
مسلمانوں کے بعض تہواروں میں خصوصاً عشرہ محرم میں مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہیں مسلمان
بھی ہندوؤں کے ساتھ ہولی رچاتے۔ اپنے ہاں بھی جلسے کرتے اور ہندو دوستوں کے ہاں بھی
بھری پچکاریاں لے کر پہنچتے جس طرح مسلمانوں میں دستور چلا آتا ہے کہ خاص خاص چیزیں
خاص تہواروں کے لئے مخصوص ہیں۔ جیسے سیویاں عیدالفطر میں روٹی حلوا شب برات میں پکتا ہے
اسی طرح ہندوؤں میں بھی رواج ہے ہولی کی تقریب میں پوئے اور مال پوئے تلے جاتے ہیں مسلمان
دوستوں کے ہاں مال پوؤں کا حصہ بھیجا جاتا تھا۔ جن کو شوق موسیقی ہوتا۔ ہندو اور مسلمان امراء
خود بھی ہولیاں گاتے اور طائفے کسبنوں کے یا گویوں کے جو بلائے جاتے وہ بھی ہولیاں گاتے۔
ہولیاں عموماً شاہانہ اور کافی راگنیوں میں گائی جاتی ہیں۔ دوسری راگنیوں میں مثلاً بھیرویں
یا پیلو میں چند ہی ہولیاں بنی ہیں ایک کافی کی ہولی یہ ہے۔

ہولی آج جلے چاہے کال جلے ٭ مورے کنور کنہائی موسے آن ملے
کنور کنہائی بڑے ہرجائی ٭ عبیر گلال کو آگ لگے

ایک دوسری ہولی

من موہن بانسری والا دیا ٭ سدھ بدھ کچھ نہ رہی موری دیا
ایسی لگائی آگ برہ کی ٭ جا کو جل میں نہ کھائے مجھیا

ازیں قبیل ہزاروں ہولیاں ڈیڑھ تالی ہیں۔ اور چار تال کی چوتالہ ہوری کہلاتی ہے
جس کو دھمار کی ہوری کہتے ہیں بعوض طبلہ کے پکھاوج پر گاتے ہیں۔ تہوار تو ایک ہی دن کا
ہوتا ہے۔ مگر پہلی پھاگن سے اکتیسویں تک کسی قسم کا جلسہ ناچ رنگ اپنی تفریح طبع کے لئے یا
دوستوں کی دعوتوں کے لئے کوئی کرتا یا اسی مہینے میں کہیں شادی یا بسم اللہ یا اور کوئی تقریب
ہوتی جس میں ناچ گانا بھی ہوتا تو ہولیاں ضرور گائی جاتیں صرف یہی نہیں بلکہ مہینے بھر سڑکوں
پر عوام ہندو یا مسلمان ہولیاں گاتے جاتے۔ حضرات صوفی مشائخین کی خانقاہوں میں جو محفل
سماع کی ہوتی۔ اس میں بھی ہولی گائی جاتی جس کے لئے عارفانہ رنگ دے کر ہولیاں بنائی گئی ہیں

نمونتاً اس جگہ ایک لکھتا ہوں ۔

اول ہولی میں کھیلوں بسم اللہ کہ لا الہ الا اللہ ۔ نبی جی کی شیشی میں نور کا رنگ ہے
اپنی امت پہ چھڑکیں رسول اللہ ۔ اپنی تصنیف کردہ ہولیوں میں سے ایک ہولی میں اس جگہ
لکھتا ہوں ۔

(ہولی)

استائی ۔ بیدردی سے پریت لگائی ۔ بیکا جوگن بنائی
انترہ ۔ پی نہیں اے پھاگن ماسی کچھ نہیں دیت سوجھائی ۔ اُن بن جیرا اودیک بیاکل
ہمری سدھ بسرائی ۔ دھیرج دھر دنہیں جائی ۔ بیدردی سے الخ
انترہ ۲ مگ ہیر ہیر نینا تھکت ہیں ۔ نہیں آوت ہر جائی ۔ کا سوں کہوں
اپنی بتیا میں ہمری تو مت بورائی ۔ چلت نہیں کوواپائی ۔ بیدردی سے الخ
انترہ ۳ پریتم پریم لگا من لینا انت کہرت چترائی ۔ میں برہن مورکھ ناری
بیت لگا پچھتائی ۔ کو واُن سمجھائی ۔ بیدردی سے الخ
انترہ ۴ آس ان پی کے آت دن بیتے پی نہیں دیت دکھائی ۔ ہمایوں پیا
کرپا کرو مو پر بیگی دودرشن آئی ۔ نہیں تو دونگی دوہائی ۔ بیدردی سے الخ

واضح ہو کہ عربی شاعری میں مرد اپنے جذبات کا اظہار اپنی عورت معشوق کے فراق میں
یا وصالیہ مضامین میں کرتا ہے ۔ فارسی شاعری میں مرد کا معشوق کمسن لڑکا ہے جس کی تتبع
اردو شعرا نے کی ہے ۔ مگر سنسکرت یا برج کی بھاشا یا بہار کی پالی زبان میں عورت اپنے مرد
عاشق کے لئے عشقیہ جذبات کا اظہار کرتی ہے ۔ اسی لئے اسی ہولی میں عورت اپنے بچھڑے ہوئے
عاشق کے فراق میں واردات دلی ظاہر کر رہی ہے ۔ مختصر یہ کہ تندرستی وہ آب و ہوا کی وجہ سے
لوگوں کی طبیعتوں کا یہ رنگ رہتا کہ پھاگن کے پورے مہینہ میں ہولی گائی جاتی ۔ جوان اور چھوکرے
ہندو اور مسلمان دونوں کوچہ و بازار میں ہولیاں گاتے جاتے در و دیوار سے ہولی کی صدا آتی ۔
سڑکوں پر سانگ اقسام کے بنا کر پھرتے خصوصاً دھولنڈی کے دن سانگوں کی بڑی کثرت ہوتی تھی
کوئی شیر بنتا کوئی لنگور بنتا کوئی جنازہ کی نقل کرتا متعدد اقسام کے سانگ نکلتے ۔ جسے حیدرآباد میں
رنگ نکالنا کہتے ہیں اور کسی زمانہ میں محرم میں حیدرآباد میں رنگ نکلتے تھے ۔

پھاگن کے بعد کا مہینہ چیت ہے ۔ یہ مہینہ موسم بہار کا ہے ۔ گلابی جاڑے نہایت پیاری خنکی

رہتی اور طبیعتوں میں جولانی اور اُمنگیں بھر جاتیں۔ صوبہ بہار کو ایک خصوصیت حاصل ہے کہ ایک قسم کا گیت جس میں موسمی کیفیت اور فراقیہ مضامین باندھے جاتے ہیں صوبہ بہار میں تمام ماہ گاتے ہیں جس کو چیتی کہتے ہیں۔ یہ چیتی اودھ بنگالہ وغیرہ میں کہیں نہیں گائی جاتی ہے۔ ہولی تو اودھ و پنجاب گجرات، کاٹھیاوار وغیرہ ہر جگہ کے ہندو گاتے اور یہ تہوار کرتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ صوبہ بہار کے مسلمان بھی اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ ہولی مناتے ہیں۔ اودھ کے مسلمان بھی ہولیاں گاتے اور ہندو دوستوں کے ساتھ شریک حال ہوتے ہیں۔ مگر چیتی سوا بہار کے اور پٹنہ عظیم آباد میں بوجہ دارالامارت ہونے کے بہت زیادہ گائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ تمام مہینہ میں ہزاروں بندگان خدا ہندو اور مسلمان راتوں کو سوتے نہ تھے اور کوچہ و بازار میں جگہ جگہ پر چیت کا ناچ اور گانا سننے کو پھرتے رہتے۔ میرے بچپنے میں اور عنفوان شباب تک یہ دستور تھا کہ ایک محلہ کے چند دوکاندار چندہ کر کے ایک گانے والے چھوکرے کو جس کا باقاعدہ طائفہ ہوتا یعنی جس کے ساتھ دو سارنگئے ایک طبلہ ایک جوڑی والا یعنی منجیرا بجانے والا ہوتا مقرر کیا جاتا۔ مثلاً آس پاس کے آٹھ نو دوکاندار چندہ دینے میں شریک ہوتے جس کی دوکان بڑی ہوتی وہاں ایک منڈوا ڈالتے اور فرش کر دیتے شب کے گیارہ بجے سے صبح کے سات بجے تک ذرا وقفہ دے دے کر ناچ اور گانا ہوتا علاوہ اس چندہ کے جو آٹھ نو آدمیوں نے دینا منظور کیا ہے۔ راستہ چلنے والے بھی تھوڑی دیر کھڑے رہ کر یا بیٹھ کر ناچ دیکھتے اور گانا سنتے اور روپئے دیئے جاتے جس کو چھوٹ کہتے تھے بعض بیوقوف اس میں ضدم ضدی سے روپئے دینا شروع کرتے۔ خصوصاً اتفاق سے اگر ایسے دو شخص ایک جگہ آ گئے جن کو آپس میں چشمکیں ہوتیں تو ناچنے والے کے بھاگ جاگ جاتے۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹتا۔ زید نے ایک روپیہ دیا تو تھوڑی دیر کے بعد بکر نے دو دے۔ پھر زید نے تین دئے۔ جب ساتھ والی پونجی کسی کی ختم ہو جاتی تو وہ اُٹھ جاتا۔ ہر ہر محلہ میں گلی کوچوں میں سڑکوں میں چیت کے ناچ کے لئے منڈوے لگے ہوتے تھے اور اوس کو ہانڈی فانوس وغیرہ سے اور پھولوں کے گملوں سے آراستہ بھی کرتے تھے۔ خوب روشنی کا سامان کیا جاتا یہ سب باہمی چندہ سے ہوتا۔ سیکڑوں چھوکروں کو سال بھر تعلیم دی جاتی جن کو ناچنا گانا سکھایا جاتا۔[1] یہ چھوکرے کسبنوں کی سی پیشواز پہن کر۔ پاؤں میں گھونگرو باندھ کر ناچتے اور گاتے۔ یہ چیت کے لونڈے کہلاتے۔ نمونتاً چند چیت کے گیت لکھتا ہوں۔

---

[1] کسی زمانہ میں دہلی میں بھی بازاروں میں صورت دار چھوکرے ناچتے گاتے تھے۔ ان چھوکروں کو وہاں امرد کہتے مگر یہ ناچ گانا چیت کے مہینہ میں نہیں ہوتا یوں سال بھر ہوتا۔

۱۳۳۱ 1331

چیت ماس پیا نہیں آئے ہو راما ؎ کون دیس ڈھونڈ ہون
گمین بگمین امواں مجرائے ؎ پھر بھی کویلیا سبد سنائے ہو راما ۔ کون دیس ڈھونڈ ہون ۔
جاہی جوہی پھولی پھولوریا چمپا کا چھی بھونرا لبھائے ہو راما ۔ کون دیس ڈھونڈ ہوں ۔
اُتباتی رت میں پی نہیں بھورے ؎ رہے رہے جوبنا ستائے ہو راما ۔ کون دیس ڈھونڈ ہوں
چن چن کلیاں سیجیا دسیون ہمایون بن کچھو نہ سہائے ہو راما ۔ کون دیس ڈھونڈ ہوں ۔

دیگر

بن سیاں جوبنا ستائے ہو راما چیت پاپی آئے
امواں کی ڈاری پپیہیا بھائے پی پی کہت جی جرائے ہو راما ۔ چیت پاپی آئے
کھکی میں ٹھاری باٹ تکت ہوں مورے پیا جھون نہ آئے ہو راما ۔ چیت پاپی آئے ۔
راہی بٹوی کہے جاکے کوئی ہمایون پیا کاہے بسرائے ہو راما ۔ چیت پاپی آئے ۔

پہلی چیتی خالص برج کی بھاشا میں نہیں ہے بلکہ ایک زمانہ میں جو زبان بہار میں بولی جاتی تھی جس کو پالی کہتے اس میں ہے ۔ چونکہ چیتی خاص صوبہ بہار کی ایجاد ہے اسلئے میں نے اسی زبان میں تصنیف کی ۔ مثلاً اس میں یہ الفاظ پھولی یعنی پھولی ۔ سیجیا دسیلون ۔ یعنے پلنگ سجایا ۔ اتباتی رت یعنی اُمنگ بھرا زمانہ وغیرہ ۔ دوسری چیتی برج کی بھاشا میں ہے ۔ تال کہروا اور راگنی نارہ ہے ۔ ایک چیتی میں سیکڑوں سال قبل کی لکھتا ہوں جبکہ اردو پیدا نہیں ہوئی تھی ۔

استائی ۔ دیکھو ناپیون ہو راما کہ نینا بھر کے
انترہ ۔ سنجھا کے سوتل پیو ۔ اُگ گیلے کرنیا ہو راما ۔

اس میں برج بھاشا کا ایک لفظ نہیں ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے نینا بھر کے یعنی دل بھر کے اپنے معشوق (مرد سے مراد ہے) کو نہیں دیکھا ۔ سنجھا کے سوتل پیو یعنے سرِ شام وہ سو گیا ۔ اُگ گیلے کرنیا ہو راما یعنی اتنے میں سورج نکل آیا اور وہ چلا گیا ۔

ایک اور چیتی اس زمانہ کی لکھتا ہوں ۔ جبکہ کچھ کچھ اثر اردو کا ہو چلا تھا ۔
چلو سکھیاں ملیا کی بگیا ہو راما ۔ بیلا پھول پھول لئی چمپا پھول پھول لئی ۔ پھولندا گلبوا ہو راما ۔
اس میں ایک لفظ بگیا کا آیا ہے ۔ یعنی باغ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا کچھ اثر ہو چکا تھا ۔ پٹنہ میں یہ دستور تھا کہ بہت سے ہندو جوق جوق ہولی جلانے کے بعد چیتی گاتے ہوئے واپس ہوتے تھے ۔ جس طرح ہولی میں امرا ناچ رنگ جلسے کرتے تھے چیت کے مہینہ میں یہ طریقہ نہ تھا ۔ البتہ

عوام سڑکوں پر ناچوں میں شب بھر شریک ہوتے۔ اور بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں شاما ڈھاکہ کی مینا کوکلا وہیل وغیرہ بولنے والی چڑیوں کے پنجرے ہوتے۔ ان چڑیوں میں شاما ن اور وہیل بہت بولتی ہے میرا من طوطا بھی بہت بولتا ہے۔ ایک گیت چڑیوں کی بولی کے متعلق یہ ہے۔

طوطی بو بورے میری بولی سُنئے مہاراج۔ طوطی بولے شاما بھی بولے۔ بولے وہیل ساری رات۔

ان چڑیوں کے پالنے والوں کا یہ خیال ہوتا کہ گانا سنکر یہ چڑیاں خوب بولیں گی۔

آخر الدکر دونوں بہ جیتی جیت کے دہن میں ہے جو خاص دہن ہے۔ گرمیوں کا خیر مہینہ جیٹھ ختم ہونے کے بعد باراں رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ برسات کا چوماسہ شروع ہوتا ہے۔ ان دنوں ملک بھر میں بارش ہوتی ہے۔ اساڑھ سے آسن تک بارش کا موسم ہوتا ہے انتہائی گرمی کے بعد بارش جو لطف وکیف و سرور پیدا کرتی ہے۔ اس کا اظہار اور بیان مختلف طریقوں سے ہوتا ہے خصوصاً ساون کا مہینہ اس چوماسہ کے شباب کا ہوتا ہے۔ فلک کے مزاج میں اعتدال آجاتا ہے۔ زمین اپنے رنگین خزانے اُگل دیتی ہے۔ کوئل۔ پپیہے۔ مور کی ولدوز و دلکش صداؤں سے فضا معمور ہو جاتی ہے۔ بقول امانت۔ کوئلیں کوکو کریں اور پپیہے کریں شور بہ مور چلائیں کرت آئی ہے کیا ساون کی بہ شمالی ہند کے دیہاتوں میں ہندو مرد چوپالوں میں اور عورتیں گھروں میں جشن مناتی ہیں۔ کڑاہیاں چڑھتی ہیں۔ پکوانیں قسم قسم کی ہوتی ہیں۔ جھولے ڈالے جاتے ہیں۔ جھولا ہندو اور مسلمان گھروں میں عام طور پر ایک موہنی چیز ہے۔ پکوان اس لئے ہوتا ہے کہ کچھ تو ٹھنڈ کا مقابلہ آگ سے کیا جائے۔ اور کچھ اسلئے کہ ساون میں بھوک بڑھ جاتی ہے جھولا بچوں اور جوان عورتوں کا دلکش مشغلہ ہے۔ لیکن دنیا میں خوشی اور غم توام ہیں جب نوجوان بیوائیں اور مہجور دُلہنیں جھولے کو دیکھتی ہیں تو یہی جھولا جو لطف و نشاط کا گہوارہ ہے آگ پر کی پتی سیخ بن جاتا ہے۔ پھر جھولے کے بعض درد مند گیتوں سے جو اثر پیدا ہوتا ہے اوس کا بیان ممکن نہیں۔ عشق و محبت کے کامیاب اور ناکام پہلوؤں کو دیکھنا ہو تو جھولے کے گیت سُنئے اور ان گیتوں میں ایسی ایسی چیزیں بیان کی جاتی ہیں جو حقیقتاً آرٹ کی جان ہیں اور اردو شاعروں کو جن کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ بیاہی عورتیں ہمیشہ یہ چاہتی ہیں کہ ساون کے پُرکیف مہینہ میں اور برسات کی اندھیری بھیانک راتوں میں جب کہ بجلی کوندتی بادل گرجتے ہیں اون کا عاشق اُن کے پاس رہے اور اگر پردیس میں رہے تو جلد آجائے۔ عاشق بھی یہی چاہتا ہے کہ برسات میں معشوق پاس رہے۔ چنانچہ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے ؛ الٰہی یہ گھٹا وو دن تو برسے

نئی بیاہی دلہنیں جو بہت کمسن ہیں اور میکے والوں سے پہلی دفعہ بچھڑی ہیں اور پہلا ساون ان کو سسرال میں ہونے والا ہے وہ ابھی سسرے والوں سے مانوس نہیں ہوتیں اور میکا یاد آتا ہے ماں بہنوں کی چاہت بڑے بھائی کی محبت بھاوجوں کے ساتھ جھولا جھولنا یاد آتا ہے تو بے چین ہو جاتی ہیں۔ جھولا تو سسرال میں بھی نند دن نے ڈالا ہے مگر بوجہ کمسنی کے ماں کا گھر بہت یاد آتا ہے وہ جھولے پر یہ گیت گاتی ہیں۔ جو اساڑھ یعنی شروع برسات میں ڈالا گیا ہے۔ وہ چاہتی ہے ساون میکے میں ہو۔

نیم کی نبولی ٹپکی ساون کب کو آویگا ؛ جے میری ماں کا جایا گاڑی بھیج بلاویگا
گاڑی کے پہیئے چرکے بیلوں کی تالیاں ؛ بھاوین کے چیرے میکے بھاوجوں کی چوڑیاں
کاکڑی خربزے پکے ہم کو کون کھلائیگا ؛ جیے میری ماں کا جایا گاڑی بھیج بلاویگا

اس کا مطلب یہ ہے کہ نیب یا نیم کے درخت کی نمولیاں ٹپک رہی ہیں جو ساون کی آمد کی خبر دیتی ہیں تسکین دل کے لئے کہتی ہے کہ میرا بھائی جئے وہ گاڑی بھیج کر بلائے گا۔ اور چشم تصور میں دیکھتی ہے کہ کوئی بھیلی گاڑی آرہی ہے پہیئے چرکتے آرہے ہیں۔ اور بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ بھائیوں کی پگڑیاں اور بھاوجوں کی چوڑیاں چمک رہی ہیں اور وہ مجھے لینے آرہے ہیں۔ پھر کہتی ہے ککڑیاں اور خربزے پکے ماں کی طرح کون محبت سے کھلائے گا۔ سسرال میں نئے لوگ ہیں شرم سے ان کے سامنے نہیں کھا سکے گی۔ عموماً جھولے آموں کی ڈالیوں میں ڈالے جاتے ہیں۔ زنانہ مکانوں میں یا اور مقاموں میں جہاں آم کے درخت نہیں ہیں۔ دو کھمبے گاڑے جاتے ہیں جھولا ڈالا جاتا ہے۔ ایک عورت امرائی میں کھڑی سوچ رہی ہے کہ کس جگہ جھولے کے لئے رستے ڈالے اور یہ گا رہی ہے شام قریب ہے

جھولا کینے ڈالوں رے امرئیاں ؛ ساون اندھیری تال تلیاں
مرلا جھنگارے باور کارے ؛ بوندپرت پھیاں پھیاں

ایک سہاگن کا شوہر کسی ضرورت سے پردیس جانے والا ہے تو اس سے منت کہہ رہی ہے

نجاسیاں نہ جا تو ایسی بدری میں
جھولا لگا دے کھمبوا گڑا دے ؛ مہدی لگا دے چوڑیاں پنہا دے۔ نجاسیاں نہ جا

ایک سہاگن اپنے خاوند سے جو پردیس جانے والا ہے۔ کہہ رہی ہے۔

برست منہ کو گھر سے نہ نکسے تمہیں انوکھے بدیس جویا ؛ پاؤں دھرن کو جائے نہیں ہے ؛

جل سے تو بھر گئے تال تلیاں ۔ آخر الذکر شہانہ راگنی میں ہے ۔ اول الذکر تین چیزیں ساون کی دھن میں ہیں ۔ ایک اور ساون لکھتا ہوں ۔

ابکی ساون میں سیاں گھر ہی رہو ۔ گھر ہی رہو نند کے بیر
سانپ نے چھوڑا اپنا چولا ۔ ندیا نے چھوڑا ہے کنار
سیاں نے چھوڑا بالا جوبنا ۔ یہہ دکھ سہو نہ جائے

چھ راگ اور چھتیس راگنیوں سے علٰحدہ بعض وہ دھنیں مقرر کی گئی ہیں جس طرح جیتی کی خاص دھن ہے ۔ یوں تو منجملہ چھتیس راگنیوں کے کسی میں جیتی گا سکتے ہیں جس طرح میں نے اپنی تصنیف شدہ دو جیتی غارہ راگنی میں باندھی ہیں ۔ جس طرح جیتی ایک خاص دھن ہے اسی طرح ساون کی دھن ہے کجری کی دھن ہے ۔ یوں تو ساون بھی چھتیس راگنیوں سے بعض راگنیوں میں ہیں ۔ ساون کی ٹھمریاں شہانہ اور کافی اور ملاریں بندھی ہوئی ہیں ۔ مگر زیادہ لطف مخصوص دھنوں میں آتا ہے ۔ میاں کی ملاریں ساون کے مضامین زیادہ ہوتے ہیں ۔ مندرجہ ذیل ٹھمری ساون کے مضمون کی ہے ۔ مگر کہاچ میں ہے تین تالہ ہے ۔

کارے بدرا کہی چھائے گھنگھور ۔ برس لاگے گرج گھر چو آور
ہمایوں پیا بن سونی مدریں ۔ کلیجے تڑپے جیسرا مور

مندرجہ ذیل ٹھمری بھی کہاچ میں ہے اور تتالہ ہے ۔

استائی ۔ پیارے پیارے ساون آئے ۔ چوکا اور بادر چھائے
انترہ ۔ نس اندھیاری دامن دمکے بہوت جہتیاں مورلہ
ہمایوں پیا نہیں آئے کن سوتن بلمائے ۔ پیارے پیارے ساون آئے

ایک اور ساون لکھتا ہوں ۔ یہ ٹھمری میں ہے تال قوالی ہے ۔ راگنی ملار ۔ ایک مہجور عورت کی زبانی

آ گئی ساون کی رت بادل جو کالے چھائے ہیں ۔ جھولے ہے کوئی سکھی کوئی ملار گائے ہیں
اپنے اپنے پی کے سنگ گاتی بجاتی ہیں سکھی ۔ میں اکیلی ہوں پڑی اور جی مرا گھبرائے ہیں
یہ سماں برسات کا اور پی نہیں ہمرے دوار ۔ پی کہاں کیسے پپیہا من مرا تڑپائے ہیں
دھیان میں تیرے ہمایوں مت میرا بورا گیا ۔ ہوک چھاتی میں اٹھے ہے تو نہ بسرا جائے ہیں

ہر برسات ہی میں کنہیا جی جنم لیتے ہیں جو ہندوؤں کے نزدیک سترہ او تا خدا کے اور اہم دس اوتار ہیں ۔ منجملہ جن کے کنہیا جی ہیں جن کو کرشن بھی کہتے ہیں ۔ انہوں نے گوالن کے گھر میں ابتدا میں

لہ مرحوم بہت اچھا گاتے تھے آواز بہت شیریں تھی ۔ بھاشہ زبان کی ٹھمریوں میں ہمایوں تخلص کیا کرتے تھے ۔ موسیقی پر کتاب لکھی ہے ۔ جسکا نام گلشن ترنم ہے ۔

جنم لیا اور سولہ سو گوپیاں (عورتیں) رکھتے تھے۔ رام اوتار بہت بڑا اوتار ہے جنکو رام چندر کہتے ہیں۔ (یہ راجہ دسرتھ کے فرزند تھے) جو اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ باپ کے حکم سے بن باسی ہوئے تھے اور دکن کے جنگلوں میں مارے پھرتے تھے کہ اونکی بیوی سیتا کو راون لنکا کا راجہ بھگا کر لے گیا تھا ہنومان لنگوروں کا راجہ اپنی لنگوروں کی فوج لیکر گیا راون کو مارا لنکا میں آگ لگائی اس واقعہ کی یادگار دسہرہ میں رام لیلا ہوتی ہے۔ منجملہ اور اوتار کے کچھ اوتار یعنی کچھوے کے پیٹ میں خدا پیدا ہوئے۔ پھر مچھ اوتار ہے یعنی مچھلی کے پیٹ میں اللہ میاں نے جنم لیا۔ ایک بیسوا اوتار ہے (نعوذ باللہ) یعنی کسبن کے پیٹ سے خدا پیدا ہوا۔ پھر بھوس اوتار یعنے گھاس سے خدا پیدا ہوا۔ کندھیا جی کے جنم میں ایک پتلا جھولے پر ڈالا جاتا ہے اور شوالوں میں بہت دنوں تک خوب گانا بجانا اور بڑی دھوم دھام ہوتی ہے۔

بہت سے جھولن بنائے گئے ہیں۔ کندھیا جی کے پتلے کو پالنے یعنی جھولے میں جو بہت پُرتکلف ہوتا ہے، ڈالکر گاتے بجاتے ہیں۔ گھروں میں بھی جھولن گاتے ہیں۔ ایک جھولن لکھتا ہوں۔

گڑھ ہی لادے پالنا بڑھیا ہو۔ اگر چندن کا پالنا اور ریشم کی ہے ڈور ہو جھولیں گے مورے کرشن کندھیا ایک چیز خاص دہن میں گائی جاتی ہے۔ جسکو کجری کہتے ہیں اسکا رواج بنارس مرزاپور اور پٹنہ عظیم آباد میں بہت ہے مرزاپور میں ہندو عورتوں کا جھرمٹ پیتل تھالیوں میں سیندور وغیرہ رکھا ہوا دیا جلتا ہوا گھروں پہ یہ تھالیاں لئے ہوئے گاتا ہوا نکلتا ہے بہت ہی خوش الحالی سے یہ عورتیں گاتی ہیں۔ مضامین عشقیہ اور طبیعتوں میں ہیجان پیدا کرنے والے ہوتے ہیں نمونتاً دو کجریاں لکھتا ہوں۔

استائی۔ منا مان کہنوا دیدے جوبنا کا دان

انترہ۔ جب رہلی میں بھولی رے بھالی اب بھیلی جوان۔

جب رہلی میں کنولا نارنگی اب بھیلی انار۔

کتنے عاشق سیٹی بجاویں کتنے ماریں تان۔

مندرجہ ذیل کجری ایک مہجور عورت کی زبانی ہے۔

استائی۔ ساون کے مہنوا سیاں نہیں آئے رام ہو بادر گرجے بجری چمکے بہوسے چھتیاں رے ہری

انترہ۔ آپ نہ آئے پیا پتیاں نہ پٹھارے رام ہو بتیا جوہت بیتی رتیار سے ہری

رسیا ہماروں پیا کہوان بلمائے رام ہو بسرت ناوا کی صورتیار سے ہری

مندرجہ بالا اقسام کی چیزیں رنگیلے لوگوں کی محفلوں میں گائی جاتی ہیں جھولوں کی دعوتوں میں سیکڑوں کجریاں اور ساون ملار گلی کوچوں میں لوگ گاتے جاتے تھے جس طرح

چیت اور پھاگن کے مہینوں میں بسنتی اور ہولی کی صدائیں در و دیوار سے آتی اور ساری فضا اُن میں ڈوبی رہتی تھی اوسی طرح ساون اور بھادون کے مہینوں میں ساون اور ملار سے فضا گونجتی تھی۔ مسلمانوں کے شریف اور امیر گھرانوں میں بھی برسات میں مہندی لگانا جھولا جھولنا تلن کی چیزیں پکانی خاص مشغلہ تھا۔ امرا ہندو اور مسلمان جھولوں کی دعوتیں باغوں میں دیتے تھے۔ عظیم آباد کے دیوان محلہ میں بہت سے ہندو رئیسوں کے مکانات تھے۔ ایک قدیم خاندان راجہ جے کشن کا تھا اون کے چھوٹے بھائی راجہ ہری کشن تھے۔ جنہوں نے لاکھوں کی تیاری سے عجیب پُرلطف قابل دید باغ بنایا تھا۔ وہ دونوں بھائی راجہ جے منگل پرشاد کے پوتے تھے۔ اور راجہ جے منگل پرشاد سے اور میرے والد کے نانا کے حقیقی چھوٹے بھائی نواب میر ذوالفقار علیخان مرحوم سے پگڑی بدلنے کی رسم ہوئی تھی۔ یعنی ایک نے دوسرے سے پگڑی بدلی تھی اور دونوں بھائی بن گئے تھے۔[له] پھر باہمی اتحاد کا کیا پوچھنا ان کے والدین ایک دوسرے کو چچا جان پکارتی تھیں میرے والد تک قدیم رسم و راہ میں کمی نہیں ہوی تھی راجہ صاحب کی اولادیں باقی ہیں تو اگلی سی دولت و شان نہیں رہی ہے۔ بہر حال راجہ جے کشن آنجہانی جو بڑے مخیر اور اولوالعزم تھے۔ ان کے ہاں سے ہر تہوار میں ہمارے ہاں حصے آتے اور ہمارے ہاں سے جاتے میں کمسنی میں یورپ چلا گیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد کچھ دن کلکتہ میں گذرے پھر قسمت یا بدقسمتی حیدرآباد لے آئی۔ عزیزوں سے میل جول و اتحاد نہ رہا دوستوں سے کہاں تک رہتا بہر حال راجہ جے کشن بھادون کے مہینہ میں بہت دفعہ دعوتیں جھولوں کی اپنے باغ میں کرتے ہندو اور مسلمان ہم عمر و ہم مذاق دوستوں کی دعوتیں کرتے چار بجے سے لوگ آنا شروع ہوتے ایک جانب باغ میں کشادہ جگہ دیکھ کر دو کھمبے بہت بلند گاڑے جاتے اور کھمبوں میں سبز و سُرخ اطلس لپٹی جاتی اور سُرخ و سبز اطلس کے جوڑوں پر جوڑا پٹھا سنہرا یا زرد پھیلا لپٹا جاتا۔ دونوں کھمبوں کے اوپر جو موٹی لکڑی رہتی جس پر جھولا لٹکایا جاتا اس لکڑی پر بھی اسی طرح اطلس اور پٹھا لپٹا جاتا جھولے کی شکل تقریباً ویسی ہوتی جیسی ہاتھی کے ہودوں کی ہوتی ہے۔ اس کی شکل مستطیل ہوتی چار آدمیوں کی نشستیں اندر ہوتیں آمنے سامنے دو دو اشخاص پاؤں لٹکا کر بیٹھتے سُرخ و سبز مخمل کی گدیاں نشست کی جگہ اور پشت پر ہوتی۔ لکڑی جھولے کی رنگی ہوئی ہوتی۔ کٹھروں کے باہر پٹیاں پر کھڑے ہونے والوں کے لئے تھوڑا تھوڑا تختہ دونوں جانب نکلا رہتا۔ چاروں طرف ریشمی کپڑے کی سُرخ و سبز جھالریں ہوتیں۔ اور بڑے بڑے گھنگرو جھالروں کے اندر لگائے جاتے جو دکھائی نہیں دیتے مگر پینگ چلنے کے وقت

له دیکھو پہلے زمانہ میں ہندو مسلمانوں میں کیا اتفاق تھا۔ حضرا ہمایون مرزا

چھناچھن بولتے۔ جہاں یہ کھمبے نصب کئے جاتے اس زمین پر بہت دور تک بچالی گھاس بچھائی جاتی (حیدرآباد میں جسے پرال کہتے ہیں) اور اس پر شطرنجی کا فرش اسلئے کہ کوئی گرے تو چوٹ نہ آئے۔ چاروں طرف کرسیاں بچھائی جاتیں ایک جانب حسین کسبنوں کی مع سازندوں کے زمین میں نشست رہتی دوست احباب ان کسبنوں کو لے کر جھولا جھولتے۔ سازندے ساز بجاتے اور کسبنیں جھولن اور ساون جھولے پر گاتیں۔ جوہی کے پھولوں کے گجرے کیونکہ یہ فصل جوہی کی ہوتی تقسیم کئے جاتے۔ گلوریوں اور حقوں کا دور ہوتا اور علحدہ کمرے میں میز پر اقسام کی شرابیں سوڈا اور برف وغیرہ کا انتظام رہتا۔ راجہ صاحب کے یورپین احباب اور بعض ہندو و شاذ مسلمان چپکے سے جا کر پی آتے یہ وہ زمانہ تھا۔ مے نوشی عام طور سے معیوب تصور ہوتی تھی۔ پینے والے چھپ چھپا کر پیتے تھے شام تک یہ صحبت رہتی پھر کمروں میں لوگ آجاتے۔ اندر اور باہر خوب روشنی ہوتی تھی سارا گھر روشنی سے بقعۂ نور بن جاتا۔ ایک کمرہ میں مسلمانوں کے لئے دسترخوان بچھتا جس پر اقسام کے عمدہ اور لذیز کھانے نمکین اور شیریں چن دیے جاتے۔ راجہ صاحب کے ہاں مسلمان خاصہ پز اور ایک رکابدار ہمیشہ ملازم رہتا کیونکہ اکثر مسلمانوں کی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ چند خدمتگار زرق برق وردیاں پہنے جن کی اچکنوں کے کف اور کالر اور چھاتی پر سنہرے کلابتوں کا کام کیا ہوتا اور پگڑیوں میں راجہ صاحب کا نقروی مونو گرام لگا ہوا کھانا کھلانے کے لئے حاضر رہتے۔ ایک کمرہ میں لمبا میز کھانے کا رہتا جس پر انگریز اور بعض مغرب زدہ مسلمان بیرسٹر اور ڈپوٹی مجسٹریٹ وغیرہ اور بعض ہندو بنگالی اعلیٰ عہدہ دار بھی شریک ہوجاتے۔ انگریزی سب کھانے۔ سنڈری سوپ۔ فیش۔ انٹری یعنی سائڈ ڈشین کی قسم کی پھر جائنٹ اور اس کے بعد دو تین طرح کی پڈنگ فروٹ کمپوزٹ۔ بلو مانش۔ اس کے بعد ڈزرٹ یعنی میوے اقسام کے ہوتے پھر کافی پلائی جاتی۔ میز کے چاروں طرف ٹیبل بائز قوم کے گوانیز ڈنر جیکیٹوں میں رہتے۔ یہ لوگ کسی ہوٹل یا مس ہوز وغیرہ سے بلائے جاتے جن کو انعام دیا جاتا۔ ان سب پر ہدایت کرنے والا راجہ صاحب کا میز خانہ کا خانساماں ہوتا جو ہیڈ بٹلر کے فرائض ادا کرتا۔ ایک علحدہ کمرہ میں جس پر فرش نہیں ہوتا لپی پوتی زمین پر ہندوؤں کے لئے انتظام ہوتا۔ دو قطاریں ہوتیں ایک گوشت خواروں کی اور دوسری جو ندہبًا گوشت چھوتے نہیں۔ ہر ایک کے آگے پیتل کی چار چار تھالیاں ہوتیں پیتل کی دھات ہندوؤں کے نزدیک بہت پتر یعنی پاک ہے۔ ایک تھالی میں اقسام کی کچوریاں اور پوریاں پچیاں ہوتیں۔ ایک میں کئی قسم کی چٹنی کئی قسم کے تیل اور سرکہ وغیرہ کے اچار اور ایک تھالی میں

ترکاریاں بغیر گوشت کی چھوٹی چھوٹی پیتل کی کٹوریوں میں ہوتیں مختلف ساگ حیدرآبادی اصطلاح میں بھاجی اور مختلف ترکاریاں آلو مٹر کی پھلیاں اور موسمی ترکاریاں۔ کئی قسم کی بریاں تلی ہوئی اور مصالحہ کے ساتھ پکی ہوئی منگوچھیاں (مونگ سے بنائی جاتی ہیں) آلوریاں کل سے بنائی جاتی ہیں کئی طرح کے پاپڑ مونگ کی دال اور اُڑد یعنی ماش کی دال کے۔ چوتھی تھالی میں طرح طرح کی ہندوانی مٹھائیاں مثلاً مونگ کے لڈو گلاب جامن۔ کھاجا۔ گھیور کئی طرح کے پیڑے کئی طرح کی برفیاں کھوئے کی چنے کی بالائی کی خربزہ کے بیجوں کی بادام پستہ کی لوزین پتے کی پیپڑی وغیرہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بڑے ہال میں مہمان آجاتے انگریز تو رخصت ہوکر چلے جاتے۔ بعض رہ بھی جاتے اور ہندو مسلمانوں کے ساتھ جوتے نکال کر فرش پر بیٹھ جاتے۔ تین طرف قالین بچھائے جاتے اور لمبے لمبے گاؤتکیے رکھے جاتے سامنے گویّے اور گسبنیں گاتیں اس زمانہ میں مشہور گویّوں میں پٹنہ میں بڑے دُنی چھوٹے دنی دو حقیقی بھائی تھے۔ بنو خان عنایت خان وغیرہ تھے۔ ان میں سے کوئی ایک ہوتا پھر رباب اور سرودے اصرار اور دلبر با نواز اور جلترنگ بجانے والے تھوڑی تھوڑی دیر یہ سب بھی اپنے کرتب اور کمال دکھاتے۔ بارہ بجے کبھی ایک بجے محفل برخاست ہوتی ہزاروں روپے ایک ایک جلسہ میں صرف ہوتے۔ مسلمانوں کے دسترخوان پر بھی ہندو والے کھانے بھیجے جاتے۔ میں کئی دفعہ اپنے پھوپھی زاد بھائی ڈپٹی سید ہادی علیخان مرحوم (جو میرے والد کے فرزند آغوش بھی تھے) کے ساتھ ان جلسوں میں شریک ہوا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد بھی میرے نام دعوتی رقعے تمام والد کے ملنے جلنے والوں کے ہاں سے ہر تقریب میں آتے رہتے اور میری نانی صاحبہ مرحومہ مجھکو ضرور یا کسی بزرگ عزیز کے ہمراہ ورنہ منشی سید خورشید حسین صاحب مرحوم کے ساتھ بھیج دیتیں۔ (یہ منشی صاحب بزمانہ اقامت عظیم آباد ملازم رکھے گئے تھے اور میں نے اُن سے پڑھا بھی تھا) نانی صاحبہ اس لئے دعوتوں میں بھیج دیتیں کہ رسم و راہ خاندانی جاری رہے بلکہ نسلاً بعد نسلاً بھی جاری رہے۔ اگلے لوگ اس امر پر فخر کرتے اور کہتے تھے کہ مجھ سے فلاں صاحب سے چار پشتوں یا پانچ پشتوں کی دوستی ہے۔ بڈھے ایک دوسرے کے خاندان کے بچوں سے تاکیداً کہتے کہ میرے بعد بھی آپس کا ملاپ اور اتحاد و خلوص قایم رکھنا۔ میں اپنی بدبختی پر متاسف و افسوس کناں ہوں کہ میری نکبت نے مجھسے وطن سی پیاری چیز چھوڑ وائی اور کشش آب و دانہ حیدرآباد کھینچ کر لائی اور پشت ہا پشت کے تعلقات منقطع ہوگئے حقیقت یہ ہے کہ انسان عاجز و مجبور ہے۔ میں نے ایک کتاب دو سو صفحوں سے زیادہ کی

ناول کے پیرایہ میں لکھی ہے۔ جو شائع ہو چکی ہے۔ اس کا نام کرشمہ تقدیر ہے اس کے مطالعہ سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ میں حیدرآباد کیوں آیا اور پھر کیونکر مستقل سکونت اختیار کرلی میں تین مہینے کا ریٹرن ریلوے ٹکٹ لے کر آیا تھا جس سے ظاہر ہے کہ میرا ارادہ قطعاً یہاں رہنے کا نہ تھا بلکہ واپس جانے کا تھا۔

مگر۔ دوشئے میکشد آدمی را بزور ؎ یکے آب ودانہ دگر خاک گور۔ صرف راجہ جے کشن بہادر آنجہانی کے جلسوں کی کیفیت لکھی ہے۔ گو اسقدر پرلطف تو نہیں لیکن متعدد گھروں میں اور باغوں میں۔ ساون کے جلسے ہوتے تھے۔ نواب سید سلطان مرزا مرحوم خلف نواب بہادر پٹنہ بھی اپنے باغ واقع لوہانی پور میں جو شہر عظیم آباد سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اور بہت وسیع اور پرلطف باغ تھا۔ علاوہ چمن بندیوں کے نایاب و منتخب میووں کے سیکڑوں درخت تھے موقع موقع پر بڑے بڑے حوض جس میں بیسوں فوارے چھوٹتے رہتے۔ جس میں کئی بھول بھلیاں اور پھسلنڈے وغیرہ تفریح کے لئے بنائے گئے تھے۔ ساون کے جلسے کرتے ہند و اور مسلمان دوستوں نوابین و راجگان کو مدعو کرتے۔ گانا بجانا ہوتا جھولے بھی ڈالے جاتے۔ نواب سید سلطان مرزا مرحوم کشیدہ قامت نہایت خوبصورت سجیلے جسم کے نواب زادہ تھے۔ ننہال سے یہ صفوی شہزادہ تھے۔ شاہ عباس صفوی ثالث کے ایک فرزند لبدتباہی خاندان صفویہ اکبر کے زمانہ میں عظیم آباد آئے تھے۔ اکبر اعظم سالانہ چھ لاکھ نقد صوبہ بہار کی صوبیداری سے دیتا تھا اکبر کو باین لحاظ کہ شاہ طہماسپ صفوی نے ہمایوں کو جبکہ شیر شاہ سور سے وہ شکست کھا کر ایران آیا تھا پناہ دی اور بڑی مدد کی تھی۔ چودہ سال اپنے پاس مثل بھائی کے رکھا اور پھر ایرانی جرار فوجوں کے ساتھ ہند میں ہمایوں کو بھیجا۔ ایرانی فوجوں کی امداد سے سور خاندان کا قلع قمع کرکے تخت سلطنت پر ہمایوں بیٹھا تھا۔ شہزادہ صفویہ کا نام نوذر میرزا تھا۔ جن کی نسل سے نواب سید سلطان مرزا مرحوم تھے یہ نہایت خوش گو شاعر اور فن سپہ گری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ گھر ہی میں اکھاڑہ تھا۔ کئی پہلوان نوکر تھے۔ نشانہ انداز ایسے کہ اڑتی چڑیا کو چھروں سے نہیں بلکہ گولی سے گراتے اور چراغ کی ٹیم اوڑا دیتے تھے زور ایسے کہ روپیہ کو چنگلی سے دبا کر موڑ دیتے۔ یکہ جسقدر بھاری اُنہوں نے اُٹھایا کسی پہلوان نے نہیں اُٹھایا اور اُٹھائے ہوئے دور تک لے گئے۔ مگدر کی جوڑی کی ایک فرد بہت اونچی اور بہت وزنی کو یکہ کہتے ہیں۔ جس طرح نوجوان امیرزادوں اور شریف زادوں کو گانے بجانے اور موسیقی سے شوق تھا۔ اسی طرح ڈنڈ مگدر کشتی، بانک پٹا لیزم، بنوٹ وغیرہ میں بھی مشاق ہوتے تھے۔

دور دور سے بنارس و لکھنو وغیرہ سے بنوٹیے اور پٹے باز عظیم آباد کے شوقینوں سے مقابلہ کرنے کو آتے اور ہمیشہ منہ کی کھاتے۔ اکھاڑہ (حیدرآباد کی اصطلاح تعلیم) تقریباً ہر محلہ میں تھا۔ جہاں محلہ کے نوجوان لڑکے آکر ڈنڈ پیلتے مگدر ہلاتے کشتی لڑتے اور ہر اکھاڑہ میں ایک بڑا پہلوان اُستاد کہلاتا وہ اپنا ایک خلیفہ بھی مقرر کرتا جو سب شاگردوں میں فن کشتی کے پیچوں میں اور طاقت میں سبقت لیجاتا پٹنہ میں پہلوان بھولن وغیرہ بہت مشہور نزدیک و دور تھے متھرا کے چوبوں اور پنجاب کے مسلمان پہلوانوں سے بارہا مقابلہ ہوا۔ اور عظیم آباد کے پہلوان ورر ہے۔

میں ساون کا ذکر کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا بہر حال پٹنہ کے ساون کے سُنباری میلوں کا ذکر کئے بغیر یہ بیان ناتمام رہ جاتا ہے۔ اس لئے مختصراً اُس کا ذکر بھی کئے دیتا ہوں۔ ججی کی عدالت جس مقام میں ہے وہاں بہت بڑا کھلا ہوا میدان تھا۔ اس میں یہ میلے ہوتے تھے۔ سُنبار پیر کو یعنے دوشنبہ کو کہتے ہیں۔ ہر ساون کے مہینہ میں چار سُنبار آتے ہیں۔ ہر سُنبار کو اس میدان میں میلہ لگتا تھا۔ ہر قسم کی چیزوں کی دوکانیں قرینہ سے لگائی جاتی تھیں۔

دوکانیں لکڑی اور کپڑے سے بنائی جاتی تھیں جو ساون شروع ہونے سے پیشتر تیار ہو جاتیں۔ ہر سوموار کو صبح سے اشیاء فروختنی لاکر سجادی جاتیں۔ چار بجے سے تماشائیوں کا ہجوم شروع ہوتا صبح تک یہ میلہ رہتا بعض دولتمند اپنے خیمے بھی نصب کرتے اور رات بھر کیلئے دو تین طائفے مقرر کئے جاتے۔ خوب خرید و فروخت ہوتی تفریح کے سامان مختلف اقسام کے مہیا کئے جاتے مثلاً چرخدار گھوڑے۔ چرخ ہنڈولہ قسم قسم کی لاٹری بھی کھیلی جاتی۔ غرض بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ اخیر ساون میں ہندوں کا ایک تہوار راکھی پونم ہوتا ہے عظیم آباد کے امرا کے ہاں خواہ مسلمان ہوں یا ہندو۔ ایک برہمن ماہر فن جوتش لگا رہتا تھا۔ بڑی بڑی ڈیوڑھیوں میں وہ درباری جوتشی کہلاتا تھا۔ سلاطین مغلیہ بھی جوتش کے جس سے احکام سیارگان اور ان کی تاثیرات معلوم ہوتی ہے بہت قائل تھے۔ مسلمانوں کو مذہباً یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جوتش یعنے نجوم سچا علم ہے لیکن نجومی جھوٹے ہیں تاہم بہت مسلمان جوتشیوں کا کہنا مانتے ہیں۔ متعدد بار ان کے بنائے ہوئے زایچے صحیح بھی ہوئے ہیں۔ بہر حال راکھی پونم کے موقعہ پر جوتشی آتا ہے اور سنسکرت زبان کے کچھ اسلوک پڑھکر گھر والے صاحب کی اور ان کے بچوں کی کلائیوں میں ریشمی سیلی جس کو راکھی کہتے ہیں باندھتا اور مقررہ انعام لیتا تھا۔ صرف اسی موقعہ پر نہیں بلکہ مہینے میں دو تین بار آتا ہے۔ اگر کوئی ستارہ بُرے استھان یعنی گھر میں آتا تو صدقہ کی چیزیں ستارہ کا اتارہ رویہ کیلئے

بتلاتا یعنی رد بلا کی غرض سے بتلا کر صدقہ اتر وا کر لے جاتا۔ اگر کوئی خطرناک گھر میں کوئی ستارہ آجاتا تو تلا دان کرواتا ہے یعنی بڑی ترازو میں ایک طرف تلا دان کرنے والا بیٹھتا دوسرے پلہ میں اقسام کے اناج عموماً ست نجا یعنی سات طرح کے اناج اور سات طرح کے دھات پیتل تانبا لوہا سیسہ کانسا، سونا چاندی جس کا جو وزن ہے اس کے برابر تول کر جوتشی لے جاتا۔ چاند اور سورج گرہن یعنی گہن کے موقعہ پر بھی یہ جوتشی آکر گہن کا اوگرا یعنی صدقہ کا کالا کمبل لوہے کے کچھ ٹکڑے کالی ماش وغیرہ گہن چھوٹنے کے بعد اکر لیجاتا ہے۔ کسی شاعر نے لفظ اوگرا کو کس خوبصورتی سے باندھا ہے وہ کہتا ہے۔

زلف ہے رخ پر بوسہ دو ہٹو چاند گہن کا اوگرا دو ٹو

علاوہ ازیں سیزدہ صفر وغیرہ کے صدقے لینے بھی یہی برہمن لے جایا کرتا تھا۔ ساون میں جو کیفیتیں رہیں۔ بھادوں میں بھی اس قسم کے شغل رہتے۔ برسات کا چوماسہ ختم ہونے کے بعد جاڑوں کا چوماسہ شروع ہوتا ہے۔ ہندؤں کے تہواروں میں دسہرہ اور دیوالی بہت اہم تہوار ہیں پہلے دسہرہ آسن کے ابتدائی حصہ میں آتا ہے۔ بنگالی کہیں بھی رہیں بہت دہوم دہام سے دسہرہ کرتے ہیں گھر میں دیبی کا بت بٹھاتے ہیں۔ گانا بجانا ہوتا ہے۔ اور جلوس کیساتھ دیبی نکلتی ہے۔ پٹنہ میں بنگالی ہندوں کی تعداد اسوقت جبکہ صوبہ بہار سر سید علی امام مرحوم کی بدولت بنگالہ سے علیحدہ نہیں کیا گیا تھا تب بھی پٹنہ میں وکالت پیشہ اور عدالتی خدمتوں پر بہت بنگالی تھے۔ تو بہاری ہندوں کی دیکھا دیکھی یہ بھی مسلمان دوستوں سے بہت اتحاد رکھتے تھے۔ دسہرہ کی صحبتوں میں مسلمانوں کو مدعو کرتے۔ میٹھائیوں کے حصہ بھیجتے۔ بہاری ہندو رام لیلا کرتے اور یہ لیلا دیکھنے کیلئے مسلمانوں کو مدعو کرتے۔ رامچندر کی بیوی کو لنکا کے راجہ راون سے چھین کر لانے کے لئے لنگوروں کی جو فوج گئی تھی اس کی نقل کی جاتی ہے۔ لڑائی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ پھر لنکا شہر کو فاتح فوج آگ لگا دیتی ہے یہ سب اس لیلہ میں دکھاتے ہیں۔ لیلہ کے معنی تماشہ کے ہیں۔ دسہرہ کے تقریباً ایک ماہ کے بعد عموماً کارتک سدی ۱۴ کو دیوالی ہوتی ہے۔ ایک دن قبل جنم کا دیا ہندو خوب روشنی کرتے ہیں۔ ہندو دوکاندار ہر شہر کے دوکانات سجاتے اور روشنی کرتے اور ایک دوسرے سے گویا سبقت لیجانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور چھوٹے بڑے اس روز جوا ضرور کھیلتے ہیں بڑے شہروں میں لاکھوں کا وارا نیارا ہو جاتا ہے جو لوگ محتاط ہیں وہ جوا نہیں کھیلتے لیکن کوڑی ہاتھ سے ضرور چھوئیں گے۔ اس کو باعث برکت سمجھتے ہیں مسلمان نوجوان بھی اپنے ہندو جوان دوستوں کے ہاں دعوتوں میں شریک ہوتے جہاں گانے بجانے کی محفلیں ہوتی تھیں دیوالی میں طرح طرح کی مٹھائیاں ہندو

آپس میں ایک دوسرے کو بھیجتے تھے اور مسلمان دوستوں کے ہاں بھی بھیجتے ۔ پیشہ ور ہندو مثلاً بزاز، جوہری ۔ وغیرہ جن مسلمانوں سے ان کا بیوپار چلتا یا جس سرکار میں وہ لین دین کرتے دیوالی کی مٹھائیوں کا حصہ ضرور بھیجتے ۔ کہا جاتا ہے کہ اُس روز لچھمی جو دولت کی دیوتا ہے وہ آتی ہے اس لئے مکانوں کو دھو دھلا کر اور آہک پاشی کرکے صاف ستھرا اور آراستہ رکھنا چاہئے ورنہ لچھمی ناراض ہو کر فوراً واپس چلی جائے گی ۔ حقیقت یہ ہے کہ دیوالی موسم برسات کے بعد آتی ہے اور قدیم زمانہ میں شدت سے برسات ہوتی تھی بہت سے مکانات بوسیدہ ہو جاتے تھے ۔ اسلئے مذہب کے پیرایہ میں مکان کی درستی لازماً قرار دی گئی ہے ۔ یوں اگر کوئی کہتا کہ موسم بارش کے بعد لوگ مکانوں کو درست کریں جو کچھ ٹوٹا پھوٹا ہے اُس کو بنا دیں تو ہرگز اس پر عام طور سے عمل نہ ہوتا ۔ پٹنہ میں عام ہندوانی مٹھائیوں کے دیوالی کی خاص مٹھائیاں بنائی جاتی ہیں ۔ شکر کی پتلیاں ہاتھی گھوڑے بلی وغیرہ دیوالی کے کھلونے بھی خاص ہوتے تھے ۔ دیوالی کی کلھیاں تو مشہور ہیں ۔ ہندو کے لڑکے خوب پٹاخے وغیرہ چھوڑتے ہیں ۔ جس طرح مسلمان شب برات میں جاڑوں میں اور بھی چھوٹے موٹے ہندوؤں کے تہوار ہوتے ہیں ۔ بسنت پنچمی اور سیوراتری ذرا بڑے تہوار ہیں ۔ جن میں مسلمان بھی حصہ لیتے ہیں ۔ بسنت میں تو بڑے جشن ہوتے تھے ۔ جب تک صوبہ داری پٹنہ میں رہی تو بسنت کا دربار بہت شان و شوکت سے ہوتا تھا مگر میرے بچپنے کے زمانہ شباب تک مسلمان امرا بسنت کے جلسے دھوم سے کرتے جس کمرہ میں ناچ رنگ ہوتا اس کا رنگ پہلے سے بسنتی رنگوایا جاتا ۔ پھر شیشہ و آلات فرش فروش سب بسنتی خود صاحب خانہ پرتکلف بسنتی رنگ کی پوشاکیں زیب تن کرتے ۔ حتیٰ کہ ملازموں کی وردی جو پیشی میں حاضر رہتے زرد بانات کی ہوتی جو طائفے ناچنے کے لئے آتے اُن کو فرمائش کر دی جاتی یا حکم بھیجدیا جاتا کہ بسنتی لباس میں آئیں باہر قدرت کی طرف سے بھی اس خصوص میں بڑی فیاضی کیجاتی ۔ کھیت اور باغات سب بسنتی اس زمانہ میں ہو جاتے ہیں ۔ کھیتوں میں سرسوں پھولی رہتی ہے ۔ وہ بالکل زرد ہوتی ہے ۔ باغوں میں آم کے درخت بور سے لدجاتے ہیں ٹیسو اور گیندا پھولتا ہے ۔ غرض عجب سماں ہوتا ہے ۔ [1]

گیندا کھلا ہے باغ میں میدان میں سرسوں پھولی صحرا وہ بسنتی ہے یہ گلزار بسنتی

کسبیں گڑوا بنا کر لاتی ہیں اور انعام پاتی ہیں ۔ گڑوے سے مراد یہ ہے ایک پیتل کی تھالی میں ایک پیتل کا لوٹا رکھا جاتا ہے ۔ اُس میں آم کے بور ہوتے ہیں اور تھالی میں ناریل سیندور وغیرہ ہوتا ہے

[1] مرحوم نے بھی بسنت ایک سال دھوم سے منایا تھا شادی کے قبل ۔ صغرا ہمایوں مرزا

ہندو اس کی پوجا کرتے ہیں اور ہندو کسبنیں گڑوے بنا کر لاتی ہیں۔ بسنت بہار راگنی میں گاتے ہیں نمونتاً ایک بسنت لکھتا ہوں۔

تیر و نیو نیو جوبن نئی رے بہار۔ ایک کیاری بسنت کی رے دو جے بورے آم ڈار
تیسجے پپیہا پیو پیو کرت رار۔ تیر و نیو الخ

مشایخین بھی حال قال کی صحبتوں میں بسنت قوالوں سے گواتے ہیں۔ عارفانہ رنگ دے کر موسیقی دان مشائخ خود بسنت کا گیت تصنیف کرتے ہیں اور قوالوں کو یاد کرواتے ہیں۔ ایک نمونہ ہے

حوریں لائیں بسنت بنا کے نبیؐ جی کے دوارے۔
چاند سورج کا گڑوا گڑوا بنایا۔ بسم اللہ کی پچکاری۔ نور کے رنگ سے بھر کے بنا کے حوریں لائیں بسنت الخ

بسنت پنچمی جو اصل تہوار کا دن ہے۔ جس دن پوجا پاٹ ہندو کرتے ہیں۔ وہ بماہ ماگھ سدی ۵ کو ہوتی ہے۔ مگر بسنت تمام مہینہ میں ماگھ کے ہندو مسلمان بسنت بہار راگنی میں گاتے ہیں۔ ماگھ کے مہینہ کے پیشتر پوس کا مہینہ آتا ہے۔ یہ دو مہینے چلون کے جاڑوں کے ہیں اور پوس بدی ۱۳ کو تل سنکرانت کا تہوار ہوتا ہے۔ بازاروں میں اور گھروں میں ہندو تل کی مختلف مٹھائیاں بناتے ہیں۔ تلوا۔ تلکٹ۔ تل کے لڈو۔ تل کا مزاج گرم ہے اور پوس کا مہینہ سخت سردی کا ہوتا ہے اس لحاظ سے تل کا استعمال مناسب حال ہے۔ تلکٹ کے ساتھ وہاں کے چڑوے حصوں میں ہندو مسلمانوں کے ہاں بھیجتے تھے۔ بسنت پنچمی ماگھ کے مہینہ میں ہوتی اور اس کے بعد شیوراتری ہوتی۔ یوں جاڑے بھر پتنگ بازی ہوتی رہتی مگر شیوراتری کے دن خاص خاص مقامات پر ہندو سیکڑوں کی تعداد میں جمع ہو کر کنکوے لڑاتے۔ جوان مسلمان بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے شیوراتری کے بعد سے پتنگ بازی زور روں پر ہو جاتی۔ ہندو اور مسلمان امرا آپس میں شدّ بولتے اس کے معنی یہ کہ شرطیں لگاتے۔ دو چار ایک طرف دو چار دوسری طرف پارٹیاں بن جاتیں اور ایسے مقامات منتخب کرتے جو قریب قریب ہوتے۔ یا میدانوں میں چھتوں پر جمع ہوتے بعض وقت صرف دو آدمیوں میں شرط ہوتی ایک اس طرف ایک اوس طرف مگر ہر ایک کے ساتھ بہت سے دوست احباب ہوتے پہلے سے فریقین پر قید لگاتے کہ جانبین سے ڈھیل کے پیچ لڑائے جائیں گے یا صرف کھینچ کے پیچ ہوں گے۔ فی پیچ جس کا پتنگ کٹ جائے جیتنے والے کو ایک روپیہ دے۔ دو مسلمان رئیسوں میں نواب میر عمر دراز خان اور چھوٹے نواب سے شدّ ہوئی دو ہفتہ کے قریب یہ مشغلہ رہا ہزاروں روپیوں کا وارا نیارا ہو گیا ایک روپیہ سے لیکر فی پیچ پچیس ۲۵ روپیہ کی باری آ گئی تھی۔ نواب میر عمر دراز خان مرحوم بہت دولتمند تھے۔ مگر فضولیات میں

لاکھوں روپیہ برباد کئے۔ ان کے ہاں بٹیروں کی پالی ہوتی (بٹیر لڑائے جاتے) مرغ بازی بڑے قد و قامت کے اصیل مرغ پلے ہوئے تھے جن کی واشت کے لئے کئی ملازمین تھے۔ اسی طرح کئی ملازم بٹیروں پر۔ اور لال بھی لڑائے جاتے تھے۔ جس طرح ان چیزوں کا عمر دراز خان کو خبط تھا۔ اسی طرح اور چند رئیس تھے جن کی اولادیں ہیں۔ مگر اسقدر خوش حال نہیں ہیں۔ جاڑوں میں سیورا تری کے بعد سے کنکوے بازی جب زوروں پر ہوتی تو سیکڑوں مسلمان شرفازادے متوسط طبقہ کے بھی اس مرض میں گرفتار ہوتے۔ پندرہ پندرہ بیس بیس کا جتھا صبح کے ناشتہ کے بعد سے گھر دں سے نکلتا اور مناسب حال مقامات پر پہنچ جاتا بعض اپنے دوستوں کو مدعو کرکے لیجاتے تمام تمام دن اپنے ساتھ رکھتے اقسام کے کھانے خوانوں میں جاتے۔ ہزاروں روپئے اسطرح فضولیات واصراف میں صرف ہوجاتے جس کا لازمی نتیجہ تباہی وتاراجی۔ گو یہ تہوار ہندوؤں کا ہے مگر پتنگ بازی کے رنگ میں مسلمان بہت زیادہ ڈوبے ہوئے تھے۔ شرطیں اور بازی لگانے والے بھی مسلمان حضرات ہوتے اس فن میں جو بڑا استاد ماہر فن ہوتا اس کی پتنگ بازوں میں بڑی تعریفیں توصیفیں ہوتیں وہ شخص اس گروہ والوں کی جس صحبت میں جاتا بڑی آؤ بھگت کی جاتی۔ مرزا محمد علیخان کے فرزند نور علیخاں معروف بہ نور و میاں بڑے ماہر فن تھے۔ ایک بزرگ باقر صاحب دولتمند بھی تھے۔ محلہ دیوی گھاٹ کے رہنے والے نواب کلب علیخاں سابق رئیس رامپور کی وفات کے بعد جب نواب مرزا داغ مرحوم ریاست سے علٰحدہ کردے گئے تو عظیم آباد میں چند ماہ رہے تھے اور باقر صاحب کے مہمان تھے۔ چند معرکہ کے مشاعروں میں شریک ہوئے وہاں و متعدد غزلیں بھی کہیں ایک غزل کا مقطع یہ ہے۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ کو جائیں گے
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

یہ تو ہمیشہ ہوتا رہا کہ دلی یا لکھنؤ میں کوئی صاحب فن و کمال جب پریشان حال ہوا۔ تو عظیم آباد ہی اس کا مامن ہوتا میر باقر صاحب کو بھی پتنگ بازی میں بڑا دخل تھا۔ ایک رئیس مولوی اصغر حسین صاحب تخلص کامل اس فن میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ ایک رسالہ بھی انہوں نے فن پتنگ بازی پر تصنیف کیا تھا۔ یعنی پینچ کس طرح لڑانا چاہیے۔ ڈھیل اور کھینچ دونوں کے اصول بتائے تھے۔ پھر نخ وغیرہ میں مانجھا کس کس چیز کو مخلوط کرکے دینا چاہیے جس کی وجہ سے مانجھا تیز ہو اور فریق ثانی کے پتنگ کو فوراً کاٹ دے۔ لکھنؤ اور کلکتہ وغیرہ میں کنکوا بھرکی کے دھاگہ کو دوہرا بٹ کر اس پر مانجھا کرکے سکھاتے ہیں پھر اوچکے پر باصطلاح دیگر چرخ پر لپیٹ لے تے ہیں۔ نخ ایک ایسی چیز ہے کہ سوا صوبہ بہار کے اسکا رواج کہیں نہیں ہے۔ ریشم کے تار نکال کر کئی

تاروں کو بٹ کر نخ بناتے ہیں اور اُس پر مانجھا کرتے ہیں نخ گراں قیمت چیز ہے۔ غربا کے لڑکے تو سوت پر مانجھا کرکے اس سے کنکوا اُوڑاتے ہیں۔ عظیم آباد کے نوجوان مسلمانوں کو اس کا بڑا خبط و شغف تھا۔ خدا کرے اب جاتا رہا ہو۔ میں نے چند مہینوں کے موسمی گیت لکھے ہیں۔ ہر ایک سال بارہ مہینوں کا ہوتا ہے۔ یعنی بارہ ماس کا جس میں تین چوماسے ہوتے ہیں۔ ہر چوماسے کے موسم بدلتے رہتے ہیں اور اسی لحاظ سے موسمی گیت اور گانے کی چیزیں بنائی گئی ہیں۔ ہر چیز مثلاً چیتی یا ساون وغیرہ میں پہلے رُت کی قدرتی خصوصیات کا ذکر کرکے جذبات فراقیہ وغیرہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ علاوہ ان موسمی چیزوں کے ایک قسم کا گیت جس کو بارہ ماسہ کہتے ہیں سیکڑوں کی تعداد میں ہوں گے۔ بارہ ماسہ یعنی بارہ مہینوں کے حالات لکھے جاتے ہیں التزام یہ ہوتا ہے کہ ہر مہینے کی قدرتی سما کا اظہار کرکے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ بارہ ماسہ بھی خاص صوبہ بہار کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ ایک بارہ ماسہ کا کچھ مضمون لکھتا ہوں سمجھنے سے تعلق ہے۔

چیت ہے سکھی پھول لی بیلی بھونرا للانچ باسو ٭ بیساکھ ہے سکھی رو کہا جوالہ انگ سے بھیگے سر پر یو رگری چندن انگ پستوں جو کنتہ رہتا گھر یو۔ چونکہ یہ چیزیں مثل چیتی کے سوا صوبہ بہار کی ہندی کے اور کسی حصہ میں رائج نہیں ہے اسلئے یہ چیز بہاری بھاشا میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ چیت کا مہینہ آیا بیلے کا پھول پھولا بھونرا اس کی باس اُڑائے جا رہا ہے اس کا دوسرا مصرعہ مجھکو یاد نہیں ہے۔ پھر وہ مہجور عورت اپنے خاوند کے فراق میں کہتی ہے۔

اے سکھی بیساکھ کا مہینہ آیا۔ (بیساکھ اور جیٹھ کی گرمی مشہور ہے) جسم سے شعلے نکل رہے ہیں۔ اور سارا بدن پسینہ سے شرابور اور تر بتر ہو گیا ہے۔ میرے خاوند اسوقت اگر گھر پر ہوتے تو چندن (صندل) رگڑ کر ان کے جسم میں لگاتی تاکہ ٹھنڈک پڑتی اور گرمی کا اثر کم ہوتا۔ ہر موسم کی چیزیں پہلے قدرتی مناظر یا رُت کا سما دکھلا کر اپنے جذبات عشقیہ کا بیان کیا جاتا ہے۔ یہ خاصہ ہندی چیزوں کا ہے۔ اسی کو نیچرل شاعری کہتے ہیں۔

اردو کی شاعری میں اب یہ خوبی پیدا کی گئی ہے۔ میر انیس مرحوم نے اس کی ابتدا مرثیوں میں کی ورنہ صرف اندرونی جذبات کا اظہار مد نظر رہتا تھا۔ ہر موسم میں اسقدر رنگ رلیاں اور چہل پہل کا ہونا لوگوں میں اعلیٰ صحت کی دلیل ہے۔ اور جس کا سبب خوش آب و ہوا میں پرورش پانا اور رہنا اور اطمینان قلبی ہونا۔ اب تو نل پانی کا جاری کیا گیا ہے اور پانی کو جوش دینے اور فلٹر کرنے سے پانی کی قدرتی خوبیاں اور عمدہ صفتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ پوٹاس سلفر اور نمک وغیرہ سب جل کر

فنا ہو جاتے ہیں۔ البتہ مضرت باقی نہیں رہتی۔ مگر ساتھ ہی اس کے صحت بخش اجزا مفقود ہو جاتے ہیں۔ میرے بچپنے میں لوگ کنوں کا پانی اور گنگا کا پانی پیتے تھے۔ گنگا کا پانی نہایت صحت آور ہوتا ہے بعض انگریز ڈاکٹروں نے کیمیائی تجربہ کے بعد گنگا کے پانی کی بڑی تعریف کی ہے اور عراق کے دجلہ کے پانی سے مشابہت دی ہے۔ بعض کنوؤں کا پانی بھی جو شیریں اور ہلکا ہوتا ہے بہت صحت آور ہوتا ہے۔ تازہ چشمے سے نکلتا رہتا ہے۔ برسات کے موسم میں گنگا کا پانی گدلا ہو جاتا تھا۔ امرا تو چار کول فلیٹر کے ذریعہ سے مقطر کر لیتے تھے اور متوسطین نرملی گھڑوں کی تہ میں گھس دیتے تھے جس سے سارا کدرتہ میں جم جاتا اور پانی مصفا رہو جاتا اور وہ آہستہ سے چھانکر صراحیوں اور جھجریوں میں بھر لیا جاتا۔ جھجھر بھی پانی رکھنے کا گلی ظرف ہے۔

چونکہ جاڑوں کے چوماسہ کے ہندوں کے تہواروں کا اوپر میں نے ذکر کیا ہے اس سلسلہ میں ہری ہر چھتر کے میلہ کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ میلہ ہندوستان بھر میں مشہور ہے اصل میں یہ بھی ایک مذہبی تہوار ہے۔ ہری ہر جی کوئی بڑے دیوتا ہندوؤں کے گذرے ہیں اُن کا بڑا سا مندر گنگا کے اس پار عظیم آباد کے سامنے دریا کے متصل واقع ہے ہر سال لاکھوں ہندو دور دور سے اسکی پوجا کرنے آتے ہیں پہلے گنگا کا اشنان کرتے ہیں اس کے بعد مندر میں جاکر پوجا کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہہ ایک مذہبی جاترا ہے۔ ہندوستان میں چھتر کا میلہ مشہور ہے چھتر کے معنی میدان کے ہیں۔ کوسوں کے رقبہ میں میلہ لگتا ہے۔ مختلف زمیندار تھوڑے تھوڑے رقبہ آراضی کے مالک ہیں۔ اُس زمین پر کاشت وغیرہ نہیں ہوتی۔ سال میں ایک دفعہ اس کا نصیبا جاگتا ہے زمینداروں کو زمین کا زرنزول ہزاروں روپیہ ملتا ہے۔ تقریباً ایک مہینہ جلوں کے جاڑوں میں اخیر پوس سے میلہ شروع ہوتا ہے اور کچھ حصہ ماگھ کے مہینہ کا لیتا ہے۔ کوسوں کے رقبہ میں کپڑوں کا شہر بنجاتا ہے۔

بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے خیمہ چھولداریاں راؤٹیاں پال نہایت سلیقہ و قرینہ کے نصب کئے جاتے ہیں اور سڑکیں قائم کی جاتی تھیں۔ ایک جانب سڑک کے کنارہ کنارہ مثلاً صرافہ اور جوہری بازار۔ دوسری سڑک کے کنارہ مینا بازار۔ چڑیا بازار۔ بساطیوں کی دوکانیں۔ ایک جانب نخاس جہاں گھوڑے خرید و فروخت ہوتے وہ زمانہ ایسا تھا کہ گھوڑوں کی ہر طرف سے مانگ ہوتی تھی۔ ران سواری کے لئے گاڑیوں کے لئے دور دور سے گھوڑوں کے سوداگر گھوڑے بیچنے کو لاتے تھے سیکڑوں گھوڑے مختلف کھیت کے نخاس پر بندھے دکھائی دیتے۔ ایک طرف فیلخانہ ہوتا۔ جہاں ہاتھی بکتے بڑے بڑے راجاؤں نوابوں کو بھی اس زمانہ میں ہاتھی کی ضرورت رہتی۔ ایک جانب چھوٹے چھوٹے خیموں میں

کسبنیں گانے والیاں وغیرہ مقیم ہوتی ہیں۔ کرایہ پر ہر قسم کے خیمے ملتے تھے جو لوگ اپنے خیمے ڈیرے لیکر نہیں جاتے وہ کرایہ کے لے لیتے تمام صوبہ بہار کے امراء ہندو و مسلمان اپنے اپنے خیمے لیجاتے جس طرح دلی کے ۱۹۰۲ء اور ۱۹۱۲ء کے درباروں کے موقعوں پر والیان ریاست کے کیمپ بنے تھے اُتنے عالیشان تو نہیں۔ کیونکہ مہاراجہ گیکوار و حضور نظام و مہاراجہ کشمیر و مہاراجہ گوالیار کے کیمپوں کا مقابلہ یہاں کے امرا کے کیمپوں سے کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ تاہم ہزاروں روپیوں کی تیاری سے کیمپ تیار کئے جاتے میلہ شروع ہونے کے بیس پچیس دن پیشتر ہی سے امرا کے ملازمین وہاں پہنچ جاتے۔ پھاٹک نہایت شاندار مختلف وضع کے بنائے جاتے۔ اور چاروں طرف اعلیٰ قدر حیثیت و مراتب و دولت وسیع رقبہ زمین جو نزول پر لیا جاتا۔ قناتیں لگائی جاتیں۔ اینٹ چونے کے عوض کپڑہ کی دیواریں ہوتیں۔ پھاٹک کے سامنے بہت بڑا چبوترہ تیار کیا جاتا۔ چبوترہ کے نصف حصہ پر بڑا شامیانہ یا پنڈال مناسبت وسعت کے لحاظ سے لگایا جاتا۔ چھوٹے سے چھوٹا چار چوبا اور بڑے شامیانے سولہ چوبے چوبیس چوبے۔ تیس چوبے تک لگائے جاتے اور بقیہ چبوترہ پر دو ٹیا بہت بڑا خیمہ اور اس کے متصل و ملحق چند خیمے ہوتے جو حمام و خوابگاہ کے کمروں کی جگہ استعمال میں آتے اور شامیانے کے نیچے دو بڑے خیمے سے ملحق جو حصہ ہوتا۔ اُس پر صوفے اور کرسیاں وغیرہ رکھ کر ڈرائنگ روم کے طور پر بنایا جاتا۔ یوں تو سارے چبوترہ پر فرش ہوتا مگر جس جگہ کرسیاں وغیرہ لگائی جاتیں۔ وہاں قالین ایرانی یا برسلس کے بڑے بڑے قالین بچھائے جاتے کرسیوں کے سامنے جو چھوٹا ہوا فرش رہتا اُس پر طائفے ناچتے گاتے اور غلام گردش میں بہت سے چھوٹے خیمے ہوتے خیمہ کے ساتھ ایک بیت الخلا کی راوٹی ہوتی جن میں رئیس کے مصاحبین و اسٹاف کے لوگ رہتے اور جو مہمان آتے اُتارے جاتے۔ باورچیخانہ اور بوتات کے خیمے پیچھے ایک جانب رہتے پھاٹک سے جو صدر خیمہ تک سڑک بنائی جاتی۔ اوس پر پھولوں کے گملے وغیرہ خوش قطعی سے رکھے جاتے۔ عظیم آباد کے مسلمان روسا میلہ شروع ہونے کے قبل اپنے دوستوں سے دریافت کرتے کہ چھپر جانے کا اس سال قصد ہے اگر قصد ہے تو خیمے آپکے ساتھ جائیں گے۔ اگر جواب یہ ملا کہ جانے کا تو قصد ہے۔ مگر خیمے اس سال نہیں لے جاؤں گا۔ چھپرہ میں حسب ضرورت کرایہ کے خیمے لے لئے جائیں گے۔ مستفسر الوقت باصرار اپنا مہمان بناتا اگر کسی نے یہ جواب دیا کہ جانے کا قصد ہے۔ اور فلاں دوست کے ہاں قیام کروں گا اسلئے خیمے مستفسر باصرار کہتا کہ آپ میرے پاس آجایئے اور فلاں صاحب کو چونکہ زبان دے چکے ہیں اپنے بڑے صاحبزادوں کو وہاں بھیج دیجئے یا اپنے بڑے یا چھوٹے بھائی کو وہاں بھیجئے غرض

بڑے بڑے مسلمان امیروں کا یہ دستور رہا کہ بہت سے مہمان بھی ان کے ہاں اتریں۔ مہمان نوازی تو مسلمانوں کی گھٹی میں ہے کم وبیش سب ہی مہمان نواز ہوتے ہیں کھانا عمدہ سے عمدہ ہر مہمان کے خیمہ میں بھیجا جاتا صبح کے ناشتہ اور چائے کے ساتھ بہت سی چیزیں اسی طرح دوپہر کے کھانے کے لئے تیسرے پہر کی چائے کے لئے بہت لذیذ اور اقسام کے کھانے مہمانوں کے خیموں میں بھیجے جاتے شب کا کھانا بعض امیر اپنے مہمانوں کے ساتھ کھاتے یعنی اپنے پاس بلاتے تے۔ ایک محلہ گورا بازار کہلاتا جہاں یورپین اصحاب کے خیمے ہوتے۔ چھوٹے چھوٹے خیمے اور سامنے چھوٹا شامیانہ البتہ کلکٹر اور جج اور کمشنر کے خیمے بہت بڑے ہوتے اور پھول پتوں اور جاپانی چینی قندیلوں سے خوب آراستہ کئے جاتے گھوڑ دوڑ کا میدان وسیع اور گرینڈ اسٹینڈ بہت خوبصورت بنا ہوا تھا۔ ہر سال گھوڑدوڑ کی شرطیں ہوا کرتی ہیں۔ یہ رقبہ زمین چونکہ چھپرہ کے ضلع کے تحت ہے اس لئے ضلع کی پولیس اور میونسپلٹی کا عمدہ انتظام ہوتا تھا اور ایک ڈپوٹی مجسٹریٹ یا جوائنٹ مجسٹریٹ چھپرہ کا یہاں متعین کیا جاتا جو روزانہ اجلاس کرتا اور چوری اور مارپیٹ کے مقدمات کا فیصلہ کرتا۔ سڑکوں پر دو وقتہ پانی کا چھڑکاؤ ہوتا۔ بڑے بڑے راجگان مثلاً مہاراجہ گدھور، مہاراجہ دربھنگہ، مہاراجہ بتیا و راجہ صاحب چین پور وغیرہ کے اور نوابوں کے خیمے بڑے تزک واحتشام کے ہوتے۔ پھاٹکوں پر سنتری ٹہلتے رہتے اور ملازمین زرق برق وردیوں سے آراستہ ادھر اُدھر ٹہلتے نظر آتے خاص پٹنہ کے امیروں میں محمد نواب صاحب مرحوم بادشاہ نواب صاحب مرحوم وغیرہ کے اور خدا زندہ رکھے اخوی نواب سید ابراہیم حسین خاں صاحب عرف منجھلے نواب صاحب کے خیمے بہت وسیع اور بہت پرتکلف ہوتے۔ اسلئے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی کہ ہمارا کیمپ شان وشوکت میں سب سے بڑھا رہے۔ دوسرے تیسرے بڑے بڑے لوگوں کی آپس میں عموماً شب کے کھانے کی دعوتیں ہوتیں اور طائفے گانے کیلئے آتے انگریزی ترکیب کے ڈنر بھی انگریز اور مسلمان مغرب زدہ اشخاص کو دیے جاتے۔ سیکڑوں خوش باش پٹنہ اور صوبہ بہار کے دوسرے شہروں مظفر پور۔ چھپرہ۔ آرہ۔ گیا۔ وغیرہ کے میلے میں ضرور جاتے۔ کوئی دو تین روز اوائل کے صرف کرکے آتا اور کوئی وسط کے دس پندرہ دن صرف کرکے میلے سے آتا اور اقسام کے سوغاتیں اور تحفے خرید کر واپس آتا۔

ان خوش باشوں میں رنگیلی طبیعتوں کے بھی بہت سے جوان ہوتے جن کے خیموں میں بھی گانا بجانا ہوتا رہتا۔ غرض دن عید اور رات شب برات ہوتی۔ انگریز بڑے عہدہ دار بڑا بال یعنی ناچ کرتے اور ڈنر وغیرہ ان کے ہاں بھی ہوتے رہتے تھے۔ اس میلہ کے لگے کا ایک اور میلہ اسی

صوبہ بہار کے ایک شہر پورنیہ میں ہوتا ہے۔ پیر نیک مردان کا میلہ مشہور ہے۔ نیک مردان صاحب کوئی بڑے ولی تھے ان کے سالانہ عرس کی تقریب میں یہ بڑا میلہ لگتا ہے۔ یہ بھی تقریباً ایک ماہ رہتا ہے۔ چھتر ہندوؤں کے دیوتا کا۔ اور یہ مسلمان ولی اللہ کا میلہ ہوتا ہے۔ اوپر جو میں نے بعض موسموں میں مسلمانوں اور خصوصاً مسلمان امرا کے عیش ونشاط اور رقص و سرود کے حالات بیان کئے ہیں اور بعض ہندوانے تہواروں میں مسلمانوں کی شرکت بتلائی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عظیم آباد کے امیرزادے اور اُمرا صرف انہیں باتوں میں منہمک رہتے تھے ان کو علمی اور مذہبی مشاغل سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ایسا ہرگز نہ تھا۔

مولود شریف وغیرہ کا ذکر بھی ملاحظہ ہو۔ فضل و کمال علمیہ کا ذکر آگے کروں گا پہلے مذہبی امور سے جو شغف و انہماک پٹنہ والوں کو تھا۔ اس کا مختصراً تذکرہ کرتا ہوں۔ علما و فضلا کا طبقہ تو ہر جگہ مذہبی خیالات کا ہوتا ہے۔ اور معتقدات کے پکے ہوتے ہیں لیکن میں طبقہ امرا کا خاص طور سے ذکر کرتا ہوں یوں تو بہت سے امرا دوازدہم شریف اور یازدہم شریف کی نیازوں میں ہزاروں روپئے دعوتوں میں اور مساکین کو خیرات دینے میں صرف کرتے اور محفل میلاد شریف بھی اپنی حیثیت کے لحاظ سے تکلف سے کرتے۔ خصوصاً خان بہادر میر ابوسعید صاحب اور خان بہادر ابوصالح کے ہاں میلاد کی محفلیں بہت دھوم سے ہوتیں۔ جس طرح حیدرآباد میں مولود شریف پڑھنے والی جماعتیں پڑھتے ہیں اسی طریقہ سے وہاں مولود شریف بھی ہوتا بلکہ علما حضرت رسول مقبول کے حالات حیات کے مختلف پہلوؤں پر بذریعہ وعظ کے روشنی ڈالتے اور پھر کھڑے ہو کر خوش الحانی سے عربی یا فارسی کے نعتیہ قصائد سلام و درود پڑھتے۔ اس کے بعد تبرک کے حصے تقسیم ہوتے۔ متوسط شریف گھرانوں میں بھی کوئی پڑھا لکھا شخص وعظ بیان کرتا۔

محفل میلاد کے حالات ہیں شیعوں میں نواب سید امیر علیخان مرحوم کے ہاں محفل میلاد شریف دھوم سے ہوتی تھی۔ محرم میں نذر و نیاز بڑی دھوم دھام سے ہر دو فریق سنی و شیعہ کرتے علاوہ مسلمانوں کے ہندو بھی بڑی عقیدت سے محرم کرتے۔ پٹنہ کے باشندوں میں نصف سے زیادہ ہندو عزاداری سید الشہدا علیہ السلام کرتے۔ عموماً سپریں ہندو رکھتے تھے۔ سپیرہ ایک خاص چیز صوبہ بہار کی ایجاد ہے اس کی قطعہ اس طرح کی ہوتی  جو حصہ اس میں خالی ہے اس میں عموماً گینڈے کی سات ڈھالیں نصب کی جاتیں چند بہت بڑی سپیریں نو ڈھال کی تھیں اس میں بڑی بڑی صنعتیں کیجاتیں۔ جیسا میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ تقریباً

ہر محلہ میں ایک اکھاڑہ تھا اس میں جسقدر ہندو مسلمان ڈنڈ مگدر کرتے کشتی لڑتے وہ سب ایک ایک اُستاد کے شاگرد ہوتے یہ سب لوگ چندہ کرکے سپر تیار کرتے اور امام باڑہ کا خرچ عشرہ مبارک میں چلاتے۔ بعض سپریں گشت کے لئے پانچویں محرم الحرام کو اور بعض ساتویں کو نکالی جاتیں یعنی اکھاڑہ سے اُٹھاکر دو چار سڑکوں سے گھما کر پھر اکھاڑہ میں جہاں ایک چبوترہ ایک جانب ہوتا تھا واپس لاکر رکھتے اور پھر شب دہم کو بھی یہ سپریں گشت کرائی جاتیں۔ روز عاشورہ پہلام کرائی جاتیں یعنی سپروں پر جو سہرے اور پھول وغیرہ نگون چڑھائے جاتے وہ اُتار کر کے ٹھنڈے کئے جاتے۔ زیادہ تر یہ سپریں اور تعزیے تابوت وغیرہ حضرت شاہ ارزانی صاحب کی درگاہ میں پہلام کو آتے اور کچھ ایک دوسری کربلا گلشن حیدری (امام باڑہ کا نام) میں پھول وغیرہ دفن کئے جاتے۔ اربعین کے گل تعزیے اور گنتی کی سپریں بھی جو اربعین میں اُٹھتیں وہ میر باقر مرحوم کے امام باڑہ میں دفن کیجاتیں۔ اِن سپروں میں دو ڈوریاں بھی ہوتیں۔ ایک شخص سپر اُٹھا کر ڈولچی میں رکھتا جو چمڑے کی ہوتی جس کو گردن میں ڈال لیتے کمر تک لٹکتی رہتی سپر کی لکڑی کا اخیر حصہ تو ڈولچی میں رہتا۔ ایک ڈوری ایک ہاتھ میں دوسری دوسرے کے ہاتھ میں ہوتی جس شخص کی ڈولچی میں سپر ہوتی وہ سپر ہلاتا اور جن کے ہاتھوں میں ڈوریاں ہوتیں ایک جب کھینچتا تو دوسرا ڈھیل دیتا جاتا۔ ایک شخص سامنے کی ڈوری پکڑے رہتا دوسرا پیچھے والی ڈوری پکڑے رہتا۔ راستہ میں کئی آدمی جن کے گلوں میں ڈولچیاں لٹکتی ہوتیں باری باری سے وہ سپریں اپنی ڈولچی میں لے لیتا۔ سپریں بہت وزنی ہوتیں ان کا اُٹھانا اور ہلانا ایک آدمی کیلئے دوبھر ہوتا۔ اس لئے تھوڑی تھوڑی دور پر یہ لوگ بدلتے جاتے ہیں۔ عوام بعض یہ کہتے کہ فلاں مقام کی سپر آرہی ہے۔ بعض کہتے اکھاڑہ آرہا ہے بعض سپروں کے ساتھ جلوس بھی ہوتے آگے ہاتھی کے کالے پھریروں کے نشان اور بعض کے ساتھ یا تو اونٹ پر نقارہ رہتا یا گھوڑے پر اور یہ شتر سوار نقابت کرتا ہوا نقارہ پر چوب مارتا تمام راستہ اسی طریقہ سے طے کرتا۔ نقابت کے بعض الفاظ جو یاد رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

سواری امام حسینؑ شہید کربلا کی ادب سے ملاحظہ سے قدم بڑھاؤ۔ اس کے بعد بینڈ باجا ہوتا۔ پھر چند ہاتھی کوتل کے ہوتے اس کے بعد گھوڑوں کی قطار پھر بینڈ باجا۔ پھر کچھ پیدل سپاہی اس کے بعد شہنائی بجانے والے جو سلام یا نوحہ بجاتے۔ اس کے بعد اکھاڑے کے سب شاگرد اور بھی اس محلہ کے لوگ سپر کے متصل چلتے۔ بعض سپریں دورخی کہلاتی تھیں۔ جن کے دونوں جانب

کنڈے سات یا نو ڈھالیں اور ایک ہی قسم کی صناعی دو جانب ہوتی تھی۔ ایک حیدری[1] ایک تعزیہ اور اس کے سپر بہت بڑے جلوس کے ساتھ نکلتی۔ تعزیہ تو جبرو ڈنڈے کا ایک محلہ جھاؤ گنج مہاراجہ جھاؤ لال کے نام سے مشہور ہے اس سے دو فرلانگ آگے جبرو ڈنڈے کا امام باڑہ ہے جسمیں عشرہ اول میں خصوصاً شب عاشورہ کو اندر باہر قابل دید روشنی ہوتی۔ شب عاشورہ سب ہی امام باڑوں میں بہت روشنی کیجاتی تھی۔ جبرو شاہ کوئی فقیر تھے اونہوں نے ابتدا میں یہاں تعزیہ رکھا تھا۔ اس محلہ کا نام جبرو ڈنڈیا ہو گیا ہے۔ اور جبرو ڈنڈے کا تعزیہ مشہور ہے۔ سپر جو بڑے جلوس سے نکلتی تھی اوس کو بڑی سپر بھی کہتے اور نوزر کٹرہ کی سپر بھی کہی جاتی ہے۔ دیولی گھاٹ کے محلہ میں یہ امام باڑہ واقع ہے۔ محلہ کا نام نوزر کٹرہ ہو گیا ہے۔ اسکی ایک وجہ تسمیہ یہ ہے۔ کہ نوزر میرزا صاحب مرحوم جنکا اوپر کہیں ذکر آچکا ہے بعد بربادی خاندان صفویہ جب وہ دہلی آئے تو۔ اکبر اعظم نے نوزر مرزا کو ہمایون کے محسن شاہ طہماسپ کے پوتے ہونے کی وجہ سے اپنے پاس بحیثیت مصاحب خاص کے عرصہ دراز تک رکھا اور برائے نام کوئی خدمت بھی تفویض کی تھی۔ شہزادہ نوزر مرزا کا دل دلی سے جب اوچاٹ ہوا تو کسی اور مقام پر جہاں کی آب و ہوا عمدہ ہو اور وفور نعمت ہو میوے اور ترکاریاں اقسام کی بافراط ہوں رہنے کا قصد کیا۔ لوگوں سے دریافت کیا کہ کونسا شہر ان صفتوں سے متصف ہے۔ لوگوں نے عظیم آباد کا نام بتلایا اکبر سے اپنا منشا ظاہر کیا۔ اکبر چار لاکھ آمدنی کی جاگیر التمغہ صوبہ بہار میں دینے لگا۔ شہزادہ مرحوم نے کہا کہ میں جاگیر لیکر کیا کروں گا۔ مجھے ان جھمیلوں سے کیا مطلب نقدی مقرر کر دی جائے۔ تو اکبر نے ماہانہ پچاس ہزار روپیہ خزانہ صوبہ داری بہار سے دینے کا انتظام کیا اور یہ عظیم آباد دار الامارت صوبہ بہار میں آکر رہ گئے۔ ایسے مخیر اور اولوالعزم تھے کہ پچاس کوڑیاں بھی مہینے کے اخیر میں نہیں بچتی تھیں۔ انہیں کا تصنیف کردہ یہ شعر ہے ؎

نوزر مسکین اگر زر داشتے ٭ ہیچ کس را بے نوا نگذاشتے

جب اکبر نے کہا کہ پچاس ہزار ماہانہ مقرر کرتا ہوں تو شہزادہ مرحوم نے کہا کہ مساکین اور اہل حاجت کے لئے یہ عطیہ تو کافی نہیں ہے۔ قدرشناس شہنشاہ مسکرائے اور کہا کہ اچھا بوقت ضرورت دیکھا جائے گا۔ اس سے ان کے مادہ بذل وجود پر روشنی پڑتی ہے۔ القصہ مرتے دم تک عظیم آباد میں بڑے کروفر سے زندگی بسر کی اور سخاوت کے دریا بہائے۔ نوزر کٹرہ کی سپر میں ایک علم بیکار لگا ہوا ہے۔ اس کے متعلق متحقق روایت یہ ہے کہ ایک شب کو پچھلے پہر شہزادہ مرحوم نے ایک

---

[1] حیدری کی سپر کہلاتی تھی جس میں ذوالفقار حیدری کا نمونہ سپر کے اوپر بیچ میں نصب کیا جاتا تھا۔

خواب میں امام حسینؑ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ فرماتے ہیں ۔ دریا گنگا میں فلاں جانب جو ایک دیارا ہے جہاں کا پانی خشک ہو کر چھوٹا سا جزیرہ نکل آیا ہے وہاں ایک متبرک علم ہے تم جا کر اوسے لے آؤ اور اپنے عاشور خانہ میں اس کو رکھو ۔ تمہارے لئے باعث برکت ہوگا ۔

چنانچہ یہ اسی وقت اُٹھے ان کی محلسرائیں لب دریا بمقام دیولی گھاٹ تھیں انہوں نے کھودنے وغیرہ کے کچھ اوزار اپنے ساتھ لئے اور یکہ وتنہا کنارہ پر سے جو کشتیاں ہمیشہ لگی رہتی تھیں اُن میں سے ایک لکیر خود کھیتے ہوئے اس مقام پر پہونچے جہاں کا پتہ ونشان حضرت سیدالشہدا علیہ السلام نے اُنہیں بتلایا تھا زیادہ کھودنے بھی نہیں پائے تھے کہ وہ علم مبارک نکل آیا ۔ اور اوسے اپنے ساتھ لے آئے اور اپنے امام باڑہ میں نہایت طہارت کے ساتھ اس کو رکھا ۔ وہ کئی پشتوں تک ان کے ہاں رہا اور میرے شباب تک انہیں کی نسل میں نواب مرزا مرحوم کے قبضہ میں تھا ۔ جن کو نوزر کٹرہ کے امام باڑہ کی تولیت تھی ۔

بڑی سپر اور چمر وڈنڈیا کا تعزیہ اس شان وشوکت سے اور ایسے جلوس کے ساتھ نکلتا تھا جس کی لمبان ڈیڑھ دو میل ہوتی تھی ۔ پچاسوں ہاتھی کی قطار اور سیکڑوں ساز وَ اراق کے گھوڑے پیدل کی پلٹن رسالہ کے سوار بینڈ باجا ۔ گھوڑوں پر پیدل بھی ۔ مسل بڑے سلیقہ سے جمائی جاتی سب کے پہلے بڑے بڑے ہاتھیوں پر سیاہ پھریرے ۔ شتر پر ڈنکا ۔ شتر بواز نقابت کرتا ہوا ۔ گھوڑوں پر بینڈ باجا ۔ چند ہاتھیوں پر ماہی مراتب نقرئی ایک رسالہ سواروں کا اس کے بعد پیدل بینڈ باجا ۔ پیدل سپاہیوں کی پلٹن ہاتھیوں کی قطار پچاس ساٹھ ہاتھی ۔ جن میں بیس پچیس ہودے اور عماری والے پھر کوتل گھوڑوں کی قطار ستر اسی شتر گھوڑے اور سب چاندی کے اور کچھ سونے کے زیور سے آراستہ جن پر چار جامے کارچوبی پڑے ہوئے تختوں پر کنول روشن ۔ فی تختہ چھ یا آٹھ کنول دوہری قطار مزدوروں کے ہاتھوں میں کنول پچاس ساٹھ خاص بردار اور جھنڈی بردار مرثیہ خوانوں کی جماعت اس کے ساتھ چمر وڈنڈے کا تعزیہ یا بڑی سپر تعزیہ اور سپر کے ساتھ بہت سے شرفا امرا ۔ ننگے سر ننگے پاؤں آستین چڑھی ہوئی گریبان کھلا ہوا ۔ روشنی کا انتظام یہ رہتا تھا ۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے ایک مشعلچی ۔ جہاں روشنی کے کنول نہیں ہوتے ۔ عماریوں اور ہودوں پر بھی شیشہ کے کنول سرخ وسبز رنگ کے روشن آویزاں ہوتے یہ بھی عجیب اتفاق کہ چمر وڈنڈے کے متولی نواب سید محمد حسن خان صاحب عرف محمد نواب صاحب تھے ۔ اور بڑی سپر کے امام باڑہ کے متولی نواب مرزا صاحب مرحوم تھے ۔ آخر سر از ذکر

نواب نوذر مرزا مرحوم کے پوتے کے نواسے تھے۔ مگر یہ دونوں نواب حقیقی چچازاد بھائی تھے۔ نواب مرزا مرحوم کے والد نواب محمد علیخاں کی شادی نوذر مرزا کے خاندان میں ہوئی تھی۔ مگر دادا دونوں نوابوں کے ایک تھے۔ اور دونوں کی بیبیاں سگی بہنیں اور دونوں بھتیجی دونوں میں آپس کا رشک صرف اسی معاملہ میں کہ جلوس میرا بڑا رہے۔

ماہ محرم کے ایک ماہ قبل تمام صوبہ بہار میں راجاؤں اور نوابوں بڑے بڑے زمینداروں کے ہاں جسقدر ہاتھی گھوڑے ہوتے تھے ان لوگوں کے ملازمین پہنچکر جسکا پہلے ٹھہرا آٹھ دس دن قبل سے گھوڑے ہاتھی لے آتے۔ اتنے جانوروں کو روزآنہ نو دس دن تک کھلانا وہ بھی ہاتھیوں کو کچھ آسان نہیں ہے۔ چہر و ڈنڈے کے اخراجات دو چند اسلئے ہوتے تھے کہ تعزیہ محرم کی پانچویں کو گشت کو نکلتا۔ بروز عاشورہ۔ بڑی سپر صرف ایکدفعہ روز عاشورہ شب یازدہم نکلتی۔ دونوں شاہ ارزانی صاحب کی درگاہ میں پہلام کو جاتے۔ پانچویں تاریخ تو صرف چہر و ڈنڈا نکلتا۔ اور درگاہ تک نہیں جاتا۔ البتہ پہلام کے لئے بروز عاشورہ دونوں جلوس درگاہ جاتے۔ گورنمنٹ سے یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ ایک سال چہر و ڈنڈا پہلے نکلے اور ایک سال بڑی سپر نکلے۔ ان دونوں جلوسوں کو دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ پٹنہ آتے اور جن راستوں سے یہ جلوس جاتے دورویہ مکانوں میں سڑکوں پر لوگ بھرے رہتے یا تو اپنے دوستوں کے مکانوں کیلئے جوان سڑکوں پر ہوتے کئی روز بیشتر سے کہہ رکھتے یا بکرایہ لیتے اور پچاسوں روپئے کرایہ دیتے۔ روز عاشورہ خصوصاً ان سڑکوں پر جدھر سے یہ جلوس نکلتے متعدد سبیلیں رکھی جاتیں۔ بعض سبیلوں کی آرایش قابل دید ہوتی جھاڑ فانوس رنگ برنگ کے کاغذ کے پھول پتوں سے کھمبے وغیرہ سجے جاتے پھر بعض سبیلوں پہ اقسام کے شربت۔ لیمون۔ کونلا بشرطا موسم نارنگی کیسرو۔ دودھ کا شربت کیوڑہ پڑا ہوا ہوائیاں چھڑکی ہوئیں نہایت معطر سبیلوں پر کھڑے ہوئے لوگ آوازیں لگاتے۔ کوئی پیاسا خالی نہ جائے۔

پانی پیو تو یاد کرو پیاس امام کی ٭ پیاسو سبیل ہے یہ شہیدوں کے نام کی

بڑی سپر کے پیچھے پیچھے ایک چھکڑے پر سبیل ہوتی۔ بڑے بڑے مشکوں میں برف دیا ہوا شربت ہوتا۔ اور کئی آدمی راہ چلتوں کو شربت پلاتے جاتے دوکانوں پر سے اُٹھ اُٹھ کر لوگ آآ کر شربت پیتے۔ یوں تو سارے شہر کے گلی کوچوں میں جابجا چھوٹی بڑی سیکڑوں سبیلیں لگائی جاتیں۔ بعض میں بڑی بڑی ضیاعیاں کی جاتیں - محرم کے ذکر کے سلسلہ میں مجلسوں کا ذکر ضروری ہے۔

ذکر مجالس

شاذ ہی کوئی شیعہ گھرانا ہوگا جہاں مجلس مظلوم کربلا نہوتی ہو عشرت زدہ لوگ کچھ نہیں تو چند علم کھڑے کرکے اور کاغذ کا ایک تعزیہ مکان کے ایک پاک صاف گوشہ میں رکھ کر حسین حسین کرتے تے۔ عزاداروں کے مکان کی عشرہ اول میں یہہ شناخت ہوتی کہ دروازہ پر یا امرا کے بڑے پھاٹکوں پر دو سیاہ یا سبز و سرخ پھریروں کے دو علم نقرئی یا برنجی لگائے جاتے ہیں۔ بیچ میں ایک لکڑی لگا کر اس میں راتوں کو قندیلیں روشن کی جاتیں۔ بقول شاعر۔

ہر کجا چشمہ بود شیریں ؎ مردم و مرغ و مور گرد آیند

عظیم آباد میں دولت بھی تھی اور قدر و جوہر شناسی کا مادہ طبقۂ امرا میں بدرجہ اتم تھا۔ اسلئے مرثیہ گو اور مرثیہ خوان دور دور سے کھینچ کر عشرۂ اول شروع ہونے کے چند روز پیشتر عظیم آباد پہنچ جاتے۔ بعض سرکاروں میں جو خوانندہ حدیث خوان یا روضہ خوان یا سوز خوان یا تحت اللفظ خوان ایکدفعہ مقرر کرلئے گئے۔ سال بسال وہی لوگ پڑھتے خود عظیم آباد میں مرثیہ خوانوں کی کمی نہ تھی مگر بلحاظ اکتساب ثواب و اظہار ہمدردی و مسافر نوازی باہر والے بھی مقرر کرلئے جاتے دولتمندوں کے ہاں دو دو تین تین جوڑ تکیہ کے ذاکر یعنی سوز خوان و مرثیہ خوان پڑھتے پھر مہر کے چند ذاکر کوئی روضہ خوانی کرتا کوئی حدیث پڑھتا۔ کوئی تحت اللفظ پڑھتا۔ آخر میں نوحہ خوان اور ماتم کرنے والوں کی جماعت ہوتی۔ اس بارہ میں جو دریا دلی روسائے عظیم آباد نے دکھائی اسکی نظیر شاید ہی لکھنو یا مرشدآباد میں دیکھی گئی ہوگی۔ میر ببر علی انیس اعلی اللہ مقامہ کی شہرت کا باعث عظیم آباد ہوا۔ میں چند روسا کا ذکر کرتا ہوں۔

نواب قاسم علیخاں مرحوم کی سرکار میں نواب صاحب کی زندگی تک میر انیس صاحب پڑھا کئے عشرہ اول کی نو مجلسیں نہم تک اور ایک مجلس تیجہ کی میر صاحب پڑھتے تھی اسکے صلہ میں میر صاحب کو آٹھ ہزار روپیئے۔ اور ایک دوشالہ دو تین سو روپیہ کا تیجہ کی مجلس ختم ہونے کے بعد کشتیوں میں رکھ کر کشتی پوش پڑا ہوا میر صاحب کی قیام گاہ پر بطور نذر کے یہ کشتیاں بھیجدی جاتیں۔ انکی خاطر داری اور تواضع اور احترام و اکرام علاوہ صاحب خانہ کے کل امرائے شہر اس درجہ کرتے تھے کہ میر صاحب بہت محظوظ ہوتے۔ نواب سید لطف علیخان مرحوم برادر خورد نواب قاسم علیخان مرحوم کے ہاں میر انس صاحب مرحوم میر انیس صاحب کے منجھلے بھائی جب تک میر انس مرحوم زندہ رہے وہ پڑھا کئے۔ ان کو تین ہزار روپیے ملتے تھے۔ میر انس کی وفات کے بعد ان کے فرزند میر ہادی وحید آیا کئے۔ نواب لطف علیخان مرحوم کے

انتقال کے بعد تاحیات میر وحید نواب صاحب کے فرزند بادشاہ نواب مرحوم کے ہاں پڑھتے رہے۔ جب میر وحید صاحب کا انتقال ہو گیا تو اُن کے فرزند بادشاہ نواب کے ہاں پڑھتے تھے۔ نواب بہادر نواب سید ولایت علی خاں مرحوم کی سرکار میں میر مونس مرحوم جب تک زندہ رہے پڑھتے رہے اِن کو بھی تین ہزار روپئے ملتے تھے۔ میر مونس مرحوم کے بعد میر محمد صاحب سلیس خلف میر انیس مرحوم پڑھتے تھے۔ اور شیخ ولایت علی مرحوم کے ہاں میر خورشید علی نفیس خلف اکبر میر انیس مرحوم دولہ صاحب عروج کے والد تاحیات شیخ ولایت علی مرحوم پڑھتے رہے۔ پندرہ سو ان کو ملتے تھے۔ امام باندی بیگم صاحبہ اعلی اللہ مقامہا جن کی فیاضی دور دور مشہور ہے۔ مرزا دبیر صاحب مرحوم کو تاحیات پڑھواتی رہیں۔ مرزا صاحب کو تین ہزار روپئے ملتے تھے۔ مرزا دبیر کے انتقال کے بعد مرزا اوج بیگم صاحبہ کی زندگی تک اور ان کے بعد جب تک زندہ رہے بیگم صاحبہ کے امام باڑہ میں پڑھتے رہے۔ پھر اُن کے فرزند مرزا طاہر رفیع پڑھنے لگے بیگم صاحبہ مرحومہ نے ایک لاکھ سالانہ کی آمدنی کا وقف کیا۔ اور وقف نامہ میں یہ بھی لکھ دیا کہ مرزا دبیر صاحب کی اولاد ذکور میں جو کوئی جب تک زندہ رہے عشرہ اول میں بیگم صاحبہ کے امام باڑہ میں پڑھے۔ اس اولوالعزمی اور وضع داری کا کیا حساب ہے۔

مرزا دبیر مرحوم عظیم آباد کے روسا کی قدردانیوں سے بہت خوش رہے۔ ہر سال ایک رباعی یا قطعہ شہر عظیم آباد کی اور روسا کی تعریف میں ضرور پڑھا کرتے ایک رباعی کا ایک مصرعہ مجھے یاد رہ گیا ہے ؎

گو گیا گذرا ہے لیکن پھر عظیم آباد ہے

میر صاحب اور مرزا صاحب کی مجلسیں بڑے معرکے کی ہوتی تھیں۔ سنی و شیعہ ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ پھر اُن کے شاگردوں میں اور میریان و مداحان مرزا اور میر میں آپس کی نوک جھوک اور چخ پخ چلتی تھی۔ محرم کے زمانہ میں بہت سے ایرانی واقعہ خوان و روضہ خوان بعض امرا کے ہاں فارسی زبان میں پڑھتے تھے۔ جن مجلسوں کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ یہ سب دن کی مجلسیں تھیں۔ کہیں صبح کے دس بجے سے شروع ہوتی کسی جگہ بارہ بجے کے بعد سے کسی جگہ دو کے بعد سے کسی جگہ چار کے بعد سے اوپر کی بیان کی ہوئی مجلسوں میں صرف شیخ ولایت علی مرحوم کی مجلس جہاں نفیس مرحوم پڑھتے تھے شب کے آٹھ بجے ہوتی تھی۔ ان بڑی مجلسوں کا انتظام ایسا ہوتا تھا کہ وقت لڑنے نہ پاتا۔ اور ان مجلسوں میں زیادہ خوانندے نہیں ہوتے تھے۔ تکیہ کا صرف ایک ذاکر تبرکاً دس پندرہ منٹ اور ممبر پر ایک شاگرد یا فرزند یا بھائی ان بڑے مرثیہ گویوں کا چند منٹ کیلئے پیش خوانی کرتا اور

پھر میر صاحب اور مرزا صاحب منبر پر چلے جاتے ڈیڑھ دو گھنٹہ سے کم نہیں پڑھتے سامعین کی غرض بھی یہی ہوتی تھی کہ ان حضرات کا کلام فصاحب التیام سنیں۔ شب کو جن جن لوگوں کے ہاں مجلسیں ہوتی تھیں روشنی کا انتظام قابل دید ہوتا اور عشرہ مبارک میں مجلسوں کے بعد جو حصے تبرک کے تقسیم ہوتے تھے اُن میں کسی کے ہاں قورمہ اور نان آبی تنوری کسی کے ہاں شیر برنج کی قفلیاں کہیں مٹھائیاں۔ جاڑوں میں چائے کلچے یا شیرمالیں۔ گرمیوں میں برف دار شربت وغیرہ طعام داری اسقدر ہوتی تھی کہ غربا دس دن چولھا نہیں جلاتے تھے۔ بعض محلوں میں بقدر کثرت سے مجلسیں ہوتی تھیں کہ شام کے سات سے شب کے دو بجے تک حسینی سوگواروں کو دورہ کی مجلسوں سے فرصت نہیں ہوتی۔ شب عاشورہ سارا شہر بقعۂ نور بن جاتا۔ گھروں میں سے زنانہ ماتموں کی فلک شگاف آوازیں حسینؑ حسینؑ کی دلوں کے ٹکڑے کرتیں وہ تمام شب تسبیح و تہلیل میں وہ مومنین جو بوجہ پیرانہ سالی وضعف کے پیدل امام باڑوں کی زیارت کے لئے نہیں جا سکتے ورنہ کم عمر و جوان شرفا روسا رکا جھنڈ کا جھنڈ ننگے سر ننگے پاؤں آستین کہنیوں تک چڑھی ہوئی ہاتھوں میں تسبیح گریباں کھلے ہوئے سیاہ یا سبز لباس پہنے اس امام باڑہ سے اُس امام باڑہ جاتے دکھائی دیتا جو لوگ منتیں مانگتے وہ چہل منبری کرتے پھرتے یعنی چالیس امام باڑوں کے منبروں میں منت کا ناڑہ اور عرضیاں چڑھاتے۔ پیکوں کے جھنڈ دوڑتے ہوئے امام باڑوں میں جا جاکر باواز بلند کچھ پڑھتے۔ پیک سے غرض قاصد حسینؑ وہاں کے سنی و شیعہ زیادہ تر سنی جن کے اولادیں نہیں ہوتیں وہ منت مانگتے کہ یا امام حسینؑ خدا سے عرض کرکے بیٹا دلوائیے تو فقیر بنائیں گے تو جب خدا اولاد نرینہ دیتا تو مدت العمر محرم میں فقیر بنتا۔ فقیر کا خاص لباس ہوتا بتی دار پگڑی نیلے اور سفید رنگ کی اور اوسی وضع کا کمر بند پاؤں میں گھونگرو ہاتھوں میں مورچھل پانچ پانچ چھ چھ کا غول دوڑتا ہوا تعزیہ خانوں میں جاتا اور ایک ان کا استاد ہوتا وہ پہلے کچھ پڑھتا اس کا دوسرے ساتھ دیتے پھر تعزیوں اور علموں پر مرچھل کی ہوا دیکر چل دیتے۔ اور سر پیٹتے واویلا صد واویلا کہتے جاتے۔ سپریں بھی پہلام کے لئے صبح کے سات سے شب کے دس بجے تک جاتیں ان کا الگ تانتا لگا رہتا۔

چمروڈنڈیا اور نوذرکٹرہ نکلنے کے قبل تک سب سپریں نکل جاتیں یہ لوگ اکھاڑے والے عموماً پہلوان ہوتے۔ بعض وقت سخت دنگا اور فساد آپس میں کرتے وہ اس طرح کہ ایک سڑک سے ایک سپر آرہی ہے اور ایک تراہے پر اوس کا نشان مڑنے لگا۔ دوسری طرف ایک اور سپر کا نشان

پہنچی۔ ایک اکھاڑہ والا کہتا میرا نشان آگے بڑھے، دوسرا کہتا میرا نشان آگے جائے گا۔ یعنی سپر آگے جائے گی، کیونکہ نشان بڑھے تو جلوس اور سپر بڑھے۔ غرض ونگہ فساد اسقدر بڑھتا کہ سرپھٹول تک نوبت پہنچتی۔ جوش وخروش میں پولیس جو بیچ بچاؤ کرتی تو اس کو بھی مار کر دُھن دیتے۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ جاہل طبیعت اور اوسپر ورزشی جسم۔ نتیجہ تو خوش آب وہوا مقام میں رہنے سے اور کچھ ڈنڈ پیلنے اور کثرت کرنے سے کثرت تولید خون کے سبب لڑنے بھڑنے سے ڈرتے نہ تھے۔ بعض لوگوں کے ہاں تعزیہ داری اربعین تک ہوتی اور برابر مجلسیں ہوتی رہتیں عشرہ محرم کی ساتویں کو امام قاسمؑ کی مہندی بعض امام باڑوں سے جلوس کے ساتھ نکلتی۔ آٹھویں کو حضرت عباسؑ کا علم مبارک نکلتا سیکڑوں آدمیوں کا غول ماتم کرتا ہوا نکلتا شب دہم کو بعض جگہ سے تابوت بعض جگہ سے ذوالجناح نکلتا۔ جہاں ہندوؤں کے بہت سے تہواروں کا ذکر کیا ہے، مسلمانوں کے تہوار دو تین اور ایک آدھ کا ذکر غیر مناسب ہوگا۔

ذکر نیاز مثلاً رجب کے کونڈے جو حضرت علیؑ کی پیدائش کے مہینے میں لوگوں کے ہاں مہینہ بھر کسی نہ کسی تاریخ میں ہوتے ہیں۔ شبرات کی فاتحہ سوا وہابیوں کے ہر فرقہ وطبقہ کا مسلمان دیتا ہے۔ عموماً حلوا روٹی پر نذر ہوتی۔ حلوا میٹھے کی لوزون اور شیرمالوں پر فاتحہ دیجاتی۔ بعض لوگ صرف خیرنی پر نذر دیتے جن کے ہاں باقاعدہ مردوں کی فہرست رہتی بہت دیر تک فاتحہ خوانی ہوتی۔ ۱۴۔ امام حضرت مہدی علیہ السلام کی مہندی روشن کی جاتی وہ یہ کہ کاغذ اور کھپاچوں کی کشتی نما ایک چیز بنتی سبز سُرخ موم کی بتیاں روشن کی جاتیں۔ اور مالیدہ بھی بنا کر رکھا جاتا وہ اس لئے کہ صاحب الامر حضرت قائمؑ کی ولادت کی وہی تاریخ ہے۔ چھ سات سال کی عمر تک حضرت غیبت صغرا میں تھے خاص خاص لوگوں سے جو حضرت کے پیرو تھے۔ ملتے تھے ورنہ عباسی خلیفۂ وقت متوکل باللہ کے خوف سے جس نے دو دفعہ حضرت کی جان لینے کی کوشش کی روپوش رہتے تھے۔ پھر بالکل غائب ہوگئے اور اب غیبت کبریٰ میں ہیں۔ حالت غیبت کبریٰ میں بھی خاص خاص لوگوں سے ملے ہیں ان کا زندہ رہنا اس طرح سے ہے جیسے حضرت عیسیٰؑ کا فلک چہارم پر یا حضرت خضر کا۔ اِدھر نیاز سے فرست ہوئی کہ بچوں نے آتش بازی چھوڑنا شروع کی جو دو ایک دن پہلے سے منگوا کر رکھی جاتیں اور بزرگ عزیزوں کے ہاں سے جو تحفتاً آتی وہ بھی چھوڑی جاتی۔ بچے علاوہ آتش بازیوں کی نقدی عیدی بھی اپنے بزرگوں سے لیتے۔ تین چار روز تک شام سے شب کے آٹھ نو بجے تک آتش بازیوں کے چھوڑنے کا سلسلہ رہتا۔ شب برات میں بعض لوگوں کے ہاں

چراغاں ہوتا۔ اندر سے باہر تک سیکڑوں چراغ روشن کئے جاتے اور بچوں کی سلامتی کے چراغ کہلاتے سینوں میں لگ لگ کر آتے قبل فاتحہ شروع ہونیکے بچوں سے کہا جاتا اپنے ہاتھ سے ہی روشن کرو جتنے بچے ہوتے دو دو چراغ میں بتیاں روشن کرتے۔ باقی چراغوں کو ملازم روشن کرتے۔ جب نذر فاتحہ خوانی شروع ہوتی سینیاں چراغوں کی اُٹھادی جاتیں اور ملازمین چھتوں پر منڈیروں پر روشن کئے ہوئے چراغ رکھ دیتے۔ دوسرے دن جلے ہوئے چراغ اُٹھوا کر منگوائے جاتے اور تیل بتی ڈلوائی جاتی اور وہی بچے پھر روشن کرتے اُتنے ہی چراغ جتنے پہلے دن روشن کئے تھے بقیہ چراغوں کو ملازمین روشن کرکے جہاں جہاں پہلے دن رکھے گئے تھے۔ دوسرے روز بھی وہیں رکھوا دے جاتے۔ ہر صوبہ میں ہند کے شبرات کم و بیش اسی طریقہ سے منائی جاتی ہے۔

پٹنہ میں شبرات کے دوسرے دن اور تیسرے دن پیشہ ور آتشباز اقسام کی آتش بازیاں بنا کر مقررہ مقامات میں کھلے میدانوں میں اپنی آتشبازیاں چھوڑتے اور اپنی ہنرمندی دکھاتے۔ محلہ والے ادنےٰ اعلےٰ جمع ہوتے۔ بعض آتشباز اپنے محلہ کے امیروں اور خوش باش لوگوں کو بمنت مدعو کرکے اور ان لوگوں کے لئے کرسیوں کا انتظام کیا جاتا شب کے نو بجے سے ایک بجے تک یہ تماشہ رہتا۔ شاہی مدرسہ آصف خان کا صحن بہت وسیع ہے۔ وہاں تین چار آتش باز جمع ہوتے۔ ایک کے بعد ایک اپنے اپنے بنائے ہوئے نمونے دکھاتا اقسام کی آتش بازیاں گلریز پھلجھڑیاں۔ نسرین۔ نسترن۔ جوہی۔ انار ہتاشے۔ آسمان تارہ۔ ستارہ منڈل۔ ہوائیاں اقسام کی چھوڑی جاتیں۔ اور خراج تحسین حاصل کیا جاتا۔ نسرین و نسترن و جوہی جن آتشبازیوں کے نام ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے اُن میں سے اسی قسم کے پھول نکلتے۔ چھچھوندر ایک قسم کی آتشبازی ہوتی آگ لگا کر اس کو پھینک دیتے۔ مثل چھچھوندر کے چھو چھو کرتی ہوئی وہ دوڑتی۔ علاوہ پیشہ ور آتشبازوں کے بہت سے شرفا شوقیہ آتشبازی بناتے اور دوستوں کو دعوت دے کر بلاتے شب کو کھانا کھلاتے اور اپنی صناعی دکھاتے خصوصاً مغل پورہ کے رہنے والے علی مرزا صاحب مرحوم تھے آغا صاحب نے مرزا صاحب مرحوم کو اس میں کمال حاصل تھا۔ پندرہ پندرہ بیس بیس روز تک مع ملازمین کے آتشبازی بنانے میں مصروف رہتے۔ قلمی شورہ۔ گندھک کوئلہ وغیرہ پسواتے۔ بارود تو بنی بنائی بازار سے آتی بڑی ترکیب سے بوندا بنایا جاتا جس سے رنگ برنگ کے پھول نکلتے۔ مثل مشہور ہے۔ شورا شور کرے گندھک زور کرے بوندا لے اوڑے۔ موسم برسات میں بھادوں کے مہینے میں بعض مسلمان گھرانوں سے خواجہ خضر کے بیڑے نکلتے اور دریا میں بہا دیے جاتے۔ بیڑے سے غرض چھوٹی بڑی

کشتیاں علی قدر حیثیت کاغذ اور بانس کی کھپاچوں سے بنائی جاتیں۔ ولیا۔ روے اور شکر وغیرہ سے پکوا کر رکابیوں میں رکھ کر کشتی میں رکھ دیتے اور باجہ کے ساتھ یعنی روشن چوکی بجتی ہوئی اور مامائیں گاتی ہوئی یہ بیڑا کہار کے سر پر ہوتا۔ گنگا میں لے جا کر چھوڑ دیا جاتا وہ بہتا ہوا جاتا اس میں لوکیاں لٹکتی رہتیں جس میں روشنی کر دی جاتی ایک خاص نظارہ ہوتا بہت سے گھروں کے بیڑے گنگا میں بہتے ہوئے اچھے معلوم ہوتے مامائیں جو بیڑے کے ساتھ جاتیں وہ یہ گیت گاتی جاتیں

پی بسے مور کون نگریا ٭ خواجہ خضر کو میں بیڑا چڑھاوں ٭ پاؤں مراد چڑھاؤں چدریا

یہ سب باتیں دولت و ثروت کے تھے۔ اس زمانہ میں امرا و شرفا کو شطرنج و چوسر اور شاہ جنگ گنجیفہ کا بہت شوق تھا۔

مشاعرے

مشاعروں کی صحبتیں بھی وقتاً فوقتاً متعدد لوگوں کے ہاں ہوتی رہتیں۔ شعر و سخن کا چرچا عام تھا۔ خصوصاً کنور سکھہ راج بہادر آنجہانی کے ہاں میرے بچپنے میں کئی سال جو مشاعرے ہوئے ویسے مشاعرے نہ کبھی دلی میں ہوئے اور نہ لکھنو میں۔ بلا مبالغہ ہزاروں روپئے ایک ایک مشاعرہ میں صرف ہوتے تھے۔ شب کے نو بجے سے مشاعرہ شروع ہوتا دوسرے روز صبح کے دس گیارہ تک۔ پھر دوسرے دن شب کے نو یا آٹھ سے بقیہ شعرا جو رہ جاتے وہ پڑھتے اور تمام رات یہ صحبت رہتی۔ دور دور مقامات سے شعرا مدعو کئے جاتے کنور صاحب کے مہمان کی حیثیت سے تین چار روز رہتے اور ان کی مہمانداری نہایت تکلف سے کی جاتی۔ صوبہ بہار کے مختلف شہروں کے مثلاً۔ گیا۔ آرہ۔ مظفر پور۔ مونگیر وغیرہ کے مشہور شعرا لکھنو کے کلکتہ کے شعرا مدعو کئے جاتے سب مہمانوں کو نہایت فراخدلی سے کھانا شب کو کھلایا جاتا بعد اس کے محفل میں آکر یہ لوگ بیٹھ جاتے۔ عموماً موسم بہار میں یہ صحبتیں زیر سما ہوتیں۔ بیلے کے پھولوں کے گجرے تقسیم کئے جاتے گلوریاں خوشبودار بڑی بڑی کشتیوں میں لائی جاتیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے گلوریاں تقسیم ہوتیں متعدد حقے رکھے جاتے تمباکو بھی وہ نفیس کے دھوئیں سے دماغ معطر ہو جاتا۔ پہلے صاحب مشاعرہ اپنی غزل سناتے اس کے بعد نومشق شعرا یکے بعد دیگرے اپنا اپنا کلام سناتے پھر بڑوں کی باری آتی۔ چوٹی کے چند شعرا کی باری صبح کو ہوتی۔ ان مشاعروں کے لئے کچھ قواعد بنائے گئے تھے۔ اس کا بڑا لحاظ رہتا کہ کوئی شاعر طعن آمیز کنایتاً بھی کوئی شعر کسی دوسرے شاعر کی نسبت جس سے چشمک رہتی نہ پڑھنے پائے۔ اگر طنزاً ایسا کلام کسی نے پڑھا تو صاحب مشاعرہ اس کے قریب جا کر اوس کو

روک دیتا چپکے سے کان میں کہتا کہ ازراہ مہربانی ایسا کلام یہاں نہ پڑھئے۔ اگر دوبارہ ایسی حرکت اس سے ہوتی تو فہرست سے نام خارج کر دیا جاتا اور آئندہ دعوت نامہ نہ بھیجا جاتا۔ موسم بہار کا زمانہ ہوتا گو گرمیاں تیز نہ ہوتیں۔ تاہم کہاروں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے پنکھے ہوتے اور اہل محفل کی پشت پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے یہ کہار کھڑے ہو کر پنکھے ہلاتے۔ ہر ایک کہار تین چار گھنٹے مسلسل پنکھا جھلتا جب وہ تھک جاتا اس کی جگہ دوسرا کہار لیتا۔ کنور سکھراج بہادر بہت بڑے رئیس تھے۔ ماہانہ ہزاروں کی آمدنی زمینداری سے تھی۔

کنور صاحب آنجہانی راجہ پیارے لعل الفتی کے پوتے تھے۔ بادشاہ نواب صاحب مرحوم نے جو کہ از روسا رعظام میں تھے کئی سال مشاعرے اسی تزک و احتشام سے کئے تھے۔ ان کے بھی ہزاروں روپئے کھپ جاتے تھے۔ کنور صاحب کے مشاعروں کے ٹکر کے ہوتے تھے۔

ذکر خانقاہیں یوں تو قرب و جوار میں پٹنہ کے بہت سی قدیم خانقاہیں تھیں جہاں حال قال کی محفلیں ہوتیں اور مریدان طریقت کو تصوف و عرفان و روحانیات کی تعلیم دی جاتی جو مریدان باصفا مرشد کی خدمت کر کے اُن سے کچھ حاصل کرنے کا شوق رکھتے وہ خانقاہوں میں رہتے ورنہ بروز محفل حال قال اور حلقہ ذکر و شغل میں شریک ہو جاتے پٹنہ کے قرب و جوار کی خانقاہوں میں منیر شریف پھلواری شریف۔ دیوہ شریف وغیرہ کی خانقاہیں مشہور و معروف اب بھی ہیں جو شہر عظیم آباد سے آٹھ نو میل کے فاصلہ پر ہیں۔ خاص شہر عظیم آباد میں محلہ متین گھاٹ شاہ گھسیٹا صاحب کی خانقاہ میرے بچپنے میں حضرت شاہ میاں جان صاحب۔ اس خانقاہ کے سجادہ نشین تھے شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے اُن کا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا۔

ہو گئے جو کسی ٹھکانے کے ﴿ نہ کہیں آنے کے نہ جانے کے

شیخ مٹھا کی گڑھیا کے قریب حضرت شاہ امیر الحق صاحب کی قدیم خانقاہ تھی۔ میرے شباب میں اُن کے فرزند شاہ رشید الحق صاحب سجادہ نشین تھے۔ محلہ دوندی بازار میں مولانا شاہ امیر الحسن صاحب کی خانقاہ بھی تھی۔ محلہ سلطان گنج کے قریب حضرت شاہ ارزانی صاحب کی درگاہ اور بہت قدیم خانقاہ ہے اس کا ذکر بہ حیثیت کربلا کے آچکا ہے کیونکہ وہاں کربلا بھی ہے۔ جہاں تقریباً سارے شہر کے تعزیے مدفون ہوتے ہیں۔ بروز عاشورہ محرم لاکھ ڈیڑھ لاکھ خلقت کا اژدہام وہاں رہتا تھا۔ حضرت شاہ ارزانی قدس سرہٗ درویش باکرامت تھے۔ اور حضرت امام حسینؑ سے دلی عشق رکھتے تھے۔ اس نامی خانقاہ کا یہ دستور ہے کہ یہاں کے صاحب سجادہ لنگوٹ بند ہوتے ہیں۔ یعنی عمر بھر

عورت سے سروکار نہیں رکھتے۔ میں نے بزرگوں سے سنا کہ کسی زمانہ میں دکن کی طرف یا پچھم جانے والے مسافروں کا حد ترحسن۔ یہی مقام تھا پہلے چندروز یہاں قیام کرلیتے تو آگے بڑھتے۔ اس درگاہ کے علاقہ او قاف کی آمدنی اسّی ہزار سالانہ بچت کی ہے۔ حکام اسلام و امرا برابر زمینداریاں نذر کرتے تھے۔ خصوصاً مشہور صوبہ دار بہار و بنگال و اڑیسہ نواب مہابت جنگ علیؒ وردی خان کو بڑی عقیدت تھی۔ اسی طرح ہیبت جنگ مرحوم کو ان لوگوں نے فقیر کدہ کو امیر کبیر کی ڈیوڑھی بنادی تھی۔ باشندگان خانقاہ کو دوازدہ ماہ کھانا ملتا ہے۔ محرم میں مجلس عزائے شہید کربلا بڑی دھوم سے ہوتی۔ اور جب تک جمرو ڈنڈے کا تعزیہ اور نوور کٹہرہ کی بڑی سپر درگاہ پہنچ کر پہلام نہولے صاحب سجادہ فاقہ شکنی نہیں کرتے تھے روزہ نہیں رکھتے تھے۔ جو فرقہ اثنا عشری میں ممنوع ہے صرف فاقہ کرتے تھے۔ میرے بچپنے میں وہاں کے صاحب سجادہ شاہ غلام نجف صاحب تھے۔ اور اسم باسمی تھے۔ حضرت علیؑ کے غلامان خاص میں تھے۔ میرے والد مرحوم سے اور ان سے بہت مراسم تھے۔

عظیم آباد میں بہت سے بزرگان دین کے مزارات ہیں۔ منجملہ جن کے حضرت منصور شاہ و حضرت معروف شاہ بہت مشہور و معروف ہیں۔ شہر کے پورب گوشہ جنوب میں ایک بلند ٹیلے پر شاہ منصور صاحب کا مزار ہے۔ یہ بڑے صاحب کرامت بزرگ ہیں یہ ایک واقعہ ہے کہ ایسٹ انڈیا ریلوے لائین ابتداً جب بنائی جارہی تھی تو اس ٹیلہ کے منہدم کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی۔ تو جس مزدور نے پہلا پھوڑا مارا وہ مرگیا دوسرے نے جب پھوڑا مارا وہ بھی جان بحق تسلیم ہوا۔ تو پھر دوسرا کوئی مزدور ٹیلا توڑنے پر راضی نہ ہوا۔ تو ایک انگریز انجینیر نے غصہ میں آکر کئی پھوڑے مارے اس کا پاؤں پھسلا اور گر کر فوراً مرگیا۔ آخر کو وہاں سے ہٹا کر لائین ڈالی گئی۔ شاہ صاحب کے نام کے لحاظ سے محلہ کا نام منصور گنج ہے۔ شہر کے پورب گوشہ شمال میں دریائے گنگا کا کنارہ ہے۔ وہاں بھی ایک ٹیلہ ہے۔ وہاں حضرت معروف شاہ مدفون ہیں۔ اسی لحاظ سے محلہ کا نام معروف گنج ہے۔ ان کے مزار کے متصل شاہ پیر دمڑیا کا مزار ہے۔ دریا کے اس پار حاجی پور میں ان کے بھائی کا مزار ہے۔ وہ بھی بسا بزرگ تھے ان کا نام بھی پیر دمڑیا ہے شہر کے پچھم گوشہ میں جانب جنوب ایک ٹیلہ پر شاہ حمزہ صاحب کا مزار ہے۔ یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ اور شاعر بھی تھے۔ ان کے مزار کے متصل ایک ٹیلہ ہے۔ جو مجنون کا ٹیلہ کہلاتا ہے۔ شہر کے پچھم محلہ سلطان گنج سے آگے پیر بہوڑ کا مزار ہے۔ اس لئے یہ محلہ ہی پیر بہوڑ کہلاتا ہے۔ سالانہ عرس

دھوم سے ہوتا ہے۔ او چھری اور روئی چڑھائی جاتی ہے۔ مجنوں کے ٹیلہ کے آگے ایک بہت بڑا اندارہ یعنی کنواں مشہور اگم کنواں ہے۔

اس کے متصل ایک بند احاطہ میں ایک باغ تھا۔ شہر میں جب چیچک کا زور ہوتا تو ہندو وہاں جاکر پوجا کرتے تھے۔ اگم کنواں ہندوؤں کے عہد کا ہے۔ اس کے قریب نوابان گنڈری کے مورث اعلیٰ میر عبداللہ صاحب مرحوم و مغفور کی شاندار قبہ سنگ مرمر کی جالیوں کی ہے۔ اس مقام کو تلسی منڈی کہتے ہیں۔ اس مقبرہ میں بڑے بڑے بزرگ مدفون ہیں۔ شیر شاہ والی سڑک جو پیپل پاتی والی سڑک کہلاتی ہے۔ اس مقبرہ کے قریب سے گئی ہے۔ پیپل پاتی والی سڑک کے کنارہ کنارہ ریلوے لائین ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور آگے بجانب مغرب موضع ملکھراریں میں میرے والد کے نانا نواب میر ذوالفقار علیخاں کا تاریخی باغ ذوالفقار باغ تھا جو ریلوے لائین میں آگیا اُس باغ کے ایک گوشہ میں بجانب شمال مقبرہ ہے۔ اور مسجد ہے اس مقبرہ میں نواب میر ذوالفقار علیخاں مرحوم اور اُن کے منجھلے بھائی نواب میر کلب علیخاں مرحوم والد مرحوم کے حقیقی نانا وغیرہ مدفون ہیں میرے والد مرحوم اعلی اللہ مقامہ بھی یہیں خواب راحت میں ہیں۔ جس جگہ یہ مقبرہ اور مسجد ہے ریلوے لائین وہاں سے ہٹا کر نکالی گئی ہے۔

ذکر طوائف عظیم آباد

میرے بچپنے اور غنفوان شباب تک بعض طوائف عظیم آباد کی علاوہ فن موسیقی کے ماہر ہونے کے تعلیم یافتہ اور شاعرہ بھی تھیں۔ اور بہت سے کم عمر امیر زادے ہندو اور مسلمان ان کی صحبتوں میں جاکر علم مجلس سیکھتے تھے۔ یہ بھی میں نے سُنا کہ ان لوگوں کے دسترخوان بھی وسیع ہوتے تھے۔ بعض شعرا بھی ان کے محفلوں میں شریک ہو کر مضامین نو حاصل کرتے تھے۔

ان کے عشوے و غمزے رقیبوں کا آپس کا برتاؤ اور بیسواؤں کے ہتکنڈے تریا چرتر کے کرشمے وغیرہ ان امور کے نظارے شعرا کے لئے ماخذ مضامین ہوتے تھے۔ ان حسن فروشان بازاری کے کمروں کی قطاریں محلہ گرہٹہ سے مچھر ہٹہ چوک جھاؤ گنج تک مسلسل تھیں گرہٹہ میں خانگیاں رہتی تھیں۔ جن کو گانے بجانے سے سروکار نہیں تھا۔ شاذ و نادر گانے بجانے والیاں بھی وہاں رہتی ہوں۔ سر شام بناؤ سنگار کرکے اپنے اپنے کوٹھوں پر جو سڑک کے کنارے کنارے تھے جلوہ گر ہوتیں۔ اور عشاق طبیعت نوجوان فٹنیں اور لینڈو گاڑیوں پر جن میں جوڑیاں اور ٹیکے جُتے ہوئے ہوتے۔ سائیس اور کوچبان بھی زرق برق وردیوں سے آراستہ ہوتے۔ اور

خود صاحب سواری بھی بن ٹھن کر نکلتے تھے۔ بہت سے امیر زادے گھوڑوں پر سوار بھی۔ اپنی آرائش دکھانے نکلتے تھے۔ بعض طوائفیں جو تمیز دار اور دولتمند ہوتیں وہ لب بام نہیں بیٹھتیں ان کی شہرت خود اسقدر تھی کہ نمائش کی ضرورت نہ تھی۔ دولت و ثروت بعض کے پاس بہت تھی۔ ناچ گانے کے ذریعہ ہزاروں کماتیں پھر کسی رئیس سے تعلق ہوتا تو دو تین سو ماہانہ وہ ملتا۔ علاوہ فرمائشات کے از قسم زیور و پارچہ ہزاروں کھینچ لیتیں۔ بعض ایسی بھی تھیں جو کسی کی ملازمت پسند نہیں کرتیں پابند ہونا عذاب جان سمجھتیں۔ ایسی طبائع کی طوائفوں کو اس میں لطف خاص آتا کہ بیک وقت بہت سے عاشق پروانہ وار دربارداری کریں۔ لطف یہ کہ یہ عقل کے پٹ امیر زادے ہزاروں روپئے دیتے اور ان دشمنان وفا کے نکتوڑے اور اوکھیاں سہتے ان کے چونچلے اٹھاتے اور خوشامد بھی کرتے وار وار کے پانی پیتے ؎

نازبیہودہ کبھی عشوہ بیجا دیکھا ٭ جو نہ دیکھا تھا کبھی ہم نے وہ غمزہ دیکھا

یہ طوائف بڑی حاضر جواب ان کی نوک زبان پر سیکڑوں اشعار اور ان کا برمحل استعمال کرنا عموماً یہ امیروں کی اولادیں ہوتی تھیں اس لئے صورت دار نازک اندام بھی ہوتی تھیں۔ اور ان کی نائکائیں بچپنے سے ان کو زلف گرہ گیر میں دل پھنسانے کی تعلیم دیتی تھیں۔ ان کے عشاق ان کو بی بی کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ عام طوائف کو تو لوگ صرف منی جان یا چنی جان وغیرہ کہتے تھے لیکن چند جو ممتاز تھیں۔ غائبانہ ان کو بی چھٹن جان، بی بندی جان، بی حیدر جان، کہتے تھے۔ ان کے ہاں عشرۂ محرم کی اور رمضان مبارک میں شبوں کی مجلسیں بڑی تیاری و تکلف سے ہوتی تھیں۔ بعض خیر و خیرات میں بھی مشہور تھیں۔

یہ بھی ایک رُخ اُسوقت کے تمدن کا تھا۔ جو میں نے اوپر لکھا ہے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے مسلمانوں کا اقبال افق مغرب تک پہنچ کر کب کا ڈوب چکا تھا۔ مگر کہیں کہیں فقط شعاعیں باقی رہ گئی تھیں۔ اسوقت کی سرکاری رپورٹ کے موجب بہار کی کل زمینداری کو سولہ حصوں میں قرار دے کر دس حصے ہندوں اور چھ حصے مسلمانوں کے قبضہ میں باقی رہ گئے تھے اس پر قیامت یہ کہ رنگیلے مسلمانوں نے مہاجنوں سے سودی روپیے قرض لے لے کر اپنی زمینداریوں میں گہن لگا رکھا تھا۔ قدیم خاندان والے ظاہر اتو خوش حال نظر آتے تھے مگر باطن میں انہیں کی حالت زیادہ تر تباہ تھی۔ مثلاً دو پشت پہلے جن کے مداخل پچاس ہزار سالانہ اور مخارج بھی اسی کے قریب تھے تقسیم در تقسیم میں اولاد کی آمدنی چوتھائی یا آٹھواں حصہ رہ گئی تھی۔ مگر اپنے

مخارج اور شان و شوکت قریب قریب اوسی پیمانہ پر رکھی تھی جس طرح وہ اپنے بزرگوں کو دیکھتے آئے تھے۔ بایں ہمہ کمی مقدر پر بھی ان کے حسن معاشرت اور اسلامی تمدن و مذاق میں بہت کم فرق آیا تھا۔ اگر چند شرفا کسی صحبت میں جمع ہو جاتے تو ممکن نہ تھا کہ ان میں کوئی علوم فارسی و عربی کا جید عالم نہ ہو یا مورخ یا شاعر یا خوش نویس یا طبیب یا جوتش دان اور پھکیت موجود نہو ایسے باسواد بزرگوں کی صحبت میں اتفاق سے اگر کوئی امی بھی ہوتا تو برکت صحبت و مجالست کے سبب سے وہ بھی پڑھا لکھا دیکھائی دیتا۔ بعض ناخواندہ محض پاکیزہ شعر کہتے اور نقاد سخن ہوتے تھے۔ امرا کے صاحبزادوں کے لئے جو اتالیق وادیب استاد رکھے جاتے وہ بھی چند فنون و علوم کے جاننے والے ہوتے تاکہ علم مجلس آئے اور جب اپنے مورث کے جانشین ہوتے تو ان کی سرکار میں کوئی شخص کسی خاص علم و فن کا آتا تو اس کی قابلیت کے لحاظ سے اس کی قدر کی جاتی۔ انعام و اکرام دے جاتے یہ ظاہر ہے کہ ایک فقہ کا جاننے والا بھی کسی فقیہ کی یا شعر فہم ہی شاعر کی قدر و منزلت کر سکتا ہے۔ اور ان مباحث میں اپنے خیالات کا اظہار کر کے حصہ لے سکتا ہے۔ ورنہ مُنہ تکنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مختلف علوم و فنون کے لوگ دور دور سے و نکائے عظیم آباد آتے اور یہاں سے جیبیں بھر بھر لیجاتے۔

دلی کے اجڑنے کے بعد شعرا اور اہل قلم کی قدر یا تو لکھنو میں ہوئی یا عظیم آباد میں خصوصاً لکھنو کے مٹنے اور تاراج ہونے کے بعد عظیم آباد اور مرشد آباد نے اہل کمال کی جانیں بچائیں۔

امرائے عظیم آباد

عظیم آباد کے مسلمان روسا میں بھی بجائی ثروت اتنی رنگینی تھی اور ساتھ مادہ جوہر شناسی اتنا تھا کہ پردیسی اہل کمال کا پیٹ یہاں بھرتا۔ مولوی مہدی علی محسن الملک سر سید احمد خان مرحوم کے انتقال کے بعد سر سید میموریل کے قیام پر جب عظیم آباد چندہ وصول کرنے غالباً سنہ ۱۹۰۱ء میں گئے تھے تو کسی جلسہ میں بدوران تقریر انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہند کے طول و عرض کے مختلف شہروں میں پھرتا ہوا آیا ہوں یہ مسلمانوں کی خوش نصیبی کا باعث ہے کہ جسقدر دولتمند زمیندار مسلمان صاحب علم و سواد پٹنہ میں ہیں میں نے کہیں نہیں دیکھے امرا کے طبقہ کے بعض روسا اور متوسطین طبقہ کے بعض شرفا کی صحبتوں میں بجز علمی مشاغل کے کوئی دوسرا شغل باعث دلچسپی نہ تھا۔ ان صحبتوں میں ایرانی و اہل عرب و اہل کشمیر بھی ہوتے تھے جن میں بعض سیاح اور بیشتر بڑے بڑے تجار ہوتے تھے اور یہ لوگ خالی مذاق علم و کمال سے نہ تھے ان میں بعضوں نے دائمی سکونت عظیم آباد میں اختیار کر لی تھی محلہ مغلپورہ میں ایرانی نسل کے لوگ

اور کشمیری کوٹھی میں اہل کشمیر زیادہ تھے۔ خوش قسمتی سے میری دادھیال عظیم آباد اور ننھیال مرشدآباد
اور خدا نے ایسے گھر میں پیدا کیا جو گہوارہ علوم و فنون کا اور مرکز اعظم شاعری کا تھا۔ میرے والد کی
خدمت میں جب تک کلکتہ میں تشریف فرما تھے وہاں کے مسلمان عمائد و شعرا و علماء کا ازدہام رہتا تھا
اور جب عظیم آباد تشریف لائے تو یہاں کے چوٹی کے امراء و شعراء وغیرہ حاضر خدمت رہتے۔ جن کی
مختلف غرضیں ہوتیں۔ بہت سے امراء جن کے بزرگوں سے باپ یا چچا وغیرہ سے میرے والد سے
دوستانہ تھا۔ اپنا بزرگ سمجھ کر سلام کو حاضر ہوتے اور حضرت کی صحبت سے فیض پاتے۔ بہت سے
لوگ بغرض درس و تدریس حاضر ہوتے گو والد مرحوم کو اپنی کم عمری سے پڑھانے کا جبلی شوق تھا۔
لیکن اخیر زمانہ میں بوجہ کبر سنی اور ضعف کے پڑھانے سے مجتنب ہو گئے تھے۔ مگر مانتا کون۔ لوگ
نہایت اصرار و منت و سماجت کرتے اور عرض کرتے کہ ایک ہی سبق کسی کتاب کا پڑھا دیجئے یا کلام پر
اصلاح فرما دیجئے تاکہ باعث برکت ہو۔ اصلاح لینے کی غرض سے بہت لوگ آتے۔ حضرت کا معمول تھا۔
صبح کے آٹھ بجے سے دس بجے تک منتہیوں کو خود پڑھاتے ایک سبق میں گھنٹہ ڈیڑھ حضرت کا صرف ہو۔
حضرت کسی کتاب کے کسی مضمون کے متعلق لکچر دینا شروع کرتے تو دنیا بھر کے نکات و غوامض حقائق
و معارف کا دریا بہا دیتے۔ جو شاگرد سب سے زیادہ پڑھا ہوا ہوتا اس سے فرماتے کہ دوسروں کو
پڑھا دو۔ دوران درس میں جبکہ کوئی شاگرد کسی کو پڑھا رہا ہوتا حضرت کی طبیعت نہیں مانتی جب
اسطرف متوجہ ہو جاتے تو پھر لکچر دینا شروع کر دیتے۔ علاوہ ان پڑھنے والوں کے بہت سے لوگ
سفارش لینے کے لئے حاضر ہوتے۔ دس بجے کے بعد سے شعرا علماء کے طبقہ کے لوگ فیض صحبت سے
متمتع ہونے کیلئے حاضر ہوتے اس جگہ پر چونکہ حضرت والد مرحوم کا ذکر خیر آگیا ہے۔ اسلئے ان کے
رکھ رکھاؤ اور وقار کا تذکرہ مختصراً کرنا مناسب موقع سمجھتا ہوں۔

ذکر والد مرحوم نواب فیروز جنگ بہادر نبیرہ نواب رضا علیخان منیر الدولہ بڑے رکھ رکھاؤ کے امیر تھے
ان کی صحبت میں شاذ و امراء اُن کے ہم پلہ حقہ پی سکتے تھے جسوقت والد مرحوم اُن سے ملنے کو جاتے
نواب صاحب لب فرش تک استقبال کو آتے اور وہ خود حقہ نہیں پیتے تھے۔ مگر والد مرحوم جب جاتے
تو جو شاگرد و پیشہ دست بستہ سامنے کھڑے رہتے۔ ان کو صرف آنکھوں کے اشارہ سے حکم دیتے
اور اُن میں سے ایک دوڑا ہوا جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم زیر انداز لاکر بچھاتا اور حقہ بردار
پیچوان لاکر رکھتا۔

اسی طرح مہاراجہ مہیت سنگھ بہادر نبیرہ مہاراجہ شتاب رائے اخیر شاہی صوبیدار

صوبہ بہار بھی بڑے رکھ رکھاؤ کے امیر تھے۔ گو دولت و ثروت اگلی سی نہ تھی مگر لوازمات شاہانہ رکھتے تھے۔ سواری جلوس کے ساتھ نکلتی تھی۔ مہاراجہ مہیپت سنگھ کے زمانہ میں انگریزی حکومت کا آغاز تھا۔ گورنر جنرل کے دربار میں پہلی کرسی انہیں کی ہوتی تھی عمر میں والد مرحوم سے بہت بڑے تھے۔ مگر لب فرش تک استقبال کیلئے آتے تھے۔ اور اسی طرح رخصت کرتے۔

میر عبداللہ صاحب بہت بڑے دولتمند اور بڑے باوقار امیر تھے دولت کی یہ حالت تھی کہ بہت سے راجگان و نوابان صوبہ بہار کے اُن کے مقروض تھے۔ بڑے کلے جبڑے کے رئیس تھے۔ ان کے چھوٹے فرزند نواب سید لطف علیخان مرحوم میرے والد کے ہم عمر تھے۔ مگر والد کا کمال اور انکی عالیخاندانی کیوجہ سے میر صاحب سرو قد تعظیم کو کھڑے ہو جاتے۔ اور اپنے خاصدان میں سے چار گلوریاں والد مرحوم کے ساتھ جو خاصدان رہتا اس میں رکھدیتے۔ اسی طرح اور امرا بھی پیش آتے۔ یہ باتیں اسوقت کی ہیں۔ جب والد مرحوم کمسن تھے اور مرشدآباد و کلکتہ کا سفر نہیں فرمایا تھا۔ میں نے بڈھوں سے سُنا کہ حضرت والد مرحوم نے اکیس ۲۱ بائیس ۲۲ سال کی عمر میں اپنی استادی کا جھنڈا گاڑا۔ مرشدآباد و کلکتہ کے زمانہ اقامت میں جہاں حضرت کی عمر کے تقریباً چالیس سال صرف ہوئے روسا امرا و کملا نہایت ادب و احترام سے پیش آتے جس طرح اپنے زمانہ شباب میں بمقام عظیم آباد سیکڑوں نے تلمذ حاصل کیا تھا۔ اسی طرح مرشدآباد و کلکتہ میں بھی متعدد اشخاص نے پڑھا یا اصلاح اپنے کلام پر لی کلکتہ جیسے شہر میں بوجہ دارالسلطنت ہونے کے ماوا و ملجا روسائے عظام و حکام عالیمقام کا تھا۔ جس میں بہت سے ایرانی تجار کروریتی تھے۔ بعض بیس بیس جہازوں کے مالک تھے۔ پھر حضرت واجد علیشاہ کو انگریزوں نے کلکتہ میں نظر بند رکھا تھا۔ اور کئی میل کا رقبہ مشہور مٹیا برج بادشاہ کے رہنے کو دیا جہاں تیس چالیس ایوانات شاہی بادشاہ نے بنالئے تھے۔ گو انگریز صرف ایک لاکھ ماہانہ بادشاہ کو جیب خرچ کیلئے دیتے تھے مگر کروڑہا روپے کے جواہرات لکھنو سے بادشاہ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ جواہرات وقتاً فوقتاً بکتے رہتے تھے۔ جب کہیں ماہانہ تقریباً دو لاکھ کے اخراجات چلتے تھے۔

بہت سے شعرا و علما و امرا بادشاہ کی سلک ملازمت میں تھے ان کا اجتماع الگ کلکتہ میں تھا۔ پھر سرنگا پٹام کی جنگ کے بعد اور ٹیپو سلطان کے شہید ہونے کے بعد لارڈ ولزلی (بعد کو ڈیوک آف ولنگٹن) جس نے واٹرلو کی لڑائی میں نپولین اعظم کو بشرکت افواج جرمنی شکست دی تھی ٹیپو سلطان کے لڑکوں کو کلکتہ لے گیا۔ بحیثیت پولیٹکل قیدی کے نظر بند تھے۔ یہ لوگ بھی شاہانہ

طریقہ سے رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے بھی بہت سے باکمال مسلمانوں کا جمگھٹا کلکتہ میں ہو گیا تھا۔ غرض اسوقت کلکتہ میں بڑے بڑے دولتمند معزز مسلمان معزز تجار اعلیٰ عہدہ دار زمیندار باکمال شعرا علما وغیرہ کی کثرت تھی اس حالت میں یہ امر دیکھنے کے لائق ہے کہ نواب بہادر نواب عبداللطیف خاں سی۔ آئی۔ ای جو مسلمان قائدین میں تھے اپنی سوانح عمری میں جو انگریزی میں لکھی ہے۔ جہاں والد کا ذکر خیر ہے وہ لکھتے ہیں۔ — Syed Shah Ulfat Hussain, The well-Known anthor and scholar was The most learned and most influencial member of The muslim Community.

جس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔ سید شاہ الفت حسین مشہور عالم و مصنف جو کلکتہ کے سب سے بڑھکر عالم و فاضل اور سب سے بڑھکر با اثر کلکتہ کے مسلمانوں میں تھے۔ الخ

یہ معمولی الفاظ نہیں ہیں اور پھر نواب بہادر عبداللطیف خاں سی۔ آئی۔ ای کے قلم سے نکلے ہوئے۔

وزیر السلطان فخر الملک نواب سید امیر علیخاں بہادر اخیر شاہ اودھ کے اخیر وزیر جو اس زمانہ میں کلکتہ میں تھے وہ اپنی تصنیف امیر نامہ میں یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ فخر الادبا ملک الشعرا سحبان ملک سخندانی حسان کشور معنی استادی حضرت سید شاہ الفت حسین فریاد مد ظلہ العالی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ بزمانۂ قیام کلکتہ حضرت والد مرحوم کا وجود ذیجود کسقدر باوقار و ممتاز تھا جب حضرت والد مرحوم اخیر دفعہ عظیم آباد اپنے وطن تشریف لائے اور سات سال اقامت کرنیکے بعد یہیں رحلت فرمائی تو اسوقت جسقدر اعیان و عمائد عظیم آباد میں رہ گئے تھے والد مرحوم ان کے بزرگوں کے دوست تھے اور سنی و شیعہ ہر دو فرقہ کے عمائد اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ اور اسی طرح ادب کرتے تھے۔ جیسا اپنے باپ دادا کا کرتے تھے۔ کیونکہ بعض کے باپ سے بعض کے دادا یا نانا سے دوستانہ تھا اس مقام پر دو نقلیں کتاب حیات فریاد مولفہ خان بہادر حضرت سید علی محمد شاد مرحوم سابق رئیس عظیم آباد سے نقل کرتا ہوں۔ تقریباً وہی الفاظ استعمال کروں گا۔ جو حضرت شاد نے کئے ہیں۔

"میں حضرت (فریاد) کی خدمت میں عموماً صبح کو حاضر ہوا کرتا تھا۔ بعض دفعہ تیسرے پہر کو بھی حاضر ہوتا تھا اور حضرت معمولاً بوقت عصر نواب بہادر نواب سر سید ولایت علیخاں کے۔ سی۔ ای۔ آئی۔ کے ہاں جن کا دولت خانہ حضرت کے دولت خانہ کے محاذی تھا۔ تشریف لیجایا کرتے تھے۔ اور شب کے آٹھ بجے تک وہیں تشریف فرما رہتے تھے۔ بہت سے ایسے حضرات جن کو حضرت سے

قدمبوسی ہونا ہوتا وہیں آجاتے تھے اور حضرت کے حیرت خیز افادات سُن سُن کر فیض پاتے تھے۔ اور میں بھی حضرت کے ساتھ نواب بہادر کے ہاں چلا جاتا تھا۔ چنانچہ ایکدفعہ جب تیسرے پہر کو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد حضرت اُٹھے اور میں بھی ہمراہ ہو گیا۔ نواب بہادر کے ہاں جب پہنچے تو حسب معمول جسقدر لوگ وہاں تھے۔ معہ نواب بہادر سروقد کھڑے ہوگئے اور ہمارے حضرت نواب بہادر کی مسند پر جوں ہی تشریف فرما ہوئے کہ میر نواب جان صاحب ایکے از مصاحبان خاص نواب بہادر) اپنی جگہ سے بعجلت اوٹھے بازو کے چار مخملی تکیوں میں سے جو نواب بہادر کے ہر دو بازو دو دو رہتے تھے۔ اُن میں سے دو اُٹھا کر ہمارے حضرت کے سامنے رکھ دئیے حضرت نے بغور میر نواب جان صاحب کو اور پھر نواب بہادر کی طرف دیکھا مگر میں اس کا کوئی مطلب نہ سمجھا۔ شب کے آٹھ بجے حسب معمول حضرت نے فرمایا فانوس لاؤ (یعنی لالٹین باصطلاح حیدرآباد قندیل) چنانچہ نواب بہادر کا ایک شاگرد پیشہ فانوس لیکر آیا نواب بہادر حسب عادت لب فرش تک حضرت کو رخصت کرنے آئے راہ میں مجھ سے فرمایا بیٹا تم نے آج کچھ دیکھا۔ میں خالی الذہن تھا میں نے عرض کیا گستاخی معاف فدوی سمجھا نہیں فرمانے لگے "تم تو بارہا میرے ساتھ تیسرے پہر کو نواب بہادر کے ہاں گئے ہو اور یہ بھی تم نے دیکھا ہوگا کہ بازو کے دو تکئے خود نواب بہادر نے اپنے ایک بازو سے اُٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا کرتے ہیں مگر آج خلاف معمول میر نواب جان نے تکئے میرے آگے رکھے آج ایک مصاحب نے رکھے کل کوئی شاگرد پیشہ رکھے گا" میں نے عرض کیا کہ نواب بہادر کے اشارہ سے یہ کام نہیں ہوا بلکہ فدوی کے خیال میں میر نواب جان صاحب نے اپنا رسوخ جتانے کو خود یہ حرکت کی۔ حضرت نے فرمایا ممکن ہے ایسا ہی ہو۔

دوسرے دن میں قصداً تیسرے پہر کو حضرت کی خدمت میں اسلئے حاضر ہوا کہ حضرت کی ہمرکابی میں نواب بہادر کے ہاں جا کر دیکھوں کہ آج بھی میر نواب جان صاحب تکئے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ میں ساتھ ہو لیا۔ اور جب نواب بہادر کے ہاں گئے اور ہمارے حضرت حسب معمول نواب بہادر کی داہنی جانب مسند پر جلوہ افروز ہوئے تو فوراً میر نواب جان صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے اور بازو کے تکئے اُٹھانے کو تھے کہ نواب بہادر نے تکئے اپنے ہاتھ سے ہمارے حضرت کے سامنے رکھ دئیے اور جسوقت میر نواب جان صاحب تکئے اُٹھانے کو تھے کہ نواب بہادر نے فرمایا آپ رہنے دیجئے۔ میر نواب جان صاحب یہ خدمت میری ہے۔ نواب بہادر بڑے فرلیس اور ذہین واقع ہوئے تھے۔ یا تو روز اول حضرت کے تیور کو بھانپ گئے یا وہ شاگرد پیشہ جو شب گذشتہ فانوس لیکر ساتھ آیا تھا

اس نے حضرت کی گفتگو جو مجھ سے فرمائی تھی سن لی اور نواب بہادر سے اوس کا اعادہ کیا دو باتوں میں سے کوئی ایک ضرور ہوگی۔ جو نواب جان صاحب کو تکیئے پیش کرنے کی نواب بہادر نے اجازت نہیں دی" ایک اور نقل اس حیات فریاد میں سے اس جگہ میں نقل کرتا ہوں۔

اس کے راوی ایک بزرگ مرزا مغل جان صاحب تھے جنہوں نے حضرت شادؔ مرحوم سے یہ واقعہ بیان کیا۔ مرزا صاحب نے یوں بیان کیا۔

ایک زمانہ میں نواب بہادر بغرض تبدیل آب وہوا اپنے باغ موقوعہ لوہانی پور میں جو شہر عظیم آباد سے دس گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے مقیم تھے اور حضرت شاہ الفت حسین صاحب قبلہ دوسرے تیسرے دن نواب بہادر سے ملنے کیلئے جایا کرتے تھے۔ ایک روز تیسرے پہر کو جب حضرت گاڑی میں سوار ہونے لگے میں اتفاق سے اسوقت موجود تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں بھی ہمراہ چلوں۔ فرمایا چلئے۔ چنانچہ میں بھی لوہانی پور کے باغ گیا۔ وہاں اور چند حضرات اعیان شہر میں سے پہلے سے موجود تھے منجملہ جن کے نواب سہراب جنگ بہادر بھی تھے۔ شب کے آٹھ بجے جب صحبت برخاست ہوئی تو سب ملکر اُٹھے۔ باغ والی کوٹھی میں برساتی نہیں تھی اور برآمدہ کے سامنے چمن کے بعد گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ جب سب لوگ اُٹھے تو نواب بہادر نے مجھ سے فرمایا مرزا صاحب مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے یہ کہکر لب لب گاڑیوں کے پاس چلے گئے۔ جہاں ہمارے حضرت کی بھی گاڑی تھی۔ نواب بہادر کے پیچھے پیچھے میں بھی وہاں پہنچا۔ ہمارے حضرت لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے خراماں خراماں گاڑی کے پاس آگئے۔ نواب سہراب جنگ بہادر بھی ہمارے حضرت کے ساتھ تھے نواب بہادر جب گاڑیوں کے پاس قبل سے پہنچ چکے تھے میں نے عرض کیا۔ کیا ارشاد ہوتا ہے۔ نواب بہادر نے فرمایا کچھ بھی نہیں۔ بات یہ ہے مرزا صاحب کہ میں حضرت شاہ صاحب کو ہمیشہ گاڑی تک پہنچانے آتا ہوں اور نواب سہراب جنگ بہادر کو لب فرش تک پہنچاتا ہوں۔ چونکہ نواب سہراب جنگ بہادر حضرت شاہ صاحب کے ساتھ آرہے میں اگر ان لوگوں کے ساتھ گاڑی تک آتا تو آئندہ ہمیشہ نواب سہراب جنگ کو گاڑی تک پہنچانے کیلئے آنا پڑتا اور اگر گاڑی تک نہ آتا تو حضرت شاہ صاحب کو ناگوار گذرتا کہ مجھ سے ایک خلاف عادت حرکت ہوئی یہ گفتگو ختم ہوئی تھی کہ سب لوگ گاڑیوں تک آگئے اور نواب بہادر سے رخصت ہوکر اپنی اپنی گاڑیوں پر سوار ہوگئے۔ میں تو حضرت شاہ صاحب قبلہ کے ساتھ گیا تھا۔ جب ہم لوگ گاڑی میں آکر بیٹھ گئے تو میں نے حضرت سے اس گفتگو کا اعادہ کیا جو نواب بہادر نے فرمائی تھی۔ حضرت یہ سُنکر مسکرائے اور فرمایا چھوٹے نواب صاحب بہت مُدبر

اور وضعدار رئیس ہیں" ان دونوں نقلوں کے یہاں قلمبند کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ پہلے تو یہ ظاہر کروں کہ میرے والد کس پایہ اور کس وقار کے انسان تھے۔ دوسرے یہ کہ اگلے روسا کا کیا رکھ رکھاؤ اور کیا پاس وضعداری تھا۔ کسقدر خیال حفظ مراتب و لحاظ جس کی چھاؤں بھی اس زمانہ کے امرا میں نہیں پڑی ہے۔ میں نے جس شہر مینو سواد کے تمدن کا اور وہاں کے چہل پہل کا مرقع پیش کیا ہے، افسوس صد ہزار افسوس کہ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۴ء کی دوپہر کو بلائے آسمانی نازل ہوئی وہ زلزلہ قیامت خیز و محشر انگیز آیا کہ جس نے سارے شہر کو تاراج کیا۔ ہزاروں عمارتیں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی زمین بوس اور چونے اور مٹی کے ڈھیر ہوگئیں۔ سیکڑوں جانیں تلف ہوئیں۔ کتنی عورتیں بیوہ ہوئیں اور کتنے مرد رنڈوے ہو گئے اور کتنے بچے یتیم و اسیر ہو گئے یہ ایک عجیب واقعہ ہوا کہ گنگا اتنا بڑا دریا پانچ چھ منٹ کیلئے غائب ہو گیا۔ یعنی سارا پانی زمین کے اندر چلا گیا اور چند منٹوں کے بعد توپ کے چھوٹنے کی سی گرج ہوئی اور پھر پانی بہل بہل نکلنا شروع ہوا اور گنگا بہنے لگی صرف پٹنہ دار السلطنت بہار ہی زلزلہ سے متاثر نہیں ہوا بلکہ گنگا پار کے جو پٹنہ سے شمالی جانب ہے بہت سے خوشحال و خوبصورت شہر مثلاً بتیا۔ مظفر پور۔ دربھنگہ سمتی پور۔ مدھوبنی موتی پور۔ سیتامڑی کا خاتمہ ہو گیا۔ خصوصاً مظفر پور اتنا بڑا اور خوبصورت شہر جو ترہٹ کی کمشنری ہے۔ یعنی جہاں کمشنر رہتا ہے بالکل برباد ہو گیا اور زمین سے اسقدر پانی نکلا کہ سڑکیں بہ گئیں نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن اور پھر پانی برسنا شروع ہوا۔ پندرہ سولہ ہزار جانیں تلف ہوئیں۔ بتیا کے ضلع میں عجیب واقعہ ہوا کہ موضع نکد ہرم اور پتو کی زمین کے اندر سے شعلے نکلے اور دونوں بستیاں جلکر خاکستر ہو گئیں۔

دربھنگہ کو بھی بیحد نقصان جانی و مالی پہنچا مہاراجہ دربھنگہ کے خوبصورت اور عالیشان ایوانات و باغات سب مسمار ہو گئے پچاس ساٹھ لاکھ کی عمارتیں مہاراجہ کے علاقہ کی تباہ و تاراج ہو گئیں گنگا کے اس پار مونگیر جو نہایت قدیم خوبصورت خوش آب و ہوا شہر تھا جس کو میر قاسم خاں سابق صوبیدار بنگالہ نے اپنا دار السلطنت بنایا تھا۔ اور فرانسیسیوں کے مشورہ سے پرانے قلعہ کی مرمت کی تھی۔ جہاں ایک قدرتی چشمہ ہے جسکو سیتا کنڈ کہتے ہیں اور پانی اسقدر صحت افزا ہے کہ بوتلوں میں بھر بھر کر فروخت ہوتا وہ شہر بالکل برباد ہو گیا۔ ساری عمارتیں زمین کے برابر ہو گئیں۔ بیس پچیس ہزار جانوں کا اتلاف ہوا چونے اور پڑے ہوئے اینٹوں کا انبار لگا ہے۔

نیپال کا دار السلطنت کھاٹ مانڈو جو پٹنہ کے شمال میں ہے۔ اور چند اضلاع نیپال کے

بیحد متاثر ہوئے حقیقتاً زلزلہ کا مرکز کہاٹ مانڈو تھا اور نیپال کی ترائی کے جتنے مقامات تھے وہ سب فنا ہو گئے۔ یہ زلزلہ عالمگیر تھا۔ بنارس۔ لکھنو۔ کانپور۔ دلی۔ الہ آباد۔ ان سب مقامات میں زلزلہ کے جھٹکے محسوس ہوئے۔ لیکن جسقدر نقصان صوبہ بہار کو ہوا اسکی نظیر کہیں نہیں ہے۔ چالیس پچاس ہزار جانوں کو نقصان پہنچا اور عمارات وغیرہ کا دس کرور کا نقصان بیان کیا گیا۔ میں نے جو عظیم آباد کے قدیم اسلامی کلچر اور تمدن کا مرقع ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کھینچا ہے کاش کے یہ خیال مجھکو پندرہ بیس سال پیشتر آتا۔ جبکہ عمر کم تھی صحت بھی اچھی تھی۔ قوائے دماغی حافظہ وغیرہ اپنے فرائض مفوضہ جو قدرت کی جانب سے انکو عطا ہوئے تھے۔ اچھی طرح ادا کرسکتے تھے تو اُسی حالت میں یہ مرقع کچھ اور ہی ہوتا۔ کبیر سنی اُس پر کئی سال سے سلسلۂ علالت نے اور بھی توڑ ڈالا ہے۔ اب تو یہ حالت ہے۔

تقریر میں وصف خوش بیانی نہ رہا ؛ تحریر میں رنگ نوجوانی نہ رہا
تصویر ہوں یک پیری و صد عیب کی میں ؛ افسوس کہ لطف زندگانی نہ رہا

مگر صرف اس خیال سے کہ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اُتنا بھی دیکھنے اور سننے والا صوبہ بہار میں اب کوئی نہیں ہے۔ اس لئے جو تصویر میں نے کھینچی ہے وہ بہار کی موجودہ نسل اور آئندہ نسلوں کے لئے ممکن ہے کہ کسی حد تک مفید ثابت ہو۔ میں اصل مقصد تحریر و ترتیب سوانح حیات سے بہت دور نکل گیا ہوں۔ پھر اسی سلسلہ بیان کو شروع کرتا ہوں

تعلیم میں اپنی جماعت میں ہمیشہ فرسٹ یا سکنڈ رہتا سالانہ امتحانات میں فرسٹ آتا۔ دو سال متواتر ڈبل پروموشن اور انعامات مجھکو ملے۔ والد مرحوم بہت خوش ہوئے۔ ایک دن کا ذکر ہے جبکہ میں فورتھ کلاس میں تھا شمس العلما خان بہادر مولوی سید وحید الدین خان بہادر صدر اعلیٰ مرحوم شمس العلما نواب امداد امام صاحب کے والد اور سر سید علی امام مرحوم کے دادا جو میرے دادا صاحب مرحوم کے قریبی رشتہ دار اور بھتیجے تھے اور اکثر ملنے آیا کرتے تھے۔ حسب معمول ملنے کیلئے آئے اور بھی چند اصحاب والد مرحوم کی خدمت میں حاضر تھے۔ میں بھی ٹہلتا ہوا ادھر نکلا میرے ہاتھ میں انگریزی کتاب تھی۔ والد مرحوم نے صدر اعلیٰ صاحب سے کہا کہ آپ ان کا (میری طرف اشارہ فرماکر) امتحان لیجئے۔ انہوں نے عرض کیا بہتر یہ کہکر مجھکو اپنے پاس بٹھایا میرے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں کتاب لیکر مجھ سے پوچھا کہ کہاں تک پڑھا ہے۔ اخیر سبق کہاں ہے۔ میں نے کہا فلاں صفحہ میں ہے اس کے چند صفحے آگے سے کھول کر مجھ سے کہا پڑھو۔ میں نے بہت روانی سے

عبارت پڑھی اس کے معنی پوچھے پھر کتاب بند کر کے لفظوں کی ہجے اور معنی پوچھے پورا لفظ صدراعلیٰ صاحب کی زبان سے نکلنے بھی نہیں پایا تھا کہ میں فوراً ہجے کر کے معنی کہہ دیتا تھا۔ کتاب میرے ہاتھ میں دے کر صدراعلیٰ صاحب نے فرمایا بس بس۔ اور ہنستے ہوئے والد مرحوم سے عرض کیا خدا نظر بد سے بچائے۔ بڑا ہونہار صاحبزادہ ہے یہ ڈپٹی ہوں گے یعنی ڈپوٹی مجسٹریٹ۔ اس زمانہ میں ہندیوں کیلئے ڈپوٹی کلکٹری و وڈپوٹی مجسٹریٹی کی خدمت گویا زمرہ ملازمت انگریزی میں معراج کے مترادف تھی جو لوگ اس صحبت میں بیٹھے تھے سب نے بیک زبان ماشاءاللہ ماشاءاللہ کہا والد مرحوم بھی بہت مسرور و محظوظ ہوئے اور فرمایا خدا ایچو کند۔ اسوقت سے میں ڈپٹی صاحب مشہور ہوا۔ والد مرحوم کے ملنے والے مجھے دیکھ کر کہتے آئے ڈپٹی صاحب اس واقعہ کے غالباً ایک سال کے بعد والد مرحوم نے بعارضہ فالج انتقال فرمایا۔

میری تعلیم میری نانی صاحبہ کی سرپرستی میں جاری رہی۔ سکنڈ کلاس تک پٹنہ گورنمنٹ سٹی اسکول میں تعلیم پائی سکنڈ لینگویج عربی لی تھی اس کے بعد پٹنہ ٹریننگ اکاڈمی کے انٹرنس (میٹرک) میں داخل ہو کر وہاں سے انٹرنس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی لیکن پہلے سال سالانہ امتحان کو جب چند ماہ باقی تھے کہ عارضۂ اسہال کبدی میں مبتلا ہوا۔ زیست کی کوئی امید نہ تھی بہرحال بعد صحت نقاہت بہت تھی امتحان میں بیٹھ نہ سکا ایک سال رائیگاں گیا۔

انجمن قایم کرنا

اسی زمانہ میں جبکہ انٹرنس میں تعلیم پا رہا تھا پٹنہ ڈبیٹنگ سوسائٹی کے نام کی ایک انجمن کی بنا میں نے ڈالی* مجلس کے اراکین سب کے سب امیرزادے تھے نواب سید ابراہیم حسین خان عرف سید منجھلے نواب صاحب خلف نواب سید لطف علی خان بہادر رئیس، نواب سید تجمل حسین خان عرف نواب سید سلطان مرزا خلف نواب بہادر نواب سر سید ولایت علی خان بہادر نواب سرفراز حسین خان مرحوم (جو کسی زمانہ میں آنریری مجسٹریٹ و وائس چیرمین پٹنہ میونسپلٹی کے اور وائسرائے کی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ اور ۱۹۲۵ء میں بمقام بمبئی آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے پریسیڈنٹ بنائے گئے تھے۔ (اس کانفرنس کے جلسوں میں میں بھی شریک تھا) نواب علی محمد خان مرحوم، سید ممتاز نواب مرحوم وغیرہ میں سکریٹری منتخب کیا گیا۔

ہر اتوار کو انگریزی میں کوئی مضمون پڑھا جاتا اور ہر مباحث انگریزی زبان میں ہوتے۔ اوس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی میں تقریر کرنے کی مہارت پیدا ہو جب انٹرنس پاس کرنے کے بعد میں ایف اے میں آیا تو چند ماہ فرسٹ ایر میں پڑھنے کے بعد پھر علیل ہوا اور ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ

---

* اتفاق دیکھیے میری بی بی کو بھی انجمن و اسکول قائم کرنے کا شوق ہے۔

چند دنوں دماغی محنت نہ کروں اور آرام لوں۔ زمانۂ بیکاری میں بمشورہ برادرزادہ سید احمد علیخان بعد کو مخاطب بہ خان بہادر ڈپوٹی مجسٹریٹ ڈپوٹی کلکٹر وغیرہ پٹنہ ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی اور اس کے کلاسوں کی فیس بمقابلہ اور اسکولوں کے کلاسوں کے بہت کم رکھی اور غیر مستطیع طلبار کو مفت تعلیم دیجاتی۔ مکان تو مفت کا مل گیا تھا۔ بغیر کرایہ کے اسکول اس میں قایم کیا بنچ وغیرہ کی خریداری کیلئے کچھ روپیہ میں نے دیا اور کچھ اپنے عزیزوں اور برادرزادہ سید احمد علیخان سے لیا چند مدرسین بھی مفت ملے۔ وہ اس طرح کے وہ دوست جو اسکول میں میرے ساتھ تھے۔ جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ ان لوگوں کو ٹیچر بنایا۔ ان لوگوں نے بھی میرے ساتھ بہت ایثار کا ثبوت دیا۔ انٹر کلاس کو میں دو گھنٹہ خود پڑھاتا تھا۔ اور ایک گھنٹہ میرے برادرزادہ سید احمد علیخان جو اسوقت تھرڈ ایر بی۔ اے میں تعلیم پارہے تھے۔ اپنے اسکول کا وقت صبح کے نو بجے سے رکھا تاکہ احمد علیخان کو پڑھانے کا موقع ملے۔

ابتداً یہ اسکول صرف غریب مسلمان بچوں کیلئے قائم کیا تھا مگر اخراجات کی تنگی کی وجہ سے ہندو لڑکوں کو بھی داخل کرنا پڑا کیونکہ یہ سب صاحب مقدرت تھے۔ بیس روپیہ ماہانہ پر ایک لائق پنڈت مل گئے تھے۔ ان کی تنخواہ چپراسی وغیرہ کی تنخواہ اور دو مدرسوں کی جو خوش حال نہ تھے اور قلیل تنخواہ قبول کرلی تھی ستر روپئے کے قریب فیس سے ملجاتے تھے میری حیثیت اونریری مینجر (منتظم اعزازی) کی تھی چار پانچ ماہ بڑی دقتوں سے اسکول کے اخراجات چلائے۔ اس کے بعد بڑی ترغیب وتحریص سے نواب احمد حسین خان کو سو روپئے ماہانہ امداد دینے پر رضامند کیا۔ اس واقعہ کے دو ماہ بعد نواب سید لطف علیخان مرحوم کا انتقال ہوا اُن کے تینوں فرزندوں کو اسّی اسّی ہزار روپئے سالانہ کی بچت کی معاش ملی اور دونوں بیٹیوں کو چالیس چالیس ہزار سالانہ کی علاوہ ازیں تیس تیس لاکھ روپئے نقد ہر بیٹے کے حصہ میں آئے اور پندرہ پندرہ لاکھ بیٹیوں کے حصہ میں آئے میں نے مرحوم نواب کے منجھلے فرزند سید منجھلے نواب صاحب کو جن سے مجھسے بیحد محبت تھی۔ اس امر پر رضامند کیا کہ پانچسو روپیہ ماہانہ میرے اسکول کو دیں جب یہ انتظام کر چکا تو سرکار میں درخواست کی ڈاکٹر مارٹن ال۔ ال۔ ڈی جو اُسوقت سرکل انسپکٹر تھے۔ اسکول کا معاینہ کروایا اونہوں نے۔ انسپکشن بک یعنی کتاب الرائے میں میری بڑی تعریف لکھی کہ اعزازی مینجر سید ہمایون مرزا نے باوجود بہت کمسن ہونے کے اسکول کا انتظام بہت اچھا رکھا ہے۔ اور یہی اسکول کی جان ہیں دو سو روپیہ ماہانہ سرکار سے دینا منظور کیا۔

اب تو میری خوشی واطمینان قلبی کی انتہا نہ تھی۔ کئی بی۔ اے مدرس رکھے پنڈت جی کی تنخواہ بڑھادی اور مولوی بھی دوسرا رکھا ہڈماسٹر مسٹر ڈن ایک انگریز کو مقرر کیا۔ یہ پہلے بہار نیشنل اسکول میں جسکو چند ہندؤں نے تجارتی غرض سے قایم کیا تھا۔ ہڈماسٹر رہ چکے تھے۔ اور وہاں ان کے طریقۂ تعلیم دینے کا بہت پسندیدہ خیال کیا جاتا تھا۔

جب مسٹر ڈن میرے اسکول کے ہڈماسٹر ہوئے تو بہت سے لڑکے اسکول میں داخل ہوئے خصوصاً انٹر کلاس میں۔ اسی سال میرے انگلستان جانے کا انتظام ہو گیا اور اسکول کا انتظام اپنے برادرزادہ سید احمد علیخان کے سپرد کیا۔ میرے یورپ جانے کے تقریباً سال بھر کے بعد مسٹر ڈن سے اور احمد علیخان سے ان بن ہو گئی۔ مسٹر ڈن نے مجھے میں شکایت آمیز لمبا چوڑا خط لکھا۔ میں نے اس کا جواب دیا کہ میرے واپس آنے تک کسیطرح اسکول کو چلاؤ اور احمد علیخان سے مل جل کر کام کرو دوسرا خط میں نے احمد علیخان کو افہام و تفہیم کا لکھا اور مسٹر ڈن نے جو کچھ شکایت لکھی تھی اُس کا ذکر کرکے اُن سے بھی یہ استدعا کی کہ مل جل کر کام کرو جسکا جواب احمد علیخان نے طول طویل دیا اور یہ لکھا کہ نہ معلوم آپ سے کیونکر مسٹر ڈن سے بنتی تھی وہ آپ سے اسلئے سیدھے رہتے تھے کہ آپ نے تین سو روپیہ ماہانہ ان کو مقرر کیا تھا۔ حالانکہ ان کو اس سے بہتر یا اس کے برابر کوئی خدمت کسی اسکول میں نہیں مل سکتی وہ مطلق العنان بہت ہیں ان کو اگر آپ رکھیں گے تو آپ کوئی دوسرا منتظم مقرر کیجئے وہ محکوم ہوکر نہیں رہنا چاہتے بلکہ خود مختار حاکم بنکر رہنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ میں نے ان کو ایک معقول جواب دیا اور ڈن کو بھی لکھا اور منجھلے نواب صاحب کو جو حقیقت میں اسکول کے مالک تھے۔ کیونکہ ماہانہ پانچ سو روپئے کی امداد دیتے تھے ایک طول طویل خط لکھا کہ مسٹر ڈن کو طلب کرکے میری جانب سے بھی اور اپنے طور پر بھی ان کو سمجھا دیں کہ اگر وہ رہنا چاہتے ہیں تو احمد علیخان جو کیے از بانیان اسکول اور بہت سلیم و حلیم اور فہمیدہ شخص ہیں۔ اُن کے کہنے کے بموجب عمل کریں اور احمد علیخان کو بھی بلا کر سمجھا دیں۔ غرضکہ کئی مہینوں تک رسل و رسائل ہوتے رہے۔ انھیں میں چونکہ میرا وقت بڑا خراب ہوتا اور ایک قسم کی پریشانی ہونے لگی۔ میں نے عاجز ہو کر منجھلے نواب صاحب کو لکھدیا کہ مسٹر ڈن کو علیحدہ کیجئے ورنہ احمد علیخان ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ پھر ایسا کوئی ہمدرد اور منتظم نہیں ملیگا۔ جسپر میں بھروسہ کرسکوں یہ بھی میں ان کو لکھا کہ اخباروں میں اشتہار دیجئے۔ اُمیدوارو درخواستوں کا تصفیہ احمد علیخان کے مشورہ سے کیجئے جسے وہ پسند اور منتخب کریں اس کا تقرر ہڈماسٹری پر کیجئے۔ چنانچہ چند ماہ کے بعد مجھے ایک خط منجھلے نواب صاحب کا ملا کہ ڈن علیحدہ کر دئے گئے۔ اور

منتخب کیا گیا۔ ایم۔ اے کا جو تعلیم دینے کا اچھا تجربہ و صلاحیت رکھتے ہیں۔ بنگال کے کسی ضلع کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹری کر چکے ہیں۔ بمشورہ سید احمد علیخان صاحب تقرر کر لیا گیا۔

یورپ کو روانگی

میں اپنے اسکول کی جانب سے مطمئن ہو گیا۔ اب میں یورپ جانے اور سفر جہاز وغیرہ کے اور قیام یورپ کے حالات قلمبند کرتا ہوں۔ میں میں انگلستان جانے کے قبل کلکتہ کئی غرضوں سے گیا۔ ایک تو یہ کہ کوک کمپنی کے ذریعہ سے جہاز کے ٹکٹ کا انتظام کروں۔ چنانچہ پی او کمپنی کے میل اسٹیمر موسوم بہ اورنٹل کے فرسٹ کلاس کیبن کا ٹکٹ لیا۔ اس زمانہ میں پی او کمپنی کے ڈاک لیجانے والے جہازوں میں سب سے بڑے اورنٹل وہمالینا جی جہاز تھے۔ اب تو موریا وغیرہ ہیں۔ رینکن اینڈ کمپنی سے سوٹ بنوائے کلکتہ میں اوس زمانہ میں تین انگریز خیاطیوں کے کارخانے مشہور تھے۔ ہارمن اینڈ کمپنی۔ ہینڈرسن اینڈ کمپنی اور رینکن اینڈ کمپنی آخرالذکر کے ہاں بہترین کٹر یعنی پوشاکیں قطع کرنیوالا تھا۔ چنانچہ اسی کے ہاں اور ڈر دے کر میں نے چند سوٹ بنوائے۔ ایک لانج سوٹ۔ ایک فراک کوٹ سوٹ۔ ایک ڈبل برسٹ ریفر اور ایک ڈریس سوٹ بنوایا۔ علاوہ اس کے ٹرنک خریدے جہاز کے ہولڈ کے لئے ایک بڑا ٹرنک اور ایک کیبن اسٹیل ٹرنک۔ اور ایک چمڑے کا گلیڈ اسٹون بیگ ایک چمڑے کا ہیٹ کیس اور چند چیزیں ہولڈآل رگ بلینکٹ وغیرہ جو بعد کو بیکار ثابت ہوئیں۔ پورا اوٹ فٹ کلکتہ میں تیار کیا کلکتہ میں جب اوٹ فٹ لینے کیلئے گیا تھا تو رائے بہادر تیج نرائن سنگھ رئیس بہاگلپور کی کوٹھی نمبر ۹ بن اسٹریٹ میں ٹھیرا تجربہ سے بعد کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں زیادہ سوٹ نہیں بنوانا چاہئے۔ صرف جہاز میں ان کو پہننے کیلئے نیوی بلو سرج کا ایک لانج سوٹ اور راتوں کو کھانے کے میز پر جانے کیلئے پورا ٹیل کوٹ نہیں بلکہ سی ڈریس سوٹ کافی ہے۔

لندن میں پہنچکر وہاں حسب ضرورت اچھے درزی سے چند سوٹ بنوائے جائیں۔ کیونکہ وہاں فیشن بدلتا رہتا ہے یہاں کے بنے ہوئے سوٹ بیکار ہو جاتے ہیں۔ زیادہ ٹرنک اور ہیٹ کیس اور ہولڈآل رگ اور بلینکٹ وغیرہ یہاں نہ خریدنا چاہئے۔ صرف ایک یا دو چمڑے کے سوٹ کیس اس زمانہ میں اسٹیل ٹرنک کا اور چمڑے کے پورٹ مینو اور چمڑے کے گلاڈسٹون بیگ کا زیادہ رواج تھا بہر حال دو سوٹ کیس جو کیبن میں با سانی رہ سکیں۔ ایک ہینڈ بیگ او - سن ہاٹ یا سافٹ فلٹ ہاٹ نہیں لینا چاہئے۔ جہاز پر استعمال کرنے کیلئے ریونگ کیاپ کافی ہے۔ بہر حال میں نے علاوہ اوٹ فٹ کی تیاری کے مسٹر جسٹس سید امیر علی سی۔ آئی۔ ای مرحوم (بعد کو رائٹ آنریبل پریوی کانسلر و ڈکلٹر)

جو اس زمانہ میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جج تھے اور جن کے والد سے اور بڑے بھائی ڈپٹی وارث علیخان مرحوم سے اور والد مرحوم سے دوستانہ تھا اور سید امیر علی مرحوم والد مرحوم کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ اور میرے بچپنے سے مجھے بہت چاہتے تھے۔ کئی خطوط لئے ایک مس مینگ کے نام کا لارڈ نارتھ برک سابق والیسرائے ہند کے نام کا اور ایک ارل یعنی لارڈ جبل کے نام کا۔ نواب بہادر سید امیر حسن خان مرحوم سے جو میرے رشتہ کے چچیرے بھائی ہوتے تھے اور اس زمانہ میں کلکتہ کے سدرن ڈویژن کے پریسیڈنسی مجسٹریٹ تھے انہوں نے چند خطوط دے ایک سر چارلس ٹرنر سابق چیف جسٹس مدراس ہائیکورٹ ایک سر الفرڈ لائل سابق لفٹنٹ گورنر صوبہ نارتھ ویسٹرن پراونسز جواب یونائیٹڈ پراونسز آگرہ اینڈ اودھ کہلاتا ہے۔ ایک خط سر اوپر لیتھ برج مشہور مصنف و مولف کے نام کا اور پٹنہ واپس آکر۔ نواب بہادر نواب سید ولایت علیخان مرحوم جن کا ذکر اوپر کئی جگہ آچکا ہے جن کے خاندان سے اور میرے خاندان سے کئی پشتوں کا دوستانہ و اتحاد تھا۔ اب بھی نواب بہادر مرحوم کے نواسے سید خورشید نواب صاحب مرحوم کے فرزند خان بہادر نواب سید اسمٰعیل خان عرف ججن صاحب سابق ممبر والیسریگل اسمبلی سے اور مجھ سے وہی روابط ہیں۔ اور مجھکو اپنے والد کا دوست سمجھ کر اس قسم کا برتاؤ کرتے ہیں۔ بہر حال نواب بہادر مرحوم نے اپنے دوستوں کو سر اسٹورٹ[1] کالون بیلی سابق لفٹنٹ گورنر بنگالہ اور سر ایڈمنڈ ڈرمنڈ کے نام خطوط دے۔

سر اسٹورٹ مالون پہلے صوبہ بہار میں آغاز ملازمت سے جبکہ وہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے قبل وارد ہند ہوئے اور بوقت غدر آراہ میں تھے اسسٹنٹ مجسٹریٹ سے کالکٹر و کمشنر ڈویژنل کمشنر پٹنہ کے ہوئے۔ بہار ہی میں عرصہ دراز تک رہے تھے قصبہ بہار کے کسی زمانہ میں جوائینٹ مجسٹریٹ و سب ڈویژنل افیسر بھی تھے۔ اونہیں کے زمانہ میں ان کے نام سے بیلی سرائے تعمیر کروائی گئی تھی جس میں بھولا چندر بھٹاچارجی ڈپوٹی مجسٹریٹ نے جو بیلی صاحب کے خاص آدمیوں میں سے تھے بڑا حصہ لیا تھا۔ بیلی سرائے بہار میں موجود ہے۔ بیلی صاحب میرے والد کے ثنا ساؤں میں تھے۔ ان کے نام کا خط لیجانے کی ضرورت نہ تھی۔ میرے بچپنے میں وہ مجھکو دیکھ چکے تھے۔ میرے خاندان سے خوب واقف تھے۔ جب وہ پٹنہ کے کمشنر تھے۔ مجھکو انعام بھی دیا تھا۔ اور یہیں سے

---

[1] سر اسٹورٹ کالون بیلی دو دفعہ حیدرآباد کے رزیڈنٹ ہو کر آئے تھے اور ان کے بڑے بھائی جو کلکتہ ہائیکورٹ کے کسی زمانہ میں جج تھے۔ فرزند سر چارلس بیلی بھی حیدرآباد کے رزیڈنٹ رہ چکے ہیں۔ پھر وہیں سے مشرقی بنگالہ کے لفٹنٹ گورنر ہوئے اور صوبہ بہار جب سر علی امام مرحوم کی کوشش سے بنگالہ سے علاحدہ کیا گیا تو سر چارلس لفٹنٹ گورنر ہو کر آئے بیلی اور کالون پرانا انگلو انڈین خاندان ہے۔

بنگالہ کے لفٹنٹ گورنر ہو کر گئے تھے۔ گو مجھے ان کے نام خط لیجانے کی ضرورت نہ تھی مگر نواب بہادر نے خود ارشاد فرمایا کہ بیلی صاحب کے نام بھی مجھ سے ایک خط لے لو۔

جب بقصد انگلستان پٹنہ سے میں روانہ ہوا تو صوبہ بہار کے اور چند طلبا بھی میرے ہمسفر تھے اور ایک ہی ٹرین اور ایک ہی کمپارٹمنٹ میں سوار ہوئے۔ ایک تو نواب زادہ ولی الدین خان نبیرہ نواب فخر الملک جنکا ذکر اوپر آچکا ہے اور ولی الدین خان میرے بچپنے کے دوست تھے علاوہ ان کے قصبہ باڑہ کے ایک رئیس خان بہادر بہادر حسین خان کے فرزند احمد حسین خان اور سید سراج الہدیٰ عرف نواب (مسٹر نور الہدیٰ سابق سشن جج کے برادر خرد مسٹر سید نور الہدیٰ ایم۔اے ال۔ ال۔ بی بیرسٹر ایٹ لا نے اپنے صوبہ کی بڑی خدمت یہ کی کہ جو کچھ کمایا اور اس سے بڑا حصہ پس انداز کرتے گئے۔ اس کثیر رقم سے مدرسہ عربی کا باقی پورلین قایم کیا اور ہزاروں کی لاگت سے عمارت بنوائی اور کثیر جائداد وقف کی اون کے اور دو بھائی مسٹر سید قمر الہدیٰ اور مسٹر سید نجم الہدیٰ بھی انگلستان کے تعلیم یافتہ تھے) اور سید محمد قاسم (حال خان بہادر متولی اوقاف بی بی صغرا مرحومہ) فرزند سید شاہ مقصود احمد صاحب رئیس قصبہ بہار غلام محی الدین احمد حسین خان کے بہنوی ہم سب بمبئی میں جب پہنچے تو ایک ہی ہوٹل میں جا کر مقیم ہو گئے۔ ہم لوگوں کے بمبئی پہنچنے کے دوسرے دن نواب احسن الدولہ بہادر بیرسٹر ایٹ لا جو بعد کو بنگالہ کے اکسائز کمشنر اور انسپکٹر جنرل رجسٹریشن صوبہ و کمشنر آبکاری وغیرہ ہوئے۔ اپنے خواہر زادہ سید ولی الدین خان کو پہنچانے کیلئے وارد بمبئی ہوئے اور جس ہوٹل میں ہمارا مختصر قافلہ مقیم تھا وہاں آگئے۔ چونکہ ہمارے جہاز کی روانگی کو چار روز باقی تھے تو ہم لوگ بمبئی کی سیر کو ادھر اُدھر نکل جایا کرتے تھے۔ کبھی وکٹوریہ فٹن جسکی اس زمانہ میں بمبئی میں بیحد کثرت تھی۔ لے لیتے یا مٹر گشتیاں کرتے پھرتے۔

بمبئی میں وارد ہو کر دوسرا دن تھا صبح کی چائے اور ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد میں اور ولی الدین خان ملکر ٹہلنے کو نکلے۔ ہمارا ہوٹل موسوم بہ الکزنڈرا ہوٹل فورٹ (قلعہ) میں تھا جسکے آس پاس یورپین وضع کی بکثرت دوکانیں تھیں اُن میں سے ایک میں جو پارچہ فروش کی دوکان تھی۔ تفریحاً گھس گئے لینا دینا ساڑھے بائیس میں نے دوکاندار سے کہا کہ سوٹنگ کے عمدہ نمونے کے کپڑے دکھاؤ۔ چنانچہ وہ غریب دوکاندار یکے بعد دیگرے بہت سے تھان لا لا کر دکھانے لگا یہ ناپسند وہ ناپسند کرکے میں ناحق بھی اسکو پریشان کر رہا تھا کہ اتنے میں دو مسلمان صاحب انگریزی لباس میں مگر ترکی ٹوپی دیئے آئے۔ ان میں سے ایک صاحب نے بہت بے تکلفی سے

مجھ سے پوچھا آپ کہاں کے رہنے والے ہیں اور کہاں جائیں گے۔ ہم دونوں سراپا یورپین لباس میں تھے۔ سوٹ بوٹ اور ہیٹ ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ میں فلاں جگہ کا رہنا والا ہوں۔ اور عازم انگلستان ہوں یہ سنکر میرے مستفسر نے کہا کہ کیا تعلیم کی غرض سے انگلستان جاتے ہیں۔ اور کس جہاز پر اور کب جائیں گے۔ میں نے کہا جی ہاں تعلیم ہی کی غرض سے جانے کا قصد ہے اور اورنٹل جہاز میں جاوں گا۔ یہ سُننا تھا کہ اُنہوں نے جھٹ ہاتھ ملایا اور کہا کہ میں بھی اسی جہاز میں جانے والا ہوں۔ پھر تو ہم آپ ہمسفر ہوں گے۔ میں نے کہا مجھے یہ سنکر بہت خوشی ہوئی۔ میرا نام سید ہمایوں مرزا ہے۔ آپ کا اسم شریف کیا ہے۔ اور ان صاحب کا (جوان کے ساتھی تھے) اسم گرامی کیا ہے۔ انہوں نے کہا میرا نام سید سراج الحسن ہے اور یہ میرے عزیز ہیں ان کا نام مرزا خورشید بیگ ہے۔ پھر مجھ سے پوچھا آپ کہاں ٹھیرے ہیں میں نے کہا فلاں ہوٹل میں جس پر انہوں نے کہا کہ کل دس بجے آپ سے ملنے کیلئے ہوٹل میں آوں گا میں نے کہا بسر وچشم ضرور آیئے اور بریکفاسٹ ہم لوگوں کے ساتھ کھا یئے۔ میں آپ کا منتظر رہوں گا۔ اور یہ بھی کہا کہ گیارہ بجے ہم سب بریکفاسٹ کھاتے ہیں۔ دوسرے روز میں نے انتظار کیا اور بارہ بجے خلاف معول بریکفاسٹ کھایا مگر یہ نہ آئے۔

سید سراج الحسن وہی ہمارے قدیم دوست ہیں جو ڈاکٹر سراج یار جنگ وظیفہ یاب حیدرآباد ہائیکورٹ کے جج ہیں اور خورشید بیگ نواب نظر جنگ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے

حالات جہاز

عجیب اتفاق کہ جب جہاز پر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہی کیبن میں ہم دونوں کے اسباب کوک کے آدمیوں نے لاکر رکھ دیے تھے۔ میرے برتھ کا نمبر بائیس تھا اور سراج الحسن کے برتھ کا نمبر ۲۳ تھا۔ پھر تو رات دن کا ساتھ ان سے رہا۔ جہاز پر علاوہ ہم مسلمانوں کے دو پارسی طلبا بھی تھے مسٹر ازیان اور مسٹر مانک شاہ۔ اول الذکر بہت مسن تھے بیرسٹری کی تعلیم کے لئے جارہے تھے اور آخرالذکر بہت کمسن تھے اور آئی۔ سی۔ ایس کیلئے جارہے تھے۔ ایک بنگالی ہندو مسٹر سین بھی تھے۔ جو انجنیرنگ کی تعلیم کے لئے جارہے تھے۔ ان کو گانے کا بہت شوق تھا اور آواز بھی بہت سُریلی تھی۔ اکثر ان کو گوایا کرتے اور لطف صحبت رہتا مجھے بھی موسیقی سے دلچسپی تھی پھر تو بقول شاعر۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو   خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

میرے کیبن میں اکثر یاروں کا جگھٹا رہتا کبھی سین گاتے کبھی میں گاتا۔ آٹھویں اپریل کو دن کے دو بجے میرے جہاز نے بمبئی سے لنگر اٹھایا تھا۔ موسم عدن تھا۔ بہت خوشگوار تھا۔

سمندر بالکل خاموش تھا۔ معلوم ہوتا تھا ایک شیشے کی چادر یہاں سے وہاں تک بچھی ہوئی ہے جسوقت جہاز بمبئی سے روانہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے یہ مطلع موزوں کیا۔

ہمصفیر و آج گلشن سے جدا ہوتے ہیں ہم خوش رہو تم صید فتراک بلا ہوتے ہیں ہم

دوسرے دن اور چند شعر کہکر غزل مکمل کر ڈالی اور عدن پہنچکر وہ غزل اپنے ایک دوست حسن نواب کو پٹنہ بھیجی۔ ہم چند ہندیوں کے سوا باقی مسافر فرسٹ اور سکنڈ کلاس میں سب یوریپین مرد وزن تھے۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ اینگلو انڈین حضرات اپنے تئیں خاصان خدا تصور کرتے تھے۔ اور ہندیوں کو جنگلی نیم وحشی سمجھ کر ہمکلامی کا موقع دینا کسر شان سمجھتے تھے۔ اسلئے ہملوگوں سے یہ خاصان خدا بات چیت کرنا ننگ و عار جانتے ہملوگوں کو بھی ان کی پروا نہ تھی تجھے پروا نہیں میری کر دل پروا میں کیوں تیری۔ ایک امر قابل ذکر یہ ہے کہ پورٹ سعید یعنی بندر سعید تک یہ خاصان خدا ہم نیم وحشیوں کی جانب مطلق متوجہ نہوئے بھولے منہ سے ایک بات نہ کی جب جہاز بندر سعید سے آگے بڑھا تو بعض نے یکے بعد دیگرے ہمکلامی کا شرف بخشا وہ بھی معمولی باتیں آپ یورپ جارہے ہیں اور کس غرض سے جارہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس کا مطلب جہاں تک میں نے غور کیا تھا کہ غالباً ان گورے چٹوں کا یہ خیال ہوگا کہ یہ کالے آدمی عدن یا سویز یا بندر سعید میں کہیں اُتر جائیں گے۔ جب یہ معلوم ہوگا کہ یہ کالے لوگ یورپ جارہے ہیں اور یورپ کی ہوا کھا کر آزادی پسند بھی ہو جائیں گے۔ اور یورپ پہنچکر ہماری حقیقت کا اندازہ کرلیں گے۔ ہماری خو بو سے واقف ہوں گے اور بعد مراجعت ہمارا بھانڈا پھوڑینگے اور خود بھی صاحب بہادر ہو جائیں گے۔ انگلستان پہنچکر بڑی بڑی سوسائٹیوں میں گھل مل جائیں گے اور یوریپین ان کی نظروں میں نہ سمائیں گے۔ ان خیالات کے اثر نے ان کی صاحبی کرکری کردی اور ہم لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ چھٹے دن جہاز عدن پہنچا۔ چار گھنٹے لنگر انداز رہا یہ ہمیشہ کا دستور ہے کہ جب کوئی جہاز کسی بندر پر پہنچکر ٹھہرتا ہے تو اس مقام کے سوداگر مختلف اشیاء لے کر جہاز پر فروخت کرنے کی غرض سے آجاتے ہیں۔ مسافر چیزیں اچھی قیمتوں پر خرید لیتے ہیں خصوصاً ایسے مسافر جو اس طرف پھر نہ آنے کا خیال رکھتے ہوں۔ مثلاً وہ انگریز جو وظیفہ لے کر انگلستان جارہے تھے اُن کو یہ توقع نہیں تھی کہ عدن پھر بھی کبھی آئیں گے۔ انہوں نے کچھ چیزیں خریدیں ہم لوگوں نے بعض نے کچھ سگریٹ کے بکس خریدے عدن میں چونکہ تمباکو پر چنگی کا محصول نہیں ہے اسلئے سستے داموں سگریٹ اور سگار ملتے ہیں۔ عدن میں یہ نظارہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا۔

کہ جس جگہ جہاز کھڑا رہتا ہے۔ اس کے اردگرد سیکڑوں وحشی عربوں کے چھوٹے چھوٹے چھوکرے صرف لنگوٹیاں باندھے غوطے لگانے جاتے ہیں اور یہ کہتے جاتے ہیں۔ ہوائے ٹو دوبو ہوائے ڈرائیو Have a drive یعنی لٹ می ہوائے ذرد بو Let me have a drive یعنی مجھے غوطہ لگانے دو مسافر سمندر میں دو قی چو قی پھینکتے ہیں اور یہ چھوکرے انکو منہ میں لیکر دانتوں سے دبائے ہوئے۔ باہر نکل آتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے جہاز کے مسافروں نے دونیاں چونیاں بہت سی پھینکیں ہم لوگوں نے بھی پھینکیں جب تک جہاز کھڑا رہا یہ تماشہ ہوتا رہا۔

بمبئی سے جب ہمارا جہاز روانہ ہوا تو چار روز تک جانب جنوب ارے بین سی میں یعنے بحر عرب میں چلتا رہا۔ بحر عرب بحر ہند سے مل گیا ہے دو دن پھر جانب جنوب بحر ہند میں ہمارا جہاز چلتا رہا۔ بعد جانب غرب ایک آبنائے میں داخل ہوا جس کا نام باب المندب ہے عدن کا بندر اسی آبنائے میں ہے۔ عدن وہ مقام ہے جہاں سیکڑوں سال کے قبل شداد نے بہشت و دوزخ بنایا تھا اب بھی اس کے آثار موجود ہیں یہ مقام ایک عرب رئیس کی ملک میں تھا جسکو سنہ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے لے لیا تاکہ ہندوستان کے رستہ کی حفاظت ہو وہاں قلعہ بھی تعمیر کیا ہے۔

عدن سے بوقت عصر ہمارا جہاز جانب شمال رڈ سی یعنے بحر احمر میں جسکو بحر قلزم بھی کہتے ہیں داخل ہوا عدن تک گرمی کی مطلق تکلیف نہ تھی۔ اپنے اپنے کیبنوں میں راتوں کو آرام سے سوتے تھے۔ کیبن کو عرب قمارہ کہتے ہیں۔ جسوقت بحر احمر میں جہاز داخل ہوا معلوم ہوا کہ تنور میں ڈالدیا گیا۔ شب و روز وہ بلا کی گرمی کہ الاماں الاماں بقول غالب ؎ بہار میں جائیں ایسے لیل و نہار

راتوں کو ڈک یعنی عرشہ پر بچھونے کئے جاتے تھے اسیر بھی ہوا نام کو نہیں جس بیجا کی سزا بلا قصور قدرت نے دی تھی اوپر مصیبت یہ کہ گرمیوں کا لباس ساتھ نہیں راتوں کو سلیپنگ سوٹ میں گزر بسر کر لیتے مگر دن کو گرم سوٹ میں رہنا بھاڑ میں چنوں کے بھونے جانے کے مترادف تھا۔ ایک دن کسی طرح سوٹ میں رہ کر کاٹا دوسرے دن یہ ترکیب کی کہ سلیپنگ سوٹ پہنے کیبن ہی میں رہتے بہ دستور بریکفاسٹ کھانے کیلئے سوٹ پہن کر اوپر جاتے پھر کیبن میں آکر کپڑے بدل لیتے کیبن کے باہر بغیر سوٹ پہنے نکلنا خلاف تہذیب مغربی تھا کیونکہ انگریزنیں ادھر سے اُدھر پھرتی رہتی تھیں میم صاحب کے سامنے بغیر سوٹ کے آنا ارتکاب گناہ کبیرہ ہے۔ مغربی تہذیب کی بعض باتیں تو معقول قابل اخذ ہیں ورنہ حماقت آمیز و پر تکلف ہیں ہماری سب سے بڑی کمزوری و خامی یہ ہے کہ بلا سمجھے بوجھے یورپ کی ہر چیز کی تقلید کرنے اور لبیک کہنے کو تیار رہیں انسان کا اصول خذ ما صفا دع ما کدر ہونا چاہئے

اے ذوقِ تکلیف میں ہے تکلیف سراسر ٭ آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

گرمی کا یہ عالم کہ ناک میں دم باوجودیکہ علاوہ صبح کے حمام کے تیسرے پہر کو بھی حمام کرتے اور خوب تربوز (عدن سے نہایت شیریں تربوز جہاز والوں نے لیے تھے) اور سنتروں پر ہاتھ مارتے مگر گرمی بے پناہ تھی اس پر سے تکلف و حماقت آپ گورے حضرات ٹویڈ کے اونی سوٹ میں ملبوس نظر آتے چار دن کے بعد جہاز سویز کنال میں داخل ہوا۔ ساٹھ سال کے قبل اتمس تھا جسے اتمس آف پناما ہے یعنی دو سمندروں کے بیچ میں زمین کا ٹکڑا تھا وہ زمین کاٹ کر نہر نکالی گئی جسے بحر احمر کو میڈیٹرین سی یعنے بحر روم سے ملا دیا۔

ایک فرانسیسی انجنیر الیساپ نامی نے فن انجنیرنگ کا یہ بیش بہا کرتب دکھایا سویز کنال میں جب جہاز یورپ کو جاتا ہے تو داہنی جانب حجاز عربستان کا حصہ ہے اور بائیں جانب اقلیم افریقہ واقع ہے وہ حصہ افریقہ کا جسکو مصر کہتے ہیں اور جسکا شرقی حصہ سویز اتمس سے ملا ہوا تھا۔ صرف وہی تھی بلکہ سارا مصر و سوڈان اور ملک عربستان مع حجاز ساٹھ سال قبل جبکہ نہر نکالی گئی تھی ترکوں کا ملک تھا۔ اسلئے نہر نکالنے کیلئے ترکوں سے اجازت لیکر یورپین انگریز و فرانسیسی اشخاص کی ایک کمپنی قائم ہوئی اور کروروں روپئے کے صرفہ سے یہ نہر نکالی گئی اور جو جہاز اس میں سے گزرتا ہے اُس پر محصول عائد ہوتا ہے یا اور جو ذرائع آمدنی کے نکالے گئے ہیں وہ شرکار کمپنی آپسمیں تقسیم کر لیتے ہیں اسوقت ترکوں کا بھی کچھ حصہ رکھا گیا بہرحال سویز کے کنارہ کنارہ مصری زمین پر ٹرین اسکندریا و قاہرہ وغیرہ جاتی ہے۔ اور ریلوے کا بہت بڑا ورک شاپ اور افسروں کے خوشنما متعدد بنگلے اور عملہ کے کثرت سے مکانات وہاں ہیں نہر جو نکالی گئی ہے۔ وہ زیادہ عریض نہیں ہے۔ دو جہاز بدقت آتے جاتے ہیں۔ عمیق بھی بہت نہیں ہے۔ بعض دفعہ جہاز پھنس جاتا ہے پھر گھنٹوں میں بڑی مشکل سے نکلتا ہے اور جب نہر کو عبور کرتا ہے تو رفتار سست ہو جاتی ہے۔ ہمارا جہاز قریب ظہر سویز میں داخل ہوا اور چیونٹی کی یا سلاتھ (جالور کا نام ایک قسم کا ریچھ) کی رفتار سے تھوڑی دور جا کر پھنس گیا۔ بڑے بڑے رسے جہاز میں باندھے گئے کھینچ تانی دونوں کناروں سے ایک طرف حجازی دوسری جانب مصری ہو رہی تھی بہت سے قلی رسوں کو کھینچ رہے تھے مگر ہمارے جہاز صاحب بہت وضعدار تھے وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے ہم لوگوں کی اچھی خاصی دل لگی تھی۔ سویز کے اس کنارہ پر جہاں ریلوے لائین وغیرہ ہے عربوں کے چھوکرے خچر لیے بیچا سو کی تعداد میں پہلے سے وہاں موجود تھے وہ دریافت کر لیتے ہیں کہ کونسا جہاز کب آنے والا ہے۔

چونکہ دیر تک جہاز یہاں عموماً ٹھہرا رہتا ہے اور اگر پھنس گیا تو اور بھی دیر لگتی ہے۔ اس اثنائے میں مسافر خچروں پر سوار ہو کر تھوڑی دور سویز کے دیہاتوں میں نکل جاتے۔ تین روپیہ آٹھ آنے مسافت اور وقت کے لحاظ سے خچر کے مالک کو دیتے ہیں اور یہ لونڈے خچر والے ڈنکی رائڈ ڈمسر ڈنکی رائڈ (Donkeyride Dir donkeyride) کے نعرے اس زور سے لگاتے ہیں کہ کان کے پردے پھاڑے ڈالتے ہیں۔ یہ چھوکرے صاحب بہادر سے دبتے ہیں۔ سواری کرکے آنے کے بعد جو صاحب بہادر نے خوشی سے دیدیا کان دبا کر لے لیتے ہیں۔ مگر ہندیوں کو دباتے ہیں کہ اور دو چنانچہ ہمارے قافلہ کے دو آدمی سین بنگالی اور پارسی نانکشا عصر کے وقت خچروں پر سوار ہو کر ہوا خوری کو گئے تھے۔ واپسی میں سین کے ساتھ بڑی حجت خچر والے نے کی اور نانکشا کے ساتھ ان کے خچر والے نے بہت برا برتاؤ کیا۔ ان کو راستہ معلوم نہ تھا۔ ایک جانب کھیت میں لے کر چلا گیا۔ اُدھر سناٹا تھا۔ غالباً پہلے سے کہی بدی تھی کہ ایک اور عرب ایک جانب سے نکل آیا اور بیچارہ مانکشا کو مارا اور ان کا پرس بٹوا جس میں کئی پونڈ تھے ان کی جیب میں سے چھین کر ان کو وہیں چھوڑ کر اور دونوں عرب اپنا خچر لیکے بھاگے پہلے کو دو تین انگریز ہمارے جہاز کے مسافر جو کرایہ کے خچروں پر تفریحاً سیر کو نکلے تھے۔ اس طرف سے آرہے تھے مانکشا کی نظر ان پر پڑی اور چیخ کر پکارا وہ ان کی مدد کو آگئے اور ان کو ساتھ لے کر جہاز پر آئے۔

ان بدمعاشوں پر بھروسہ کرکے کبھی تنہا نہ جانا چاہئے۔ انگریز تین چار مل کر ایسے موقع پر ہوا خوری کو نکلتے ہیں۔ خدا نے خیر کی کہ مانکشا کو زیادہ نہیں مارا پیٹا یہ کہتے تھے کہ جب ان دونوں بدمعاشوں نے تشدد کرنا چاہا تو میں نے فوراً اپنا بٹوا ان کے حوالہ کر دیا اونہوں نے خچر پر سے گرا دیا اور ایک لات رسید کرکے بھاگے شب کے کھانے کے وقت بڑی دل لگی رہی۔ رات بھر ہمارا جہاز سویز میں رہا۔ بجلی کے سبز سرخ بلب یعنی قمقمے سیکڑوں کی تعداد میں کنارہ اور پانی پر چھوٹے چھوٹے فلوینٹ پر روشن کر دیے گئے تھے۔ بہت دلفریب نظارہ تھا صبح کو تار دے کر بندر سعید سے جو وہاں سے قریب ہے ایک اسٹیمر منگایا گیا۔ اور بڑی موٹی زنجیریں اسٹیمر میں لگا کر ہمارے جہاز کے سامنے کے حصہ میں لگائی گئیں اور اسٹیمر نے کھینچنا شروع کیا۔ تب ہمارا جہاز پانی پر اوبھرا اور خراماں خراماں چلا چند گھنٹے سویز میں چلتا رہا خدا کی قدرت ادھر ہمارا جہاز سویز سے نکلکر بحر روم میں داخل ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ہم دوسری دنیا میں آگئے۔ یا تو مارے گرمی کے حواس باختہ اور پسینہ میں تر بتر تھے یا سردی سے کانپنے لگے۔ جھٹ گرم کپڑے پہنے اور گرم اونی انڈرویسٹ عام طور سے بنیاین اور

گنج فراک بھی کہتے ہیں۔ بمبئی میں ہوٹل کے منیجر کے مشورہ پر میں نے ایک خرید لیا تھا۔ اس کے پہننے کی ضرورت ہوئی دوسرے دن بندر سعید میں ہمارا جہاز پہنچا وہاں بھی بہت سے سودے والے جہاز پر آگئے اقسام کے پتھروں کے مالے۔ کہربائے شمعی اور کہربائے بلغی کے مالے بیچنے کو لائے تھے۔ انگریز ان کی بہت شائق دکھائی دیں۔ عمدہ خوش رنگ کہربائے شمعی کا بڑا مالا پانچ چھے پاونڈ کو بعض نے خریدا۔ شیم اور کہربا کے سگریٹ ہولڈر بہت سے لوگوں نے خریدے۔ تین چار گھنٹے وہاں جہاز ٹھہرا۔ پھر اس نے لنگر اٹھایا۔ چوتھے دن برانڈزی میں جو اٹلی کے مشرقی کنارہ کا ایک بندر ہے پہنچا۔

اس زمانہ میں انگلستان وغیرہ کی ڈاک برانڈزی میں اتاری جاتی اور پھر بذریعہ ریل کیلے[1] تک وہاں جہاز سے عبور کرنے کے بعد ڈوور[2] سے ٹرین کے ذریعہ لندن جاتی یا تو مارسیلز فرانسی بندر میں ڈاک اتاری جاتی ہے اور وہاں سے بذریعہ ریل کے کیلے تک جاتی ہے۔ انگلش چینل کو بذریعہ جہاز گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں عبور کرکے فوکسٹن سے پھر ریل کے ذریعہ لندن وغیرہ جاتی ہے۔ بہر حال جہاز برانڈزی میں ٹھیرا۔ ہم لوگ بھی شہر دیکھنے کیلئے اترے اور ایک وکٹوریا فٹن لیکر بازارات وغیرہ دیکھ کر آئے۔ میرے دوست سید سراج الحسن برانڈزی میں اتر گئے اور مسٹر ڈنلاپ جو حیدرآباد میں صدر ناظم مال تھے۔ اس زمانہ میں نہ معلوم کس خدمت پر تھے وہ بھی وہیں اترے اور سراج الحسن ان کے ساتھ ریل کے ذریعہ لندن روانہ ہوئے۔

ہم لوگوں کا یعنی صوبہ بہار کے طلبا کا اور پارسیوں اور سین کا سمندر کے راستہ سے لندن تک کا ٹکٹ تھا۔ اس لئے ہم سب جہاز میں رہے۔ جہاز نے کوئلہ وغیرہ برانڈزی میں لیا۔ چار گھنٹوں کے بعد جہاز روانہ ہوا۔ تیسرے دن آبنائے جبرالٹر میں جہاز پہونچا یعنی جبل الطارق میں۔ موسیٰ ابن طارق نے اندلس فتح کرنے کیلئے اپنا جہاز یہیں ٹھہرایا تھا۔ آبنائے کے کنارے پہاڑ پر ایک قلعہ انگریزوں نے بنالیا ہے۔ اور ہندوستان کی حفاظت اور اسکو اپنے قبضہ میں رکھنے کیلئے اس پر بھی قبضہ کرلیا ہے۔ یہاں بھی حسب معمول سوداگر جہاز پر اپنا سودا لیکر آئے انگریزوں نے کچھ خریدا۔ تین چار گھنٹہ کے بعد جہاز روانہ ہوا اور جانب غرب ایک سمندر موسوم بہ بے آف بسکے میں پہنچے یہاں بیحد تلاطم تھا اور دوازدہ ماہ رہتا ہے تین شبانہ روز متلاطم سمندر میں جہاز چلتا رہا۔ جہاز اسقدر ڈول رہا تھا کہ چلنا پھرنا دشوار تھا۔ چوتھے دن پلے متھ انگلستان کے مشرقی بندر میں جہاز پہنچا۔ بعض لندن جانے کے ہم سب یہیں اتر پڑے۔ کیونکہ سمندر کے نام سے وحشت ہوتی تھی یہاں سے لندن میں ہماری دوستوں کو تار دیا کہ بذریعہ ٹرین ہم لوگ آرہے ہیں

[1] مقام کا نام [2] جگہ کا نام

چنانچہ دوسرے دن چار بجے پیاڈنگٹن اسٹیشن میں ہماری ٹرین پہنچی یہاں ہم لوگوں کے لینے کے لئے عزیزی سید حسن امام مرحوم اور عزیزی سید آل حسن مرحوم اور سید نجم الہدیٰ سراج الہدیٰ عرف مجھلی نواب کے سنجھلے بھائی اسٹیشن پر موجود تھے۔ ہم لوگوں کو لے کر نمبر ۴ پمبرج ولاز (نام مکان) واقع محلہ بیز واٹر میں آئے چند روز یہاں قیام کرنے کے بعد ہم سب مثل بوئے گل منتشر ہو گئے۔

لندن پہنچے

کوئی کیمبرج گیا کوئی اکسفورڈ گیا کوئی لندن میں رہا جو سوٹ کلکتہ سے میرے ساتھ آئے تھے وہ سب بیکار ہو گئے۔ ایبسی مارو ساکن ۲۰ ر وکٹوریہ اسٹریٹ ایک نامی خیاط کے ہاں ایک انگریز دوست مجھکو لیکر گئے وہاں میں نے چند سوٹ بنوائے ہیں جن انگریزوں کے نام خط لیکر گیا تھا جب کپڑے وغیرہ درست ہو گئے اور کچھ دن لندن میں رہ کر وہاں کے حالات و تہذیب وغیرہ سے بھی واقف ہو چکی تو ان لوگوں کو خط لکھ لکھ اوقات معینہ کے لحاظ سے ملتا گیا۔ ان لوگوں نے دعوتیں کیں۔ کسی نے ڈنر پر بلایا کسی نے لنچ کی دعوت کی اور کسی نے صرف چائے کی دعوت کی سر ایسٹورٹ کالون بیلی نہایت اچھی طرح شفقت بزرگانہ کے ساتھ ملے اور کھانے کی دعوت پر بھی بلایا۔ اور پھر ہمیشہ دوران قیام انگلستان میں ان سے ملتا رہا۔ لارڈ نارتھ بروک سابق وائسرائے ہند بھی اچھی طرح سے ملے وہ اس زمانہ میں بمنزلہ ہیملٹن پلیس متصل ہائیڈ پارک رہتے تھے۔ جب میں نارتھ بروک کلب کا ممبر ہو گیا تو اکثر اون سے ملنا ہوتا تھا۔ انگلستان پہنچنے کے چند روز بعد میں بیرسٹری کی تعلیم کے لئے مڈل ٹمپل میں داخل ہوا چند دنوں کے بعد میں کیمبرج بغرض تعلیم یونیورسٹی گیا اور چند دن قیام کیا کسی کالج میں کوئی کمرہ خالی نہ تھا میں نے کچھ دن انتظار کیا پھر میں علیل ہو گیا۔

ملیریا کے بخار نے میرا پیچھا لیا کیمبرج میں رنجیت سنگھ جی سے مجھسے اچھے مراسم ہو گئے تھے۔ (بعد کو مہاراجہ جام صاحب جام نگر[1]) علالت کا سلسلہ بہت دنوں تک رہا۔ ڈاکٹروں نے مجھسے کہا کہ کیمبرج مارشی مقام ہے یعنی دلدلی ہے۔ بعض طبایع سے موافقت نہیں کرتا۔ خصوصاً بلغمی مزاج والونکی اس لئے بہتر ہے کہ کیمبرج سے چلے جاؤ۔ چنانچہ میں بغرض تبدیل آب و ہوا بورنمتھ جو سمندر کے کنارے واقع ہے چلا گیا اور ہفتہ عشرہ میں میرا مزاج سنبھل گیا اور ملیریا کے بخار نے میرا پیچھا چھوڑا۔ وہاں سے میں لندن واپس آگیا اور کنگس کالج میں ڈے اسکالر کی حیثیت سے داخل ہوا۔ وہاں میں نے ریکونامکس (معاشرت) لیا یہ حالات ۱۸۹۱ء کے ہیں۔ اسوقت تک چاروں انس آف کورٹ (Inns of Court) میں جو طلبا بیرسٹری کی تعلیم کے لئے داخل ہوئے تھے۔ لکچر سننا اُن کے لئے

---

[1] جام نگر کا پٹھا دو از چند سال قبل میں اور میری بی بی گئی تھیں۔

لازمی امر نہ تھا چار دن انس آف کورٹ سے غرض یہ ہے انر ٹیمپل (Inns Temple) و مڈل ٹیمپل (Middle Temple) لنکنس ان (Lincolns Inn) گریز ان (Grays Inn) ٹیمپلو سے کیا مراد ہے اور ابتدا بیرسٹروں کی کیونکر سے ہوئی اسکی تاریخی کیفیت مختصر طور سے بیان کئے دیتا ہوں

سلطان صلاح الدین کا ذکر

جس زمانہ میں کہ جنگ صلیب سلطان صلاح الدین اور سلاطین یورپ سے ہوئی تو چھ سات عیسائی سلاطین ملکر بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ سے لے لینے کیلئے مع اپنی افواج جرار کے صلاح الدین کے مقابلہ میں گئے تھے۔ سلطان صلاح الدین نے تقریباً وہی کام کئے جو حال میں مصطفےٰ کمال پاشا نے کئے۔ یعنی ایک طرف تو مسلمانوں کی عزت بچائی۔ ترکوں کو از سر نو زندہ کیا دوسری طرف خلافت آل عثمان کا خاتمہ کیا صلاح الدین نے بھی ایسا ہی کیا تھا کہ ایک طرف مسلمانوں کی عزت آبرو بچائی۔ بیت المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ نہیں ہونے دیا۔ باوجودیکہ سات سلاطین ملکر آئے تھے۔ دوسری جانب خلافت بنی فاطمہ کا خاتمہ کیا تھا بہرحال اس جنگ صلیب میں جسکو انگریز (War of Crusades) یعنی جہاد کی جنگ کہتے ہیں۔ انگلستان کا بادشاہ رچرڈ شیر دل Richard the Lion Hearted بھی شریک تھا۔ اس کے ساتھ اس کے درباری امرا بھی میدان جنگ میں ساتھ تھے۔ جب عیسائی سلاطین نے منہ کی کھائی اور شکست خوردہ سلاطین اپنا اپنا سامنہ لیکر واپس گئے۔ تو وہ امرا جو شاہ انگلستان کے ساتھ آئے تھے انہوں نے دنیا ترک کی چونکہ بیت المقدس بھی ان عیسائیوں کے خیال میں ایک ٹمپل معابد ہے تو اس کی نقل کی یعنی لندن میں ایک ٹمپل بنایا اور جسقدر ان کے پاس املاک تھی وہ سب اللہ کی راہ میں ٹمپل کے اخراجات کیلئے وقف کردی اور ٹمپل کے متصل دارالاقامہ بنایا زن و فرزند کو چھوڑ کر وہیں رہنے لگے۔ ایک ہی جگہ سب ملکر کھاتے تھے شاہ وقت اس گروہ کی تعظیم و تکریم کرتا جب اور امرا نے دیکھا کہ اس گروہ میں داخل ہونے سے علاوہ دینی خدمات کے عوض اور ترک دنیا کرنے سے عقبیٰ میں تو صلہ ملے ہی گا۔ دنیا میں بھی عزت و احترام ہوتا ہے طبقہ امرا کے بہت سے لوگ بیوی بچوں کی قوت بسری کیلئے کچھ چھوڑ کر بقیہ جائداد وقف کرکے اس گروہ میں داخل ہو جاتے اور فقیروں کا لباس اختیار کرتے۔ اس وقت کا جو مروجہ لباس تھا اُس پر سے ایک بڑی کفنی گلے میں ڈال لیتے جب لوگوں کو رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوا کہ اس طبقہ کے لوگوں کی عزت بادشاہ بھی کرتا ہے تو جس کسی کو کوئی ضرورت لاحق حال ہوتی تو اس گروہ کے اشخاص میں سے کسی سے سفارش کرواتا اور ان لوگوں کے ذریعہ سے کام نکل جاتا۔ اس زمانہ میں عدالتیں نہیں تھیں

نہ فوجداری نہ دیوانی بلکہ طریقہ یہ تھا کہ بادشاہ ذوقت وقت مقررہ پر دسٹ منسٹر[له] ہی میں ایک مقام پر اجلاس کرتا جہاں ایک گرجا تھا اور وہ اب بھی ہے ۔ اور اس گرجے میں مشاہیر اور بعض سلاطین کے مزارات ہیں اب تو ایک خاصہ قبرستان ہے ۔ کسی بڑے امیر یا بڑے باکمال شاعر یا ناول نویس یا اور کسی معروف و مشہور شخص کو مدفون کرنا ہوتا ہے تو اجازت خاص لینی ہوتی ہے۔

غرض بادشاہ اجلاس کرتا اور حاجتمند اپنی درخواستیں لیکر جاتے اور بادشاہ اسیوقت تصفیہ جو کرنا چاہتا کر دیتا وہاں یہ حضرات ٹمپل کے پجاری جنکا خطاب نائٹ ٹمپلر دیا گیا تھا۔ لوگوں کی درخواستیں لیکر آتے اور چند کلمے سفارش کے کہکر بادشاہ سے حسب دلخواہ تصفیہ کراتے ۔ نائٹ ٹمپلر کی وجہ تسمیہ یہ ہے چونکہ بڑی مہم سے واپس آئے تھے حالانکہ ناکام واپس آئے تھے ۔ مگر خطاب نائٹ کا دیا گیا ۔

قدیم زمانہ میں آٹھ نو سال قبل نائٹ اس شخص کو خطاب دیا جاتا تھا جو غیر معمولی قسم کی شجاعت دیکھاتا تھا ۔ جسکو شیر نیستان کہہ سکتے تھے مگر یہ حضرات شیر قالین تھے ۔ شجاعت تو کچھ دیکھائی نہیں مگر مفت میں نائٹ کا خطاب مل گیا ۔ ٹمپلر اسلئے کہ ٹمپل بناکر اس کے پجاری بنے ہوئے تھے رفتہ رفتہ یعنے کئی پشتوں کے بعد یا تو بادشاہ ان کو اپنے برابر کرسی پر بٹھاتا تھا یا یہ حالت ہوئی کہ بادشاہ کی کرسی کے سامنے ایک کٹہرا قایم کیا گیا اور ان حضرات کو حکم دیا گیا کہ کٹہرے کے اس طرف کھڑے ہوکر جو کچھ معروضہ کرنا ہے کریں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر روز اگر شب قدر بودے شب قدر بے قدر بودے ۔ کٹہرا جو نصب کیا گیا وہ بار کہلاتا تھا اور یہ حضرات نائٹ ٹمپلر جنٹلمین ایٹ دی بار کہلانے لگے ۔ ایک عرصہ دراز تک یہ لوگ سعی سفارش جو کرتے تو کسی سے کوئی صلہ نہیں لیتے رفتہ رفتہ کچھ لینے لگے مگر ہاتھ سے نہیں چھوتے کفنی جو گلے میں ڈالے رہتے جواب کچھ ترمیم کے ساتھ گون کہلاتا ہے ۔ اس میں ایک تھیلی بنا لیتے تھے جو اب بھی گاؤن میں رہتی ہے ۔ مگر بیکار ہے تو لوگوں سے کہتے جو کچھ دینا ہے ۔ اس تھیلی میں ڈالدو جسکا نام آنریریم (Honorarium) رکھا گیا تھا یعنی اعزازی نذرانہ یہی وجہ ہے کہ اب بھی بیرسٹر محنتانہ کے متعلق انگلستان میں اور نیز کلکتہ و بمبئی میں نالش نہیں کرسکتے ہیں ۔ کیونکہ کسی مقدمہ کی پیروی کے معاوضہ میں جو کچھ قرارداد ہوتی ہے وہ فیس نہیں ہے بلکہ آنریریم ہے موکل کی خوشی و مرضی پر ہے چاہے دے یا نہ دے ۔ بہرحال بار کے اس طرف کھڑے رہنے والے جنٹلمین ایٹ دی بار سے بار ایٹ لا اور بیرسٹر کہلانے لگے ۔ مگر یہ گروہ رفتہ رفتہ چونکہ عدالتیں قایم ہوگئیں قوانین بنائے گئے ۔ ان کو قانون جاننے کی ضرورت ہوئی اور قوانین کی توضیح و ترجیح

[له] ایک گرجہ کا نام ہے

انہیں لوگوں نے کی بڑے بڑے جورسٹ و مقنن اس گروہ میں پیدا ہوئے اور اسکو پیشہ بنالیا اب یہ بہت ہی معزز و ممتاز پیشہ ہے جسکو انگریزی میں Honourable & profession کہتے ہیں۔ خود شاہان انگلستان بغیر امتحان دے بیرسٹر بنادئے جاتے ہیں۔ بہت سے امیرزادے بیرسٹر ہیں۔ اب تک اس وقت کی بہت سی رسمیں جاری ہیں مثلاً سب ملکر رات کا کھانا ساتھ کھاتے ہیں۔ طلبا کو تو ساتھ کھانا لازمی ہے۔ سال کے چار ٹرم ہوتے ہیں ہر میں کم از کم چار وقت ساتھ کھانا لازمی ہے۔ اور بارہ ٹرم رکھنا بھی لازمی ہے اگر طالب علم امتحانات مقررہ میں کامیابی حاصل کر بھی لے اور ٹرم پورے نہوں تو کال کی رسم ادا نہیں کی جاتی اور نہ اٹرابار کی ڈگری دیجاتی ہے۔ بوقت کال مقررہ لونگ کلارٹ کپ کا پینا ہوتا ہے جو نہیں پیتا ہے لب تک لاکر چھوڑ دیتا۔ بعض حالتوں میں دو تین ٹرم معاف بھی کردیجاتی ہے۔

۱۸۹۲ء میں انس آف کورٹ کے بنچروں نے (یہ لقب عہدہ داروں کا ہے) نئے قوانین و ضوابط وضع و نافذ کئے جن کے تحت لکچر سننا طلبا کیلئے واجبات سے ہوگیا۔ الا ان طلبا کیلئے جو اکسفورڈ یا کیمبرج میں زیر تعلیم ہوں لکچروں کا زمانہ وہی ہوتا تھا۔ جبکہ کوئی ٹرم شروع ہوتا تھا

قومی و ملی خدمات

اپنے متعلق اب صرف ان باتوں کا ذکر کروں گا۔ جنکا تعلق قومی و ملی خدمات سے ہے یا ادبی مصروفیتوں سے یا کسی اعزاز واکرام سے یا اور کوئی قابل ذکر واقعہ سے ہے ۱۸۸۸ء میں خدا غریق رحمت کرے سید علی امام (بعد کو سر وغیرہ ہوئے) اور شاہ دین (بعد کو چیف کورٹ پنجاب کے جج) سید کرامت حسین (بعد کو الہ آباد ہائیکورٹ کے جج) حسن امام مرحوم جج کلکتہ ہائیکورٹ سر شفیع مرحوم اور دو تین طلبا نے لندن میں ایک انجمن موسوم بہ انجمن اسلام لندن قائم کی تھی خیالات کی اصلاح زبانی تقریر کرنے کی عادت، وصلاحیت پیدا کرنی آپس میں اتحاد پیدا کرنا اور مفاد اسلام کی حفاظت، وغیرہ مقاصد اس انجمن کے تھے۔

مگر سید کرامت حسین مرحوم کے اور سر علی امام کے واپس آنے کے بعد ممبروں نے دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی ۱۸۹۰ء میں یہ حضرات ہندوستان واپس آگئے تھے۔ شفیع مرحوم حسن امام مرحوم وغیرہ موجود تھے مگر انجمن کے جلسے وغیرہ کم ہورہے تھے۔ میں ۱۸۹۱ء کے اپریل میں لندن پہنچا تھا۔ چند ماہ کے بعد میں انجمن کا ممبر بنایا گیا میں نے بہت دلچسپی لینی شروع کی کیونکہ انگلستان جانے کے پیشتر زمانہ طالب العلمی میں بمقام پٹنہ ان چیزوں سے میں خاص دلچسپی رکھتا۔ ڈبیٹنگ سوسائٹی جو میں نے قائم کی تھی وہ تقریر کرنے کی عادت پیدا کرنے کیلئے کی تھی تعلیمی مسائل سے بھی مجھے خاص شغف تھا۔

پٹنہ ہائی اسکول کا قایم کرنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ مجھے مسلمانوں کی تعلیم کا کسدرجہ خیال کمسنی سے تھا۔ اور بحمد اللہ اب بھی ہے میں نے اس انجمن میں تازہ روح پھونکی اور جو نیا طالب العلم لندن آتا اسکو گھیر کر انجمن کے جلسوں میں لاتا اور ممبر بناتا۔ یہاں یہ ہوتا کہ ایک جلسہ میں ایک موضوع مقرر کردیا جاتا اور ایک ممبر نامزد کیا جاتا وہ اسکی تائید میں تقریر کرے اور ایک دوسرا ممبر خلاف میں بولنے کیلئے نامزد ہوتا آیندہ جلسہ میں کچھ لوگ تائید میں گفتگو کرتے اور کچھ خلاف میں من بعد اوٹ لئے جاتے کہ مخالف کتنے اور موافق کتنے۔ جسطرف زیادتی یعنے غلبۂ آرا ہوتا اسطرف کامیابی ہوتی جب تک میرا قیام انگلستان میں رہا برابر انجمن کے کاروبار میں امداد دیتا رہا۔ ایک سال سکرٹری کی خدمت پر رہا دوسرے سال نائب صدر انجمن۔ تیسرے سال صدر انجمن باتفاق آرا منتخب ہوا میرے زمانۂ قیام انگلستان میں جو لوگ وقتاً فوقتاً اس کے ممبر رہے ان کے نام جہاں تک مجھے یاد ہیں وہ یہ ہیں۔

لندن میں انجمن ارادت اللہ ساکن چاٹگام بنگالہ، ظہیر الدین احمد مرحوم بہاری، سید حسن امام مرحوم بہاری، میاں محمد شفیع مرحوم (بعد کو سر وغیرہ) پنجابی، نواب علی حسن خان قزلباش پنجابی، محمد اسمعیل خان مرحوم میرٹھی، ڈاکٹر عبد الغنی پنجابی جنکو نصر اللہ خان خلف امیر عبد الرحمن خان سابق والئ افغانستان اپنے ہمراہ لندن سے کابل لائے تھے وہاں بڑی خدمتیں وغیرہ ملیں پھر قید کئے گئے۔ علی محمد خان دہلوی (حال سر پریسیڈنٹ بمبئی لیجسلیٹو کانسل) رفیع الدین احمد (حال سر سابق وزیر تعلیم بمبئی) احمد علی حسین بہاری مرحوم (بعد کو آئی سی ایس مرنے کے قبل علیگڈھ کے سشن جج تھے۔ سید محمد یونس مرحوم ساکن بنگالہ۔ شیخ اصغر علی پنجابی (بعد کو آئی سی ایس) ۱۹۲۸ء میں اخیر دفعہ لاہور میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اسوقت کہیں کے کمشنر تھے۔ سید شاہ عبد المجید غالباً بعد کو گورنمنٹ پراوزیکیوٹر علیگڈھ میں ہوئے ضیاء الحق ہندوستان کے کسی شہر کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی میں نے اپنے زمانہ میں طریقہ نکالا تھا کہ عید و بقرعید کی نماز پڑھنے اور کنگ کی مسجد میں مسلمان جمع ہوں۔ ممبران انجمن کے علاوہ جسقدر مسلمان لندن کیمبرج اوکسفورڈ میں زیر تعلیم ہوتے سب انجمن کی طرف سے مدعو کئے جاتے اور جن لوگوں کو ہندوستانی کھانا پکانا آتا۔ ایک دن پیشتر سے وہ حضرات جاتے اور مال مصالحہ وغیرہ اپنے ساتھ لیجاتے۔ بروز عید صبح ہی سے پلاؤ قورمہ پکانے کا انتظام کیا جاتا بعض دفعہ شامی کباب بھی پکائے جاتے۔ پکانے والوں میں غیر ممبر بھی شریک ہو جاتے۔ یا یہ کہ ممبروں میں سے کسی کو یہ ہنر نہ آتا تو غیر ممبر مسلمان جو خاصہ پزی سے کچھ واقف ہوتے۔ ان سے کھانا پکوایا جاتا ایک دفعہ ایسے لوگوں نے ادعا پکانے کا کیا کہ بالکل اناڑی تھے۔ کچے چاول اور قورمہ کا

گوشت کچا اور قورمہ میں خوب ہی نمک ڈالدیا اس روز سب کے سب بھوکے رہے۔ پکانے والوں کی جانوں کو دعا دیتے رہے۔ اقامت کیلئے ہم لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا ایک عید میں ٹرکش امبسی (سفارت خانہ ترکی) میں جو امام صاحب رہتے اون کو لاکر امامت کرواتے دوسرے عید میں پرشین لگیشن (سفارت خانہ ایران) سے پیش امام صاحب کو لاتے اور امامت کرواتے حضرات اہل تسنن اور حضرات اثنا عشری دونوں مذاہب کے لوگ ان اماموں کے پیچھے نماز عیدین کی پڑھتے کوئی ہاتھ باندھ کر اور کوئی ہاتھ کھول کر پڑھتا۔

ڈاکٹر لائٹنر جو کسی زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کا رجسٹرار تھا جس نے ہندوستان کے لوگوں سے اپنے تئیں مسلمان بتلا کر چندہ لیا خصوصاً شاہجہان بیگم مرحومہ سابق فرمانروائے بھوپال سے خوب پیٹ بھر کر لیا اور مختصر سی مسجد او کنگ میں بنائی اور مسجد کے متصل اپنا عالیشان قصر بنایا اس میں ایک میوزیم بھی قایم کیا۔ یہ حضرت اصل میں یہودی تھے عیدین میں یہ لوگ نماز پڑھنے آتے ان کو تیسرے پہر کی دعوت دیتے اور اپنے تئیں مسلمان بیان کرتے ۱۹۱۲ء کا ذکر ہے کہ بنگالہ کے ایک طالب العلم سلیم نامے نے انتقال کیا۔ ہم چند مسلمانوں نے انکی تجہیز و تکفین کی اور انکی لاش او کنگ میں بغرض تدفین لائے اس خیال سے کہ مسجد کے صحن میں ان کو مدفون کریں گے۔ جب ہم لوگ جنازہ لیکر وہاں پہنچے تو لائٹنر Lightner کو معلوم ہوگیا اور چند آدمی بھیجکر ممانعت کی اور کہا کہ یہ ملک میری ہے مجھے اختیار کلی ہے کہ لاش دفن ہونے دوں یا نہ دوں کچھ دیر تک تو تو میں میں ہوتی رہی پھر اس نے پولیس کو بلایا کہ نقص امن ہونے کا اندیشہ ہے۔ ان کالے آدمیوں کو یہاں سے نکال دو اگر کوئی دعویٰ انکو ہے تو عدالت سے تصفیہ کروائیں یہ انوکھا بیان کہ مسجد میری ذاتی ملک ہے کسی نے نہ سنا ہوگا۔ بہرحال ہم لوگ جنازہ واپس لائے اور لورپول لیگئے۔ وہاں ایک قبرستان ترکی گورنمنٹ کا ہے۔ وہاں سلیم مرحوم کو دفن کیا۔ میں اس زمانہ میں انجمن اسلام لندن کا سکرٹری تھا میں نے مراسلہ منجانب ڈاکٹر لائٹنر کو لکھا کہ مسجد کو خانگی ملک کیسے بتلایا ہے۔

ویٹ نایرن لنگ اس نے جواب دیا کہ میرے روپیہ سے مسجد بنی ہے۔ اس میں ایک اور صاحب نے جو میرے دوست تھے کچھ مدد دی ہے۔ جواباً اس کو لکھا کہ یہ مسجد مسلمانوں کے چندہ سے بنی ہے اور مہربانی کرکے اپنے دوست کا نام بتلایئے۔ مگر اس نے اس کا جواب نہیں دیا۔ یہ سراسر غلطی ہم مسلمانوں کی تھی کہ ایک اجنبی شخص پر اعتبار کرکے ہزاروں روپیے دیدئے۔ ہمارے پاس کوئی

ثبوت اور وثیقہ اسکا نہیں تھا کہ کس نے کس نے چندہ دیا تھا مگر یہ امر یقینی اور محقق تھا کہ انڈیا کے مسلمانوں سے خصوصاً بھوپال سے اس بہانہ سے بہت روپیہ لیا کسی نے سنا تھا کہ ایک لاکھ کے قریب بھوپال سے لیا تھا۔ بھوپال کی ریاست کو ایک مراسلہ انجمن کی طرف سے لکھ کر حقیقت دریافت کی مگر کوئی جواب نہیں ملا آخر خاموش ہو جانا پڑا۔

جب خواجہ کمال الدین مرحوم سنہ ۱۹۱۳ء میں بغرض تبلیغ لندن گئے تو سید امیر علیؒ صاحب مرحوم کی اور وزیر ہند کی امداد سے ڈاکٹر لٹنر کے بیٹے کے قبضہ سے یہ مسجد نکالی اور ایک مکان جو مسجد کے متعلق تھا جسکو لائٹنر کے بیٹے نے گرو کر دیا تھا اسکو چھڑایا انجمن کی جانب سے میلاد النبیؐ کی تقریب میں ڈنر دیا جانا میرے زمانہ میں قرار پایا۔ چنانچہ پہلا ڈنر بماہ نومبر سنہ ۱۸۹۲ء ہوبرن اسٹراں میں بڑے پیمانہ پر ترتیب دیا گیا علاوہ ممبران کے غیر ممبروں سے بھی شرکت کیلئے کہا گیا اور انہوں نے منظور کیا۔ کھانے کا فی کس پانچ شلنگ چندہ قرار پایا ممبران سے فی کس چھ شلنگ لیا گیا وہ اسلئے کہ بعض اشخاص کو انجمن کا مہمان بنایا گیا۔ کھانے کی رقم اسی روپیہ میں سے نکالنی تھی۔ مہمان کی حیثیت سے ٹرکی کی سفارت خانہ اور ایران کے سفارت خانہ کے اعلیٰ عہدہ دار مدعو کئے گئے سید امیر علیؒ صاحب مرحوم جو اس زمانہ میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جج تھے رخصت پر لندن آئے ہوئے تھے میں ان کے پاس گیا اور اُن سے صدارت کیلئے کہا اور انہوں نے منظور کیا۔ یہ سب انتظام بحیثیت سکرٹری کے مجھکو کرنا پڑا۔ امیر علیؒ صاحب نے کھانا ختم ہونے پر ملکہ وکٹوریہ اور خاندان شاہی کا جام صحت کی تحریک کی مسٹر ظہیر نے انڈیا دی لینڈ وی لیو انڈر (India the land welive in) اور حسن علی مرحوم نے انجمن کا ٹوسٹ پرپوز کیا اور میرا نام پیش کیا۔

میں نے بحیثیت سکرٹری کے انجمن کی جانب سے جواب دیا مسٹر ارادت اللہ نے امیر علیؒ صاحب نے اتحاد بین المسلمین پر زور دیا نظام الدین (حال سر نظامت جنگ) ان کے بھائی نصیح الدین (حال رفعت یار جنگ) یہ دونوں بھائی انجمن کے ممبر نہ تھے مگر میرے کہنے سے فی کس حصہ چندہ دیا اور شریک ڈنر ہوئے۔ انجمن نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ ہال کین (Hall Cain) مشہور ناول نویس نے ایک ڈرامہ پیغمبر خدا محمد مصطفیٰؐ کے متعلق بنایا تھا اور جس میں یہ ظاہر کیا تھا کہ ان کے پاس متعدد بیبیاں تھیں اور بڑے شہوت پرست تھے وغیرہ وغیرہ یہ بھی معلوم ہوا کہ ماؤنٹنگ (Mounting) تک ہو گئی ہے۔ ماؤنٹنگ کے معنی یہ ہیں کہ پردے سینریز اکسریز لوازمات ایکٹروں کے ڈریسز اقسام کے سب تیار ہو چکے ہیں۔ امروز فردا میں کھیل شروع ہوگا۔ اسوقت اخباروں میں

یہ خبر شائع کی گئی ۔ یہ خبر پڑھتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے میں نے اور چند مسلمان احباب سے اس کا ذکر کیا ۔ ایک صاحب نے ان میں سے کہا کہ ان دنوں امیر علیؒ صاحب لندن آئے ہوئے ہیں اور تم سے اور ان سے اچھے تعلقات ہیں کیونکہ اسروز ہوبرن میں رسُول خدا کی ولادت کا جو ڈنر ہوا تھا میں نے دیکھا تھا تمہاری طرف امیر علی صاحب بہت مخاطب تھے اس تقریر میں جہاں اُنہوں نے احمد علیؒ حسن علیؒ کے والد حسین علیؒ آفندی کا ذکر خصوصیت سے کرکے کہا کہ حسن علی میرے دوست کے فرزند ہیں ۔ تمہارا نام لیکر بھی کہا تھا ۔ ہمایون مرزا میرے محترم و بزرگ دوست کے فرزند ہیں میرے خیال میں بہتر ہے کہ تم ان سے جاکر ملو اور مشورہ کرو کہ کیا کرنا چاہیئے میں نے کہا کہ بیشک بات تو ٹھکانے کی تم نے کہی میں ضرور آج ہی اُن سے جاکر ملتا ہوں یہاں پر احمد علیؒ حسن علیؒ اور اُن کے والد کا ذکر آیا ہے واضح ہو کہ احمد علیؒ حسن علیؒ کا ذکر میں اوپر کہیں کر چکا ہوں ۔

یہ آئی سی ایس پاس کرکے سشن جج ہو گئے تھے اور گرمیوں میں غالباً ۱۹۱۶ء میں اپنے وطن کراچی جا رہے تھے یا غالباً گڑھ جہاں وہ سشن جج تھے کہ ریل میں سن اسٹروک سے انتقال کر گئے ان کے والد بہت مشہور و کامیاب سالیسٹر کراچی میں تھے اور ٹرکش کانسل جنرل بھی ہو گئے تھے لاکھوں روپئے اپنے پیشہ سے کمائے اور ایک بہت بڑا اسکول و دارالاقامہ مسلمان لڑکوں کیلئے کراچی میں بنایا اور بڑا وقف چھوڑ کر مرے وہ درسگاہ کراچی میں موجود ہے ۔ امیر علیؒ صاحب سے اور حسن علی آفندی مرحوم سے خاص تعلقات تھے بوجہ ٹرکش کانسل ہونیکے آفندی کا لفظ اُن کے نام کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا بہر حال میں اس روز تیسرے پہر کو امیر علیؒ صاحب مرحوم سے ملا اور اُنہوں نے کہا کہ انجمن کی جانب سے وزیر ہند کے پرائیوٹ سکرٹری کو لکھو کہ منجانب انجمن اسلام لندن ایک وفد وزیر ہند کے پاس آنا چاہتا ہے اور میرا نام لکھو کہ فلاں صاحب اس کے اسپوکسمن ہوں گے ۔ یعنی فلاں کی سرکردگی میں آئے گا ۔ فلاں معاملہ کے متعلق گفتگو کریگا وقت اور مقام سے اطلاع دی جائے اور مجھ سے فرمایا کہ دو آدمی اپنی انجمن سے لے لو ایک پریسیڈنٹ اور ایک سکرٹری میں نے کہا کہ سکرٹری تو میں خود ہوں اور پریسیڈنٹ اس سال سید ظہیر الدین احمد بی ۔ اے ہیں ۔ امیر علی صاحب نے فرمایا میں بھول گیا تھا سکرٹری تو تم ہو اور یہ ظہیر الدین کون بزرگ ہیں ۔ میں نے کہا کہ لائق آدمی ہیں ۔ اور قصبہ بہار کے زمیندار ہیں ۔ امیر علی صاحب نے فرمایا بہتر ۔ ان کو بھی ساتھ رکھ لیں گے ۔ خط کا مسودہ ابھی کرلو ۔ چنانچہ جیسا انہوں نے فرمایا میں نے مسودہ لکھ لیا ۔ اور انجمن کے دفتری کاغذ پر لکھ کر شام کو روانہ کر دیا ۔ امیر علیؒ صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ جواب آتے ہی میرے پاس

لیکر آ ؤ چنانچہ چو تھے دن جواب آیا میں اسیوقت جواب لیتا ہوا امیر علی صاحب کے پاس گیا۔ اس کی اطلاع میں نے سید ظہیر الدین کو بھی دیدی تھی ۔اس اثنا رمیں امیر علیؒ صاحب ایرانی لیگیشن کے منسٹر جنرل پرنس مرزا محمد علیؒ خان اور ٹرکش امب بیڈر میلکم پاشا (Malcom Padsha) سے مل کران سے کہا کہ اپنے اپنے ملک کی جانب سے احتجاجی مراسلے وزیر خارجہ کو لکھیے ۔ اور لکھیے کہ ایران وٹرکی سے ہدایت آئی ہے ۔ میلکم پاشا قوم کے ارمنین اور مذہب کے عیسائی تھے ۔امیر علیؒ صاحب نے جنرل مرزا محمد علیؒ خان مرحوم سے بذریعہ ایک فارسی خط کے میرا تعارف بھی اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد کرایا تھا اور میں نے جنرل مرحوم کو اپنے والد کی مثنوی دبستان اخلاق تتبع بوستان شعاری کی جو منطبع ہے ایک کاپی دی تھی جسکو پڑھکر وہ بہت محظوظ و خوش ہوئے اور پہلے چائے کی دعوت مجھ کو دی پھر کھانے کی دعوت دی عمدہ سے عمدہ اقسام کے ایرانی کھانے کھلائے تھے۔

جب تک میں لندن میں رہا گاہے ماہے جنرل مرحوم سے ملتا رہا ۔امیر علیؒ صاحب کو فارسی زبان سے اُنس تھا اور بڑی تیزی سے فارسی بولتے تھے ۔

بہر حال وزیر ہند کی جانب سے جو جواب بنام سکرٹری انجمن اسلام لندن یعنی میرے نام آیا تھا اس میں جو تاریخ و وقت و مقام وفد سے ملنے کا مقرر کیا گیا تھا ہمارا وفد بوقت مقررہ انڈیا آفیس پہنچا بہت ہی خوش خلقی سے سکرٹری اوف اسٹیٹ (وزیر ہند) ملے اوسوقت وزیر ہند لارڈ کراس تھے اور انڈیا سکرٹری مسٹر کرزن (بعد کو لارڈ اور والیسرائے ہند ہوئے)

امیر علیؒ صاحب کی قابلیت کا کیا کہنا برسوں نہایت قابلیت سے کلکتہ میں بیرسٹری کرنیکے بعد جج ہوئے تھے ۔ لارڈ کراس کے سامنے انکے پولیٹکل اے ڈی ۔سی اور پرسنل اسسٹنٹ بیٹھے ہوئے تھے ۔ ہم لوگوں نے جوں ہی کمرہ میں قدم رکھا سب کھڑے ہوگئے امیر علیؒ صاحب سے وزیر ہند پہلے سے واقف تھے پہلے ان سے ہاتھ ملایا امیر علیؒ صاحب کے ظہیر کا اور میرا تعارف کرایا پھر سب سے یکے بعد دیگرے مصافحہ ہوا ۔امیر علیؒ صاحب نے ہماری انجمن کے متعلق بھی خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا اسکی اہمیت بتائی اور کہا کہ بڑے بڑے اشخاص مختلف اقطاع ہند کے باشندے اس کے ممبر ہیں ۔اس انجمن کے لندن میں قیام کا مقصد مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ ہے برطانیہ عظمٰے دنیا میں سب سے بڑی مسلم گورنمنٹ ہے جس کے تحت سات آٹھ کرور مسلمان ہیں یہ فخر ترکی کو حاصل ہے نہ ایران کو ہر گورنمنٹ کا فرض ہے کہ رعایا کو خوش رکھے برطانیہ عظمہ کو چاہیئے کہ مسلمان رعایا کی خوشنودی و رضامندی کا بدل وجان خیال رکھے صرف یہی نہیں کہ یہ ملکہ

ہندوستان ہی کے مسلمانوں کیلئے باعث اشتعال طبع ہو گا بلکہ جو دوستانہ تعلقات ٹرکی وایران وغیرہ سے قایم ہیں وہ باقی نہ رہیں گے اور نہ معلوم اس کے عواقب کیا کیا ہوں گے اور بہت سی باتیں کیں جو یاد نہیں ہیں وزیر ہند خاموشی سب سنتے رہے اور جب ہم لوگوں کے اٹھنے کا وقت آیا تو وزیر ہند نے دو چار لفظ کہے ہم لوگوں کی زحمت کشی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جو کچھ امداد اس خصوص میں مجھ سے ہو سکے گی میں دریغ نہ کروں گا۔ جسکا شکریہ امیر علیؒ صاحب نے ادا کیا۔

وہاں سے رخصت ہو کر جب گاڑی میں سوار ہوئے سواری اسٹیبل سے کرایہ کی لینڈو وار جوڑی میں نے منگائی تھیں سواری اسٹیبل لندن میں تقریباً ہر محلہ میں اس زمانہ میں تھے۔ جہاں نہایت عمدہ ٹرن اوٹ یعنی عمدہ گاڑیاں اور گھوڑے سائیس کوچبان وردیاں پہنے ہوئے مختلف شرح کرایہ فی گھنٹہ کے حساب سے دستیاب ہوتے تھے یہہ ٹرن اوٹ خانگی معلوم ہوتا تھا۔ بند گاڑیوں کی اور کھلی گاڑیوں کی شرح جداگانہ تھی۔ بہرحال گاڑی میں جب سوار ہوئے امیر علیؒ صاحب کا چہرہ بہت بشاش تھا۔ یوں تو فطرۃً ان کا چہرہ مائل بہ مسکراہٹ ہمیشہ رہتا تھا مگر اس موقع پر وہ مسکراہٹ بہت نمایاں تھی تھوڑی دور گاڑی جب جا چکی تو ظہیر سے مخاطب ہو کر امیر علیؒ صاحب نے فرمایا آپکا کیا حال ہے مسٹر ظہیر وزیر ہند پر میری تقریر کا کچھ اثر ہوا ہم دونوں بیک زبان بولے بہت کچھ اثر ہوا آپکی تقریر اسقدر مدلل اور معقول تھی جسکا جواب وہ کیا دیتے اور کوئی کیا دے سکتا ہے۔ امیر علی صاحب نے فرمایا مجھے یقین ہے خدا نے چاہا اب یہ منحوس ڈرامہ نہیں ہوگا۔ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ چند دنوں کے بعد اخباروں میں یہ خبر گشت لگانے لگی کہ گورنمنٹ نے خاص مصالحہ کی بنا پر محمدؐ دی عربین پر وفٹ والا ڈرامہ اسٹیج پر ہونے سے روکدیا۔ جسکی بڑی خوشی ہم لوگوں کو ہوئی اور انجمن کی جانب سے گورنمنٹ کے شکریہ کا اعلان دو اخباروں میں ڈیلی ٹیلیگراف اور لندن کرانیکل میں شائع کیا گیا۔ اور انجمن کے ممبروں میں سے ارادت اللہ سید ظہیر الدین سید امیر علیؒ صاحب کے ہاں گئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

اسی ۱۹۱۳ء کی فروری میں مجھے ایک خط رائے بہادر دیپ نرائن سنگھ رئیس اعظم و زمیندار بھاگلپور جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے مقام فلورنس (اٹلی) سے روانہ کیا ہوا ملا رائے صاحب کی شادی پٹنہ عظیم آباد محلہ بانڈریہ میں میرے مکان کے متصل ہوئی تھی۔ دیپ نرائن سنگھ کی ننہال پٹنہ ہے رائے صاحب سے اور مجھ سے ایسے مراسم و محبت تھی جیسے دو سگے بھائیوں میں ہوتی ہے۔ ہمیشہ رائے صاحب آنجہانی مجھکو مائی ڈیرسٹ فرنڈ کے الفاظ سے مخاطب کرتے تھے۔

رائے صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ میں نونو کو (یعنی دیپ نرائن سنگھ کو) جنہوں نے انٹرنس (میٹرک) پاس کرلیا ہے بیرسٹری کی تعلیم کیلئے انگلستان لارہا ہوں اور فلاں تاریخ و وقت وکٹوریا اسٹیشن پر لندن پہنچوں گا میرے ساتھ علاوہ نونو کے میرے پرائیوٹ سکریٹری مسٹر شا اور تین ملازمین ہوں گے ہم لوگوں کے قیام کیلئے کوئی آرام دہ مکان لیکر رکھئے یا کوئی ہوٹل ٹھہرا لیجئے یہ انتظام مستقل طریقہ کا نہ ہو وہاں پہنچنے کے بعد مستقلانہ انتظام کرلوں گا۔ اسی خط میں اپنا پروگرام بھی ملفوف کردیا تھا۔ یورپ کے ممالک کے جن شہروں میں ہوتے ہوئے آرہے تھے اُن شہروں کے نام اور کس جگہ کب پہنچیں گے اور کتنے روز قیام کریں گے۔ اور کب وہاں سے روانہ ہوں گے یہ سب کچھ درج تھا۔

رائے صاحب آنجہانی بڑے سیاح تھے ۱۸۹۷ء میں ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کی گولڈن جوبلی کے موقع پر بھی یورپ آئے تھے چونکہ جو تاریخ لندن پہنچنے کی ان کے خط اور نیز پروگرام میں درج تھی وہ قریب تھی اس لئے میں نے چند ہوٹلوں کو بھی جاکر دیکھا اور بڑے بورڈنگ ہوس اور اپارٹمنٹس وغیرہ دیکھنے کے بعد سدرلینڈ ایونیو میں ایک سمی بورڈنگ ہوس یعنی ایسا بورڈنگ ہوس جس میں فیملی میں رہنے کا بھی لطف آئے ایک سٹ آف رومس مع کھانے کے ٹھہرائے اور اس کی مالک ایک انگریز بیوہ مس گرین تھی۔ مقام خوش آب و ہوا اور کھلا ہوا تھا۔ اس کو سولہ گنی ہفتہ پر ٹھہرایا (لندن میں ملازموں کی تنخواہ وغیرہ مکانوں کا کرایہ ہفتہ وار دینا ہوتا ہے) اور اپنے نزدیک جو کچھ ردوبدل کروانا تھا اس کے متعلق ہدایت دیدی اور یہ کہدیا کہ جس تاریخ میرے دوست کی پارٹی یہاں پہنچیگی اُس تاریخ سے کرایہ کا حساب ہوگا۔ اس انتظام سے مطمئن ہونے کے بعد بمسرت دلی رائے صاحب کیلئے چشم براہ رہا۔ اور چند بہاری دوستوں سے کہا کہ میرے ساتھ رائے صاحب کے استقبال کیلئے اسٹیشن چلنا ہوگا چنانچہ بروز و وقت مقررہ میں اپنے چند ساتھیوں سمیت اسٹیشن پہنچا میرے ساتھ مرحوم سید حسن امام محمود الحق مرحوم۔ ظفر بہادر مرحوم ساکن گیا اور سچتا نند سنہا جو اسوقت پٹنہ میں وکالت کررہے ہیں۔ پارلیمنٹ کی مخلوط سلکٹ کمیٹی اصلاحات ہند کے متعلق رونڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلہ میں حال ہی میں بمقام لندن ہوئی تھی منجانب سرکار یہ بھی منتخب ہوکر گئے تھے اور کئی سال کے قبل بڑے عہدہ جلیلہ پر ممتاز تھے۔ بہار واڑیسے کے گورنر کے اگزیکٹیو کانسل میں فینانس ممبر پانچ ہزار روپیہ ماہوار مقرر کئے گئے تھے اِن کے بعد اسی خدمت پر مہاراجہ ٹیکاری مقرر کئے گئے تھے۔ اسٹیشن سے رائے صاحب کو لیکر ان کے قیام گاہ پر آئے

رائے صاحب اپنے کمروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور میری زحمت کشی کا شکریہ ادا کیا یہاں کا کھانا کھا کر اور انتظام دیکھ کر اور بھی خوش ہوئے۔ خصوصاً ایسا عمدہ کھانا اور اتنے آدمیوں کا اور اسقدر قلیل رقم پر سولہ گنی ہفتہ پر اور بھی خوش ہوئے چونکہ رائے صاحب کے ساتھ منجملہ تین ملازمین کے دو ہندو تھے اور ایک باورچی محمد علی نامی مسلمان تھا یہ نہایت عمدہ خاصہ پز تھا۔ انگریزی کھانے بھی پکانا جانتا تھا۔ اور ہندوستانی کھانوں کا بھی کیا کہنا۔ رامپور کا رہنے والا تھا اور نواب کلب علیخان مرحوم سابق رئیس رامپور کے باورچیوں میں رہ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ نواب کلب علیخان جیسے کھانے کے شوقین اور تمیز دار اور اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھنے والے تھے ان کے ہمعصر والیان ملک میں کوئی نہ تھا اس مکان میں ہندوستانی کھانے کا ملنا اور ایسے اعلیٰ درجہ کے کھانوں کا جو محمد علی پکاتا تھا غیر ممکن تھا اسلئے اس امر کی ضرورت ہوئی کہ اچھے محلہ میں معقول کرایہ پر پورا مکان فرنش یعنی سجا سجایا لے لیا جائے۔

چنانچہ بتلاش بسیار مذاق وضرورت کے موافق نمبر ا انڈل گارڈن میں ایک مکان بارہ گنی ہفتہ پر لے لیا گیا رائے صاحب کو ابھی ایک ہفتہ پورا اوس بورڈنگ ہوس میں نہیں ہوا تھا۔ جہاں آکر ٹھہرے تھے کہ وہ تاریخ مقررہ جلسہ کی جسکا اشتہار دیا جا چکا اور انتظام ہو چکا تھا آگئی۔ رائے صاحب کو اور دیپ نرائن سنگھ اور رائے صاحب کے پرائیوٹ سکرٹری مسٹر اشنا کو اپنے ہمراہ لیکر اس جلسہ میں میں گیا۔

جلسہ مختصر کیفیت اس جلسہ کی یہ ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے کہ دادا بھائی نوروزجی انڈیا کے مشہور قائد اعظم و مصلح سابق برودا اسٹیٹ کے دیوان پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے فنس بری وارڈ کے نمایندہ کی حیثیت سے منتخب ہونا چاہتے تھے جس کے لئے وہ اُمیدواری کر رہے تھے لارڈ سالسبری جو اسوقت کنسرویٹو پارٹی کے لیڈر اور وزیر اعظم برطانیہ تھے اُنہوں نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں مسٹر (بعد کو ڈاکٹر) دادا بھائی نوروزجی کے حق میں دی بلیک مین (وہ سیاہ فام آدمی) کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ حالانکہ مسٹر دادا بھائی اسقدر سرخ و سفید تھے کہ لارڈ سالسبری کے رنگ سے کہیں نکلتا ہوا ان کا رنگ تھا مگر اس تعصب کا خدا بھلا کرے کہ اتنی بڑی شخصیت کیلئے اور اتنا بڑا آدمی ایسی رکاکت کا مرتکب ہو صرف سالسبری ہی نہیں اور بھی بہت سے تنگ نظر و متعصب انگریز تھے جو ہندیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ زمانہ حال میں بھی اللہ رکھے لارڈ جیوارج لائیڈ لائیڈ ونسٹن چرچل لائیڈ جیوارج جیسی ذہنیت کے لوگ بھی

انگریزوں میں کمی نہیں ہے اس زمانہ میں علاوہ لارڈ سالسبری کے اور بھی انگریزوں نے ہندوستان اور ہندیوں کی نسبت دریدہ دہنی کی تھی۔ منجملہ جن کے ایک میکلین نامے ممبر پارلیمنٹ تھا اس قماش کے انگریز اس امر کو اپنے حق میں من حیثیت قوم کسرشان تصور کرتے تھے کہ کوئی ہندی کالا آدمی انگریزوں کی نمائندگی و نیابت انگریزی پارلیمنٹ میں کرے۔ دادا بھائی نوروزجی باوجودیکہ بہت ہی گورے چٹے اور بہت سے انگریز ممبران پارلیمنٹ سے کہیں زیادہ قابل و بہتر مقرر تھے۔ مگر اقتضائے فطرت کا کیا علاج ہے۔ پس مسٹر میکلین نے بھی اسی قسم کے زہر اگلا تھا جس پر سے ہندی مقیمان لندن کے غیظ و غضب کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور بمشورہ باہمی یہ طے پایا کہ ایک جلسہ عام نہ صرف ہندیوں کا بلکہ برٹش پبلک کو بھی مدعو کر کے کیا جائے اور دل کا بخار نکالا جائے جو انگریز مسٹر نوروزجی کو خاص طور سے بُرا بھلا کہتے ہیں اور عام طور سے ہندوستان کو بُرا کہتے ہیں اسلئے ایک جلسہ مقرر کیا۔

کمیٹی نونفوس کی بنائی گئی تاکہ ہندیوں سے خواہ طلباء ہوں یا تجار یا اور کسی غرض سے مقیم انگلستان تھے زر چندہ وصول کرے اور ضروری امور کو انجام دے۔ چنانچہ ان نو آدمیوں میں میں بھی شریک کیا گیا ہم لوگوں کا پہلا فرض چندہ وصول کرنا تھا پھر ایک مقام معین کرنا تھا تاکہ اشتہار میں تاریخ وقت کے ساتھ مقام جلسہ کا اندراج ہو سکے۔ چنانچہ میموریل ہال چار پانچ گھنٹوں کے لئے کرایہ لیا گیا اس قسم کے ہال لندن کے اکثر محلوں میں ہیں۔ نشستوں کیلئے کرسیوں کی فراہمی اور اگر شب کو جلسہ ہو تو روشنی کا انتظام وغیرہ مالک یا منتظم ہال کے ذمہ ہوتا ہے ایسے ہال میں صدر کے اور مقررین وغیرہ کے لئے ڈائس بھی بنا ہوا رہتا ہے مثل تھیٹر کے ساخت ہوتی ہے میموریل ہال محلہ اسٹران میں واقع ہے جو مشہور محلہ لندن کا تاث شہر میں ہے۔ مسٹر دادا بھائی نوروزجی نے جلسہ کی صدارت قبول کی اشتہارات چھپوا کر تقسیم کئے گئے اور غرض جلسہ کی صاف لفظوں میں یہ بتلائی گئی کہ (To London Mr Maclian) یعنی مسٹر میکلین ممبر پارلیمنٹ کی نفرین کیلئے بصدارت فلاں صاحب بوقت فلاں بمقام فلاں جلسہ منعقد ہوگا۔ اہل ہند مقیمان برطانیہ عظمیٰ و نیز برٹش پبلک سے توقع کی جاتی ہے کہ جلسہ کی شرکت سے بانیان و داعیان جلسہ کو مرہون منت کریں گے۔ نیچے ممبران کمیٹی کے نام لکھے گئے غرض یہ جلسہ بوقت مقررہ شام کے سات بجے سے شروع ہوا۔ مسٹر بوس نے جلسہ کی صدارت کیلئے تحریک کی پھر کسی نے جلسہ کی غرض و غایت بیان کی تین چار مقرروں نے تقریریں کیں اور میکلین پر لعنت ملامت کی خوب بوچھاریں ہوئیں لارڈ سالبری کی بھی جنہوں نے نوروزجی کو بلیک میں کہا تھا خوب خبر لیگئی

چترنجن داس یعنی دیس باندھو سی آر داس نے نہایت پُرمغز فصیح و بلیغ تقریر کی۔ سی آر داس کی انگلستان میں یہ میڈن اسپیچ تھی یعنی پہلی تقریر تھی اس سے پیشتر کبھی کسی نے ان کو بولتے نہیں سُنا تھا ان کی تقریر کا سامعین پر بڑا اثر ہوا۔ جب وہ تقریر ختم کر چکے تو مسٹر نوروزجی نے ان کی پیٹ ٹھونکی اور یہ الفاظ کہے (Willdone may boy willdone) ولڈن مئی بائے ولڈن۔ مجھ سے اور داس سے بہت بے تکلفی کی دوستی تھی۔ ڈریس پر ان کی کرسی میرے کرسی کے برابر تھی۔ جب وہ اپنی کرسی پر بیٹھ چکے تو میں نے مذاقیہ طور پر دونوں ہاتھ ان کے شانوں پر زور سے مار کر کہا کہ تم نے تو آج ہم لوگوں کو حیرت میں ڈالدیا حقیقت ہے کہ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات یا سامے کہ نکواست از بہارش پیدا جب ہی تو بیرسٹری کے زمانہ میں بہت نام آور ہوئے اور ماہانہ آمدنی پچاس ہزار پیدا کرنے لگے تھے جو کسی بیرسٹر کی آمدنی نہیں تھی۔

میدان سیاسیات میں جب قدم رکھا تو آپ نے اخیر زمانہ ۱۹۲۴ء میں کانگریس پارٹی کے قائد اعظم میں شمار کروایا یہ جلسہ شب کے دس بجے ختم ہوا لوگ رخصت ہوئے میں نے رائے صاحب کو معہ دیپ نرائن و مسٹر خاں ان کے قیام گاہ پر لا کر پہنچا دیا۔ ایک ہفتہ ختم ہونے کے بعد جو مکان نمبر ارنڈل گارڈن میں رائے صاحب نے لیا تھا اس میں منتقل ہو گئے۔ میں نے بہاری دوستوں سے کہا کہ سال گذشتہ سے یہ امر طے ہو چکا ہے کہ جب کوئی بہاری اپنے وطن انڈیا واپس جائے تو اسکو ویلفر (Welfare) یعنے وداعیہ ڈنر دیا جاتا ہے (پہلا ڈنر مظہر الحق کو ہم لوگوں نے دیا تھا) اسوقت رائے بہادر تیج نرائن سنگ بہار کے ایک معزز و ممتاز شخص آئے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے تیج نرائن وکٹوریہ جوبلی کالج بھاگلپور میں قایم کیا جسکو ابھی تین ہی چار سال ہوئے ہیں اور چوبیس ہزار سالانہ کی معاش کالج کے نام وقف کردی ہے مکان ہزاروں روپیہ کی لاگت کا بنا کر دیا۔ بھاگلپور شہر بھر میں پانی کا نل اپنے صرفہ سے جاری کیا اور ہمیشہ رفاہ عام کے کاموں میں عملی دلچسپیاں لیتے رہتے ہیں اور ہزاروں خرچ کرتے ہیں۔ اپنے فرزند کو تعلیم دلانے کی غرض سے آئے ہوئے ہیں، ہم لوگوں کو چاہیئے کہ ایک ولکم ڈنر (خوش آمدید) انکو دیں میری رائے سب نے پسند کی۔ چندہ کیا گیا اور رائے صاحب گیسٹ آف ایوننگ کا ٹوسٹ پروپوز کرنے کیلئے مجھے منتخب کیا گیا۔ کیونکہ میرے قدیم دوست تھے اور میں ہی ان کے حالات سے واقف تھا۔ باقی بہاری طلباء ان کے نام سے واقف تھے کسی سے ذاتی تعارف نہ تھا میں نے سب کو ملایا ہوبرن میں وہ ڈنر دیا گیا یہ واقعہ

۱۸۹۲ء کے مارچ کا ہے بہت سے واقعات مقدم و موخر ہو گئے ہیں وہ صرف مناسبت محل و موقع کے لحاظ سے لکھنا پڑے مثلاً میلاد النبیؐ کا جلسہ جو زیر صدارت امیر علیؒ صاحب نومبر ۱۸۹۹ء میں ہوا پھر سال بہ سال ہونے لگا اس کے قبل کا واقعہ ہے میں نے سر اسٹورٹ کالون بیلی سے کہا کہ میں ملکہ کے دربار میں جو آئندہ جون میں ہونے والا ہے شریک ہونا چاہتا ہوں آپ مجھ سے اور میرے خاندان سے واقف ہیں اس کا انتظام کر دیجئے۔ یہ سنکر وہ ہنسے اور کہنے لگے جلدی کیا ہے۔ ابھی تو تمہیں بہت رہنا ہے۔ میں نے جب اصرار کیا تو کہنے لگے اچھا کل تم انڈیا آفس میں گیارہ بجے آؤ اس زمانہ میں سر اسٹورٹ انڈیا آفس کے پولیٹکل سکرٹری تھے (یہ عجیب بات ہے ان کے بھتیجے سر چارلس بیلی جو ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد میں رزیڈنٹ تھے اور ایسٹ بنگال کے لفٹنٹ گورنر ہوئے اور پھر بہار واڑیسہ کے پہلے لفٹنٹ گورنر ہوئے ۱۹۲۷ء میں جب میں دوبارہ انگلستان گیا تو سر چارلس بیلی پولیٹکل سکرٹری انڈیا آفس میں تھے)

لندن میں شاہی دربار وکٹوریہ میں شرکت

چنانچہ دوسرے دن میں گیارہ بجے انڈیا آفس گیا اور بیلی صاحب کے منیجر[1] کو اپنا کارڈ دیا کہ سر اسٹورٹ کو دے آئے۔ سر اسٹورٹ کے کارڈ بھیجتے ہی مجھکو فوراً بلا لیا۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد مجھے اپنے ہمراہ لے کر وزیر ہند کے پولیٹکل اڈی کانگ سر جرلڈ فٹز جرلڈ کے دفتر کے کمرہ میں جو قریب ہی تھا لیکر گئے میرا تعارف کرایا اور مجھے ایک طرف کرسی پر بٹھا دیا خود سر جرلڈ کی قریب والی کرسی پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرتے رہے پھر مجھ سے کہا کہ کوئی فاضل کارڈ تمہارے نام کا تمہارے پاس ہے میں نے کہا جی ہاں ہے۔ اور میں نے کارڈکیس میں سے ایک کارڈ نکال کر دیا۔ سر جرلڈ نے کہا اس پر اپنا پتہ لکھدیجئے پتہ لکھ کر میں نے دیا تو سر جرلڈ بولے ۱۳ر جون کی شام شاہی لیوی کارڈ آپکو مل جائے گا۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ بیلی صاحب مسکراتے ہوئے اُٹھے اور مجھ سے کہا چلو۔ راستہ میں میں نے انکا شکریہ ادا کیا۔ بیلی صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ کورٹ ڈریس تمہارے پاس ہے میں نے کہا نہیں تو۔ کہنے لگے ہندوستانی اچھی پوشاک ہے۔ میں نے کہا جی ہاں ہے۔ پھر بولے پگڑی یا عمامہ ہے۔ میں نے کہا جی ہاں ہے تو کہا کہ اپنے نیشنل کاسٹوم میں لیوی میں جانا اور جھک کر آداب بجا لانا۔ بادشاہی دربار ہے۔ پھر بولے کارڈ پر یہ سب ہدایتیں لکھی رہتی ہیں۔ میں بیلی صاحب کو اُن کے دفتر کے کمرہ کے دروازہ پر چھوڑ کر ان سے رخصت ہوا اور پھر شکریہ زحمت کشی کا ادا کیا۔

---

[1] امدلی کے چپراسی کو انڈیا آفس میں منیجر کہتے ہیں۔

چوتھے یا پانچویں دن مجھے لیوی کا کارڈ مل گیا میں اپنے ساتھ ایک پر تکلف جوڑا ہندوستانی ساتھ لے گیا تھا اور عمامہ بھی بنارسی تھا جو ایرانی وضع کا بندھا ہوا تھا ۔مس پینگ کی سواری میں ایک دو دفعہ یہ پوشاک پہنکر گیا بھی تھا۔بہرحال وہی لباس پہنکر ۱۳؍جون کی لیوی میں سنٹ جیمس پیلس میں گیا بہت سے راجگان آئے ہوئے تھے نوابان فوجی عہدہ دار جنرل وغیرہ انڈیا کے امرا و اعلیٰ دول غیر کے سفرا آئے ہوئے تھے عہدہ داروں کو اور مجھکو جنرل سر جرلڈ نے پیش کیا۔اسوقت سے میں ٹیلنڈ درباری یعنی دربار شاہی میں شرکت کا مجاز ہو گیا پھر تو موجودہ ملک معظم جارج پنجم کے دربار میں جب وہ ۱۹۱۲ء میں انڈیا آئے تھے کلکتہ کی لیوی اور شاہی تقاریب میں مدعو کیا گیا اور ۱۹۲۴ء میں لندن میں شاہی تقاریب میں مدعو کیا گیا۔

اسی زمانہ میں پارلیمان کا انتخاب عام ہوا اور دادا بھائی لبرل پارٹی کی جانب سے منتخب ہو گئے جس زمانہ میں انتخاب ہونیوالا ہوتا ہے سارے انگلستان میں بڑی گڑبڑ اور بڑی ہل چل رہتی ہے ۔ایک امیدوار کی جانب سے اس کے بہت سے ہواخواہ دوست احباب متقلدین مہینوں پیشتر سے کینوس کرتے پھرتے یعنی جس محلہ یا جس کونٹی کی جانب سے کوئی امیدوار ہوتا ہے ۔اس کونٹی کے لوگوں کو اوٹ یعنی رائے دینے کیلئے ہموار کرنا ہوتا ہے ۔امیدوار کو تقریریں کرنی ہوتی ہیں اور اپنا مطمع نظر اور دستورالعمل بتلانا ہوتا ہے اور اس بات کا یقین دلانا ہوتا ہے کہ درصورت منتخب ہونے کے یہ یہ کام تمہاری اور ملک کی بھلائی کا ہم کریں گے ۔

اس زمانہ میں اصل میں دو پارٹیاں تھیں کنسرویٹو یعنی قدیم خیالات والی اور لبرل یعنی آزاد خیال والی کنسرویٹو خیال والوں میں جو بہت زیادہ سخت ہوتے تھے ان کو ٹوری کہتے تھے ۔اور لبرل خیالات والوں میں جو زیادہ متشدد ہوتے تھے ان کو ریڈیکل کہتے تھے ہر کونٹی کی جانب سے دو امیدوار ضرور ہوتے تھے ایک کنسرویٹو دوسرا لبرل بعض اوقات ایک ہی مشرب کے دو امیدوار بھی ہو جاتے تھے ۔اوٹ دہندوں کی بڑی خاطریں امیدوار اور اُن کے طرفدار کرتے تھے ۔ بعض لوگوں کو رشوت بھی دینی ہوتی تھی پولنگ اسٹیشن جہاں اوٹ دئے اور گنے جاتے تھے وہاں تک اوٹ دہندوں کو لیجانے کے لئے سواریوں کا انتظام کرنا ہوتا تھا ۔ہزاروں روپئے ایک ایک امیدوار کی جانب سے خرچ ہوتے تھے ۔بہرحال دوپہر کا وقت تھا کہ ڈیلی ٹیلیگراف میں میں نے یہ خبر پڑھی کہ دادا بھائی فنس بری کی طرف سے بحیثیت لبرل ممبر کے منتخب ہو گئے اور اُن کے کنسرویٹو رقیب کو شکست فاش ہوئی ۔ اس خبر کے پڑھتے ہی دلی مسرت بے پایاں مجھکو ہوئی

میں وہ اخبار لیتا ہوا سید ہا ارنڈل گارڈن نمبر ۱ میں رائے صاحب بہادر تیج نرائن سنگھ کے مکان پر گیا رائے صاحب سے کئی روز سے ملا نہیں تھا۔ آدمیوں سے معلوم ہوا کہ دو روز سے درد نقرس میں مبتلا ہیں اور خوابگاہ کے کمرہ میں لیٹے ہوئے ہیں چونکہ مجھ سے کوئی تکلف نہ تھا میں نے پلنگ کے کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے آواز آئی کون ہے۔ میں نے کہا ہمایون مرزا رائے صاحب بولے آئیے میں نے خوشی کے مارے نہ خیریت پوچھی حتیٰ کہ صاحب سلامت تک نہیں کی اور کمرہ کے اندر داخل ہوتے ہی جو الفاظ میری زبان سے نکلے وہ یہ تھے۔ اخبار کا وہ مقام جس میں یہ خبر مسرت اثر تھی دکھاتے ہوئے لیجئے مبارک دادا بھائی ہو گئے رائے صاحب یا تو لیٹے ہوئے تھے یا فوراً اٹھ بیٹھے اور کہا دیکھوں وہ کاغذ مجھ سے لیا ان کے چہرہ پر بھی سرخی دوڑ گئی مجھ سے کہنے لگے خوشی میں آپ کب تک کھڑے رہیں گے بیٹھئے تو میں ان کے پلنگ پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ رائے صاحب مکرر سہ کرر اس حصہ اخبار کو جس میں یہ خبر درج تھی پڑھتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے صاحب اور مجھ پر ہی موقوف نہ تھا کل ہندیوں کو کم و بیش بیحد خوشی ہوئی۔ انگلستان کی تاریخ اور انگلش پارلیمنٹ کی ہسٹری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا یہ پہلا موقع تھا کہ انگریزوں کی نمائندگی و نیابت ایک ہندی کے ذریعہ ہونیوالی تھی۔

دادا بھائی کے بعد تو کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے کئی سال کے بعد مسٹر (بعد کو سر) منچرجی بھاؤنگر کنزرویٹو پارٹی کی جانب سے منتخب ہوئے اور ایک عرصہ دراز کے بعد سکلٹ وارڈ لیبر پارٹی کی طرف سے منتخب ہوئے مگر عجیب بات کہ یہ تینوں حضرات پارسی تھے۔ بہر حال رائے صاحب نے مجھسے پوچھا اب ہم ہندیوں کو کرنا کیا چاہئے اس بیحد مسرت کا اظہار کیونکر کیا جائے۔ میں نے کہا بہتر یہ ہے ایک میٹنگ آپ اپنے ہاں ہندیوں کی کیجئے اور جو لوگ شریک جلسہ ہوں ان سے رائے لیجئے کہ ہم لوگوں کو کیا کرنا چاہئے یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ پلنگ کے کمرہ کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں نے پوچھا کون۔ جواب ملا رائی ہیں لے رائے صاحب سے کہا کہ پی۔سی۔ رائی ہیں۔ میں نے ان کو بھی ملایا تھا۔ جسطرح اور بہت سے ہندیوں کو رائے صاحب سے ملایا تھا۔ اور یہ اکثر آنے جانے لگے تھے۔ رائے صاحب نے خود کہا کم اِن مسٹر روائے یعنی اندر آئیے مسٹر روائے۔ ان کے ہاتھ میں بھی ایک اخبار تھا۔ مجھکو اور پلنگ پر اخبار دیکھ کر روائے بولے۔ آپ صاحبوں کو اطلاع ہو گئی رائے صاحب نے کہا۔ ابھی مسٹر مرزا یہ اخبار لیکر آئے وہاں کئی کرسیاں رکھی تھیں۔ رائے صاحب نے روائے سے اشارہ سے کہا بیٹھئے۔ ہم تینوں میں آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ ایک نوٹس اطلاعنامہ

کے طور پر ہندیوں کے نام بھیجی جائے کہ فلاں تاریخ بمقام نمبر ۱ ارنڈل گارڈن چار بجے جلسہ عام ہوگا اس امر پر غور کرنے کیلئے کہ مسٹر نوروزجی کے منتخب ہونے پر ہندیوں کو جو اسوقت برطانیہ عظمیٰ کے مختلف مقامات پر مقیم ہیں کیا کرنا چاہئے۔ چونکہ کاغذ قلم نے کر پی۔سی رائے نے مسودہ کیا۔ ذیل کے دستخط کنندگان ممبران ارگنائزنگ کمیٹی کی یہ خواہش ہے وغیرہ وغیرہ۔ نیچے ہم تینوں آدمیوں نے دستخط کئے۔ دیپ نرائن سنگھ (رائے بہادر) سید ہمایوں مرزا۔ پی۔سی۔ رائے۔

میں نے گھنٹی بجائی ایک ملازم آیا اس سے کہا کہ مسٹر شا اپنے کمرہ میں ہوں یا دفتر کے کمرہ میں ہوں رائے صاحب کا سلام دو (یعنی بلاؤ) چنانچہ فوراً مسٹر شا آئے اور رائے صاحب نے کہا کہ اس نوٹس کی سو کاپیاں چھپواکر فوراً منگوا دیجئے۔ آپ خود تکلیف کیجئے۔ رائے۔رائے نے اور میں نے جسقدر نام ہندیوں کے یاد تھے اُن کی ایک فہرست بنائی لنڈن میں رہنے والوں کے بتیس ۳۲ نام لکھے گئے۔ ان میں علاوہ طلبار کے اور بھی لوگ تھے جو بطریق سیاحت آئے ہوئے تھے۔ رائے صاحب نے دیپ نرائن سنگھ کو ان کے کمرہ سے بلوایا اور ان سے نام دریافت کئے کیونکہ ان کے بھی بہت سے دوست ہو گئے تھے خصوصاً کیمبرج کے ہندی طلبار کے نام دریافت کئے کیمبرج کے ٹرنیٹی کالج میں دیپ داخل ہو چکے تھے اور لنڈن ٹرم رکھنے کیلئے آئے ہوئے تھے۔ اونہوں نے فہرست پڑھی اور چند ناموں کا اضافہ کیا۔ رائے صاحب نے دیپ نرائن سنگھ سے کہا کہ تم یہ فہرست لیلو اور سنہا سے جاکر ملو۔ محمود الحق و حسن امام بھی اُسی مکان میں رہتے تھے ان لوگوں سے دریافت کرو ہندی کون کون ہیں۔ بعض کے پتے معلوم ہیں بقیہ کے پتے ان لوگوں سے لے لو میں نے ایک نقل فہرست کی فوراً کرلی اور رائے صاحب سے میں نے کہا ابھی جاتا ہوں اور ہندی طلبار کے جو مختلف ایجنٹس اور بینکرز ہیں مثلاً ہنری ایس کنگ اینڈ کو۔ ولیم ہچنسن اینڈ کو۔ ولیم واٹسن اینڈ کو۔ ٹامس کوک اینڈ سنس سے ان لوگوں کے پتے دریافت کرتا ہوں۔ رو ائے سے میں نے کہا کہ تم بھی شام کو آجاؤ جبتک نوٹسیں بھی چھپ کر آجائیں گی۔ رائے صاحب نے کہا یہ بہتر ہو گا کہ رات کا ڈنر آپ لوگ ہمارے ہاں کھائیے میں تو ہل نہیں سکتا۔ ڈائننگ روم میں جا نہیں سکتا۔ جوکچھ کھانا ہوتا ہے بڈروم میں کئی روز سے کہا رہا ہوں، دیپ آپ لوگوں کے ساتھ کھائیں گے۔ جب سے ارنڈل گارڈن میں رائے صاحب آئے تھے رات کے کھانے پر دو چار ہندی ضرور ہوتے تھے۔ خصوصاً ہندوستانی کھانے کے لالچ سے اکثر ہندی کھانے کے وقت آجایا کرتے تھے اور عمدہ سے عمدہ ہندوستانی کھانے علاوہ دو تین انگریزی ڈشوں کے رائے صاحب کے میز پر رہتے تھے۔

گھی لندن میں نہیں ملتا ہے لارڈ یعنی سور کی چربی سے یا مکھن سے کھانے وہاں پکتے ہیں۔ رائے صاحب نے یہ انتظام کر لیا تھا کہ ہندوستان سے پندرھویں دن عمدہ مسکہ کا دانیدار گھی بافراط آتا تھا۔ کیونکہ تینوں وقت خصوصاً ڈنر میں اقسام کے کھانے میٹھے اور نمکین گھی سے پکتے تھے۔ شام کو سب لوگ جمع ہوئے سچتا نند سنہا بھی آ گئے تھے جو اکثر شام کو رائے صاحب کے ہاں رہتے تھے۔ ان کے اور ویپ نرائن سے بہت گہری دوستی ہو گئی تھی۔ جب ویپ نرائن لندن آتے تو سنہا کا یہاں ہونا لازمی امر تھا بہر حال رات ہی کو نوٹسیں لفافوں میں ڈالدی گئیں پوسٹ باکس میں لفافے ڈلوا دیے گئے بیالیس ۴۲ یا تینتالیس ۴۳ نام فراہم ہوئے تھے۔ جن میں بعض کیمبرج اور اوکسفورڈ کے طلبار کے نام بھی تھے۔ تین چار روز کے عرصہ میں رائے صاحب کا مزاج بھی ذرا سنبھل گیا۔ درد کی شدت جاتی رہی مگر کرچز کی مدد سے نقل و حرکت کرتے تھے۔

چنانچہ بروز معینہ ووقت مقررہ لوگ جمع ہوئے گو نوٹسیں بیالیس یا تینتالیس بھیجی گئی تھیں۔ مگر آئے کل چوبیس یا پچیس آدمی ان میں علاوہ طلبار کے نواب محمود علیخان بہادر رئیس رامپور سابق فرمانروا۔ نواب کلب علیخان کے چھوٹے بھائی جو بغرض سیاحت لندن میں آئے تھے مسٹر بعد کو سر منچرجی بھاؤنگری منچرجی غالباً منوچہرہ کی خرابی ہے اور بھاؤنگری اپنے نام کے ساتھ انہوں نے اسلئے لگایا تھا کہ ٹھاکر آف بھاونگر (حال مہاراجہ) کے دیوان تھے اور کچھ عرصہ سے لندن میں مقیم تھے اسٹیٹ کے اخراجات سے رہتے اور ممبران پارلیمنٹ وغیرہ کی دعوتیں کرتے۔ انہیں کی کوشش سے ٹھاکر کے لقب سے مہاراجہ کا لقب والی بھاؤنگر کو انگریزوں لے دیا۔ یہہ ریاست گجرات کے علاقہ میں ہے۔ رائے مانک چند جیپور کے رئیسوں میں تھے یہ بھی بغرض سیاحت لندن میں مقیم تھے۔ اور جواہرات کی تجارت بھی کرتے تھے۔ جب سب لوگ جمع ہوئے تو میں نے بحیثیت سکے از داعیان انعقاد جلسہ کی غرض بیان کی اور ساتھ ہی یہ بھی تحریک کی کہ اسوقت کے جلسہ کی صدارت نواب محمود علیخان بہادر کریں۔ ان کی تھوڑی سی تعریف بیان کر کے حاضرین سے ان کا تعارف کرایا اس جلسہ میں یہ طے پایا کہ ہندیوں کی جانب سے بہت بڑا بینکویٹ (ضیافت) دادابھائی کو دیا جائے اور ایک اڈریس ان کو دیا جائے انڈیا کی انمول خدمتیں جو سالہائے دراز سے مسٹر نوروزجی کر رہے تھے ان کا تذکرہ کیا جائے اور ہندیوں کی جانب سے ایک بڑا جلسہ کیا جائے جسکی غرض یہ ہو کہ مسٹر نوروزجی کے کانسٹیٹیو ئنسی کو ان کی کوشش و زحمت و آزاد خیالی پر انڈیا کی جانب سے شکریہ ادا کیا جائے کانسٹی ٹیونسی سے مطلب وہ اشخاص جو کسی کانسٹیٹیوئنسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

مسٹر نوروزجی فنس بارو کی کانسٹی ٹیونسی کی جانب سے منتخب ہوئے تھے ۔ پس جن لوگوں نے مسٹر نوروزجی دی گرانڈ اولڈمین آف انڈیا کے لئے اولس ویکران کو کامیاب کیا تھا ان کا شکریہ ادا کرنا لازمی امر تھا اوسی وقت باتفاق آرا بھی طے ہوا کہ بینکوٹ کی صدارات رائے صاحب کریں اور شکریہ کے جلسہ کی صدارت مسٹر منچرجی کریں سات آدمیوں کی ایک اسپیشن کمیٹی یعنی استقبالیہ کمیٹی بنائی گئی تاکہ امور مذکور صدر کی تکمیل اوران کا انصرام وانتظام بحسن وخوبی کیا جائے اور مسٹر نوروزجی کا استقبال کرے میری شرکت اس کمیٹی میں لابدی تھی ۔ سچتانند سنہا بھی اس اسپیشن کمیٹی کے ممبر بنائے گئے تھے ۔ جب جلسہ کی کارروائی ختم ہوچکی تو چیرمین (میر مجلس) کیلئے ووٹ آف تھینکس (شکریہ) کی تحریک رائے مانک چند نے کی اس کے بعد مسٹر منچرجی بھاؤنگری اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے قریب آئے اور مجھ سے کہا کہ آج کے جلسہ کی صدارت کیلئے تم نے نواب محمود علیخاں کو کیوں پروپوز کیا ۔ کیا ان سے بہتر آدمی اس صحبت میں کوئی نہ تھا ۔ غالباً غرض یہ تھی کہ ان کو کیوں نہیں پروپوز کیا میں نے کہا کہ میرے خیال میں ان سے بہتر تو کیا ان کے مساوی بھی کوئی بلحاظ وقار ووجاہت کوئی نہیں ہے ۔ دولت میں سب سے بڑھکر اسوقت رائے صاحب ہیں جن کی آمدنی سالانہ ڈیڑھ دولاکھ کی ہے مگر دولت ہی معیار اعزاز ووجاہت نہیں ہے علاوہ ازیں وہ یکے از داعیان جلسہ بھی تھے آج کے جلسہ کی صدارت کیلئے زیادہ انگریزی دانی وقابلیت کی بھی ضرورت نہ تھی ۔ صدر کو کوئی تقریر کرنی نہ تھی گفتگو اتنی بڑھی کہ ترشروئی کی حد تک پہنچ گئی ۔

غرض ہوبرن اسٹوران میں بروز مقررہ بہت بڑا بینکوٹ مسٹر نوروزجی کو دیا گیا اور سب تقریریں وغیرہ ختم ہونے کے بعد ان کو ایڈریس جو چاندی کے کاسکٹ میں رکھ کر لایا گیا تھا وہ صدر نے اور رائے صاحب نے بڑھکر اور مسٹر نوروزجی کو جو ان کے برابر داہنی طرف بیٹھے تھے مخاطب کرکے سُنایا جواب اداءے شکریہ کے ساتھ بہت مدلل نوروزجی نے دیا ۔ اس ڈنر میں مہمانوں کا ٹوسٹ میں نے پروپوز کیا مہمانوں میں معزز چند انگریز مسٹر ڈگبی ان چند انگریزوں میں سے تھے جو انڈیا اور انڈین کے ہوا خواہ تھے ۔ مثلاً مسٹر ہوم سر ولیم وڈن برن اور لیڈیاں بھی شامل تھیں ۔ مہمانوں کے ناموں کے ساتھ مسٹر ولیم سی ۔ آئی ۔ ای کا نام شریک کیا انہوں نے اپنی جانب سے اور مہمانوں کی طرف سے شکریہ ادا کیا ۔ اس ڈنر کے چار پانچ روز کے بعد میموریل ہال میں مسٹر نوروزجی کے کانسٹی ٹوئنسی کو شکریہ ادا کرنے کیلئے جلسہ منعقد ہوا بہت سے تار انڈیا سے

نامی گرامی لوگوں کے اور بعض والیان ریاست کے مسٹر نوروزجی کے پاس آئے ہوئے تھے ۔ جن میں انکو مبارکباد دی گئی تھی اور ان کے کانسٹی ٹیونسی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا وہ بھی برسرِ جلسہ پڑھتے گئے جنمیں علاوہ ہندیوں کے بہت سے انگریز وانگریزنین بھی شریک تھیں کیونکہ یہ جلسہ عام تھا اور اخباروں میں نوٹس دیدی گئی تھی کہ پبلک شریک ہو حیدرآباد میں اس زمانہ میں سرآسانجاہ وزیراعظم تھے ان کی جانب سے بھی ایک تار مشتمل بہ مطالب مذکور الصدر حیدرآباد اسٹیٹ اسکولر (طالب علم) مسٹر نظام الدین احمد (حال سر نظامت جنگ) کے پاس آیا تھا جسکو انہوں نے جلسہ میں پڑھ کر سنایا ۱۸۹۲ء میں اور بھی واقعات پیش آئے ۔ نواب حامد علیخان مرحوم سابق فرمانروائے رام پور کو جنکی عمر اسوقت انیس ۱۹ سال کی ہوگی ۔ قانوناً نابالغ تھے کیونکہ قانوناً ۲۱ سال کا مرد نابالغ سمجھا جاتا ہے ۔ ان کے دادا نواب کلب علیخاں مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے والد مشتاق علیخان مرحوم صحیح الدماغ نہیں تھے اسلئے ایجنسی قایم کردی گئی تھی ۔ جنرل عظیم الدین خان ریجنٹ مقرر ہوئے تھے ۔ اہل رامپوران کو ملک کا خیرخواہ نہیں سمجھتے تھے اور یہ انکو کسی نے قتل کرڈالا جس کی بڑی ہل چل رہی ۔ غرض مشتاق علیخان پانچ چھ برس زندہ رہے ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند جو ہنوز نابالغ تھے رامپور میں ایجنسی قایم رہی گورنمنٹ آف انڈیا نے نواب حامد علیخان مرحوم کو دنیا کی سیر اور مشاہدات عالم سے بہرہ ور ہونیکے لئے بھیجا چنانچہ اُنہوں نے بمعیت پولیٹکل ریجنٹ اور چند مصاحب اتالیق وغیرہ امریکہ وجاپان سیلون ویورپ کے ممالک کی خوب سیاحت کی ۔ اسی سلسلہ میں لندن بھی آئے تھے نواب محمود علیخان مرحوم جو نواب کلب علیخان کے چھوٹے بھائی تھے ۔ منجھلے بھائی نواب حیدر علیخان تھے جنہوں نے کتاب جادہ تسخیر فسانۂ عجایب کے تتبع میں لکھی جسطرح سروش سخن خواجہ فخرالدین حسین خان مرحوم نے لکھی تھی غرض نواب محمود علیخان جن کا ذکر اوپر آچکا ہے جن سے مجھ سے بہت ربط واتحاد ہوگیا تھا ۔

ایک دن تیسرے پہر کو میرے پاس آئے اور کہا کہ آپکو اخباروں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ نواب صاحب رامپوران دنوں لندن آئے ہوئے ہیں میں نے ان کو خط لکھا تھا اُنہوں نے کل دس بجے اپنے ہوٹل پر مجھے بلایا ہے ۔ مجھے ان سے ملنا ضروری ہے درحالیکہ میں یہاں ہوں اور وہ بھی یہاں آئے ہیں ۔ اگر نہ ملوں تو بڑی شکایت ان کو مجھ سے ہوگی ۔ آپ بھی چلتے ہیں تو چلئے آپ کو اُن سے ملا دوں میں نے کہا کل صبح کو مجھے کوئی کام نہیں ہے میں صبح کے نو بجے آپ کے ہاں آجاونگا ۔ چنانچہ دوسرے دن نواب محمود علیخان کے ساتھ نواب صاحب رامپور سے ملنے گیا ۔ ان کے لئے ہوٹل میں کئی کمرے لئے گئے تھے ایک بہت آراستہ نشست کے کمرہ میں ہم دونوں بٹھائے گئے چند ہی لمحوں کے بعد نواب صاحب برآمد ہوئے

ان کے ساتھ پولیٹکل ایجنٹ اور ایک مسلمان صاحب آئے نواب محمود علیخان مرحوم نے میرا تعارف نواب صاحب سے کرایا اور لمبی چوڑی تعریف میری کی نواب صاحب رامپور نے پہلے محمود علیخان سے پوچھا آپ کتنے دنوں سے یہاں ہیں اور کب تک رہیں گے۔ کیوں نہیں وطن واپس جاتے مجھ سے دریافت کیا کہ مجھے کتنے دن لندن آئے ہوئے اور کب تک رہنے کا قصد ہے غرض اور چند باتیں ہوئیں اس کے بعد ہم لوگ رخصت ہوئے۔ جب تک ہم دونوں آدمی وہاں رہے وہ انگریز بیچارا ہا وطن واپس جانے کے بعد دو جلدوں میں ان کا سفر نامہ نہایت قابلیت کے ساتھ مرتب کیا گیا۔ چنانچہ دونوں جلدوں کی ایک ایک کاپی میرے طلبی پر نواب صاحب نے مجھے بھیجی تھیں اسی سال میں نے اخبار میں پل من کا کا اشتہار دیکھا تھا کہ کوئی مسٹر پل من ہیں انہوں نے ایک ٹرین چند گاڑیوں کی بنائی ہے۔ جو بہت ہی آراستہ اور قابل دید ہے۔ لندن سے برائٹن اور برائٹن سے لندن آتی جاتی تھی۔

ایک روز جی میں آیا کہ اسی ٹرین میں برائٹن جاؤں چنانچہ پل من کار میں گیا۔ معمولی ٹرین کا ٹکٹ تین شلنگ تھا اسکا دس شلنگ اس میں تین گاڑیاں علاوہ انجن اور گارڈ کی گاڑیوں کے تھیں۔ بہت عمدہ سجا ہوا ڈرائینگ روم ڈرائینگ سلون اسموکنگ سیلون اور سب گاڑیاں بہت آراستہ اور یہاں سے وہاں تک کوراںڈ ور کے ذریعہ سے جانیکا راستہ تھا جس وضع کی ٹرین مارسیلز سے کیلے آتی جاتی ہے ڈھائی گھنٹہ میں برائیٹن پہنچے اور ہوٹل مسٹروپول میں جاکر قیام کیا لنچ میں نے ٹرین میں کھا لیا تھا یہاں تیسرے پہر کی چائے پی کر باہر سیر کو نکلا۔ برائٹن لندن کے جنوب سمندر کے کنارہ بہت خوبصورت ایک چھوٹا سا شہر ہے جسکو لندن سمندر پر کہتے ہیں اور کوئین آف واٹرنگ پلیسز بھی کہتے ہیں۔ تھوڑی دور کے فاصلہ پر بہت سی پہاڑیاں ہیں جن پر خوبصورت مکانات لوگوں کے ہیں جو دائمی سکونت ان میں رکھتے ہیں۔ یہاں کا پیر بھی بہت وسیع و خوبصورت ہے کنارہ سے اور پانی میں تھوڑی دور ایک پل کے طور پر بنا ہے جس کو پیر کہتے ہیں اقسام کے کھیل تماشے اس میں ہوتے ہیں اور بذریعہ ٹکٹ کے ایک شلنگ دیکر لوگ اندر جاتے ہیں۔ میں بھی دو دفعہ گیا تیسرے دن برائیٹن سے واپس آیا اس ہوٹل کے پلنگ کے کمرہ میں اور باتھ روم میں یہ انتظام تھا کہ دروازہ کھلتے ہی اندر بجلی کی روشنی ہو جاتی پلنگ پر لیٹتے ہی بجلی گل ہو جاتی اور اسیطرح باتھ روم سے واپس آتے وقت دروازہ بند ہوتے ہی اندر کی روشنی غائب ہو جاتی تھی تعطیلوں کا زمانہ تھا۔ لندن واپس آکر میں تبدیل آب و ہوا کی اور سیاحت کی غرض سے سٹی آف باتھ گیا چار روز باتھ ہوٹل میں رہا۔ اس ہوٹل کے علاقہ کمروں کے اندر قدرتی چشموں سے گرم پانی آتا ہے جس میں سلفر وغیرہ ہے اور صحت کیلئے

مفید ہے میں بھی ایک شلنگ دیکر نہایا اس ہوٹل میں لوگ اسی حمام کی خاطر قیام کرتے ہیں۔ وہاں سے برسٹل گیا وہاں روائل ہوٹل میں چار روز رہا دوران قیام برسٹل میں رام موہن رائے آنجہانی کا موسولیم دیکھنے گیا۔ جہاں ان کی راکھ مدفون ہے وہ ایک قبرستان ہے اسکو انوز سمٹری کہتے ہیں۔ برسٹل کے قریب ہے شارا بون پر گیا یہ گھوڑوں کی لمبی گاڑی ہوتی ہے جس کی دونوں سیٹوں پر بیس آدمی فراغت سے بیٹھتے ہیں سمٹری دیکھی اور رام موہن رائے کا موسولیم دیکھا مینار کی وضع کا ایک گنبد ہے کلس پر سونا چڑھا ہوا ہے وہاں انسپکشن بک جو ہے یعنی کتاب الرائے جو زائرین جاتے ہیں وہ معائنہ کی کیفیت لکھتے ہیں میں نے وہ کتاب شروع سے آخر تک دیکھی اور اپنی رائے لکھی۔

راجہ رام موہن رائے۔ راجہ صاحب آنجہانی کا انتقال ۱۸۳۱ء میں ہوا اسوقت سے ۱۸۹۲ء تک کوئی مسلمان وہاں پھٹکا نہیں تھا۔ زیادہ تر ہندو بنگالی برہمو سماج والے جسکی بنیاد رام موہن رائے نے ڈالی۔ یعنی وقتاً فوقتاً آتے رہتے ۔ رام موہن رائے کا ذکر آیا ہے آپ کی مختصر کیفیت لکھنی ضرور ہے۔ جنہوں نے انڈیا کے ہندوں پر بڑا احسان کیا۔

یہ بزرگ بردوان (بنگالہ) کے قریب ایک گاؤں کے زمیندار کے فرزند تھے جس مقام پر آپ کی مستقل یادگار حال میں بنائی گئی ہے۔ چونکہ انگریزی پڑھنے کے بعد کمسنی میں بمقام پھلواری شریف جو قدیم خانقاہ پٹنہ عظیم آباد کے متصل ہے گئے۔ اور سجادہ صاحب کے پاس رہنے لگے وہاں فارسی اور عربی حاصل کی اور اسلام کی توحید کا گہرا اثر ان پر ہوا اور بت پرستی کو اور ذات پات کی بندش کو خلاف عقل و مخالف ترقی و تمدن سمجھنے لگے۔ بہرحال ان خیالات کو لیکر جب وطن آئے اور ان خیالات کا اظہار علانیہ کرنے لگے۔ والدین نے ان کو گھر سے نکالدیا کلکتہ آئے اور ایک نیا مسلک برہمو قایم کیا جو برہما سماج کے نام سے مشہور ہے۔ بہت سے بنگال کے ہندو ان کے ہم مسلک ہوتے گئے۔ ایک مندر بھی بلا بت کے بنایا جہاں بایں مضمون لکچر دیے کہ چاروں ورن برہمن چھتری۔ ویش۔ شدر کی تفریق وامتیاز بے سود ہے انسان سب برابر ہیں اور بت پرستی گناہ ہے۔ اپنے ہاتھ سے ایک پتھر تراش کرنا اور اوسکو خدا سمجھنا اور اوسکی پرستش کرنا خلاف عقل ہے۔ اور ہندوؤں کے مذہب میں جو یہ حکم ہے کہ جہاز پر سوار ہوتے ہی مذہب کو خیرباد کہنا ہوتا ہے۔ یہ بھی فضول ہے اگر یہ رسم برقرار رہی تو ہندو دنیا کی سیر کیونکر کریں گے اور مشاہدات عالم سے کیونکر مستفید ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

ان کی تبلیغ سے ہندوؤں کو بہت فائدہ ہوا بہت سے بنگالی ہندو اس زمانہ میں عیسائی ہو گئے تھے زیادہ تر مٹن چاپ اور کٹلس کھانے کے اور صاحب بننے کے شوق میں سفر یورپ سے

فائدہ اٹھانے کیلئے عیسائی ہوجاتے تھے اس کا سدباب ہوا برہمو سماج کی تبلیغ میں بہت سے بنگالہ کے دولتمند ہندوں نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ پھر تبت وغیرہ کی سیاحت کو گئے واپسی میں دلی آئے وہ زمانہ اکبر ثانی کا تھا۔ جو برائے نام لال قلعہ کے اندر انگریزوں کے قیدی تھے بنے ہوئے شہنشاہ ہند کہلاتے تھے۔ ایک رئیس مرزا افضل بیگ مخاطب بہ جواد الدولہ تھے ان سے رام موہن رائے نے دوستی پیدا کی اور ان کے ذریعہ بادشاہ کی خدمت میں پہنچے چونکہ آدمی قابل تھے۔ فارسی وعربی سے بھی بلد تھے۔ انگریزی میں بھی ان کو دخل تھا جو اس زمانہ میں ہندیوں کیلئے ایک نایاب بات تھی بادشاہ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے راجہ کا خطاب عنایت ہوا اور بادشاہ کے حقوق جو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں نے تلف کئے تھے اور ان کی آزادی چھین لی تھی جسکا بیحد قلق بادشاہ کو تھا یہ بات قرار پائی کہ راجہ رام موہن رائے بادشاہ کی جانب سے بحیثیت وکیل لندن جاکر ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس سے استغاثہ کریں اور ممبران پارلیمنٹ کو بھی بادشاہ کی داد و فریاد کی جانب متوجہ کریں۔

چنانچہ راجہ رام موہن رائے لندن روانہ کئے گئے وہاں ان سے جو کچھ کوشش ہوسکی کی، مگر ناکام رہے راجہ رام موہن رائے اس موقع کو غنیمت سمجھکر برہمو سماج کے متعلق لکچر دینے لگے۔ اور برسٹل میں اپنا قیام کیا۔ وہاں ایک ڈاکٹر کارپنٹر تھے وہ ان کے دست راست ہوگئے۔ اور ڈاکٹر کی لڑکی جو بہت قابل و ہوشیار تھی وہ بھی ان کی مدد کرنے لگی۔ رام موہن رائے نے برسٹل میں انتقال کیا ان کے ایک فرزند رام پرشاد تھے ان کا تقرر کلکتہ کی چارٹرڈ ہائیکورٹ کی ججی پر ہوا۔ چارٹرڈ ہائیکورٹ سے مطلب یہ ہے کہ ایسا ہائیکورٹ جسکا افتتاح انگلستان کے بادشاہ وقت یا ملکہ وقت کے منشور سے ہوا ہو اور ججوں کے تقررات بھی خود ملک یا ملکہ کرے۔ چنانچہ ان کا تقرر ملکہ وکٹوریہ آنجہانی نے کیا تھا۔ اسوقت انڈیا کے کسی ہائیکورٹ پر ہندی کا تقرر عمل میں نہیں تھا۔ مگر مقام تاسف ہے کہ ایسے وقت آپکا تقرر عمل میں آیا کہ رام پرشاد کی علالت نے جو کچھ دنوں پہلے سے تھی ان کا خاتمہ کردیا لیکن خوش بختی کی یہ خبر سنکر مرے۔ ان کو ایک دن بھی ہائیکورٹ کی کرسی پر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس واقعہ سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اسی وجہ سے جسٹس پنڈت شمبھوناتھ ایک کشمیری پنڈت کو جو بڑے قابل اور بڑے پایہ کے مقنن تھے اور جب جج ہائیکورٹ کلکتہ بنائے گئے تو لوگ یہ سمجھنے لگے کہ پنڈت شمبھوناتھ ہی پہلے ہندی ہیں جو ہائیکورٹ کے جج بنائے گئے۔ اب ایک اور امر اس جگہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ راجہ رام موہن رائے کے مسوئیم کو دیکھ کر اور کتاب الرائیں

اپنا نام لکھ کر جب میں چلا آیا تو اس واقعہ کے تقریباً ایک سال بعد البین بیانرجی (حال سی ایس۔ ای سی۔ آئی۔ ای نائٹ سابق کلکٹر ضلع احاطہ مدراس جن بعد دیوان ریاست کوچین پھر دیوان میسور ہوئے اس کے بعد وزیر اعظم کشمیر ہوئے یہ لندن آئے ایک دولتمند زمیندار کے فرزند ہیں ۔ اور جبکہ ان کی والدہ حمل سے تھیں ان کے والد اپنی بیوی کو بحالت زچگی لندن اس خیال سے لے گئے تھے کہ مولود کو وہ کل حقوق حاصل ہوں گے جو برٹش بارن سبجکٹ کو حاصل ہوتے ہیں ۔ چنانچہ ان کی ولادت لندن میں ہوئی تھی ۔ دو سال کے بعد ان کے والدین ان کو لندن سے واپس لائے ۔ اور کلکتہ میں تعلیم دلائی اور شروع ہی سے آئی۔ سی۔ ایس کے کورس کی تعلیم کلکتہ میں پاتے رہے ایم اے پاس کرکے لندن گئے اور چھ ماہ میں آئی۔ سی۔ ایس پاس کر لیا زمانہ دراز تک لندن میں رہنے سے اور اخراجات کثیر کا بار پروفیسروں سے آئی۔ سی۔ ایس کے کورس کی تعلیم حاصل کرنے میں اٹھانے پڑتے ہیں۔ اس سے محفوظ رہے ان کے والد بڑے سرگرم برہمو سماج کے کارکن تھے بہت سی املاک اس مشن کے نذر کر دی البین بیانرجی الولد سر لابیہ کے مصداق بہت جوشیلے ممبر برہمو سماج کے ہیں یہ ۱۸۹۴ء کے شروع میں راجہ رام موہن رائے موسویم کی زیارت کو گئے اور بقول ان کے ساری کتاب الرائے دیکھ گئے اسمیں بجز ایک مسلمان کا یعنی میرا نام دیکھ کر بہت متحیر ہوئے۔

لندن آکر انکو جستجو ہوئی کہ ہمایوں مرزا کون شخص ہیں ان سے ملنا چاہیے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے قوم پرست ہیں۔ چنانچہ ہندی طلباء کے جو لندن میں ایجنٹس اور بنکرز ہیں سب کے ہاں گئے۔ آخر ولیم بنجس سے میرا پتہ ملا اس زمانہ میں ایک دیہات کوٹربری ڈیون شیئر جو جنوبی انگلستان میں ہے میں وہاں ایک شریف خاندان کاشتکاروں کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا یہ وہاں مجھ سے ملنے کو آئے اور تقریباً دو ہفتے میرے ساتھ وہاں قیام کیا اس تاریخ سے آج تک میرے اور ان کے محبت واتحاد ہے جبکہ وہ میسور کے دیوان تھے مجھکو مدعو کیا اور پھر جب وہ کشمیر کے وزیر اعظم ہوئے تو مجھکو ۲؍ ۱۹۲۸ء میں بلایا اور بہت تکلفات و کروفر سے اپنا مہمان دو ہفتہ تک رکھا اس کے بعد دوسرے مقامات کی سیر کے حیلہ سے میں سری نگر سے چلا گیا تاکہ ان کی مہمانداری کا سلسلہ ختم ہو۔ کوٹربری میں میرے قیام کے حالات یہ ہیں۔

دیہات میں قیام | لندن میں ایک مس مینگ تھیں جنکا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ جن کے نام سید امیر علی صاحب نے کلکتہ میں خط دیا تھا ان خاتون کا حال آئندہ لکھوں گا میں نے مس مینگ سے کہا تھا کہ میں نے انگلستان کے ارسٹوکراٹک طبقہ جنکو اپر ٹن بھی کہتے ہیں یعنی طبقہ امراء میں میل جول رکھ کر

انکی طرز زندگی وغیرہ اچھی طرح دیکھی اور نیز مڈل کلاس یعنی متوسط طبقہ والوں کی حالت بھی اچھی طرح دیکھی کیونکہ میں مڈل کلاس والوں کی فیملی میں رہ چکا ہوں میرا خیال ہے کہ انگلش کنٹری لائف کا بھی مطالعہ کروں اس کے لئے آپ کیا سبیل نکالیں گی۔ چند لمحہ سکوت کے بعد انہوں نے کہا کہ ایک تدبیر یہ ہے کہ میرے فرسٹ کزن مسٹر مجلمور جنٹلمین فارمر ہیں اور کوٹر بری کے دیہات میں رہتے ہیں میں ان کو لکھتی ہوں کہ تم کو اپنے پاس رکھیں اور چونکہ کچھ عرصہ قیام ہوگا کچھ رقم معینہ ہفتہ وار تم سے لیا کریں حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے کبھی بورڈر نہیں رکھا بہت شریف لوگ ہیں اور اگر انہوں نے حامی بھری تو تم اپنے تئیں خوش نصیب سمجھو دیہات کی آب و ہوا بھی تم کو فائدہ کرے گی جواب آتے ہی تمکو لکھوں گی اور یہ بھی دریافت کروں گی کہ ہفتہ وار تم کو کیا دینا ہوگا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چھٹے ساتویں دن مس مننگ کا میرے پاس خط آیا جس میں انہوں نے یہ لکھا تھا کہ میں بمسرت تمکو مطلع کرتی ہوں کہ مسٹر مجلمور نے میری خط کا جواب حسب دلخواہ دیا جو مجھے کل پہنچا وہ بخوشی تمام تم کو اپنے ہاں رکھنے کیلئے رضامند ہیں۔ مثل ایک فیملی ممبر کے تم وہاں رہوگے اور ہفتہ عشرہ کیلئے تم رہو تو وہ کچھ تم سے نہیں لیں گی اور اگر زیادہ قیام ہو تو فی ہفتہ دو گنی تم کو دینی ہوگی اس میں دھوبی کی دھلائی شامل ہوگی ساتھ ہی اس کے کوٹر بری جانیکا راستہ لکھا کہ لندن کے کس اسٹیشن سے روانہ ہونا ہوگا۔ اور پھر ٹرین کہاں چھوڑنی ہوگی۔ دریائے ڈارٹ بذریعہ اسٹیمر عبور کرکے پیدل کے راستہ گھوڑے کی گاڑی میں جانا ہوگا۔ مس مننگ نے اپنے خط میں مسٹر مجلمور کا پتہ بھی لکھا کہ اس پتہ سے ان کو خط لندن سے روانہ ہونے کے دو روز قبل لکھو تاکہ مسٹر مجلمور اپنی خانگی گاڑی ڈارٹ متھ لیکر آئیں چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

مسٹر مجلمور کو اپنے آنیکی اطلاع بذریعہ خط دیدی اور بوقت روانگی تار بھی دیا میں صبح کے آٹھ بجے پڈنگٹن ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوا اور دو بجے کے قریب کنگ لیئر اسٹیشن پر ٹرمنس تھا پہنچا اور دریا ڈارٹ کو بمقام ڈارٹ متھ بذریعہ اسٹیمر کے پاؤ گھنٹہ میں عبور کیا۔ ڈارٹ متھ لفظ متھ مخفف لفظ موتھ کا ہے جس کے معنی دہانہ کے ہیں جیسے پلے متھ وغیرہ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے دریا کے اس پار مسٹر اپنا ڈوگ کارٹ لئے موجود تھے۔ بقول شخصے فقیر کی صورت سوال ہے یہ کہکر کہ میں مسٹر ہمایون مرزا کو مخاطب کرنے کی مسرت حاصل کر رہا ہوں۔ مصافحہ گرمجوشی سے کیا گھوڑا جو کھلا ہوا تھا اُسے جوتا اور مجھے اپنے برابر بٹھایا اور میرا گلاڈسٹون بیگ پیچھے کی سیٹ پر رکھ کر روانہ ہوئے میل ڈیڑھ میل کی مسافت کے بعد آبادی نظروں سے

غائب ہو گئی اور صرف میدان اور کھیت اور جا بجا کسانوں کی جھونپڑیاں نظر آ نی گیئں ڈارٹ متھہ سے کوئی چھہ میل کے فاصلہ پر کوٹر بری دیہات ہے۔ ہر پیر کو قصبہ ڈارٹ متھہ میں بازار لگتا ہے جیسے ہندوستان کے دیہاتوں میں آٹھویں دن ہٹیا لگتی ہے اسے یہاں سٹ بنڈی کہتے ہیں۔ چونکہ یہ روز پیر کا تھا میرے پہنچنے کے قبل مسٹر مچلمو رنے کچھ سودا خرید لیا تھا۔ بکرے کا گوشت گائے کا گوشت اور خدا جانے کیا کیا یہ چیزیں کوٹر بری جیسے دیہات میں نہیں ملتی ہیں چونکہ سرد ملک ہے مٹن وبف وغیرہ پانچ پانچ چھہ چھہ روز لوگ رکھتے ہیں اور خراب نہیں ہوتا غرض اپنی پوٹلا پوٹلی سمیٹ کے نیچے مسٹر مچلور نے ڈالدی تھی۔ راستہ میں جو باتیں کرتے چلے تو مسٹر مچلمور سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقریباً ہر پیر کو وہ ڈارٹ متھہ آ کر ضرورت کا سامان خرید لیجاتے ہیں۔ چار بجے کے قریب کاٹر بری پہنچے تین چار میل کے اردگرد کوئی مکان سوا ان کے دو منزلہ مکان کے کوئی اور نہیں تھا۔ مکان کے سامنے تھوڑا خوبصورت چمن تھا اور مکان کی پشت پر ان کا آرچرڈ تھا۔ یعنی میووں کا باغ جسمیں اقسام کے سیب و ناشپاتیاں وغیرہ درختوں میں لدی ہوئی تھیں ڈیون شائر سیبوں کی کثرت ومختلف اقسام کیلئے مشہور ہے۔

سائیڈر کارخانے میں (اس منشی عرق کو شامپین کہتے ہیں) سیب کا عرق بوتلوں میں بھرا جاتا ہے اور دور دور جاتا ہے۔ یہ منشی بھی ہوتا ہے۔ ڈیون شائر میں جا بجا کارخانے ہیں۔ سیبوں آرچرڈ چار دیواری سے محصور تھا اس کے باہر سے ان کے کھیتوں کا سلسلہ تھا جہاں مزدور کام کر رہے تھے۔ دیہاتی لوگوں کا تلفظ بھی عجیب ہوتا ہے اور مختلف کونٹیوں میں مختلف تلفظ ہوتے ہیں۔ مسٹر مچلمور گھر پر لاکر اپنی بیوی اور لڑکی سے ملا کر اور یہ کہکر کہ میں تھوڑی دیر کے بعد آوں گا۔ تکلوک چائے پیو اپنے کمرہ میں گئے وہاں سے لباس بدل کر کھیتوں میں مزدوروں سے کام لینے چلے گئے۔

یہاں تقریباً دو ماہ رہنے کا اتفاق ہوا تعطیل منانے گیا تھا۔ خوب دل کھولکر لطف اٹھایا میرے آنے کے دوسرے دن مسز مچلمو رنے چائے کی دعوت کرکے کچھ مسلمانوں کو مدعو کرکے مجھ سے تعارف کرایا میری بڑی تعریف یہ کہہ کر کی کہ میری کزن مس ہڈنگ نے لکھا ہے کہ مسٹر مرزا ہند کے بہت بڑے رئیس زادے ہیں مہمانوں میں لیڈی ڈامس سر جیمس ڈامس لارڈ آف دی مینر آف بلا کاٹن کی بیوی تھیں اون کا لڑکا چارلس ڈامز تھا اور جنرل اسٹروک کی ایک بیٹی اور کرنل کلسبی کی دو بیٹیاں تھیں سر جیمس ڈامس بہت بڑے زمیندار قصبہ بلیوگٹن تھے۔

اُن کا مکان اور قصبہ بلیکٹن سے تین میل کے فاصلہ پر ہے اور جنرل اسٹروک کا مکان کوئی ڈھائی تین میل کے فاصلہ پر ہو گا کرنل کلبی سب سے قریب تر رہتے تھے دو میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی پر ان کی کوٹھی تھی کوٹربری سے نظر آتی تھی باہر چمن میں نشستیں تھیں ان سب مہمانوں نے مجھے مدعو کیا اور مس مچلمور سے مسز مچلمور نے کہا کہ اپنے مہمانوں کو ساتھ لاؤ۔ اتنے میں مسٹر مچلمور بھی آگئے تھے۔ ان سے کہا کہ آپ بھی آیئے جنرل اسٹروک بھی مدعو تھے۔ اسدن ان کا مزاج ٹھیک نہ تھا وہ نہ آسکے اور کرنل کلبی لندن گئے ہوئے تھے تاقیام کوٹربری ان گھروں میں میری آمد ورفت رہی۔ جنرل اسٹروک کے ہاں پہلی دفعہ جب میں گیا تو ان کی بیوی نے جنرل سے تعارف کرایا انہوں نے کہا کہ دیکھو مقدر اسکو کہتے ہیں کہ لارڈ رابرٹ آف قندہار ۱۸۵۶ء میں ہم اور وہ مین جینٹ سبلٹرن (یعنی کیڈٹ) ساتھ ہندوستان گئے تھے ان کا نام مسٹر ابراہیم تھا۔

لارڈ رابرٹ جب مقدر رہبری کرتا ہے تو غیب سے مواقع اور ترقی کے سامان پیدا ہوتے ہیں۔ لارڈ رابرٹ کو ترقی کے اچھے مواقع ملتے گئے تھے میں نے کہا۔ آپ بھی قسمت کے قائل ہیں۔ یا اتفاقاً کے جنرل اسٹروک ہنسنے لگے اور بولے اب جو بھی ہو کرنل کلبی اور ان کی لڑکیاں کوٹربری میں اکثر آتے اور ہم لوگ بھی جاتے۔ بلیکوٹن کے لارڈ آف دی مینر سر جیمس ڈامس بہت بڑے زمیندار قصبہ بلیکوٹن کے مالک تھے۔ یہ چھوٹی سی بستی تھی اور کچھ بازارات بھی تھے بستی سے کچھ فاصلہ پر ان کی عالیشان دو سو سالہ پیشتر کی کوٹھی تھی جسکو کیسل کہتے تھے یعنی قلعہ بہت بڑا کمپونڈ تھا۔ ایک طرف بڑا سا تالاب تھا جسمیں اقسام کی مچھلیاں پریزرو تھیں اور ایک طرف جنگل تھا۔ جنگل اس معنی میں نہیں جیسے ہندوستان میں ہوتا ہے۔ لندن میں دس گیارہ میل کے فاصلہ پر کیمبرج کی سڑک پر اپینگ فارسٹ ہے۔ فارسٹ یعنی جنگل کا نام سنکر یہ سمجھا ہوا تھا کہ جیسے ہوشنگ آباد کے قریب پاس وحشتناک گھنے جنگل ہیں یہ بھی اسی قسم کا ہو گا۔ ۱۸۹۲ء میں دیکھنے کے بعد میں بہت ہنسا کہ یا خدا میرے یہ کس قسم کا جنگل ہے۔ درخت تو کچھ لمبے تھے نیچے زمین صاف ستھری جسپر فرش کرکے بیٹھو اوٹھو یا سو جاؤ تو لطف آئے غرض سر جیمس کے جنگل میں بہت سے درخت تھے جس میں پیا ٹرج یعنی تیتر محفوظ تھے۔ سوا ان کے اور ان کے مہمانوں کے یا ان کے بیٹے کے دوسرا کوئی شکار نہیں کرسکتا۔ اسی طرح مچھلی کا شکار بھی نہیں کرسکتا۔ سر جیمس کے فرزند چارلس ڈامس میرے ہم عمر تھے مجھ سے اور چارلی سے گہری دوستی ہوگئی تھی۔ تقریباً دوسرے یا تیسرے دن وہ میرے ہاں ہوتے یا میں اُن کے ہاں ہوتا۔ ان کے پاس بیگ آف گری ہاونڈس تھے چھ سات

شکاری کتے اچھی نسل کے تھے بڑے شکاری تھے وہ اور ہم مل کر کتوں کو لیکر دور جھاڑیوں میں چلے جاتے اور یہ مشاق کتے اقسام کے خرگوش مار کر لاتے اس زور سے گلا دباتے کہ وہیں فیصلہ کر دیتے چارلی بیگ گلے میں ڈالے رہتا اس میں سب بھر لیتے گھر پہنچکر ایک ارنڈا یوائے چھوکرے کو میرے ساتھ کر کے میرا حصہ دیتے میں اپنے مسکن پر لیجا کر مسز مچل مور کے حوالہ کرتا وہ بہت شکریہ ادا کرتیں اور ریابٹ روسٹ تیار کیا جاتا یعنی خرگوش کا کباب مجھ سے کھانیکو کہتیں میں یہ کہکر معافی مانگتا کہ مجھے یہ گوشت موافقت نہیں کرتا ہضم نہیں ہوتا۔ اول تو بغیر ذبح کے دوسرے اگر ذبح کیا ہوا بھی ہوتا تو میرے مذہب میں مکروہ وناجائز ہے کیونکہ خرگوش کو مثل عورت کے حیض ہوتا ہے ایک دن مس کلبی مس مچل مور میں اور چارلی ملکر ہنٹنگ کیلئے جاتے ایک قسم کی نٹ (میوہ) ہوتی اسٹابری بھی وہاں بہت ہوتی ہے توڑکر وہیں بیٹھ کر کھاتے کبھی موضع ڈٹشم جو کوٹربری سے کچھ فاصلہ پر ہے ڈرگ کارٹ پر جاتے ندی ڈارڈ اُدھر سے ہوتی ہوئی گئی ہے۔ وہاں جاکر ملاحوں کو پیسے دیکر کشتیاں لیتے اور اُوانگ پنٹنگ خود کرتے ہوئے کسی دیہات میں جا نکلتے۔ کشتیوں سے اُترکر کنٹری ٹیورن میں یعنی سرائے میں جاکر چائے کافی پیتے بلوکٹن قصبہ میں ایک اسمبلی روم تھا۔ مثل کلب گھر کے شام سے شب کے آٹھ نو بجے تک گاؤں کے لوگ مرد وزن جمع ہوتے گاؤں کے پادری کا بیٹا جان کلیمنٹ بھی وہاں آجاتا۔ یہ بھی میرا ہم عمر تھا۔ اور پالیٹکس بہت بگھارا کرتا اس نے اپنے مکان میں میری دعوت کھانے کی ایک دفعہ کی اور اپنے والدین سے ملایا تھا بعض اتوار کو ان سب کے ساتھ میں بھی وقت کاٹنے کی غرض سے بلوکوٹن کے گرجے میں چلا جاتا خصوصاً مارننگ سروس میں جو نو سے گیارہ تک ہوتی شریک ہوتا گاؤں کے لوگ عموماً غریب تھے اپنی اچھی سے اچھی پوشاکیں پہنکر نکھر سنور کر گرجے جاتے سب پیدل جاتے دیہاتوں میں پانچ چھہ میل چلنا مطلق گراں نہیں ہوتا تھا۔ خرگوش کے شکار کیلئے خرگوشوں اور کتوں کے پیچھے میں اور چارلی میلوں دوڑتے ایکدن چارلی نے حساب کیا ان کو دیہاتوں کے راستے اور مسافت کا اندازہ تھا تو سولہ میل ہم لوگ چلے تھے گھر آکر اسقدر کھاتے تھے جسکا حساب نہیں گھر کی پلی ہوئی بطخیں اور مرغیاں بلاناغہ میز پر رہتی تھیں کبھی کبھی بف اور مٹن یعنے گائے اور بکرے کا گوشت بھی مل جاتا تھا۔ پیر کے دن جب مسٹر مچل مور ڈارٹ متھہ سے لاتے تو تین چار روز وہ کھاتے بہت زیادہ مقدار میں لاتے تھے ایک دن چارلی مجھکو ڈارٹ متھہ اپنی کار پر لیگئے اور ڈارٹ متھہ ریگٹا کلب کا ممبر بنایا پانچ چھہ روز ریگٹا کو باقی تھے مجھ سے ایک نیا سوٹ

ڈارٹ متھ کے درزی سے بنوانا پڑا نیوی بلو سرج کا سوٹ بنوایا اور پارٹنگ کیپ خریدی ریگٹا یہ وہ چیز ہے کہ شب کو بہت سی کشتیوں میں روشنی کی جاتی ہے اور ان کو خوب گھماتے اور چکر دیتے ہیں جیسے بہار میں دریاؤں میں کشتیوں پر جھنجری کھیلتے ہیں۔ یا بنارس کا بوڑ ہوا منگل ہوتا ہے اس کو پانی پر میلہ سمجھنا چاہئے۔

کسی شب کو لیڈی ڈائمس اپنے ہاں میوزیکل ایوننگ کرتیں یعنی قریب و پاس کے سب لوگ جمع ہوتے اور لڑکیاں باجے بجاتیں کوئی وائلن بجاتا کوئی پیانو بجاتا اور کوئی گاتا جبتک کوڑبری میں میرا قیام رہا دلچسپ مشاغل رہے۔ لیڈی ڈائمس ہر ہفتہ عشرہ میں ٹینس پارٹی بھی دیتیں علاوہ موزیکل ایوننگ کے جس شام کو باہر جانا نہیں ہوتا تو تیسرے پہر کو گھر ہی میں کئی سٹ ٹینس کے کھیلتے اور شب کو اقسام کے ڈرائنگ روم گیمس سے دل بہلاتے۔ مثلاً ہلما۔ڈامینوز۔ ڈرافٹ ٹیو ٹو وغیرہ ڈیون شیر میں جس میں کوڑبری واقع ہے بافراط و اقسام کے سیب ہوتے ہیں اور ان کے نام بھی جداگانہ ہیں کسی کا نام ڈیوک آف ونگٹن ہے کسی قسم کا نام کوئن ریئن وغیرہ جسطرح ہندوستان کے بعض صوبوں میں آموں کی افراط اور اقسام اور ان کے جداگانہ نام ہوتے ہیں۔ یہاں کی بالائی بھی بہت لذیذ بالکل ہندوستانی بالائی کی سی ہوتی ہے۔ انگلستان کے دوسرے شہروں لندن وغیرہ میں بالائی جسے کہتے ہیں۔ وہ ایک قسم کا کچا گاڑھا دودھ ہوتا ہے یہ بالائی مشین کے ذریعہ بنائی جاتی ہے لیکن کوڑبری میں آگ پر دودھ کو رکھ کر بالائی بنائی اور جمائی جاتی ہے اسلئے موٹی اور پرت دار ہوتی ہے چونکہ عرصہ دراز کے بعد یعنی جب سے ہندوستان چھوٹا تھا ایسی بالائی میں نے کبھی دیکھی نہ کھائی تھی۔ پہلی دفعہ جب میں نے زیادہ مقدار میں لی تو مسز و مس بچل مور نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر مسٹر مرزا خدا کیلئے اسقدر بالائی نہ و تم مر جاؤ گے یہ بہت بلیس یعنی مولد صفرا ہوتی ہے۔ میں ہنسا میں نے کہا یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم لوگ پاؤ پاؤ سیر اسی قسم کی بالائی کھانے کے عادی ہیں۔ اسپر انہوں نے کہا تم جانو ہم لوگ ذمہ دار نہیں ہیں۔

اسی زمانہ میں میری ایک دوست مسز ڈونکن ڈاکٹر ڈونکن مشہور فزیشن ساکن کونڈش اسکوائر[1] بغرض تبدیل آب و ہوا سمندر کے کنارہ ہسٹنگس میں جو ایک تاریخی مقام ہے

---

[1] اسکوائر و ہیول اسٹریٹ دو محلوں کے نام ہیں جہاں اعلیٰ درجہ کے ڈاکٹر اسپشلسٹ سرجن و فزیشین سینہ کے امراض کے قلب وغیرہ کے امراض کے یہیں رہتے ہیں جن کی فیس دو اشرفیوں سے کم نہیں ہوتی ہے۔

مقیم تھیں میں نے جب ان کو کوٹربری سے خیریت دریافت کرنے کی غرض سے خط لکھا تو جواب میں جہاں اور باتیں لکھی تھیں یہ بھی لکھا تھا کہ تم تو اندنوں خوب ڈیون شیر کی مزیدار بالائی کھاتے ہو گے میں نے زمانہ دراز سے ڈیون شیر کی بالائی نہیں کھائی میں اسے حسن طلب سمجھا اور بہت سی بالائی ٹین کے ظرف میں بند کرکے ان کے پاس بھیجدی انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور میرے لئے اسٹنگس کی اسٹرابری جو خوش ذائقگی و شیرینی میں مشہور ہے اور لندن وغیرہ کی اسٹرابری سے بہت بڑی ہوتی ہے بھیجی۔ لندن وغیرہ میں اسٹرابری بالائی کے ساتھ شکر ڈالکر کھاتے ہیں۔ اسٹرابری اسقدر آئی تھی کہ میں نے علاوہ گھر والوں کے لیڈی ڈائمس کے لئے تھوڑی سی بھیجی انہوں نے رقعہ میں بڑا شکریہ میرا لکھا اور مذاقیہ یہ بھی لکھا کہ تمہاری دوست مسز ڈونکن سے گو میں واقف نہیں ہوں مگر میرا شکریہ لکھنا کہ ایسی مزیدار اسٹرابری کھائی لیڈی ڈئکس کو اسٹرابری کے ساتھ جو رقعہ بھیجا تھا اس میں میں نے یہ لکھا تھا کہ یہ اسٹرابری میری ایک دوست مسز ڈونکن نے اسٹنگس سے بھیجا ہے اپنے زمانہ قیام میں مسز ڈونکن کو ایک دفعہ اور یہاں سے بالائی بھیجی تھی اونہوں نے پھر اسٹرابری بھیجی جس میں سے اس دفعہ تھوڑی مس کلبی کو اور مس اسٹراک کیلئے بھیجی۔

علاوہ مسز ڈونکن کے ایلنگ[1] میں اپنی ایک دوست مسز موزر کو اور لندن میں مسز ایس کو بھی یہاں کی بالائی بھیجی تھی جسکا دونوں خاتونوں نے بڑا شکریہ لکھکر بھیجا کوٹربری میں جس زمانہ میں مسز ایلین بیانرجی (حال سرایلین بیانرجی) آئے ہوئے تھے یادگار کے طور پر ایک گروپ تصویروں کا لیا گیا جس میں مسٹر اور مسز اور مس مجل مور اور ان کی ایک بھانجی مس شارپ جو اُن دنوں مہمان آئی ہوئی تھیں میں اور مسز بیانرجی شریک تھے اسکی کاپی میرے پاس اب نہیں ہے کہیں کھوگئی مگر سرایلین کے پاس موجود ہے۔ بہت زمانہ ہوا کہ اپنے ایک خط میں سرایلین نے اس تصویر کا ذکر کیا تھا کہ میرے پاس ابتک وہ گروپ موجود ہے جو کوٹربری میں لیا گیا تھا جس میں تم بھی شریک ہو پھر یہ گروپ مجھکو ۱۹۲۸ء میں جب میں کشمیر گیا تو انہوں نے دکھایا تھا وینا ٹی فیر ناول میں میں ایک کیرکٹر (کردار) مس بیکی شارپ ہے۔ ہم لوگ مسز مجل مور کی بھانجی مس شارپ سے بہت مذاق کرتے اور مس بیکی شارپ کے الفاظ سے مخاطبت کرتے جب میں کوٹربری سے رخصت ہوا تو پہلے دو چار روز کیلئے ایلفراکوم گیا کسٹر ہوس میں ٹہیرا سمندر کے کنارہ

[1] مقام کا نام لندن سے قریب ہے۔

نہایت خوبصورت یہ مقام ہے وہاں سے ٹارکی گیا یہاں ایک ہفتہ سمندر کے کنارہ ایک ہوٹل میں جسکا نام ٹاربی ہوٹل ہے ٹھہرا وہاں سے لندن واپس آتے وقت جب ایکزیٹر میں میری ٹرین پہنچی تو میں اتر گیا۔ یہاں کا گرجا جو نہایت عالیشان اور مشہور ہے دیکھنے گیا۔ ایک رسٹران میں جاکر چائے پی اور دوسری ٹرین کے ذریعہ لندن آیا۔

جلسہ میں تقریر کیا پہلا انگریز عیسائی جو سولہویں صدی میں مشرف باسلام ہوا اسکا نام جوزف پٹ تھا وہ ایکزیٹر کا باشندہ تھا وہ الجیریا (الجزائر) میں جو اسوقت ترکوں کے قبضہ میں تھا ایک دولتمند ترک کا ملازم ہوا تھا اور حج بھی اپنے آقا کے ساتھ کیا تھا مذکورالصدر مقامات سب ڈیون شائر کونٹی میں ہیں ۱۸۹۲ء کا ذکر ہے انٹرنیشنل کانگرس آف دی اورنٹالیسٹس International Congress of the Orientalists کے جلسے لندن میں ہوئے ہر دسویں سال اس کانگرس کے جلسے بعض ممالک یورپ کے دارالسلطنت میں ہوا کرتے تھے۔ ابتدا اسکی ۱۸۷۲ء میں بمقام برلن دارالسلطنت جرمنی میں ہوئی اور ۱۸۸۲ء میں پیرس دارالسلطنت فرانس میں ہوئی اسدفعہ لندن کی باری تھی مختلف مقامات یورپ کے علما و فضلا مستشرقین جمع ہوتے تھے علاوہ ممالک یورپ کے مصر، ٹرکی، ایران، چین، جاپان، سیام وغیرہ سے بھی وہ اصحاب جو اپنے ممالک میں مشہور و معروف ہوتے تھے ڈیلیگیٹس (نمائندے) بن کر آئے تھے انڈیا کے بھی بعض مشاہیر آئے تھے۔ ہندی مقیمان برطانیہ عظمیٰ سے بھی کچھ لوگ ممبر بنائے گئے تھے۔ حسب قاعدہ عام جس یوروپین شہر کے مستشرقین کانگرس کو مدعو کرتے تھے باہر سے آئے ہوئے ڈیلیگیٹوں کے قیام وطعام وغیرہ کا انتظام وہی لوگ کرتے تھے ریسپشن کمیٹی کے ممبروں کے سپرد یہ انتظامات ہوتے تھے۔ ایک ہفتہ تک اس کانگرس کے جلسے ہوتے رہے۔ مختلف ملکوں کے لوگ اپنی اپنی مادری زبانوں میں مفید مضامین پر نہایت عالمانہ لکچر تحریری پڑھتے اور زبانی بھی تقریریں کرتے جسکا اصل مقصد مشرقی آرٹ و سائنس علوم و فنون کی ترقی ہوتا۔ پروفیسر میکسمیلر مشہور جرمن سنسکرت دان جنہوں نے ویدانت وغیرہ کا ترجمہ سنسکرت سے انگریزی میں کیا ہے اپنا وطن جرمنی چھوڑکر انگلستان میں زمانۂ دراز سے آبسے تھے اور اوکسفورڈ کے مستقل دائمی سکونت اختیار کر رکھی تھی مجھ سے بہت مراسم ہوگئے تھے۔ جب اکسفورڈ گیا تھا تو پروفیسر و مسز میکسملر نے میری چائے کی دعوت کی تھی بہرحال ان کی تحریک سے کانگرس کے انڈین سکشن کا میں سکرٹری منتخب کیا گیا تھا۔ اردو کی نیلاوجی پر میں نے ایک مضمون بھی پڑھا تھا اور لارڈ نارتھ بروک سابق وائسرائے کی جانب سے جو ڈیلیگیٹوں کو گرانڈ ہوٹل میں عظیم الشان بنکویٹ دیا گیا تھا بہت سے

لوگوں نے بعد ختم طعام تقریریں کیں جن میں نے بھی تقریر کی جس میں میں نے انگریزی حکومت ہند کا شکریہ اس بارہ میں ادا کیا کہ گورنمنٹ ہند کو ہندی مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کا بہت خیال ہے اور اردو زبان کے ساتھ جو دلچسپی لی گئی فورٹ سینٹ ولیم کلکتہ میں جو ابتدائے اٹھارہویں صدی میں اردو زبان میں تالیف و تصنیف و ترجمہ کا جو کچھ عرصہ تک زیر سرپرستی گورنمنٹ کام ہوتا رہا۔

سر ولیم جونس ڈاکٹر میلن وغیرہم نے اور روائل ایشیاٹک سوسائٹی شاخ کلکتہ نے جو خدمت اردو کی کی اور لارڈ ولیزلی نے مسلمانوں کیلئے کلکتہ میں مدرسہ قایم کیا ان باتوں کا ذکر کیا بہر حال اسوقت جو کچھ مجھے یاد آتا گیا کہتا گیا میں نہ تیار ہو کر گیا تھا اور نہ مجھے پہلے سے خیال تقریر کرنے کا تھا۔ بعض ہندی مسلمان شرکا ضیافت نے ڈنر ختم ہونے کے بعد مجھے مبارکباد دی اور میری تقریر کی نسبت پسندیدگی کا اظہار اچھے لفظوں میں کیا۔ اس بینکوٹ میں لارڈ نارتھ برک کے بہت روپئے صرف ہوئے ہوں گے چودہ پندرہ کورس سے کم نہ تھے اور ہر کورس کے ساتھ خاص قسم کی شراب دی جاتی تھی۔ ڈھائی سو آدمی کا ڈنر تھا۔ علاوہ ڈیلیگیٹوں کے مقامی سو سے زیادہ ممبر شریک ڈنر تھے۔ یہ امر لازمی نہ تھا کہ ہر شخص شراب بھی پئے لیکن مینو میں ہر کھانے کے نام کے مقابلہ خاص قسم کی شراب کا نام بھی درج اور چھپا ہوا تھا۔ لارڈ نارتھ برک کے ڈنر کے علاوہ اور بھی دولتمند اولوالعزم انگریزوں نے ڈیلیگیٹوں اور ممبروں کو دعوتیں دے دے کر مدعو کیا۔ بعض نے اپنے کنٹری ہوس (دیہاتی مکان) میں چائے کی دعوت کی بعض نے ایوننگ پارٹی دی سرایم۔ ای گرانٹ ڈف جو مدراس کے کسی زمانہ میں گورنر رہ چکے تھے۔ اپنے کنٹری ہوس مشہور پارک ہوس میں بڑی عمدہ گارڈن پارٹی دی تھی۔

اکسفورڈ میں دعوت ایک دن اکسفورڈ میں صرف کیا وہاں یونیورسٹی کی جانب سے ہم لوگوں کو لنچ کی دعوت دی گئی تھی۔ دس بجے ہم لوگ اکسفورڈ پہنچے تھے پہلے بہت سے کالجوں کو دکھایا گیا۔ یہاں تک کہ لنچ کا وقت آگیا ایک کالج کے جکا نام یاد نہیں ہے۔ بڑے ڈائننگ ہال میں لنچ (Lunch) کھلایا گیا چار بجے وہاں سے واپس ہوئے جہاں جہاں ہماری پارٹی جاتی ایک اسپیشل ٹرین میں جاتی۔ جہاں علمی مشاغل تھے وہاں تفریح کے بھی سامان تھے۔ نہایت مفید مشغلہ تھا۔ جو ہر دسویں سال رونما ہوتا تھا۔ اور اس کانگرس کے تحت مختلف زبانوں اور مباحث پر رسالے چھپتے تھے۔ مصر کے جامعہ ازہر جو دنیا میں بہت قدیم یونیورسٹی ہے کی جانب سے دو اشخاص آئے تھے۔ ایک کا نام محمد ابراہیم فہمی تھا

دوسرے کا نام احمد[1] زکی آفندی جامعہ کے پروفیسر تھے مشہور ومعروف مصنف ومولف تھے ان کا ذکر مولوی شبلی نعمانی نے اپنے سفرنامہ روم وشام میں خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ ان سے اور مجھ سے دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ جس ہوٹل میں یہ ٹہیرائے گئے تھے میں اُن سے ملنے گیا تو چائے پلائی اور ایک شیشی جس پر خول چاندی کا بہت خوبصورت چڑھا ہوا تھا۔ جس میں قسطنطنیہ کے بہترین گلاب کا عطر بھرا تھا۔ تحفۃً دی تھی وہ شیشی میرے پاس چند سال پیشتر تک تھی جو عطر اس میں تھا۔ نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ اسکی خوشبوئی اور پائیداری خارج از بیان ہے۔ ۱۸۹۳ء میں مجھے مسٹر دادا بھائی نوروزجی لندن انڈین سوسائٹی کا ممبر بنایا۔ اس سوسائٹی کی کیفیت یہ ہے کہ مسٹر ٹیگور، حال ڈاکٹر ٹیگور کے غالباً چچا تھے جو پہلے انڈین تھے۔ جنہوں نے سول سروس کا امتحان پاس کیا تھا اس زمانہ میں تقابل کا امتحان نہیں شروع ہوا تھا بمقام ہیلبری ایک کالج میں اُمیدواران سول سروس کی تعلیم دی جاتی تھی اور برائے نام امتحان کے بعد اُمیدوار منتخب کرلئے جاتے تھے۔ چنانچہ مسٹر ٹیگور پہلے ہندی تھے جو سویلین ہو کر انڈیا واپس آئے انہوں نے اپنے زمانۂ قیام لندن میں یہ سوسائٹی قائم کی تھی۔ اس زمانہ میں گنتی کے ہندی لندن میں تھے جنکو مسٹر ٹیگور نے ممبر بنایا تھا ان کی واپسی کے بعد یہ سوسائٹی سو گئی تھی۔

دادا بھائی نے عرصہ دراز کے بعد اسے جگایا تھا۔ گنتی کے چند ممبر بنائے گئے۔ زیادہ تر پارسی اور بنگالی طلبا شریک ہوئے۔ بنگالیوں میں چترارنجن داس یعنی سی آر داس بھی، ۱۸۹۳ء میں ایک ممبر تھے۔ مسلمانوں میں صرف میں ایک ممبر تھا چند دنوں کی شرکت کے بعد کمیٹی انتظامیہ کا میں ممبر بنایا گیا انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں بمقام بمبئی پڑی تھی اسکی تائید میں یہ سوسائٹی کام کرتی تھی۔

چند انگریز ہوا خواہان ہند نے بھی ایک کمیٹی لندن انڈین کانگرس کمیٹی قائم کی تھی سر ولیم وڈرن برن مسٹر ہوم آئی سی ایس، مسٹر ولیم ڈگبی، مسٹر ہچنسن وغیرہم اس کے ممبر تھے۔ اور ایک اخبار موسوم بہ انڈیا کانگرس کا لندن آرگن نکالا جانے لگا میں اس زمانہ میں کانگرس کا بھی بہت حامی تھا اخبار انڈیا میں کئی دفعہ میں نے آرٹیکل بھی بتائید کانگرس لکھے تھے اور اسکی جانب سے ہندی مسلمانوں کی بے توجہی کو بُرا ٹہیرایا تھا اور کانگرس کو مفید ملک وقوم ادارہ سمجھتا تھا مغربی مطمع نظر سے

---

[1] یہ وزیر تعلیمات بھی ہو گئے تھے حال میں انتقال کیا ہے۔

انڈیا کے کل باشندوں کو خواہ کسی مذہب و ملت کے ہوں ایک قوم سمجھ کر خیال کی تائید میں تیز مضامین ہوتے تھے۔ سر سید احمد خان مرحوم کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اس کی شرکت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اس زمانہ کے مسلمانوں نے مغربی تعلیم اتنی نہیں پائی تھی جو ہندوؤں کے شریک حال پالٹکس میں ہو سکے۔ اسی زمانہ میں اربندو گھوش نے جنہوں نے روحانیت کی تعلیم کیلئے پونڈیچری میں ایک پُر اسرار آشرم قائم کر رکھا ہے۔ آئی سی ایس کا امتحان تقابل کا پاس کیا کیونکہ ان کے چند مضامین اخباروں میں انگریزوں کے خلاف نکل چکے تھے تو بورڈ آف اکزامنرس نے (Board of Examiners) ان کو رائیڈنگ (Riding) یعنی گھوڑے کی سواری میں فیل کر دیا تھا تو یہ بے دست و پا ہو گئے تھے ان کے ایک بھائی بھی تھے اور انگریزی میں شعر کہتے تھے۔ ہم لوگوں میں وہ پوئٹ گھوس مشہور تھے۔ اربندو گھوش کے رائیڈنگ میں فیل ہو جانے سے ان کے دوستوں کو بڑی فکر دامنگیر ہوئی مجھ سے بھی اسکا ذکر کیا۔

مہاراجہ گیکوار بروده

حسن اتفاق سے ہز ہائینس مہاراجہ گیکوار بروده اس زمانہ میں لندن آئے ہوئے تھے ان کے دو بھائی رنپت راؤ گیکواڑ اور گنپت راؤ گیکواڑ میرے ہم عصر قانون کے طالب علم تھے اور ان دونوں سے مجھ سے دوستی تھی اب گنپت راؤ کا تو انتقال ہو گیا ان کے فرزند بقید حیات ہیں ۱۹۳۲ء میں جب میں بروده گیا تھا تو سنپت راؤ جی نے جنکا حال میں انتقال ہو گیا ہے۔ میری بڑی خاطر و مدارات کی۔ مہاراجہ یورپ میں تھے۔ اسلئے انہوں نے میری مہمانداری کی۔ اور یورپین گسٹ ہاؤس میں سرکاری مہمان بنا کر رکھا تھا۔ بہر حال اربندو گھوش کی بدنصیبی کا ذکر میں نے گنپت راؤ جی سے کر کے کہا کہ بروده اسٹیٹ میں ان کو کوئی خدمت جس کے یہ اہل ہوں ملنی چاہئے انہوں نے کہا کہ ہز ہائینس کے پاس ان کو لیجائے چنانچہ چار پانچ طلبا جس میں کلکتہ کے مشہور ریاضی دان بی۔ کے۔ گھوش کے فرزند بھی شامل تھے اور میں بھی شریک تھا۔ بطور وفد کے ہز ہائینس مہاراجہ بروده کے پاس اربندو گھوش کو لیکر گئے۔ اور مہاراجہ نے ان کو تین یا چار سو روپیے پر ملازم رکھ لیا۔

ہز ہائینس مہاراجہ بروده سے ۱۹۲۴ء میں بمقام لندن جب مجھے اور میری بی بی کو لنچ کی دعوت دی تھی اربندو گھوش کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا وہ عرصہ دراز تک میری ریاست میں رہے اور وہاں سے حسب عادت انگریزوں کے خلاف مضامین وغیرہ لکھے اور مخالفین گورنمنٹ سے ساز باز۔ کھٹتے ان کے لئے وارنٹ نکلا تو بھاگ کر پانڈیچری چلے گئے۔ مسٹر ڈبلو کوئیم سالسٹر یورپول بعد عبداللہ کوئیم جنکو سلطان عبدالحمید

سابق سلطان ٹرکی نے عرصہ تک اپنے پاس رکھا تھا اور شیخ الاسلام برطانیہ عظمیٰ کا لقب بھی دیا تھا غالباً ۱۸۸۹ء میں مسلمان ہو چکے تھے۔ بمقام لورپول ایک ریڈنگ روم دارالمطالعہ قائم کیا تھا اور اسی مکان کے ایک حصہ سے مسجد کا کام لیتے تھے تبلیغ کا کام بھی کرتے تھے۔ چند انگریزوں کو مشرف باسلام کیا تھا۔ بنگال کے چند مسلمان طلبا رمحمد یونس۔ محمد احمد۔ محمد حلیم ان کے یہاں رہتے تھے۔ مگر یہ طلبا دو سال کے بعد عبداللہ کویلیم سے ناراض ہو کر لندن چلے آئے تھے۔ میں جب اپنے مرحوم دوست سلیم کی لاش لیکر لورپول گیا تو عبداللہ کویلیم سے بھی ملا تھا انہوں نے اپنی چند تصنیفیں۔ دی کریسنٹ۔ دی فیاتھس اینڈ فیناٹزم اور اسلام دی ریلیجن آف دی سورڈ وغیرہ اسلام کے متعلق مجھکو تحفتاً دی تھیں عبداللہ کویلیم سے ۱۹۲۲ء میں بھی لندن میں ملاقات ہوئی تھی اسوقت زندہ تھے اور اپنا نام بدل دیا تھا جس کے کچھ اسباب تھے دو سال ہوئے انہوں نے انتقال کیا ۱۸۹۳ء میں لارڈ اور لیڈی جیسل نے جن کے ہاں میں اکثر جایا کرتا تھا۔ اپنے دیہاتی مکان متصل ہون اوکس میں کرسمس ویک منانے کیلئے مدعو کیا تھا۔ میں نے جواباً شکریہ ادا کرکے یہ لکھا کہیں دو دن سے زیادہ نہیں رہ سکوں گا اور فلاں روز ریلوے اسٹیشن ان کی گاڑی موجود تھی جب گھر پر پہونچا تو دونوں میاں بیوی نے بہت گرمجوشی سے میرا خیر مقدم کیا بالا خانہ کے ایک کمرہ میں میرا سامان رکھوا دیا گیا میں نے اپنے کمرہ میں پہنچکر منہ ہاتھ دھویا کپڑے بدل کر نیچے آیا تو مجھکو لارڈ جسل نے اپنے مہمانوں سے ملایا جو دو ایک روز قبل سے ان کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ دو مرد اور تین عورتیں تھیں لارڈ اور لیڈی ڈنلنڈ مسز میکل اور لیڈی گرنفیلڈ۔

کرسمس کا ڈنر

خوش قسمتی سے موسم غیر معمولی طور سے اچھا تھا۔ تھوڑی دیر چمن میں ٹہلتے رہے اس کے بعد اندر آئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے لنچ کھایا جو نہایت پرلطف تھا چار بجے کی چائے برآمدہ میں ہم سب نے پی۔ شام سے مہمان آنا شروع ہوئے کچھہ لوگ بذریعہ ٹرین لندن سے آئی اور کچھہ قریب پاس کے دیہاتوں کے باشندے لینڈو گاڑیوں اور جوڑیوں پر بعض ڈوگ کارٹ پر آئے سب مہمانوں سے میرا تعارف اور بعض کا بعض سے جو پہلے سے واقف نہ تھے۔ تعارف لیڈی جسل نے کرایا۔

ڈرائنگ روم کے ایک دروازہ پر مزلٹو (ایک قسم کا بیلدار درخت) کی بیل ٹکائی گئی تھی۔ کوئی مرد کسی لیڈی کو باتوں میں مصروف کرکے اس کے نیچے لیجاتا اور فوراً بوسہ لے لیتا۔ بروز کرسمس مزلٹو کے نیچے غیر عورت کا بوسہ لینا معیوب اور خلاف تہذیب نہیں سمجھا جاتا۔ سب مہمان ڈرائنگ روم

میں جب آکر بیٹھ چکے تو کوک ٹیل (دو تین قسم کی شرابیں مخلوط ہوتی ہیں) شراب کا دور شروع ہوا لیڈیوں نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد لیڈی جبل نے مہمانوں کا جوڑا ملایا کہ فلاں مرد فلاں لیڈی کو پارٹنر بنائے اسی لحاظ سے اپنے اپنے پارٹنر کو لیکر ڈرائینگ ہال میں داخل ہوئے[1] یہ وہ کمرہ نہ تھا جہاں دو بجے لنچ کھایا تھا بلکہ یہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا اور نہایت تکلف وحسن وخوبی سے سجا ہوا تھا۔

میز کے بیچ میں ایک بڑا کرسمس کیک رکھا تھا۔ مختلف اقسام کے بارہ تیرہ کورس تھے۔ ٹرکی (بہت بڑی چڑیا ہوتی ہے گلے کا چمڑا سرخ ہوتا ہے) جیسے ہندوستان میں پیرو کہتے ہیں اس میں بیا سج بھر کر پکاتے ہیں کرسمس کے ڈنر میں اسکا ہونا اور کرسمس پم پڈنگ کا ہونا تو لوازمات سے تھا۔ اقسام کی شرابیں خصوصاً شامپین کی بوتلیں چاندی کی خول کے اندر رکھ کر لائی جاتی تھیں دو ڈھائی گھنٹہ میں کھانا ختم ہوا مذاحیہ تقریریں شروع ہوئیں اور مہمانوں نے کریکرس توڑنا شروع کیے چوبیس پچیس مہمان تھے ہر ایک کے سامنے چار چار یا پانچ کریکرس تھے کسی میں سے ریشمی رومال نکلا کسی میں سے کوئی چھوٹا کھلونا کسی میں سے کریپ کے خوبصورت خوبصورت پھول کسی میں سے رولڈ گولڈ واچ چین کسی میں سے بروچ جس کے کریکرس سے زیادہ قیمتی چیز نکلتی وہ اپنے تئیں زیادہ خوش قسمت سمجھتا مرد زیادہ پی گئے تھے بعض نے کامک سانگ مذاحیہ گیت گانا شروع کیا۔

میز پر اعلیٰ میووں کی کثرت تھی میووں پر خوب حملے ہوئے پھر کافی کا دور شروع ہوا۔ اس کے بعد سب لوگ بال روم ناچ کے کمرہ میں آئے یہ کمرہ تو اسقدر آراستہ تھا کہ چوتھی کی دلہن معلوم ہوتا تھا آرکسٹرا بینڈ کھانے کے وقت بھی بجتا رہا جب تقریریں شروع ہوئیں اور مردمہمانوں نے گانا شروع کیا اسوقت موقوف ہوگیا تھا یہی ارکسٹرا بال روم کے متصل ایک کمرہ میں آگیا بال روم میں آنے کے بعد ایک صاحب ماسٹر آف سرمی منیز تھے مہمانوں کو انہوں نے چند ورقوں کی چھوٹی چھوٹی چار انگل چوڑی سرخ مراکو کی جلد کی کتابیں جن میں ریشمی ربن سے بندھی ہوئی ذری پنسلیں تھیں تقسیم کیں۔ پروگرام میں ڈانس (ناچ) کے اقسام مثلاً والٹز۔ پولکا۔ ڈانس جس میں دو آدمی ناچتے ہیں پھر اسکوئر ڈانسز مثلاً لانسرڈ اسکوٹڈرن وغیرہ جس میں چار آدمی دو مرد دو عورت ناچتے ہیں درج تھے اور ان کی ترتیب بھی تھی کہ کس ڈانس کے بعد کون سا ڈانس ہوگا۔ پروگرام کی بھی ایک ایک کاپی ماسٹر آف سرمی منیز نے سب کو تقسیم کی۔ چھوٹی کتابیں جو تقسیم ہوئیں ان کا مطلب یہ تھا کہ ہر شخص لیڈیوں سے پوچھ پوچھ کر جس ڈانس میں وہ شریک ہونا چاہتی ہیں ان کا اور

---

[1] اول جبل لیڈی وٹلنڈ کے اور لیڈی جبل لارڈ وٹلنڈ کے پارٹنرس تھے۔

ڈانس کا نام کتاب میں لٹکتی ہوئی پنسل سے لکھ لیا جائے تاکہ گڈ مڈ نہو۔ جنٹل مین خود جا کر لیڈی سے پوچھتا کہ آپ فلاں ڈانس میں کسی کے ساتھ شریک تو نہیں ہوئی ہیں میں آپ کے ساتھ شرکت کی مسرت حاصل کر سکتا ہوں۔ اگر لیڈی نے اپنی کتاب دیکھ کر کہا کہ میں فری (آزاد) ہوں اور بسر و چشم آپ کے ساتھ ناچوں گی تو لیڈی کا نام اور ڈانس کا نام و نمبر جو از روئے پروگرام ہے اس کتاب میں ٹانک لیا جاتا۔ پہلے صاحب خانہ ارل جسل نے لیڈی ڈٹمنڈ کے ساتھ لیڈ کیا یعنی قیادت کی اور لیڈی جسل نے لارڈ ڈٹمنڈ کے ساتھ ناچنا شروع کیا۔ اور ساتھ ہی بہت سے جوڑے اپنی اپنی جگہ سے اٹھے جو پہلے سے تیار اور لیڈ کے منتظر تھے۔ ہر ایک جنٹلمین چھوٹی کتاب کے اندراج کے لحاظ سے اپنی پارٹنر کے پاس جا کر کھڑا ہو چکا تھا بال روم کے برابر ایک کمرہ میں لمبے میز پر رفرشمنٹ کا سامان چنا ہوا تھا۔ میٹھی چیزیں کم کھاری چیزیں اقسام کی تھیں۔ شمپین کپ کلیرٹ کپ چاندی کے جگوں میں جنجر ایل لیمنڈ اقسام کے ایریٹیڈ واٹر تھے۔

چند ڈانس کے بعد وقفہ دس پندرہ منٹ کا ہوتا تھا اس میں لوگ ریفرشمنٹ کھاتے نہ معلوم یہ لوگوں کے پیٹ تھے یا بے ایمان کی قبریں حالانکہ نصف گھنٹہ قبل ڈنر میں دنیا کی چیزیں کھا چکے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ناچنے میں انسان تھکتا ہے اور تشنگی محسوس کرتا ہے۔ اس حالت میں لیمنڈ وغیرہ پی لینا کافی ہوتا مگر یہ لوگ تو ماکولات پر بھی ہتے مارتے تھے اور خوب شرابیں اڑاتے تھے۔ دس پندرہ منٹ کا جو وقفہ شروع ہوتا اس کے قبل جو جنٹلمین جس لیڈی کے ساتھ ناچ رہا تھا اس لیڈی کو ریفرشمنٹ روم میں وہی جنٹلمین لیکر آتا اور لیڈی سے پوچھتا آپ کیا کھائیں گی آپ یہ لیجئے آپ وہ چیز لیجئے بعض کہتیں کہ میں صرف ایک گلاس راس بری یا لیمنڈ پیوں گی۔ ریفرشمنٹ کے وقت آرکسٹرا بینڈ موقوف ہو جاتا وقفہ کے ختم ہوتے ہی آرکسٹرا بجنا شروع ہوتا اور ساتھ ہی اس کے لوگ بال روم میں آجاتے۔

ادھر ناچ ہو رہا تھا کہ ایک شخص سینٹ کلاز بن کر آیا جسکو فادر کرسمس بھی کہتے ہیں منہ پر بیجا لگائے بڑا لبادہ پہنے اور ایک جھولی لٹکائے ایک جگہ کھڑا ہو گیا اور مسخراپن کرنے لگا۔ اور اپنی جھولی میں سے اقسام کے کھلونے نکال نکال کر رکھنے لگاتیں۔ ساڑھے تین بجے صبح تک ڈانس ہوتا رہا جب ڈانس ختم ہو گیا تو گاڈ سیو دی کوئین (وہ زمانہ ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کا تھا) آرکسٹرا نے بجایا سب خاموش کھڑے ہو گئے پھر مہمان کلوک روم میں گئے۔ زنانہ زنانہ کلوک روم میں اور مردانہ مردانہ کلوک روم لیڈیوں نے اپنے فر کے اور کوٹ پہنے بونٹ پہنی۔ اور مردوں نے اپنے اپنے اوور کوٹ پہنے اور ایوننگ کیپ

یا سانٹ فلٹ پہن کر گاڑیوں میں سوار ہوتے گئے جن کی گاڑیاں موجود تھیں چند ایسے بھی تھے جو بذریعہ ٹرین کے آئے تھے اور وہ کرسمس ویک صرف کرنے یا دو چار روز رہنے کی غرض سے آئے تھے وہ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے میں بھی اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

میں دوسرے دن چائے ناشتہ کے بعد کھانے پینے کا سامان ساتھ لیکر مرغابیوں کے شکار کے لئے قریب کی ایک جھیل پر گئے۔ دوسری تیسری شب کو کھانے کے بعد پہلے ایک کھیل میری گورنگ ہوا حلقہ بناکر مرد وزن بیٹھتے ہیں اور ایک ڈوری جس میں ایک انگوٹھی ڈالدیتے ہیں۔ سب پکڑلیتے ہیں بیچ میں ایک لیڈی یا ایک مرد کھڑا ہو جاتا ہے۔ انگوٹھی جو ڈوری میں رہتی ہے۔ ایک شخص اپنے ہاتھ میں چھپا کر جلدی سے اپنے بازو والے کے ہاتھ میں دیتا وہ دوسرے کے ہاتھ میں دیتا وہ تیسرے کے ہاتھ میں جلدی جلدی بڑھاتا جاتا۔ بیچ میں جو کھڑا رہتا ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ جس کے ہاتھ میں انگوٹھی ہے اوسکا ہاتھ معہ انگوٹھی کے پکڑے وہ کہتا یا کہتی ہاتھ کھولو اگر انگوٹھی مل گئی تو وہ چور بنا اور بیچ میں جاکر کھڑا ہوگیا یا کھڑی ہوگئی اگر ہاتھ کھلوانے پر انگوٹھی نہیں ملتی تو پھر دوسرے سے کہتی تم ہاتھ کھولو اس کے ہاتھ کھولنے پر بھی نہیں ملتی بڑی دل لگی ہوتی۔

اس کھیل کے بعد گانے بجانے کی صحبت کچھ دیر ہوتی۔ میں تیسرے دن وہاں سے لارڈ دلیڈی جُنل کا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوا میں نے ڈانس کے سبق ایک استاد پروفیسر جانس سے ایک سال قبل لیے تھے۔ اور پروفیسر مذکور ہر ہفتہ عشرہ اپنے ہاں سنڈریلا ڈانس اپنے شاگردوں سے کرواکر مشق کرواتے تھے۔ جس میں مرد اور عورت دونوں رہتے۔ جب پروفیسر جانس نے اچھی طرح امتحان کرکے دیکھہ لیا تو اجازت اس امر کی دی کہ دوسری جگہ ڈانس میں یا پبلک بال میں ان کے شاگرد شریک ہوں مجھے مسنز موزر جو ایک بڑے سوداگر کی بیوی لندن کے متصل ایلنگ میں رہتی تھیں اپنے ہاں کے ڈانسوں میں شرکت کیلئے مدعو کیا کرتیں۔ اسیطرح مسنز ڈونکن کے ہاں کے ڈانسوں میں میں شریک ہوتا تھا۔ مسنز ڈونکن سوسائٹی لیڈی تھیں ان کے ہاں میوزیکل ایوننگ (ناچ گانے کا شب کا جلسہ) وغیرہ اکثر جاڑوں میں ہوتا رہتا اور ان کے ہاں مہمانوں میں ایرشن لیڈی ارل وکونٹ یعنی پیر طبقہ کے مرد اور ان کی لیڈیاں نیز ہائر مڈل کلاس کے مرد وزن شریک جلسہ ہوا کرتے میں نے کسی مارکوئس اور ڈیوک کو وہاں نہیں دیکھا۔ انگریز سوسائٹی کی بندشوں میں اسقدر جکڑ بند ہیں کہ اسطرح کوئی یورپین قوم میں نہیں ہے

قدیم رومیوں سے انگریزوں نے بہت کچھ لیا اور سیکھا۔ قانون وغیرہ بھی رومن ہوگیا

یعنی اٹلی کے سابق باشندوں سے اخذ کیا عیسائی مذہب رومن کیتھولک وہیں سے آیا بعد کو پروٹسٹنٹ کی بنیاد لوتھر نے ڈالی۔ناول نویسی بھی رومیوں سے سیکھی غرض سابق رومیوں سے بہت کچھ لیا قدیم رومیوں میں سوسائٹی کے صرف دو طبقے پلیوین اور پڑیشین تھے۔ یعنی امرا اور غربا انگریزوں نے بظاہر تین درجے سوسائٹی کے بنائے اپر تن۔مڈل کلاس۔کامنس۔ہائر مڈل کلاس میں برونٹ بھی شامل ہیں۔ بیرن کے نیچے کا درجہ بیرونٹی کا ہے یہ خطاب خاندانی ہوتا ہے۔ یہ لوگ سر کہلاتے ہیں۔

یعنی غربا اس میں بہرحال کی کھال کھینچی اپر ٹن جسکو ہیر کلاس بھی کہتے ہیں۔اس میں چند درجے رکھے۔ بادشاہ کے بعد روائیل ڈیوک یعنی شاہی خاندان کے ڈیوک پھر ڈیوک اس کے بعد مارکوئس پھر کونٹ پھر ارل پھر بیرن مڈل کلاس میں بھی دو درجے قائم کیئے گئے۔ ہائر مڈل کلاس اور لور مڈل کلاس اپر ٹن کے جو مختلف درجوں کے لوگ ہیں وہ آپس میں ملتے جلتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ باہر مڈل کلاس کے بعض اشخاص کو اور بیرونٹ کو جو بہت دولتمند ہوتے ہیں۔ اپنے گروہ میں شامل کر لیتے ہیں ورنہ ڈنر کے موقع پر سوا اپر ٹن کے بعض ہائر مڈل کلاس والوں کے اور کسی کو شریک نہیں کرتے۔غیر ممالک کے لوگوں میں سے خواہ جاپان کے ہوں یا ایران کے یا انڈیا کے جبتک ہم جم نہیں سمجھ لیتے ڈنر پر یا ڈانس میں مدعو نہیں کرتے۔ جن کو اپنے سے ذرا اوترا اور گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ان کو لنچ کی دعوت دیتے ہیں ورنہ صرف چائے کی دعوت پر ٹال دیتے ہیں یہ برتاؤ غیر ملکیوں کے ساتھ ہے اور برطانیہ عظمیٰ کے باشندوں کے ساتھ تو بڑی سختی سے سوسائٹی کے قواعد کی پابندی ہوتی ہے یعنی انکو لنچ اور چائے کی دعوت بھی نہیں دیتے اور نہ ڈانس وغیرہ میں شریک کرتے ہیں۔مڈل کلاس والے اپنے ہم طبقہ لوگوں کو ڈنر اور ڈانس وغیرہ میں شریک کرتے ہیں سوسائٹی کے لوگوں میں سے اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی وہ ایسی حالت میں جبکہ عورت کا زنا کسی غیر مرد سے عدالت میں ثابت کیا جائے یا عورت مرد سے طلاق لے لے یعنی مرد کا زنا کسی عورت سے اور ساتھ ہی اس کے اسکا ظالمانہ برتاؤ عدالت میں ثابت کرے یا عورت مرد سے صرف اس کے ظالمانہ برتاؤ کی بنا پر جوڈیشل سپیریشن یعنی عدالتی تفریق حاصل کرے تو ایسے اشخاص سوسائٹی میں شریک نہیں کئے جاتے۔جسطرح ہندوستان میں جولاہے۔دھنیے کے پنچ لوگ کسی کی بدکرداری پر کسیکو چٹائی باہر کر دیتے اور حقہ پانی بند کر دیتے ہیں۔اس جگہ میں ایک واقعہ لکھتا ہوں۔

ایک واقعہ لکھتا ہوں ایک دن تیسرے پہر کو میں مسٹر موڈو بھائی جی جی بھائی سے جو سر جمشید جی جی جی بھائی بمبئی کے مشہور کروڑپتی پارسی (جنکا جی جی بھائی ہاسپٹل وغیرہ بمبئی میں ہے) کے بھتیجے تھے۔ ملنے گیا یہ بڑے کروفر سے لندن میں رہتے تھے۔ وہاں پہلے سے لارڈ کینو مارا سابق گورنر مدراس جن کے نام کا کینو مارا ہوٹل وغیرہ مدراس میں ہے بیٹھے تھے مجھے موڈو بھائی نے لارڈ کینو مارا سے ملایا تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں اتنے میں ایڈمرل مسٹر وکسن کا کارڈ آیا موڈو بھائی سے لارڈ کینو مارا نے کہا کہ میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کسکا کارڈ ہے موڈو بھائی نے کارڈ ان کے ہاتھ میں دیا کارڈ دیکھتے ہی موڈو بھائی سے لارڈ کینو مارا نے کہا کوئی دوسرا کمرہ بتلاؤ میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھونگا جب تک تم ان سے فراغت کرو میں گھر واپس جاتا مگر دروازہ پر یہ صاحب کھڑے ہوں گے چنانچہ موڈو بھائی سٹنگ روم سے اٹھے اور لارڈ کینو مارا کو ہمراہ لیکر کسی دوسرے کمرہ میں چھوڑ آئے جب وہ لارڈ کینو مارا کو ساتھ لیجانے لگے۔ تو میں نے موڈو بھائی سے کہا کہ اگر تم کو کچھ خانگی باتیں آنے والے صاحب سے کرنی ہیں تو میں بھی لارڈ کینو مارا کے ساتھ چلا جاؤں اور جہاں یہ بیٹھیں گے میں بھی وہیں بیٹھوں گا موڈو بھائی نے کہا تم یہیں بیٹھے رہو جب لارڈ کینو مارا دوسرے کمرے میں چلے گئے تو موڈو بھائی نے نوکرانی سے جو کارڈ لیکر آئی تھی۔ کہا کہ ان کو بلا لو ایڈمرل مسٹر وکسن جب اندر آئے تو مجھے ملایا اور تھوڑی دیر ان سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں کارلٹن کلب کے ضوابط وغیرہ کی نسبت کچھ گفتگو رہی اس کے بعد مسٹر وکسن نے مجھے کہا آپ معاف کیجئے گا یہ کہکر موڈو بھائی کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کی بیلکنی پر ٹہلتے ہوئے گئے۔ اور وہاں کھڑے کھڑے اور آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں اور رخصت ہو کر مجھسے بھی ہاتھ ملاکر واپس چلے گئے۔ موڈو بھائی نے گھنٹی دی نوکرانی آئی اس سے کہا کہ فلاں کمرہ میں جو صاحب بیٹھے ہیں ان کو بلا لو لارڈ کینو مارا مسکراتے ہوئے آئے اور کہا اب میں بھی جاتا ہوں جب کینو مارا جا چکے تو میں نے موڈو بھائی سے دریافت کیا کہ لارڈ کینو مارا کا مسٹر وکسن سے منہ چھپانے کا سبب کیا ہے۔ موڈو بھائی نے کہا تم کو نہیں معلوم یہ سوسائٹی سے نکالے ہوئے ہیں انہوں اپنی بیوی سے یا بیوی نے ان سے طلاق لی ہے۔ دو میں سے کوئی بات ہے اس نقل سے یہ دیکھنا ہے کہ سوسائٹی کی کیا بندشیں ہیں۔ مگر ساتھ ہی اس کے جسطرح سیاسیات میں انگریزوں کا کوئی خاص مقررہ اصول نہیں ہے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ جیسا وقت ویسی بات پر کاربند ہیں۔ تاویلات و تعبیرات سے مطلب براری کرتے ہیں۔ معاشرتی اصول بھی عجیب وغریب ہیں۔ ایکطرف تو یہ ادعا ہے کہ انگریز ڈیموکراٹ ہیں یعنی جمہوریت و مساوات کے

گرویدہ ہیں مگر عمل اس کے خلاف لارڈ ڈیوک کا طبقہ اپنے تئیں ارسٹوکروٹ اول درجہ کا سمجھتا ہے ایک لارڈ صاحب بہادر ایک غریب شریف سے شیک ہینڈ کرنا یعنی (مصافحہ) کرنا ہتک و عار سمجھتے ہیں اور وہی غریب اگر دولتمند ہو جائے اور وزیراعظم پر اثر ڈال کر لارڈ پیر بن جائے یعنی لارڈ تو پھر وہ امرا کے طبقہ میں داخل ہو جائے گا۔

آئے دن ایسی مثالیں پیش آتی رہتی ہیں کہ ایک شخص بسکٹ بناتے بناتے دولتمند ہو گیا یا کوئی شخص چائے کافی کی تجارت کرتے کرتے دولتمند ہو گیا۔ لارڈ بنا دیا گیا۔ کوئی معماری کا پیشہ انجام دیتے دیتے بیرونٹ بنا دیا گیا۔ کوئی تھیٹر میں کھیل تماشہ کرتے کرتے بیرونٹ بنا دیا گیا۔ کوئی انڈیا میں سول سروس میں رہ کر لارڈ بن گیا۔ زیادہ تر تجارت پیشہ اصحاب لارڈ بنائے جاتے ہیں۔ تجارت انگریزوں کے آب و گل میں ہے اس لئے فرانس کا نپولین اعظم انگریزوں کو نیشن آف شوپ کیپرس یعنی بنیوں بقالوں اور دوکانداروں کی قوم کہتا تھا ان کی قومی دولت کا انحصار تجارت پر ہے۔ انڈیا بھی تجارت ہی کے ذریعہ حاصل کیا گیا انگریزوں کی امارت و شرافت جو کچھ بھی ہے پیسے کے اشراف اشرفی والے ہیں۔ طریقہ حکمرانی بھی نرالا ہے جو کسی اور ملک یورپ میں نہیں ہے یعنی کامن ولت اور پارٹی گورنمنٹ ایک طرف شہنشاہی ہے اور دوسری طرف پارلیمنٹ ایک دوسرے کے تضاد جمہوریت ہے گو شہنشاہی برائے نام ہی سہی مگر کروفر شاہانہ ہے آدھا تیتر آدھا بٹیر انگلستان کے بہت سے امرا کل کے بنئے آج کے سیٹھ کے مصداق ہیں۔ لارڈ ریڈنگ وغیرہم میرے دعوے کی دلیلیں ہیں ایک شخص جس کا باپ کیا بنٹ میکری کرتا اور خود بھی جہاز کے تختے دھوتا تھا۔ لاٹ صاحب بنا بیٹھا ہے۔ ہندوستان کے پوتڑوں کے امیروں سے انگلستان کے امرا کو کوئی مناسبت نہیں ہے۔

۱۸۹۴ء کے نیوایرس ڈے ایوننگ ڈنر کی دعوت مجھے مسٹر اور مسز سیمن نے دی تھی مسٹر سیمن کسی تجارتی کمپنی کے شرکا میں اور دولتمند شخص تھے۔ سدر لینڈ ریونیو میں رہتے تھے۔ سر شام حسب خواہش مسز سیمن گے میں ان کے ہاں پہنچا کچھ لیڈیز اور جنٹلمین میرے وہاں جانے سے قبل آچکے تھے اور کچھ بعد آئے۔ میں سب سے ملایا گیا۔ مختصر پارٹی تھی۔ تو دس مہمان ہوں گے قبل ڈنر کھانے کے لیڈیاں ایک طرف بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ اور مرد سو لو کھیلنے لگے یہ گنجفہ کا ایک قسم کا کھیل ہے جسے بازی لگا کر کھیلتے تھے۔ جسطرح بازی لگا کر برج کھیلتے ہیں۔ اُس زمانہ میں برج زیادہ فیشن میں نہیں آیا تھا میں لیڈیوں کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا ٹھیک

آٹھ بجے ڈنر گانگ بجا یعنی کھانے کی گھنٹی دی گئی یہ ایک قسم کا فیملی ڈنر تھا بعد کو معلوم ہوا کہ جو لوگ مہمان تھے کچھ تو مسٹر سیمن کے اور کچھ مسز سیمن کے عزیز و رشتہ دار تھے میں اگرچہ غیر تھا مگر چونکہ مسٹر و مسز سیمن سے اور مجھ سے بہت اتحاد تھا۔ اس لئے خاص طور سے فیملی پارٹی میں شریک کیا گیا تھا۔ پہلے بھی کئی دفعہ میں ان کے ہاں کھا چکا تھا اور میں نے بھی ان لوگوں کی دعوتیں کی تھیں۔ بہر حال کھانے سے فارغ ہونے کے بعد گانا بجانا شروع ہوا۔ دو تین لیڈیوں نے باری باری پیانو بجا کر اون کا ساتھ دیا ایک جنٹلمین نے وائلن بجا کر پیانو کی سنگت کی۔ صدر دروازے مسز سیمن نے خلاف معمول دونوں پٹ کھلے چھوڑ دیے تھے۔ ادھر بارہ بجے گرجوں میں گھنٹے بجنا شروع ہو گئے۔ اور سب نے سال نو مبارک۔ سال نو مبارک کا شور مچایا۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگا اور بہت سے دعائیہ جملے بھی استعمال ہوئے اتنے میں غول کے غول بازاری لوگوں کے ہاتھ اور منہ پر کالک ملے بنجو وغیرہ باجے بجاتے اور گاتے آنا شروع ہوئے جس وقت پہلا غول آیا جو لوگ گا بجا رہے تھے۔ اور جو بیٹھے تھے سب کے سب جلد جلد اٹھے مجھ سے بھی لیڈیوں نے کہا تم بھی آؤ مسٹر مرزا اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں یہ "کل منہے" دروازہ کے اندر پارلر یعنی دالان میں کھڑے گا بجا رہے تھے سب مہمانوں اور میزبانوں نے دس بارہ آدمیوں کے غول کو جو منہ اور ہاتھوں میں ایک کالک مل کر آیا تھا اچھی طرح دیکھا مسز سیمن نے ایک ساورن طلائی سکہ ان لوگوں کو دیا ان لوگوں نے بھی سال نو کی مبارک دی پھر مے گاڈ بلس یو۔ مے گاڈ بلیس یو { May God bless you / May God bless you } دعائیں دے کر رخصت ہوئے۔ مسز سیمن نے حسب معمول صدر دروازہ بند کر دیا۔ اس غول کے بعد یکے بعد دیگرے اور بھی کئی غول اسیطرح ہاتھ پاؤں کالے کئے ہوئے اور گاتے بجاتے ہوئے آئے سڑک پر تھوڑی دیر کھڑے رہ کر گاتے بجاتے مسز سیمن نے نوکرانی کے ہاتھ ہر غول کیلئے کچھ بھیجا ایک بجے کے بعد صحبت برخاست ہوئی اور مہمان اپنے اپنے گھر گئے کئی روز کے بعد مسز سیمن سے جب ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں میرے استفسار پر معلوم ہوا کہ صدر دروازہ سال نو کے آغاز کے قبل جو کھلا رکھا گیا تھا اس کے دو اسباب تھے ایک تو یہ کہ سال شروع ہوتے ہی خوش بختی گھر میں آئے انگریزی کا یہ جملہ انہوں نے کہا۔ گڈ لک مے کم ان (Goodluck may come in) اور سال بھر خوشیاں دیکھیں اور سارا سال بختاور ہو۔ دوسرا سبب یہ کہ کالے منہ کے گانے بجانے والوں کا غول اندر فوراً داخل ہو سکے۔ اور ہم لوگ ان کے کالے چہروں پر نظر ڈالیں۔ قبل اس کے کہ سال شروع ہوتے ہی کسی اور چیز پر نظر پڑے۔ ایسے وقت

کالا چہرہ دیکھنا بہت مبارک ہوتا ہے ۔ یہ باتیں توہمات کی لیلیں ہیں ۔ جسطرح انڈیا میں ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ دیوالی کی شب کو لچھمی دولت کی دیوتا آتی ہے ۔ علی قدر حیثیت مکان صاف ستھرا و آراستہ رکھتے ہیں اور دروازے کھلے رکھتے ہیں کہ لچھمی داخل ہو ۔

انگلستان کے لوگ بھی توہمات میں مبتلا ہیں ۔ مثلاً کمرہ کے اندر چھتری نہیں کھولنی چاہیئے راستہ چلتے وقت اگر کوئی چھتری لگائے آرہا ہے اور ایسا کوئی ملگیا جس کا بوسہ لے ۔ ضروری ہے مثلاً بیوی کا بچوں کا عزیز قریب اور گہرے دوست کا تو چھتری ہٹا کر بوسہ لیں گے ۔ راستہ میں نعل اسپ ملجائے تو بہت مبارک ہے غیب سے دولت ہاتھ آتی ہے ۔ جسطرح بعض ہندی عورتوں کا خیال ہے کہ سونا یا سونے کی چیز پڑی ملجائے تو بہت مبارک ہے غیب سے دولت ہاتھ آتی ہے ۔ جسطرح بعض ہندی عورتوں کا خیال ہے کہ سونا یا سونےکی چیز پڑی ملجائے تو بہت مبارک ہے اور سونا کھو جائے تو نحوست آتی ہے ۔ انگلستان کی عورتوں میں بھی بہت وہم ہے ۔ کوئی کیسکو چاقو یا قینچی سوغات کے طور پر دے تو لینے والا ایک پینی (پیسہ) دیتا ہے ۔ ایک قوم جپسی کہلاتی ہے یہ خانہ بدوش ہوتی ہے ۔ خاص خاص سڑکوں پر ایک پنجرہ میں طوطا لئے ہوئے ایک جپسی عورت کھڑی رہتی ہے اور راہ رو عورتیں اس سے اپنے نصیب کے حالات دریافت کرکے کچھ پیسے دیتی ہیں ۔

ہر ملک کے شہر و دیہات کے لوگوں میں فرق ہوتا ہے ۔ دیہاتی لوگوں کے خیالات تنگ اور معلومات محدود کیونکہ شہری لوگوں کی طرح ان کو وہ مواقع و اسباب وسیع النظری اور اضافہ معلومات کے میسر نہیں ہیں اس لئے بمقابلہ شہریوں کے جاہل و بیوقوف ہوتے ہیں ۔ مولانا روم فرماتے ہیں

دہ مرو دہ مرد را احمق کند　　　عقل را بے نور و بے رونق کند

اکثر مسلمانوں کے لڑکے کمسنی میں انگلستان جو بھیجے جاتے ہیں وہ عموماً اسلام اور تاریخ اسلام سے بے خبر اور مذہبی معتقدات سے لاعلم ہوتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مادہ پرست بن جاتے ہیں ۔ دہریت آجاتی ہے ۔ انکا قول ہے کہ خدا اور رسول خود انسانوں کے پیدا کیئے ہوئے الفاظ ہیں ۔ ڈرپوک پنے کی علامت ہے ۔ جہالت کا نتیجہ ہے اس قسم کے خیالات زمانہ حال کے طلبا میں جو واپس آتے ہیں زیادہ تر پائے جاتے ہیں ۔

میرے زمانہ طالب العلمی میں ہندی طلبا ہندو اور مسلمان دونوں ملاکر بہت کم تھے ۔ اس پر بھی میں نے بعض مسلمان لڑکوں کو مذہب سے بہت بیگانہ پایا یہ لوگ اپنے زمانہ اقامت انگلستان میں ایسی تصنیفات و تالیفات پڑھتے ہیں جن میں اسلام کی نسبت زہر اگلا گیا ہے ۔

مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر دو واقعات میں اپنے چشم دید لکھتا ہوں۔

ہر انس آف کورٹ کے ڈائننگ ہال میں بہت سے مس بنائے جاتے ہیں یعنی بیچ میں ایک چھوٹا سا میز اور اردگرد چار کرسیاں اس طرح کی متعدد قطاریں بہت لمبی لمبی ہوتی ہیں تاکہ سینکڑوں طلبا بیک وقت کھا سکیں علاوہ طلبا کے بہت سے بیرسٹر بھی شریک ہوتے ہیں ڈائیس پر کئی لمبی میزیں رہتی ہیں جس پر بنچرس بیٹھ کر کھاتے ہیں بنچروں کے ہاتھوں میں انس آف کورٹ کی عنان انتظامات رہتی ہے۔ کسی ایک کرسی پر جو پہلے جاکر بیٹھ جاتا ہے اس کو کپتان کہتے ہیں۔ جب کھانے کے کورس آنا شروع ہوتے ہیں تو پہلے کپتان کے سامنے آتے ہیں، اس کے لینے کے بعد جو اس کے دہنے ہاتھ کی طرف رہتا ہے۔ اس کے سامنے آتا ہے پھر اس کے بعد والے کے پاس پھر اس کے بعد والے کے پاس اسطرح ہر ایک کورس آتا رہتا ہے سب سے پہلے سوپ یعنی شوربا آتا ہے تو سوپ پلیٹ پہلے کپتان کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد مذکورالصدر ترتیب سے مختلف کھانے پیش کئے جاتے ہیں۔ کپتان بننے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز ایسی آئی جو پلیٹوں میں رکھ کر ہر ایک کیلئے علیحدہ علیحدہ نہیں لائی گئی۔ بلکہ ایک بڑی مشقاب میں ایک لگ آف مٹن روسٹ کیا ہوا لایا گیا۔ یعنی بکرے کی پوری ٹانگ کا کباب آیا تو کپتان اپنے حسب دلخواہ جو حصہ اچھا سمجھتا ہے وہ کاٹ لیتا ہے۔

ایک شب کا ذکر ہے کہ میں پہلے سے پہنچنے کی وجہ سے کپتان بنا تھا۔ اس میز پر میرے سوا تین آدمی اور تھے جس میں ایک انگریز عیسائی ایک بنگالی ہندو اور ایک مسلمان مسلمان صاحب چاٹ گام بنگالہ کے رہنے والے تھے اُن کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ سوپ کے بعد ایک مشقاب میں پورک روسٹ آیا یعنی سور کا کباب آیا۔ اور حسب قاعدہ پہلے میرے سامنے ویٹر لایا میں نے کہا نو تھینکس یعنے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ پھر وہ ویٹر بقیہ تینوں اصحاب کے پاس یکے بعد دیگرے لے گیا اور سب ہی نے لیا مسلمان صاحب نے بھی لیا۔ بنگالی نے بھی لیا۔ تیسرا تو انگریز ہی تھا۔ بنگالی کے لے نے پر میں متعجب نہیں ہوا کیونکہ ہندو جو انڈیا سے جاتے ہیں باستثنے بعض کے سب سور کھاتے ہیں اور باستثنے بعض کے گائے بھی سب کھاتے ہیں۔ اور خوب مزے لے لیکر کھاتے ہیں۔ میں نے بہت سے ہندوں کو کہتے سنا کہ انگلش بیف انگلستان کی گائے کے گوشت سے بڑھکر مزیدار کوئی چیز نہیں ہے۔ یہی حضرات انڈیا میں آکر مسلمانوں کے مقابلہ میں ہنگامے مچاتے ہیں۔ مسلمان صاحب نے جو

سور لیا تو میں نے ان کی طرف غصہ اور استعجاب کی نظروں سے دیکھا وہ بھانپ گئے اور مجھ سے بولے
کہ تم نے پورک نہیں لیا بڑا مزیدار گوشت ہوتا ہے خیر یہاں تک تو مضائقہ نہیں ۔ ایک شخص کا
شخصی خیال ہے مگر بعد والے جملہ نے مجھے برانگیختہ کیا جب اس نے یہ کہا کہ مسلمانوں کے
پیغمبر محمدؐ کو (معاذ اللہ) جو بقول مسلمانوں کے جاہل محض تھے کیا معلوم تھا کہ یورپ میں سوروں کی
غذا کیرٹ اور ٹرنپ ہے یعنی گاجر اور شلجم ہے ۔ انہوں نے دیکھا ہوگا کہ عربستان میں سور غلیظ چیزیں کھاتے ہیں
اس لئے ممنوع قرار دیا ۔ اس شخص کا یہ کہنا تھا کہ میں بے قابو ہو گیا رگ ہاشمی جوش میں آ گئی ۔
اور بیتابانہ طور سے اپنی کرسی سے اٹھ کر انہیں ایک گھونسا رسید کر کے کرسی سے گرا دیا ۔ اٹھ کر
اس نے مجھے بھی مارا ۔ اتنے میں میرے مس پر اور برابر والے مس پر جو لوگ تھے انہوں نے بیچ بچاؤ
کیا میرے منہ سے کف جاری تھا اور مثل بید سارا جسم لرزاں تھا ۔ سارے ہال میں ہنگامہ مچ گیا
بعض ٹیچر بھی اٹھ کر آئے اور کہا ان دونوں کو باہر لے جاؤ اور علیحدہ علیحدہ رکھو تھوڑی دیر کے بعد
الگ الگ جانے دو ۔ ٹیچروں نے انتظامی دریافت کیلئے تاریخ مقرر کر کے طلب نامے ہم دونوں
کے پاس بھیجے میں نے اپنی صفائی میں اپنے مس کے انگریز اور بنگالی کو پیش کیا ان دونوں نے
جو واقعہ تھا بیان کیا اور بنگالی نے جس کا نام چیٹرجی تھا کہا کہ مسلمان من حیثیت القوم درحقیقت
سور کو بہت برا سمجھتے ہیں ۔ جو جملہ مسٹر رحمان نے کہا مسٹر مرزا سے بہت مشتعل ہوئے ۔ عبدالرحمان کو
یہ سزا دی گئی کہ ایک سال کیلئے معطل کئے گئے ۔ اور خوب سرزنش کی گئی اور نوٹس بورڈ پر اس
مضمون کی نوٹس لگائی گئی کہ آئندہ کوئی شخص ڈائننگ ہال میں کسی مذہب کے خلاف کوئی
گفتگو نہ کرے ورنہ سخت باز پرس ہوگی دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن مسٹر مجید اللہ خان برادر خرد
حمید اللہ خان مخاطب بہ سربلند جنگ مرحوم سابق چیف جسٹس حیدرآباد ہائیکورٹ نے چند دوستوں کی
چائے کی دعوت اپنے مکان موقوعہ گاور اسٹریٹ میں کی گنتی کے چار پانچ اشخاص تھے ۔ دو اشخاص
میرے مخلصان خاص بھی تھے ۔

شیخ فخر الدین حسین لکھنوی مرحوم برادر عم زاد شیخ مہدی حسین مخاطب بہ فتح نواز جنگ سابق
ہوم سکریٹری حیدرآباد و محمد اسمعیل خان میرٹھ کے رہنے والے تھے ۔ جن کے انتقال کو چند سال ہوئے ۔
دلی میں پریکٹس کر رہے تھے ۔ علاوہ ان کے دو صاحب اور تھے مصطفےٰ حسین کاکوری کے رہنے
والے تھے اور احمد اللہ صاحب بریلی یا بانس بریلی کے رہنے والے تھے ۔ ان دونوں آخر الذکر اشخاص سے
بھی مجھ سے شناسائی تھی جب دو چار ہندی کہیں جمع ہو جاتے تو کبھی انگریزی میں گٹ پٹ کرتے

کبھی اردو میں بشرطیکہ اردو سے بلد ہوتے یا اردو میں انگریزی الفاظ ملاکر بولتے۔ یہاں سب اردو دان اور انگریزی دان تھے۔ حسب معمول دونوں زبانوں میں گفتگو مختلف مباحث و موضوع پر ہورہی تھی کسی نے اسلام کے متعلق ہی گفتگو شروع کی مجھے پوری تفصیل تو اسوقت یاد نہیں ہے۔ کسی نے اسلام کی خوبیاں بیان کیں کسی نے کچھ برائیاں بیان کیں میاں احمد اللہ اسلام کے بہت باغی دکھائی دیئے اور یہ کہا کہ بانی اسلام نے خدا کی وہ تصویر کھینچی ہے جس طرح سے کسی ڈسپاٹ رولر کی ہو۔ یعنی خودسر فرمان روا (معاذاللہ) اور پھر ذری بات میں اللہ میاں خوش ہوجاتے اور توبہ کرنے سے گناہ بخش دیتے ہیں۔ غفور الرحیم کہلاتے ہیں۔ ذرے سے میں بگڑ جاتے ہیں اور جبار و قہار بن جاتے ہیں معشوق مزاج بھی ہیں گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ مسلمانوں کے خدانے عجیب جنت و دوزخ بنائی ہے سزا و جزا کا وہی طریقہ رکھا ہے جو کسی مشرقی بادشاہ کا ہوتا ہے اور وہ ڈسپاٹ بھی ہوتا ہے۔ مگر مسلمانوں کے اللہ میاں ڈسپاٹ بھی ایسے کہ زار روس کی بھی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اسکا جواب میں نے اور فخر الدین حسین نے خوب مسکت و معقول دیا مگر وہ شخص کہاں ماننے والا تھا۔ اس نے ایک جملہ ایسا کہا کہ تن بدن میں سننے والوں کے آگ لگ گئی نعوذباللہ نقل کفر کفر نباشد۔ وہ جملہ تھا آئی کیک دی گاڈ آف محمد (I Kich the God of mohammad)

(معاذاللہ) "محمد کے خدا کو میں لات مارتا ہوں" یہ کہنا ہی تھا کہ اسمعیل خان مرحوم جو بہت جوشیلے مسلمان تھے اور ہم سب میں مضبوط تگڑے اور قدآور بھی تھے یہ کہکر میری لات تو تم لے لو زور سے ایک لات میاں احمد اللہ کو رسید کی وہ منہنی آدمی تھے خوب مار کھائی تھوڑی دیر ہم لوگوں نے تماشا دیکھ کر اپنے دوں کا بخار نکالا پھر بیچ بچاؤ کیا۔ اسوقت سے یہ سمجھ کر میں نے احمد اللہ سے ملنا چھوڑ دیا کہ یہ شخص ملعون درجہ اول کا ہے۔ یہ تو ایسی دو مثالیں تھیں جو میرے روبرو پیش آئی تھیں اور بھی خدا کے سنوارے راندۂ درگاہ ربانی جن پر اللہ و رسول کی پھٹکار ہے۔ بعض مسلمانوں کی اولادیں ہامان و نمرود و شداد سے کم نہیں جو طرح طرح کی نکتہ چینیاں اسلام پر کرتے رہتے ہیں اور اب تو ایسی ذہنیت اور خیالات والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ جو خدا رسول کو پہچاننے تک نہیں خدا کا نام لینا اور اس پر اعتقاد رکھنا جہالت سمجھتے ہیں۔ بقول مولانا اکبر الہ آبادی مرحوم۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں ؛ کہ اکبرؔ ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانہ میں

کسقدر افسوس ناک امر ہے کہ ہزاروں روپے صرف کرکے مسلمان اپنا مذہب خراب کرتے ہیں۔

بعض لڑکوں کے والدین جائدادیں فروخت کرکے یا قرض دام کرکے اپنی اولاد کو یورپ اس خیال و اُمید سے بھیجتے ہیں کہ لڑکا یورپ جاکر اعلیٰ تعلیم پائے گا۔ دولت پیدا کرے گا۔ عزت و آبرو حاصل کرے گا۔ اپنی ذات و وجود سے ملک وملت کو فائدہ پہنچائیگا مسلمان من حیثیت القوم اس پر نازاں ہوں گے اُس پر فخر کریں گے مگر یہاں تو حساب ہی اُلٹا ہے ایسے لڑکوں سے ساری اُمیدیں خاک میں ملجاتی ہیں اسلام کو بعوض فائدہ کے نقصان عظیم ہوتا ہے۔ بعض صاحبزادگان پست اقبال جو شہر یا شہری اپنے تئیں مسلمان کہتے بھی تو ان کا زاویہ نگاہ یہ ہوتا ہے۔ آئی ایم فرسٹ انڈین دِن محمڈن (I am first Indian then mohammadan)
پہلے میں ہندی ہوں بعد کو مسلمان تصریح یہ ہوتی ہے کہ میں مسلم خاندان میں پیدا ہوا اس لئے بلحاظ کمیونٹی کے مسلمان ہوں اور قومیت کے لحاظ سے انڈین ہوں وہ اپنے تئیں نیشنلسٹ کہتے ہیں۔ مغربی نقطہ نظر سے قوم کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ جس طرح کل فرانس کے باشندہ خواہ یہود ہوں خواہ نصاریٰ سب فرنچ میں ہیں کل انگلستان کے باشندے خواہ کسی مذہب کے ہوں چونکہ ایک ہی ملک میں وہ اور ان کے والدین پیدا ہوئے اس لحاظ سے سارے باشندے انگلش میں ہیں بنابراں انڈیا کے باشندے خواہ کسی کمیونٹی کے ہوں کل انڈین ہیں اور ایک قوم ہیں میرے خیال میں فرانس یا یورپ کے کسی اور ملک کی تمثیل انڈیا پر صادق نہیں آسکتی فرانس میں کل باشندے عیسائی رومن کیتھولک ہیں۔ مٹھی بھر یہودی بھی ہیں انگلستان کے کل باشندے عیسائی پروٹسٹنٹ ہیں اور آٹے میں نمک کے برابر یہودی ہیں بجز فرق مذہب کے یہودیوں یا نصاریٰ ایک ہی زبان بولتے ہیں ایک ہی لباس رکھتے ہیں ایک ہی طرز معاشرت ایک ہی قسم کی غذا، معیار اور تعلیم بھی برابر برابر ہے۔

آسٹریا، پرشیا ہنگری جرمنی، فرانس و اٹلی وغیرہ کل ممالک ملاکر کانٹننٹ کہلاتا ہے۔ وسعت ارض کے لحاظ سے انڈیا کے ایک گوشہ میں اٹلی یا فرانس کا ملک سما سکتا ہے انڈیا کا ایک ایک پراونس (صوبہ) فرانس یا اٹلی سے بڑا ہے سارے انڈیا کی کوئی واحد یا عام زبان نہیں ہے کسی صوبہ میں عام طور سے گجراتی بولی جاتی ہے کسی میں بنگالہ کسی میں مرہٹی تو کسی میں پنجابی کہیں کنڑی کہیں اردو کسی جگہ تلگو کہیں اوڑیا البتہ اردو تمام عرض وطول ہند میں سب زبانوں سے زیادہ بولی و سمجھی جاتی ہے۔ یہ تو زبانوں کا اختلاف ہوا۔ اب مذاہب کو لیجئے یوں تو بظاہر پانچ مذاہب کے لوگ ہیں۔ ہندو، مسلمان عیسائی، پارسی، اور کچھ یہودی مگر ہندوں میں اور مسلمانوں میں تفریق در تفریق ہے۔ ہندوں میں

جینی۔ وشنو۔ سب بت پرست ہیں۔ بودھ مت والے نہ ادہر کے نہ اُدھر کے نہ خدا کے قائل نہ منکر تقریباً سو سال سے برہمو سماج اور پچاس ساٹھ سال سے آریہ سماج والے ظہور میں آئے ہیں۔ جو بت پرست نہیں ہیں، اور خدا کو مانتے ہیں اسلامی نظریہ توحید سے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ پھر ہندوں میں آپس میں کٹم کٹا جوتم پٹی چلتی رہی ہے۔ آئے دن کے جھگڑے سناتن دھرمیوں اور آریوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ علاوہ ان کے بھیل ہیں سونتال دروید ین ہیں۔ ڈھیڑ، چمار مانگ جن کو لقب دو چار سال سے ادی ہندوں کا دیا گیا۔ اور ہندوؤں میں شمار کیا جاتا ہے مختلف صوبوں کے باشندوں کے زبانیں جدا۔ لباس میں فرق طرز معاشرت میں اختلاف غرض کسی بات میں آپس میں متحد نہیں۔

یہ تو ہندوں کا حال ہوا۔ مسلمانوں کو لیجئے دو بڑے گروہ سنی اور شیعہ اثنا عشری کے ہیں۔ اثنا عشری وہ ہیں جو کلام خدا کی اور رسول کے قول و فعل کی پیروی۔ حضرت علیؑ اسد اللہ غالب کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتے ہیں۔ گیارہ بارہ کروڑ اثنا عشری شیعہ خواہ کسی ملک کے باشندے ہوں عراق کے یا ایران کے یا انڈیا وغیرہ کے سب کے معتقدات ایک ہی ہیں شیعوں کو چھوڑ کر اہل تسنن میں متعدد فرقے ہیں۔ حنفی۔ مالکی۔ حنبلی۔ شافعی۔ وہابی۔ اہل حدیث سہروردیہ قادریہ۔ چشتیہ اور خدا جانے کیا کیا ہیں۔ جنکی نسبت حافظ فرماتے ہیں۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ٭ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

صرف یہی نہیں بہتر تہتر فرقے ہیں بلکہ ایک ہی مسئلہ کے متعلق امام ابوحنیفہ کچھ کہتے ہیں اور شافعی کچھ کہتے ہیں۔ وہابیوں میں اور حنفیوں میں مخالفت و مخاصمت بیحد ہے اسیطرح دوسرے فرقہ والوں میں باہمی نفاق ہے۔ چالیس پچاس سال ہوئے غلام احمد حنفی المذہب نے ایک اور فرقہ احمدیوں کا پیدا کیا یہ ساری فرقہ بندیاں حدیث الثقلین پر عمل نہ کرنے سے ہوئی ہیں۔ حدیث الثقلین یہ ہے۔ رسولِ پاک نے فرمایا ہم دو چیزیں تمہارے لئے چھوڑے جاتے ہیں۔ کتاب اللہ۔ اور اپنی اولاد ان دونوں سے متمسک رہو۔ چنانچہ جملہ اثنا عشری شیعہ گیارہ بارہ کروڑ جو دنیا میں ہیں حدیث الثقلین پر کاربند ہیں اسلئے شیعوں میں فرقہ بندیاں نہیں ہیں۔ کلام پاک میں فرقہ بندی کو بہت برا سمجھا گیا ہے۔

غرض باشندگان ہند متعدد مذاہب اور فرقوں پر منقسم ہیں ایسی حالت میں فرانس یا انگلستان کی نظیر ہندوستان پر کسطرح منطبق ہوسکتی ہے تیس بتیس کروڑ مخلوق خدا جن میں باہمی

اس درجہ اختلافات گوناگوں ہوں کیونکر ایک قوم بن سکتی ہے۔ یا ان پر ایک قوم کی تعریف صادق آسکتی ہے۔ اس سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ آپس میں کلمہ گویان رسول مقبول باہمی لڑیں جھگڑیں مناقشے کریں یا ہمسایہ قوموں سے برسر پرخاش ہوں بلکہ جہاں تک ہو اتحاد باہمی سے کام لیں۔ عیسیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود۔

خدانے فرقہ بندی کو بُرا کہا ہے ساتھ ہی اس کے ایک قوم ہو جانا امر بیت مشکل و کار بیت دشوار یورپ کی تعلیم کے بعد جو لڑکے لامذہب بنکر آتے ہیں اُس میں اُن کا کوئی قصور نہیں ہے ان کے والدین اور کویوں کا سراسر قصور ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اول تو اچھی تربیت نہیں دیتے ان کی اُٹھان درست نہیں ہوتی۔ لاکھ اعلیٰ تعلیم ہو گر اچھی تربیت کے بغیر علم بے کار ہے۔ اور جو زمانہ تربیت کا ہے اسوقت سے مذہبی تعلیم دینی چاہیئے۔ اسلام کی تعریف اور خوبیاں دلنشین کرانی چاہیئے صوم وصلواۃ کا پابند بنانا چاہیئے۔ پھر اُن پر یورپ کی مادہ پرستی اور دہریت کا ہرگز کوئی اثر نہیں ہوگا۔ مسلمان عورتیں جب تک تعلیم یافتہ نہ ہوں گی۔ بچوں کی تربیت درست نہیں ہوسکتی۔ لڑکیوں کو جو آیندہ مائیں بننے والی ہیں مذہبی تعلیم دی جائے۔ نپولین سے کسی نے پوچھا کہ تمہاری ترقی کا راز کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ میری ماں نے جو مجھے تربیت دی۔

میرے زمانہ اقامت انگلستان میں جہاں بعض مسلمان لڑکے لامذہب ہو گئے تھے وہاں برعکس ان کے بعض جید اور پکے مسلمان بھی تھے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جن کو بچپنے سے مذہبی تعلیم دی گئی تھی اور مئے حُب اہلبیت اطہار انکو گھٹی میں پلائی گئی تھی جس نے دامن اہلبیت مضبوطی سے پکڑا اس کا بیڑا دونوں جہاں میں پار اور شیطانی ولولے ہرگز کارگر نہیں ہوسکتے۔ بقول سعدی

دعا میکنم ردکنی ور قبول ؍ من و دست و دامان آل رسول

یہ جو کچھ میں نے لکھا کسی تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر حوالہ قلم کیا ہے۔ چار سالہ مدت قیام انگلستان میں یوں تو بہت سے انگریزوں اور انگریزنوں سے شناسائی ہو گئی تھی مگر چند خاندان ایسے تھے جن سے خصوصیت کے ساتھ بہت ربط واتحاد دوستانہ مخلصانہ ہوگیا تھا جیسے مسٹر و مسز سیمن ڈاکٹر اور مسز ووکن لارڈ و لیڈی جبل مسٹر و مسز موزر وغیرہم علاوہ ان کے ایک خاندان آیرلینڈ کا تھا۔ مسز آئرلنڈ مسن خاتون تھیں اور بیوہ تھیں ان کی دو لڑکیاں مس جینی آئرلنڈ اور مس سسی آئرلنڈ یہ دونوں نہایت حسین اور تعلیم یافتہ

خوش خلق خوش مزاج۔ ان کا ایک بھائی مسٹر آرتھر آئرلنڈ نوجوان اور حسین لڑکا تھا، روائیل نیوی میں زیر تعلیم تھا یہ لوگ لندن کے سبرب اکیشیا گروو میں رہتے تھے آرتھر کے والد کہیں کے جج تھے۔ اور کافی دولت چھوڑ گئے تھے کیونکہ یہ لوگ اچھے ساز و سامان سے رہتے تھے مکان بھی خاصہ بڑا تھا جس میں چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا اور اندرونی حصہ کی سجاوٹ اور آراستگی میں عمدہ مذاق نمایاں تھا ان لوگوں سے مجھ سے گہرے مراسم تھے ہم بھی ان کو علاوہ کرسمس اور نیو ایرس تحفوں کے یوں بھی تحفے تحایف دیتے رہتے تھے اور مسز آئرلنڈ بھی مجھے تحائف بھیجتی رہتی تھیں۔ اسطرح فریقین ایک دوسرے کی دعوتیں بھی کرتے تھے گھر میں کھانے میں رہتا تھا کہ سارے گھر کی دعوت کرنی پڑتی تھی۔ اور پھر کسی ہوٹل میں دعوت دینی ہوتی تھی۔ بعض دفعہ بعد ڈنر کے ان لوگوں کو کسی تھیٹر میں لیجانا پڑتا اور تھیٹر میں بھی یا تو پورا باکس لینا پڑتا۔ یا ڈائس سرکل کے ٹکٹ لینے پڑتے باکس اگر لینا ہوتا خواہ اس خاندان کیلئے یا اور چند دوستوں کیلئے تو صبح ہی کو جاکر باکس کے بلحاظ تعداد نشست قیمت دینی پڑتی یا ڈریس سرکل کے ٹکٹ لینے ہوتے چند یا کم سے کم دو ایک اپنے لئے اور ایک جس دوست کو لیجانا مقصود ہوتا اس کے لئے قیمت صبح کو دیکر ٹکٹ خرید لینے سے آسانی ہوتی بعض کھیل جو محبوب و مقبول ہوجاتے تو دروازہ پر شام کو وہاں ٹکٹ ملنا مشکل ہوتا بعض ملیے یعنے کھیل کی مقبولیت کا پتہ اس سے چلتا تھا کہ ایک ہی کھیل کسی تھیٹر میں ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سال روز آنہ ہوتا اور لوگ دیکھنے سے اکتاتے نہیں۔ برعکس اس کے انڈیا میں تماشہ بین چاہتے ہیں کہ کوئی شو یا ملیے دوسرے یا تیسرے دن بدل دیا جائے اس زمانہ میں سینو میٹو گراف یا سینما ایجاد نہیں ہوا تھا ڈرامہ یا۔ اوپریک ڈرامہ یا اپرا۔ یا ورائٹی انٹرٹین منٹ تھیٹروں میں ہوتا تھا یا میوزک ہال میں ناچ گانا ایک مقام لندن کے قریب اولم پیا تھا۔ ہر سال وہاں کوئی نہ کوئی شہر دکھایا جاتا تھا۔ مثلاً شہر وینس اٹلی کا ایک بندرگاہ بناکر دکھایا گیا یعنی جسطرح اس شہر میں سڑکوں کے عوض نہریں ذریعہ آمد و رفت ہیں اور جا بجا پل بنے ہوئے ہیں اور نہروں میں گنڈولے (قسم کشتی) چلنے اور لوگوں کو یہاں سے وہاں لیجاتے ہیں بالکل ویسا ہی بنایا تھا۔ اور کچھ تو اٹلی کے لوگ زن و مرد اپنے ولیسی کے کپڑوں میں دوکانیں لگائے دکھائی دیتے اور بعض انگریز انگریزنوں کو اسی وضع کا لباس پہناکر دوکانوں پر بٹھایا تھا۔ گنڈولے چلانے والے بھی انگریز اٹیلین لباسوں میں ہوتے غرض ایسا معلوم ہوتا کہ وینس شہر میں کوئی آگیا ایک سال قسطنطنیہ بناکر دکھایا۔ انگریزی مرد و زن کو ترکی لباس پہنایا گیا تھا۔ دوکانیں اور قہوہ خانے وغیرہ

مثل قسطنطنیہ کے بنائے تھے اس قسم کے تماشہ گاہ سبق آموز بھی تھے۔ انگریز اور انگریزنیں گھر بیٹھے غیر ممالک کے شہروں کو دیکھ لیتیں معلومات میں وسعت پیدا ہوتی جب تک میں انگلستان میں رہا ہر سال ایک نیا شہر اولمپیا میں دکھایا گیا۔ ایک سال امریکہ کے ویسٹ انڈیز کا ایک شہر دکھایا گیا اور وہاں سے جنگلی آدمی چند مرد اور عورتیں لائی گئی تھیں۔ وہ اپنے ننگے لباس پیرہن وار میں پھر تے اور اپنی دیسی بولی آپس میں بولتے رہتے جو کوئی کچھ نہیں سمجھ سکتا ویسٹ انڈیز کے جنگلی لوگ عجیب و غریب مخلوق خدا ہیں۔ مسز آئرلنڈ کا ذکر کرتے کرتے میں کہاں سے کہاں پہنچا۔

مسز آئرلنڈ کے ہاں ایک دفعہ لنچ میں میں مدعو تھا اور بھی چار پانچ لیڈی اور جنٹلمین تھے اون میں بڑی شخصیت سر جان لیبک کی تھی اُن کا شمار مشاہیر عالم میں تھا۔ ان کی تصنیفات دنیا کی حالت قبل تہذیب و تمدن کے کیا تھی وغیرہ وغیرہ بہت نایاب و لاجواب کتابیں ہیں۔ عالیخاندان بھی تھے اور بعد کو لارڈ آوری کا خطاب پایا ان سے اور اونرایبل جیمس آئرلنڈ آنجہانی سے اور ان کی بیوہ سے بہت ربط تھا۔ لارڈ آوری کی بیٹی مسز ایم۔ ای۔ گرنٹ ڈف کے بیٹے کرنل ڈف کی بیوی بعد کو ہوئی تھیں۔ انگلستان کے دوسرے سفر میں بھی ان بیوی سے جو اسوقت بیوہ ہو چکی تھیں۔ جنگ عظیم میں ان کے خاوند بھی مارے گئے تھے۔ میری اہلیہ سے اور مجھ سے اچھی خاصی ملاقات ہو گئی تھی اونہوں نے ہم لوگوں کی دعوت بھی کی تھی اور ایک کتاب اپنی تالیف جو اپنے والد لارڈ آوری کے حالات کے متعلق لکھی تھی۔ میری بیوی کو تحفتہً دی تھی اپنے ہاتھ سے محبت آمیز عبارت لکھ کر دی تھی جو میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ غرض سر جان لیبک سے مسز آئرلنڈ نے میرا تعارف کرایا اور جب اُن کا نام سر جان لیبک لیا تو میں دل میں بیحد خوش ہوا کیونکہ ان کا نام سُنتا اور اور اخباروں میں دیکھتا تھا۔ کھانے کے وقت انکی عالمانہ گفتگو نہایت دلچسپ و بصیرت افروز تھی مجھ سے سر جان نے چلتے وقت کہا کہ میں آپ کی گفتگو سے بہت خوش ہوا جب کبھی آپ کو فرصت ہو آپ آکر مجھ سے مل سکتے ہیں یہ کہکر وزیٹنگ کارڈ کارڈ کیس میں سے نکال کر دیا میں نے بھی اپنے نام کا کارڈ ان کو دیا۔

ایسٹ بون

١٨٩٣ء کی گرمیوں میں میں کچھ دنوں کیلئے بغرض تبدیل آب و ہوا ایسٹ بون گیا اور حسن اتفاق سے میں نے محلہ لیسلاز ٹیرس نمبر ١٢ والے مکان کے نیچے کے حصہ میں چند کمرے بکرایہ لئے اوپر کا حصہ پورا مسز اسٹوورٹ نے پہلے سے لے لیا تھا۔ خود مسز اسٹوورٹ لیڈی بیلی اور اون کا چھوٹا لڑکا جو اسوقت چودہ پندرہ سال کا تھا۔ اور وہی لڑکا

جب سر اسٹوورٹ کے بھتیجے سر چارلس بیلی رزیڈنٹ ہو کر حیدرآباد ۱۹۰۵ء میں آئے تو سر چارلس کا پرسنل اسسٹنٹ تھا فوج میں داخل ہو چکا تھا۔ لفٹنٹ تھا۔ سر اسٹوورٹ اس زمانہ میں انڈیا آفس میں پولٹیکل سکرٹری تھے روزانہ بذریعہ ٹرین ونزر آتے جاتے تھے۔ لیکن ہر ہفتہ کو جب ایسٹ بورن آتے تو اتوار کو یہیں رہتے بروز دوشنبہ صبح کی ٹرین سے جاتے اتوار کے دن ان سے ملنے اور بات چیت کرنے کا مجھے موقع ملتا۔

یورپ کے اکثر ملکوں کا یہ دستور ہے کہ گرمیوں میں امیر و غریب متوسط ہر طبقہ کے لوگ تبدیل آب و ہوا کیلئے اپنا مستقر چھوڑ کر کسی دیہات میں یا سمندر کے کنارہ کے شہر میں آرام لینے اور تبدیل آب و ہوا کیلئے کم سے کم دو تین ہفتہ جا کر ضرور رہتے ہیں تاکہ صحت درست رہے اور سال بھر اچھی طرح دماغی و جسمانی محنت کر سکیں وہاں کا عام دستور ہے اور اچھا اصول ہے اس وجہ سے سر اسٹوورٹ اس دفعہ کی گرمیوں میں ایسٹ بورن آکر رہ گئے تھے۔ میں وہاں تین ہفتہ رہا اس کے بعد لندن آیا چونکہ چھٹیاں باقی تھیں لکچر موقوف تھے میں اور مولوی رفیع الدین احمد (حال سر رفیع الدین سابق وزیر تعلیم بمبئی) ملکر مارگیٹ سمندر کے کنارہ مقام پر گئے۔ سمندر کے کنارہ ای کلف ہوٹل میں ٹھیرے اور وہاں بہت پرلطف وقت گذرا بعض لوگ جو وہاں مقیم تھے۔ بہت ملنسار تھے بعض راتوں کو امیچیور تھیٹریکلس کرتے یعنی دل سے کوئی دل لگی کا قصہ بنا کر اسکا ڈرامہ کرتے جس میں چند انگریز لڑکیاں اور کمسن مرد شامل رہتے اور اپنا اپنا مفوضہ پارٹ حسن و خوبی سے ادا کرتے دو ہفتہ وہاں رہے زمانۂ اقامت مارگیٹ میں سمندر کے کنارہ کے قریب مقامات میں دن بھر کیلئے جاتے رہے مثلاً رامس گیٹ سینٹ لیونارڈ ورذنگ وغیرہ لندن واپس آکر امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

میں نے انٹرمیڈیٹ اگزیم ۱۸۹۳ء کے پہلے ٹرم میں پاس کر لیا تھا ۱۸۹۴ء کے دوسرے ٹرم میں فائنل یعنی خاتمہ کا امتحان دیا تیرہ چودہ مضامین تھے سب میں یکدفعہ پاس کیا۔ ورنہ ہوتا یہ بھی ہے کہ دو چار مضامین کسی ٹرم میں اور دو چار کسی ٹرم میں لوگ پاس کرتے ہیں۔ فائنل امتحان کو جب دو ڈھائی مہینے رہ گئے تو میں سخت علیل ہو گیا تھا مطالعہ ناممکن ہو گیا کبھی دو دن کبھی تین دن کے بعد ملیریا کا بخار آجاتا تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً ایکماہ رہا۔ جب بخار سے بالکل نجات ملی تو میں بہت کمزور و ناتوان ہو گیا تھا۔

بیرسٹری کا امتحان

میرے استادوں نے کہا کہ اس ٹرم میں تم امتحان میں نہ بیٹھو کیونکہ امتحان کو ڈیڑھ دو ماہ کا قلیل عرصہ رہ گیا ہے گو تم نے سب کتابیں ختم کردی ہیں

مگر سب مضامین کو دوبارہ دیکھ جانا ضرور ہے۔ مدت کافی نہیں ہے ۔کہ چودہ پندرہ مضامین کی کتابوں کو جن میں بعض بہت حجم ہیں تم شروع سے آخر تک پڑھ سکو گے۔ سرسری طور سے بھی پڑھنا محالات سے ہے مثلاً ریل پروپرٹی پرسنل پروپرٹی اکوئیٹی وغیرہ ایک ایک کتاب کے سینکڑوں صفحے ہیں۔ میں نے استادوں کی شفقت آمیز رائے سن کر کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہا لیکن میں نے ان کی اطلاع کے بغیر شرکت کی درخواست و یکرفیس مقررہ داخل کر دی؛ ورشبانہ روز مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔ حوائج ضروری اور کھانے کے وقت میں جو کچھ وقفہ ہوتا تھا اس کے علاوہ جو وقت بچتا وہ سب پڑھنے میں صرف کرتا راتوں کو چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتا دوستوں سے ملنا ملانا ایک قلم موقوف کر دیا اس کے لئے یہ ترکیب کی کہ جس فیملی یعنی خاندان میں دو سال سے تھا اور بہت آرام سے تھا وہ خاندان نمبر ۲۵ الگن ایونیو میں تھا وہاں کی سکونت مستعار طور سے چھوڑ کر بیڈ فرڈ اسکوائر کے ایک مکان میں دو کمرے لیلئے ضروری سامان کتابیں اور کچھ کپڑے اپنے ساتھ لے آیا باقی سب سامان اور سینکڑوں کتابیں سب ایک کمرہ میں الگن ایونیو کے مقفل کر کے چلا آیا۔

خوش نصیبی سے بیڈ فرڈ اسکوائر کی گھر والی مسز کالنس ایک ضعیف خاتون بہت نیک مزاج ملیں میں نے اپنے کھانے کیلئے بھی مناسب رقم ہفتہ وار مقرر کر دی یہ نیکدل خاتون مجھ پر بڑی مہربان ہوگئیں۔ ان کے دو جوان بیٹے تھے وہ بھی بہت ملنسار و ہمدرد تھے میری آسائش و آرام کا یہ سب خیال رکھتے تھے اس نئی سکونت کا پتہ سوا اپنے ایجنٹس مسرس ہنجس اینڈ کو کے کسی کو نہیں دیا تا کہ احباب آکر میرا وقت باتوں میں لگا کر خراب نہ کریں۔ سوا پڑھنے کے کوئی دوسرا کام نہ تھا خدائے لم یزل نے مجھے قوت حافظ غیر معمولی دی تھی دو مہینے میں کل مضامین پر حاوی ہوگیا۔ اگر دیکھا جائے تو بالکل غیر متوقع و غیر معمولی امر ہے۔ غرض امتحان میں جا کر بیٹھا سوالات کے پرچے جب سامنے آتے اور ان پر نظر دوڑاتا تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ ان کے جوابات دے سکوں گا۔ روزانہ دو پرچے ہوتے تھے۔ ایک ہفتہ میں امتحان ختم ہوگیا۔

آخری امتحان جس روز دیکر آیا مجھے شدت سے بخار آیا مسز کالنس نے جو ڈاکٹر ان کے ہاں آیا کرتا تھا اس کو فوراً اپنے ایک بیٹے کو بھیجکر بلایا اور انہوں نے ڈاکٹر سے یہ بھی کہا کہ انہوں نے امتحان کی تیاری کیلئے غیر معمولی محنت شاقہ کی ہے جس کی تکان سے انکو بخار آیا ہے۔ ڈاکٹر بھی میری حالت سمجھ گیا اور اسی لحاظ سے علاج کیا۔ امتحان کے زمانہ میں میری یہ کیفیت تھی کہ کبھار اہوں تو وہی مضامین دماغ میں آرہے ہیں۔ سوتا ہوں تو خواب میں بعض مضامین دیکھتا تھا بس پر

سوار ہوکر امتحان دینے جاتا تھا راستہ میں اسقدر سرشار اور مدہوش رہتا تھا کہ سڑکوں کی دو طرفہ دوکانیں بازار اچھی طرح سجھائی نہیں دیتے۔ یہ تک محسوس نہیں کرتا تھا کہ میں کہاں جارہا ہوں بس کے ٹکٹ دینے والے سے یہ کہدیتا تھا کہ فلاں مقام کا ٹکٹ دو اور جب وہ مقام آجائے تو مہربانی کرکے مجھ سے کہدو اور وہاں مجھے اُتار دو۔ بس میں آکر بیٹھ جاتا مگر دماغ میں آیندہ پرچے مضامین چکر لگاتے رہتے۔ میرے مکان کے قریب سے بس جاتی تھی۔ چند قدم جو پیدل آتا جیسے کوئی متوالا آتا ہے۔ ملیریا کے جراثیم جسم میں باقی رہ گئے تھے کہ ایک عرصہ تک دوسرے تیسرے دن بخار آنے لگا۔

مسز کانس اور ان کے بیٹوں نے بڑی دلدہی سے میری تیمار داری اور آرام رسانی کی۔ کئی روز تک بخار جب نہیں آیا تو ڈاکٹر جسکا نام آبرم اسٹرانگ تھا مجھ سے کہا کہ مجھے یقین ہے اب بخار نہیں آئیگا۔ مگر احتیاط کھانے پینے چلنے پھرنے میں کچھ عرصہ تک درکار ہے۔ میں بہت نحیف و ناتوان ہوگیا تھا۔ اُنہیں دنوں ایک صبح کو میں جوں ہی بیدار ہوا کہ خوابگاہ کے کمرہ کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا میں نے پوچھا کون۔ مسز کانس نے کہا میں ہوں مسٹر مرزا یہ کہکر دروازہ کا باہر کا کھٹکا کھول کر باہر سے ہاتھ بڑھا کر اُس دن کا لندن ٹائیمس مجھکو دے کر کہا لو مبارک ہو تم امتحان میں کامیاب ہوگئے تم نے اپنی محنت و جانفشانی کا پھل پایا میں نے شکریہ ادا کرکے کاغذ ہاتھ میں لے لیا قبل اس کے کہ حوائج ضروری سے فرصت کروں۔ اخبار پڑھنا شروع کیا اپنا نام دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی جسم میں یک بیک تھوڑی طاقت آگئی ناشتہ سے فارغ ہونیکے بعد وہ اخبار لیتا ہوا میں اپنے دو تین استادوں کے پاس گیا ایک نے دیکھتے ہی مبارکباد دی انہوں نے صبح ہی کو اس دن کا ٹائیمس پڑھ لیا تھا۔ ایک نے جنہوں نے اس ٹرم میں امتحان میں بیٹھنے کو منع کیا تھا۔ میرے ہاتھ سے اخبار لیکر نتیجہ پڑھ کر میری خوب پیٹ ٹھونکی اور کہا کہ مجھے حیرت ہے تم نے کیونکر پاس کیا اور جملہ مضامین میں نکل گئے۔ قلت وقت کے سبب پھر تمہارے مزاج کی ناسازی جسکا سلسلہ امتحان سے کچھ دنوں پہلے تک رہا مجھے مطلق امید نہیں تھی کہ تم قبل شرکت امتحان کل مضامین ختم کرسکوگے اس لئے میں نے کہا تھا کہ آیندہ ٹرم میں امتحان میں شریک ہونا دوسرے دن میں جب لارڈ نارتھ بروک کلب میں گیا جسکا میں زمانۂ دراز سے ممبر ہوچکا تھا۔ بعض ہندی طلبا سے ملاقات ہوئی سب نے مبارکباد دی کوئی ڈنر کا طالب ہوا کوئی لنچ کا طالب ہوا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد میں نے اپنے خاص خاص دوستوں کو ہوبرن رسٹران میں لنچ کی دعوت دی جس میں سولہ سترہ احباب

مختلف صوبوں کے شریک ہوئے بعد فراغت لنچ ان سب دوستوں کا ایک گروپ عکسی ایجنٹ اسٹریٹ میں اسٹوری پو اسٹوکیس کمپنی کے کارخانہ میں میں نے لیا اور ہر ایک دوست کو جو شریک لنچ تھا میں نے ایک ایک کاپی گروپ کی تحفتہً بھیجدی ۔ علاوہ اس گروپ کے بہت سے صوبہ واری گروپوں میں احباب نے مجھے شریک کیا بہاری طلبا نے جو گروپ کئی دفعہ اس کے لئے جب کوئی طالب العلم بعد فراغ تحصیل واپس جانے لگا تو اسوقت سب نے مل کر یادگار کے طور پر ایک گروپ لیلیا یہ بات بھی میرے لندن جانے کے بعد قائم کیگئی جو بہاری طالب العلم انڈیا واپس جاتا اسکو وداعی ڈنر دیتے نام اس کا بہاری ڈنر رکھا گیا پہلا ڈنر جو اس لنچ کا دیا گیا وہ مظہر الحق مرحوم کو دیا گیا ۔ پھر ظفر بہادر مرحوم کو پھر حسن امام مرحوم کو اسیطرح جو جو جاتا جاتا اسکو بہاری طلبا وداعی ڈنر دیتے اور ایک گروپ لیتے مجھے فخر اس کا ہے کہ علاوہ بہاری گروپوں کے مختلف صوبہ واری گروپوں میں بھی مجھے احباب شریک کرتے مثلاً بنگالہ کے طلبا یا پنجاب کے طلبا یا اودھ کے طلبا نے جو گروپ لئے میں بھی اس میں شریک ہوں ماسوا ان گروپوں کے جن میں تین چار خاص احباب شریک ہیں بعض حیدرآبادی طلبا کے بھی ساتھ ہوں ۔ لنچ کھانے کے بعد میں نے جو گروپ شرکا کا لیا تھا ۔ اور اسکی ایک ایک کاپی سب شرکا کو بھیجدی تو اس واقعہ کے چند روز کے بعد عبدالعلیم میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ یاتو مسٹر محمد علی روگے نے ہندی مقیمان لندن کو اپنے زمانہ میں لنچ دینے کے بعد بڑے سائز کا گروپ لیکر سب کو ایک ایک کاپی مفت تقسیم کی تھی یا تم نے وہی طریقہ اختیار کیا ۔ میں نے کہا کہ میں نے کسی کی تقلید نہیں کی ۔ میں محمد علی روگے سے واقف ہوں وہ پٹنہ آئے تھے ۔ میں ان سے بچپنے میں ملا بھی تھا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ لندن بھی کئی بار آئے تھے ۔ اور پرنس آف ویلس (بعد کو ایڈورڈ ہفتم) کے خاص دوستوں میں تھے ۔ مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے ہندی مقیمان لندن کو کوئی لنچ بھی دیا اور گروپ بھی لیا تھا ۔

محمد علی روگے بمبئی کے بڑے ناخدا ملک التجار اپنے زمانہ میں تھے اور نواب نصر اللہ خان بیرسٹر رئیس سچین کے خسر تھے عبدالعلیم الہ آباد کے نامی بیرسٹر نواب عبدالمجید خان بہادر سی ۔ آئی ۔ ای مرحوم کا برادر عم زاد تھے اور عبدالعلیم کے حقیقی بھائی بھی بیرسٹر تھے ان کا نام بھی عبدالمجید تھا یہ لوگ جونپور کے دولتمند زمینداروں میں تھے عبدالعلیم زمانہ طفلگی میں جبکہ دس بارہ سال کی عمر تھی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ انگلستان آئے تھے اور یہاں کسی گریمر اسکول میں عرصہ دراز تک تعلیم پاتے رہے اسقدر کم عمر انگلستان آئے تھے کہ بے بی علیم ان کے شناسا ان کو کہتے تھے یہ عرصہ دراز تک

انگلستان میں رہے۔ اور محمد علی رو گے والے لنچ میں شریک ہوئے تھے جس واقعہ کو اسوقت تیرہ چودہ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ میرے لنچ کا تذکرہ بعض شرکا اپنے دوسرے دوستوں سے بعد کو کرتے رہے۔ خصوصاً نایاب اور عمدہ میوے جو میں نے میز پر رکھوائے تھے۔ مجھے ہمیشہ سے عمدہ میووں کا شوق ہے بزمانہ قیام لندن میں صبح کے آٹھ کے قبل کاونٹ گارڈن جا کر میوے خرید کر لایا کرتا تھا۔ چنانچہ لنچ والے دن بھی میں کاونٹ گارڈن گیا تھا اور وہاں سے ہاٹ ہوز گیریس یعنی انگور پیچیس یعنے (شفتالو) نکٹرین (قسم شفتالو) ولیم ڈچیس (اقسام پیرس) یہ چیزیں خرید کر لایا اور مینجر سے ہوبرن رسٹران کے میں نے کہا کہ میز پر انکو چنن دو کھانیوالوں نے قسمیہ کہا کہ اسقدر لذیز نکٹرین کبھی نہیں کھائی ہوں تو ہر محلہ کے بازار میں ہر موسم کے میوے بافراط لندن میں ملتے ہیں۔ مگر اعلیٰ درجہ کے میوے برلنگٹن آرکیڈ میں موقوعہ وسٹ اینڈ (لندن کے غربی حصہ میں) ہر قسم کی چیز اعلیٰ درجہ کی وہیں ملتی ہے۔ اور دولتمند امراء چیز اپنی ضرورت کی وسٹ اینڈ سے خرید کرتے ہیں۔ برلنگٹن پرکیڈ سے زیادہ تر افراط سے اور عمدہ میوے اور پھول کاونٹ گارڈن میں دستیاب ہوتے ہیں بشرطیکہ علی الصباح کوئی جا کر خریدے۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد ۱۸۹۴ء کے جون ٹرم میں کال ہوا تقریباً دو ماہ انگلستان و اسکوٹ لینڈ و آئرلینڈ کے سفروں میں صرف کئے انگلستان کے پراونشل ٹاونس (Provinci al Towns) میں برمنگھم شفیلڈ کچھ اور شرقی سمندر کے کنارہ کے شہروں میں اسکاربراجہاں کا خصوصاً "اسپا" تماشہ گاہ دیکھنے کے لائق ہے وہاں سے وٹبی گیا یہ اسکاربرا کے متصل ہے اسکاٹ لینڈ میں بلاکاٹن۔ گلاسگو۔ لنلتگو۔ اڈنبرا گیا۔ لیک اسٹریٹ دیکھا۔ اڈنبرا میں ہولی ہوڈ کاسل وغیرہ دیکھا اڈنبرا کے قریب فرتھ اوف فورتھ سمندر کے حصہ پر جو پل بنایا گیا ہے۔ اور اعجوبہ روزگار ہے اس کو جا کر دیکھا اڈنبرا میں جان ناکس کا مکان دیکھا[1] وہاں سے آئرلینڈ گیا ڈبلن سے ہو کر آئیل آف وائٹ آیا وہاں سے لندن آیا یوں بھی زمانہ قیام لندن میں سر اسٹورٹ کالون بیلی سے جو میرے والد مرحوم کے دوست تھے۔ اکثر اوقات ملا کرتا تھا۔ خصوصاً جب کبھی لندن کے باہر جاتا تو واپس ہونیکے بعد ان سے ضرور مل کر اپنے مشاہدے بیان کرتا اور میری باتوں سے وہ بہت خوش ہوتے۔ ۱۸۹۴ء کے جون ٹرم میں کال ہوا۔ بیرسٹری کی تکمیل ہوئی جولائی میں مقامات مذکورالصدر کی

---

[1] جو کوئن میری آف اسکاٹس کو پروٹسٹنٹ بننے کی نصیحت کرتا تھا کئی صدیاں گذری مکان اسیطرح ہے۔

سیاحت کے لئے نکلا ۔

قسطنطنیہ میں زلزلہ کیلئے چندہ

ستمبر میں لندن واپس آیا اسی زمانہ میں قسطنطنیہ میں تیا تیز زلزلہ آیا جسکی وجہ سے بے انتہا جانی و مالی نقصان ہوا میں نے بمشورہ چند احباب کے ایک کمیٹی قایم کی اور برطانیہ عظمٰی کے لوگوں سے چندہ کی فراہمی کیلئے یہاں کی اخباروں میں بھی اپیل شائع کی ۔ اخباروں میں جو اپیل شائع ہوئی وہ تین آدمیوں کی دستخطوں سے میری اور رفیع الدین احمد کی (حال سر سابق وزیر تعلیمات بمبئی) اور احمد علی حسن علی کی (بعد کو آئی ۔ سی ۔ ایس سابق سشن جج علیگڈھ) اسی اپیل میں یہ بھی استدعا تھی کہ زر چندہ دینے والے لارڈ میئر لندن کے پاس بھیجیں ۔ چنانچہ انہوں نے رضامندی ظاہر کردی تھی ۔ یہ عنایت ایزدی ہماری محنت بارآور ہوئی اور معقول تعداد چندہ کی لارڈ میئر کے پاس جمع ہو گئی ۔ جسکو لارڈ میئر نے ٹرکی بھجوادیا جس اخبار میں ہم لوگوں کی جانب سے اپیل چھپی اور شائع ہوئی تھی ۔ اس کی ایک کاپی کلکتہ سید امیر علی صاحب کی خدمت میں بھیجدی تھی اور جو کمیٹی قایم کی تھی اسکی کیفیت بھی ان کو لکھ کر بھیجدی تھی ۔

میرے خط کے جواب میں امیر علی صاحب مرحوم نے اپنی بے پایاں مسرت کا اظہار کیا اور بہت سے جملے میری حوصلہ افزائی کے لئے لکھے اور یہ امید مجھ سے ظاہر کی کہ آیندہ بھی ہمیشہ اسلام کی خدمت کرتا رہوں ۔ میرے ایک دوست ضلع ملتان کے کسی دیہات کے رہنے والے تھے ۔ ان کا نام سید حسین علیشاہ تھا ۔ انجنیرنگ کے طالب علم تھے اور بڑے جوشیلے مسلمان تھے ۔

لندن میں محرم

۱۸۹۴ء کے محرم کی دوسری یا تیسری تاریخ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ تم لندن میں کبھی عزاداری حضرت سیدالشہدا میں بھی شریک ہوئے ہو میں نے باستعجاب اُن سے کہا کہ لندن میں اور عزاداری حسین علیہ السلام چہ معنی وارد انہوں نے کہا کہ پھر تو تم اچھے شیعہ ہو تم کو تو سنت کی خبر ہی نہیں میں تم کو ایک مجلس میں لے چلوں گا ۔ چنانچہ ساتویں یا آٹھویں محرم کو حسب قرار داد میرے ہاں آئے اور مجھکو اپنے ساتھ لیکر ٹرلی ڈورکس میں پہنچے وہاں ایک جانب لسکر کوارٹرس ہیں ۔ وہاں لیگئے ۔ لسکر سے غرض یہ ہے کہ مسلمان جہازران جنکو خلاصی بھی کہتے ہیں اور مانجھی بھی کہتے ہیں ۔ زیادہ تر بنگالہ کے رہنے والے چاٹگام اور ڈھاکہ وغیرہ کی طرف کے جہازوں کے ساتھ مختلف اقطاع عالم میں پھرتے ہیں ۔ لندن میں بھی آتے ہیں ۔ پندرہ بیس دن تک بعض جہاز

لنگر انداز رہتے ہیں۔ سامان خالی ہوتا اور دوسرا بھرا جاتا ہے جس میں عرصہ لگ جاتا ہے۔ یہ لوگ بہت اونچا تعزیہ پنی اور کاغذ اور بانس کا بناتے ہیں یہ چیزیں کلکتہ سے اپنے ساتھ لیجاتے ہیں حسین علیشاہ اس دن ہیٹ پہنکر نہیں آئے تھے بلکہ پنجابی صافہ باندھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا ان سے اور خلاصیوں سے پہلے سے بہت اچھا ربط تھا۔ ان کو دیکھ کر بہت سے لوگ دوڑے ہوئے آئے اور بہت گرمجوشی سے ملے انہوں نے مجھ سے ملایا وہاں اخلوت اسلامی کا مزا آیا ہم لوگ سر شام پہنچے تھے۔ بعد نماز مغرب مجلس شروع ہوئی۔

جہاں تعزیہ رکھا تھا وہاں چند علم بھی ایک چبوترہ پہ تھے اسی جگہ پر پچاس ساٹھ خلاصی جمع ہوئے ایک نے جو ٹنڈن تھا خلاصیوں کا سردار اس نے شہادت نامہ پڑھنا شروع کیا۔ خوب شیون گریہ وزاری ہوئی۔ بعد ختم مجلس شربت تقسیم کیا اس کے بعد تل چوری اور کھچڑا سب کے سامنے لاکر رکھا گیا۔ تبرکاً ذرا سا کھچڑا میں نے چکھا اور معافی مانگی۔ ایک نے کہا ہم لوگ غریب ہیں۔ آپ بڑے آدمی ہیں اسلئے نہیں کھاتے میں نے کہا ہرگز ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہ میرا مزاج اچھا نہیں ہے میں پرہیز کر رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا اگر آپ کا مزاج درست نہیں ہے تو کھچڑا ضرور کھائیے اور مولا کی برکت سے آپکی بیماری جاتی رہے گی۔ خوش عقیدگی کے یہ کلمے سنکر میں بے انتہا خوش ہوا۔ میں نے مختصر سی ایک تقریر کی اور شہادت سیدالشہدا سے کیا کیا سبق حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا مختصراً ذکر کیا اور کہا کہ کل مسلمانوں کو ان کی پیروی کرنی چاہئے۔ تقریباً شب کے دس بجے وہاں سے رخصت ہوئے راستہ میں میں نے حسین علیشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ کہ یہ سعادت تمہاری وجہ سے نصیب ہوئی ورنہ میرے تو خواب وخواب وخیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ لندن میں بھی غم حسینؑ ہوتا ہے۔ اوسوقت یہ شعر مجھے بے ساختہ یاد آگیا اور میں نے باواز بلند پڑھکر حسین علیشاہ کو سنایا۔

در ملک عرب یا کہ عجم یا کہ بدخشان — دیدم ہمہ جا ماتم شاہ مدنی بود

لندن سے روانگی اوائل نومبر میں انگلستان کو خدا حافظ کہنے والا تھا شپنگ جہاز میں جو مارسلیس سے آخر نومبر میں انڈیا جانے والا تھا۔ اس میں ذریعہ ٹامس کوک اینڈ سنس کے پیسیج بک کر لیا (Passag Book) یعنی ایک برتھ کا ٹکٹ لے لیا پٹنہ میں بھی اپنے عزیزوں کو آنے کی اطلاع دیدی اور لندن کے دوستوں کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ حسب عملدرآمد ہماری دوستوں کی جانب سے وداعی ڈنر دیا گیا۔ خاص خاص دوستوں نے بھی اپنے

مکانوں اور بعض نے ہوٹلوں میں دعوتیں دیں بعض انگریز دوستوں نے تحفے بھی دیے اور ایک ڈنر بہت بڑے پیمانہ پر مختلف صوبوں کے رہنے والے ہندو مسلمان پارسی دوستوں نے چندہ کرکے مجھکو دیا جسکا عنوان مینو پر یہ چھپوایا گیا تھا۔ Farewell dinner by the admirers of Syed Humayun Mirza Barat Law.

یعنی دعوت وداعیہ منجانب مداحان مسٹر سید ہمایوں مرزا بیرسٹرایٹ لا۔ اس ڈنر کا مینو ایک میرے پاس موجود ہے۔ جس کو اپنے لئے باعث فخر وناز تصور کرتا ہوں۔ اس ڈنر میں چند ممتاز انگریز بھی شریک ہوئے۔ مثلاً سرجوزف بارنبیسی سابق کنڈکٹر اوف ایلبرٹ ہال سرجان بلنس پریزیڈنٹ رائل اکاڈمی آف آرٹس اینڈ سائنس۔ مسٹر انڈر روز اسکاٹ مشہور ناولسٹ وغیرہ اس ڈنر کا ذکر انڈین میگزین میں تھا۔ جسکی مدیرہ مس فیننگ آنجہانی تھیں اور وینیٹی فیر (Vanity fair) اخبار نے بھی کیا۔ جو اسوقت کا سوسائٹی پیپر تھا۔ میں سراسٹورٹ کاون بیلی سے جب رخصت ہونے لگا تو بہت متاثر ہوئے چند کلمہ نصیحت آمیز کہے۔ پھر مجھ سے خود ہی کہا کہ میں تمہیں ایک خط تعارف کا اوس وقت کے موجودہ لفٹنٹ گورنر بنگالہ سرچارلس الیٹ کے نام دیتا ہوں کیونکہ یہ اودھ سے بنگالہ گئے ہیں۔ تمہارے خاندان سے واقف نہیں ہیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور اوسیوقت انہوں نے خط لکھ کر دیا پہلے میرے خاندان کا حال مختصر طور سے لکھا۔ پھر میری نسبت چند کلمہ لکھے جس میں کا ایک جملہ مجھے اسوقت یاد ہے وہ یہ ہے۔

Mr. Humayun mirza who is extremely intelligent has seen a good deal more of our People and our country Than many of his contemporaries have done

جسکا مفہوم یہ ہے کہ مسٹر ہمایوں مرزانے جو بہت ذہین ہیں بمقابلہ اپنے ہمعمر لوگوں کے بہت زیادہ ہماری قوم اور ہمارے ملک کو دیکھا یہ کوئی معمولی جملہ نہیں تھا وہ بھی کس کے قلم سے جسکا سبب یہ تھا کہ ہمیشہ میرے خیالات اور مشاہدات سُنتے رہتے تھے۔ جب میں روانہ ہوا تو وکٹوریہ اسٹیشن پر ایک جم غفیر ہندی اور انگریز زن ومرد دوستوں کا خدا حافظ کہنے آیا تھا۔ وکٹوریہ اسٹیشن سے میری ٹرین ڈوور آئی بذریعہ اسٹیمر انگلش چینل عبور کرکے کیلے فرانس کے بندرگاہ میں اُترے۔ خوش قسمتی سے اس روز انگلش چینل مطلق متموج ومتلاطم نہ تھا اس لئے نصف گھنٹہ میں اس پار سے اُس پار پہنچ گئے۔

عموماً یہاں طوفان وتلاطم رہتا ہے خصوصاً نومبر دسمبر اور جنوری میں بعض دفعہ چھ سات

گھنٹے عبور و مرور میں صرف ہوتے ہیں نومبر کا سارا مہینہ انگلستان میں فوگ کا مرہون منت رہتا ہے۔ فوگ ایک قسم کا گھر اکہرا اور اسقدر گہرا ہوتا ہے کہ قریب اور پاس کی چیز سجھائی نہیں دیتی جب فوگ بہت گہرا ہوتا ہے تو انگلش چینل یعنی رودبار انگلستان کے پار ہونے میں پورا دن صرف ہو جاتا ہے جبکہ کہر نہیں بھی ہوتا ہے تو تلاطم سے نجات حاصل نہیں ملتی اور استفراغ کا ہونا ضروری امر ہے خوش نصیبی سے باوجودیکہ نومبر کا مہینہ تھا مگر اس دن فوگ یعنی کہر نام کو نہ تھا اور سمندر ساکت تھا ہندوستان کی واپسی کے دو تین ماہ قبل میں نے ٹامس کوک اینڈ سنس کو اپنا ایجنٹ اور بینکر بنالیا تھا اور ولیم ہچنسن سے قطع تعلق کر لیا تھا اس انتظام سے بہت آسانی ہوئی۔ لندن سے روانہ ہونے کے قبل میں نے کوک کے ذریعہ جہاز کا ٹکٹ خریدا تھا اور تاریخ روانگی کی اطلاع بھی کوک کو دیدی تھی۔ اسلئے جب میں کیلے پہنچا تو کوک کا ایک ملازم ملا جس نے مجھے پیرس جانیوالی ٹرین میں باسائش بٹھایا جب میں پیرس پہنچا تو وہاں کے اسٹیشن پر بھی کوک کا آدمی موجود تھا۔ اس نے میرے قیام کے لئے پہلے ہی سے ایک کمرہ سینٹ پیٹرس برگ ہوٹل میں لیلیا تھا اس ہوٹل کے ملازمین تقریباً سب ہی تھوڑی بہت انگریزی زبان سمجھ لیتے اور بول لیتے تھے۔ اس کی وجہ سے مجھے آسانی ہوئی ٹامس کوک اینڈ سنس کی ایجنسی تقریباً ممالک یورپ کے کل بڑے شہروں میں ہے ٹامس کوک اینڈ سنس کو ایجنٹ اور بینکر بنا لینے سے بڑی سہولتیں ملتی ہیں۔ جگہ جگہ پر ان کے ملازم ہر قسم کی مدد دینے کو تیار رہتے ہیں حال میں ایک امریکن کمپنی بھی بمبئی میں قائم ہوئی ہے جسکی شاخیں مثل ٹامس کوک کے ممالک یورپ کے ہر بڑے شہر میں موجود اور اسی طرح کی آسائش دیتی ہیں میں پیرس میں بارہ دن رہا وہیں سے جاکر وارسیس بتلفظ فرانسیسی وارسائے وغیرہ دیکھ کر آئے اور پیرس کا ایفل ٹاور نپولین کی قبر تریز گارڈنس نیشنل آرٹ گیلری وغیرہ دیکھی پیرس سے مارسلیس بہ تلفظ فرانسیس مارسائی آیا اور یہاں چونکہ میرے آنے کی اطلاع کوک کی پیرس کی ایجنسی نے مارسائے کی ایجنسی کو دیدی تھی اسلئے اسٹیشن پر ٹامس کوک کا ملازم ملا اس نے ہوٹل ڈی لوور میں میرے رہنے کیلئے کمرہ لیلیا تھا۔

اسٹیشن سے اس ہوٹل میں آئے جہاز کی روانگی کو جو انڈیا آنیوالا تھا تین دن باقی تھے دو دن پھر پھر اکر مارسائی کو اچھی طرح دیکھ لیا جس جہاز پر انڈیا آئے اسکا نام شٹینن تھا یہ جہاز بہت چھوٹا تھا۔ اس زمانہ میں بڑے بڑے جہاز نرپی اینڈ او کمپنی کے پاس تھے نہ کسی اور کمپنی فرانسیسی یا اٹیلین کے پاس تھے۔ شٹینن کل چھ ہزار ٹن کا تھا اس لئے بہت ہلتا ڈولتا تھا۔

خصوصاً تھوڑے سے طوفان میں بھی اس کی مرن تھی جب سمندر میں تلاطم ہوتا ہے تو تین قسم کے حرکتیں جہاز میں ہوتی ہیں رولنگ Rolling روکنگ Rocking پچنگ (Picking) رولنگ تو وہ حرکت ہے کہ جہاز کبھی داہنی کروٹ اور کبھی بائیں کروٹ جلدی جلدی بدلے۔ روکنگ وہ حرکت ہے کہ جہاز منہ کے بل سمندر میں جھکے اور پھر سر اٹھائے جسطرح روکنگ چیر پر بیٹھ کر انسان منہ کی جانب جھکتا اور اٹھتا ہے پچنگ وہ حرکت ہے کہ جہاز منہ کی جانب سے سمندر کے پانی میں ڈوبے اور ڈوب کر نکلے یہ حرکت خوفناک ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب جہاز پچ کرتا ہے تو سمندر کی تہہ اپنی جانب جہاز کو کھینچ لیتی ہے۔ پھر جہاز اُبھر نہیں سکتا انجن لاکھ زور لگائے مگر سمندر کی قوت کا مقابلہ دشوار ہوتا ہے۔ چھوٹے اور ہلکے جہازوں میں ان حرکتوں کا اسوقت خوف ہوتا ہے۔ جب سمندر طوفان خیز و متموج ہوتا ہے۔

ہمارا جہاز شپنگ پی اینڈ او کمپنی کا تھا۔ مگر ڈاک لیجانے والے جہازوں میں نہ تھا۔ پی اینڈ او کمپنی کے جہاز انڈیا سے یورپ کے ممالک میں انگلستان وغیرہ ڈاک لیجاتے اور یورپ سے انڈیا لاتے ہیں۔ اس زمانہ میں یورپ کی ڈاک والا جہاز برنڈیزی میں جو اٹلی کا ایک شرقی بندر ہے ڈاک اتار دیتا اور وہیں سے لاتا تھا اور اب مارسیلس میں جو فرانس کا ایک جنوبی بندر ہے ڈاک اتاری جاتی اور وہیں سے لائی جاتی ہے ہم مارسیلس سے روانہ ہوئے تھے اس لئے شپنگ ڈاک کا جہاز نہ تھا مارسیلس جو بندرگاہ ہے وہ گلف آف لیون یعنی خلیج لیون پر واقع ہے۔ خلیج لیون کا پانی میڈیٹرینسی یعنی بحر روم میں مل گیا ہے۔

ہمارے جہاز نے قریب شام لنگر اٹھایا۔ ڈیڑھ دو گھنٹہ کے قریب تو خلیج لیون کا سا ملا اس کے بعد سے طوفانی سمندر کا سامنا ہوا اور طوفان بھی وہ قیامت خیز کہ پناہ بخدا اسیطرح ہمارا جہاز چھوٹا تھا اس لئے کبھی رول کرتا اور کبھی روک اور کبھی پچ کرتا تمام رات جہاز طوفانی سمندر کو قطع کرتا ہوا چلتا رہا۔ جہاز کا ڈک یعنی عرشہ بالکل خالی کر دیا گیا تھا پانی اوپر سے جا رہا تھا۔ جہاز اسقدر تہ و بالا ہو رہا تھا کہ معلوم ہو رہا تھا کہ اب ڈوبا تب ڈوبا خصوصاً جسوقت پچنگ کی حرکت زور سے ہوتی تھی اس ہل ڈول کیں دو لیڈیوں کا حمل ساقط ہو گیا۔ صبح ہوتے ہوتے جہاز بحر روم کے ایسے پانی میں پہنچا جہاں سکوت تھا۔

میرے سوا اس جہاز پر اور دو ہندی تھے ایک پارسی مسٹر جی جو بیرسٹری کی سند لیکر انڈیا واپس جا رہے تھے جن سے مجھ سے لندن کی گہری ملاقات تھی دوسرے مسٹر اس بہاری گھوش

بعد کو ڈاکٹر اور سر ہوئے۔ یہ کلکتہ ہائیکورٹ کے بہت مشہور اور ممتاز وکیلوں میں تھے۔ جنہوں نے بیحد دولت حاصل کی تھی۔ تیرہ لاکھ روپیہ اپنی زندگی میں خیراتی مدات میں دیے اور تقریباً اسیقدر روپئے بذریعہ وصیت نامہ کے تعلیمی امور کیلئے دیکر گئے قانون دانی میں ان کے مثل دو ہی چار وکلا، اور بیرسٹر کلکتہ میں تھے مارگیج یعنی رہن پر انکی تصنیف بہت صحیح کتاب ہے اور انگلستان وامریکہ میں مستند مانی گئی ہے میں اسکا مطالعہ انگلستان ہی میں تھوڑا سا کرچکا تھا اور اس طرح ان کے نام نامی سے واقف ہوچکا تھا۔ ان سے جہاز پر مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ یہ حضرت بغرض سیروتفریح پہلی دفعہ لندن گئے تھے، اور صرف بیس یا اکیس دن لندن میں رہکر آئے میں نے ان سے کہا بھی تھا کہ لندن ایسا شہر آپ نے بیس اکیس دن میں کیا دیکھا ہوگا کہنے لگے مجھے انگریزی کھانے پسند نہ تھے جسکی وجہ سے سخت تکلیف تھی۔ زیادہ ٹھیرنا مشکل ہوگیا۔

میں اس زمانہ میں سیاسیات سے بہت دلچسپی لیتا تھا جیسے اکثر انگریزی طلبا انگلستان میں تعلیم پانے کے بعد پولیٹکس سے دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ اور انڈیا میں انگریزوں کی حکومت انہیں ایک آنکھ نہیں سہاتی اور طویل قیام انگلستان کی وجہ سے انگریز قوم کے بہت سے عیوب سے بھی واقف ہوکر انگریزوں سے متنفر بھی ہوجاتے۔ برعکس جن کے بعض طلبا صاحب بہادر بنکر انگریز پرست ہوجاتے ہیں۔ مگر اس قماش کے لوگ کم ہیں اور وہی حضرات ہیں جنہوں نے مطالعہ کم کیا۔ اور جو کچھ بھی پڑھا یا دیکھا سرسری اور سطحی طور سے دیکھا۔

بہر حال میں اس زمانہ میں کانگرس کا حامی اور نیشنلسٹ یعنی قوم پرست بننے کا شائق تھا انڈیا میں انگریزوں کی طرز حکمرانی سے بیزار تھا خصوصاً جو برتاؤ ہندیوں کے ساتھ اس زمانہ میں انگریزوں کا تھا وہ بہت نازیبا تھا جسے کوئی بھی صاحب منش وزہی ہندی گوارا نہیں کرسکتا تھا بعض ہمسفر انگریزوں سے مجھ سے خوب مباحث ہوتے تھے۔ خصوصاً دو انگریزوں سے جو کہ اینگلو انڈین روش کے تھے۔ ایک تو ان میں سے کلکتہ کا غالباً پولیس کمشنر اور دوسرا اروڑکی کالج کا پرنسپل تھا یہ دونوں رخصت لیکر انگلستان گئے ہوئے تھے اور وہاں سے واپس آرہے تھے۔

شب کے کھانے کے وقت ڈاکٹر راس بہاری گھوش بھی میز پر رہتے تھے اور بحث اشتعال دیکر خود تماشہ دیکھتے تھے اور میں ان دونوں انگریزوں کو خوب کھری کھری سناتا تھا جس سے راس بہاری گھوش بہت محظوظ ہوتے اور لطف یہ کہ خود ایک لفظ میری تائید میں نہیں بولتے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ڈک پر جب وہ اور ہم ٹہلنے لگتے تو میری پیٹھ ٹھونکتے اور میری تعریف کرتے اور کہتے کہ

تم نے ان انگریز بچوں کو خوب معقول کیا۔
غالباً ڈاکٹر اس بہاری گھوش کا یہ ریمارک صحیح بھی تھا کیونکہ روڑکی کالج کے پرنسپل کو میرا نام بھی یاد رہا اور میری گفتگو کا ان پر اچھا اثر ہوا ہوگا۔ جسکا ثبوت یہ ہے کہ جب وہ ہندوستان آئے اور روڑکی پہنچے تو میرا ذکر اچھے لفظوں میں اُنہوں نے روڑکی کے اپنے بعض شاگردوں سے کیا جن میں میرے ایک عزیز قریب سید عطاحسین ایم۔ اے سی۔ ای بعد کو ناظم تعمیرات سرکار عالی بھی تھے۔ یہ اسوقت خاتمہ کا امتحان دے رہے تھے۔ چنانچہ پرنسپل مذکور نے جن کا نام میں نے اسوقت بھول گیا میرا ذکر سید عطاحسین صاحب سے کیا تو اُنہوں نے ان سے کہا کہ مسٹر ہمایون مرزا بیرسٹر میرے عزیز ہیں جب سید عطاحسین حیدرآباد ملازم ہوکر آئے اور میں بھی حیدرآباد آگیا تو مجھ سے اُنہوں نے اس اس واقعہ کا ذکر کیا آمدم برسر طلب
جہاز پر آغاز سفر میں جو کچھ طوفان کی تکلیف ہوئی اس کے سوا بقیہ زمانہ جہاز کا پرلطف رہا۔ کھیل تماشوں میں اچھی طرح وقت گزرتا تھا۔

بمبئی پہنچے

بمبئی بخیر و خوبی خدا نے بماہ نومبر ۱۸۹۴ء پہنچا دیا جہاز پر بہت سے ہوٹلوں کی جانب سے ان کے ملازمین یا دلال اپنے اپنے ہوٹل کی ٹاریف لئے ہوئے آگئے۔ ہر ایک کہتا میرا ہوٹل نہایت اعلیٰ درجہ کا ہوٹل ہے۔ نہایت عمدہ انتظام ہے اور لذیذ طعام ملتا ہے۔ ہر شخص اپنے مُنہ آپ میاں مٹھو کا مصداق تھا۔
میں نے جسقدر اسباب کیبن میں تھا قلیوں سے اُٹھواکر ایک وکٹوریہ فٹن میں رکھوایا قبل اسکے کہ اسباب جہاز کے باہر جائے چنگی کا ایک افسر جہاز کے اُس ڈوری یعنی اُس راستہ پر کھڑا تھا۔ جدھر باہر نکلتے ہیں مسافروں سے دریافت کرتا گیا کہ آپ کے اسباب میں کوئی شئے محصول دینے کے لائق تو نہیں ہے۔ نفی میں جواب ملنے پر ٹرنکوں اور گلاڈسٹون بیگ وغیرہ پر چاک کھریا مٹی سے ایک حرف پی لفظ پاس کی جگہ لکھدیتا۔
میں نے وکٹوریہ فٹن کے کوچبان سے کہا کہ الکزینڈرا ہوٹل (Alexandra Hotel) جو فورٹ (fort) قلعہ میں ہے سے چلو یورپ جاتے وقت بھی میں اور میرے ہمراہی نواب زادہ ولی الدین احمد خان وغیرہ اس میں ٹھیرے تھے اسکا مالک کوئی پارسی تھا۔ اور مینجر بھی پارسی تھا جس نے ہم لوگوں کو بہت آرام دیا تھا۔ اس لئے اسی ہوٹل میں قیام کرنا مناسب خیال کیا مینجر کا نام مسٹر فیروز شاہ تھا۔ بہت خلیق شخص تھے۔ جسوقت میری فٹن ہوٹل میں آئی مینجر

دور سے دیکھ کر ہنستے ہوئے دوڑتے ہوئے آئے اور میرا سامان گاڑی سے اتروا کر کمرہ میں رکھوایا اور مجھے کامیاب وطن واپس آنے پر مبارکباد دی اور جلدی جلدی میرا سامان موقع سے رکھو اتے جاتے اور لندن کے حالات پوچھتے جاتے صبح کے گیارہ کا وقت تھا۔ میں نے کہا مسٹر منیجر پہلے مجھے کچھ کھلاؤ پھر باتیں کرنا۔ مجھ سے دریافت کیا کہ آپ ڈرائینگ روم میں نیچے آئیں گے۔ یا آپکے کمرہ میں آپ کا بریکفاسٹ بھیجدوں میں نے کہا مہربانی ہوگی یہیں بھیجدیجئے۔ وہ جب چلے گئے میں نے کپڑے بدلے منہ ہاتھ دھویا بریکفاسٹ کے ساتھ وہ خود بھی آئے اور دنیا بھر کی غپیں لگائیں۔ پھر مجھ سے دریافت کیا کہ آپکا کوئی سامان جہاز کے ہولڈ میں بھی ہے۔ میں نے کہا ہاں دو بڑے بڑے ٹرنک کتابوں کے ہیں اور ایک بڑے ٹرنک میں میرے کپڑے جوتے مختلف سامان ہے۔ منیجر نے کہا میں ایک سادہ ڈکلریشن فارم لاتا ہوں اس میں آپ سامان کی فہرست و نوعیت لکھئے۔ ٹرنکوں کی تعداد لکھئے اور یہ لکھئے کہ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ ان میں کوئی سامان ممنوعہ یا لائق کسٹم ڈیوٹی نہیں ہے۔ دستخط کر کے بیرسٹر ایٹ لا لکھدیجئے۔ میں جہاز پر سے نکلوا کر لے آؤں گا۔

چنانچہ ایک فارم لے کر آئے اور میں نے جب یہ عبارت لکھدی گھنٹہ بھر کے بعد وہ سب سامان آگیا۔ جب منیجر سادہ فارم لانے جانے لگے تو میں نے کہا کہ ایک فارم تار کا بھی لیتے آئے۔ چنانچہ وہ دونوں فارم لے کر آئے۔ میں نے تار لکھ کر منیجر کو دیدیا کہ بھجوا دیجئے تار کی اجرت میرے حساب میں لکھ لیجئے۔ تار میں نے پٹنہ بھیجا تھا[1] جب منیجر جہاز سے میرا سامان لانے گئے۔

میں اپنے کمرہ میں بیٹھ کر اس دن کا اخبار جو منیجر نے لا کر مجھے دیا تھا۔ میں پڑھ رہا تھا کہ ہوٹل کے ایک ملازم نے ایک وزیٹنگ کارڈ لا کر دیا اس پر سید عقیل بلگرامی لکھا تھا۔ میں نے ملازم سے کہا کہ صاحب کو سلام بولو جسکا مطلب یہ تھا کہ ان کو اندر بھیجدو جب وہ صاحب اندر آئے تو میں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ اور ایک کرسی اپنی کرسی کے نزدیک رکھ کر ان سے کہا آپ بیٹھئے میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کس غرض سے مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ جس جہاز پر آپ آئے ہیں اسی پر میرے بڑے بھائی سید زین العابدین آنے والے تھے آپکو کچھ معلوم ہے کہ وہ کیوں نہیں تشریف لائے پھر سید ہاشم مرحوم کی جو بعد کو حیدرآباد ہائیکورٹ کے جج ہوئے

---

[1] جسمیں بمبئی بخیریت پہنچنے کی اطلاع دی تھی۔

خیریت پوچھی اور کہا کہ یہ بھی میرے بھائی ہیں۔ جب میں نے یہ سُنا کہ یہ حضرت سید زین العابدین (حال عابد نواز جنگ) کے اور ہاشم مرحوم کے بھائی ہیں تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ دونوں صاحب آپ کے حقیقی بھائی ہیں۔ اور غالباً آپ سے بڑے ہیں اُنہوں نے میرے استفسار کا جواب اثبات میں دیا۔ میں نے ان سے کہا یہ دونوں بھائی میرے بڑے دوست ہیں صرف یہی نہیں بلکہ آپ کے خاندان کے بزرگوں سے جو صوبہ بہار کے مختلف مقامات اور خصوصاً پٹنہ میرے وطن میں زمانہ دراز تک رہے اور میرے بزرگوں سے دوستانہ تعلقات تھے یہ کہہ کر میں نے ان کو گلے سے لگایا اور کہا کہ زین العابدین اس جہاز پر آنے والے تھے مگر وہ علیل اور سخت علیل ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک سنٹ ٹامس ہوم (ایک قسم کا ہسپتال) میں انہیں رہنا پڑا۔ اب طبیعت روبا صلاح ہے مگر ناتوانی اس قدر ہے کہ سفر کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ انشاء اللہ کافی طاقت آنے کے بعد آئیں گے۔

اس کے بعد میں نے ان سے ان کی تعلیم وغیرہ کے حالات دریافت کئے اور یہ پوچھا کہ حیدرآباد سے کب آئے اور کہاں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ بھائی جان کو لینے کیلئے کل آیا اور فلاں ہوٹل میں ٹھیرا ہوا ہوں ان کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بمبئی کے الفنسٹون کالج میں وہ عرصہ تک درس پاتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ مضائقہ نہ ہو تو آپ اسی ہوٹل میں منتقل ہو جائیے۔ آپ کی تنہائی بھی دور ہو گی اور ادھر مجھ سے صحبت مل جائے گی۔ مجھسے اُنہوں نے دریافت کیا کہ بمبئی کب تک آپ قیام کریں گے۔ میں نے کہا یہی دو تین روز کچھ تحفے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بہتر میں اسی ہوٹل میں آجاتا ہوں یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ جب وہ اپنا سامان لانے گئے میں نے منیجر کو بلا کر کہا کہ میرے کمرہ کے برابر جو کمرہ خالی ہے اسے فوراً صاف کرواو میرے ایک دوست آکر رہیں گے۔ میں نے مذاقیہ یہ بھی کہا کہ لاؤ میرا کمیشن لاؤ۔ میں نے تمہارے لئے ایک وزیٹر پیدا کر دیا منیجر میرا شکریہ ادا کیا۔ اور قبل اس کے کہ سید عقیل آئیں منیجر نے آکر مجھ سے کہا چلئے دیکھئے آپ کے دوست کیلئے کیسا اچھا ہوا دار اور خوب سجا ہوا کمرہ تیار کر کے رکھا ہے۔ پھر پوچھا آپ کے دوست کب آئیں گے میں نے کہا تھوڑی دیر میں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سید عقیل وکٹوریہ فٹن پر آدھمکے۔

میں نے منیجر کا تعارف ان سے کروایا کہ اس ہوٹل کے منیجر ہیں۔ اور بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ درحقیقت وہ آدمی تھے بھی۔ اچھے بہت خلیق با مذاق ہنسمکھ۔ ہم شام کو وکٹوریہ فٹن

کرکے سید عقیل کو لیکر ہواخوری کو نکلے رستہ میں حیدر آباد کے متعلق بہت سی باتیں میں دریافت کرتا رہا یہ وہ زمانہ تھا کہ حیدر آباد کی رزیڈنسی کورٹ میں شیخ مہدی حسین مخاطب بہ نواب فتح نواز جنگ سابق ہوم سکرٹری حیدر آباد دالاشتہور، وبدنام کنندہ سنسنی خیز مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی کا متراکے مقابلہ چل رہا تھا جسمیں بڑے لوگوں کی مثلاً شمس العلما، سید علی بلگرامی وغیرہم کی گواہیاں ہو رہی تھیں علاوہ مقامی گواہوں کے لکھنؤ سے بڑے بڑے لوگ گواہی دینے کو طلب کئے گئے تھے بظاہر تو ایک معمولی مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی کا تھا۔

جس کی بنا یہ تھی کہ ایک پمفلٹ جس میں بہت سے واقعات مزیل حیثیت عرفی آبرو شکن فتح نواز جنگ کے متعلق تھے شایع کیا گیا تھا۔ رزیڈنٹ وقت سر پلوڈن تھے۔ مہدی حسین کے خلاف تھا اس نے حیدر آباد کی ریاست سے کہا کہ جس عہدہ دار یعنی مہدی حسین کے ایسے کرتوت اور چال چلن ہوں وہ ملازمت میں رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ یا تو مہدی حسین کو چاہئے کہ مقدمہ دائر کرکے بیانات مبینہ کو جھوٹ ثابت کریں یا مستعفی ہو جائیں۔ پمفلٹ میں کاتب یا مصنف کا نام نہیں تھا مہدی حسین نے کہا کہ میں کسکے مقابلہ میں مقدمہ چلاؤں لکھنے والے نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔

حقیقت میں یہ ایک سازشی مقدمہ تھا۔ عہدہ داروں کی ایک پارٹی جو مہدی حسین کو ذلیل کرنا اور گرانا چاہتی تھی جس نے یہ پمفلٹ لکھوایا تھا۔ اسکو یہ جستجو ہوئی کہ کسی ایسے شخص کو پیدا کرنا چاہئے جو اُٹھوں گانٹھ کمیت ہو بیانات مبینہ ناثابت ہونیکی شکل میں جیلخانہ جانے سے بھی جسے باک نہو اور ہوشیار و چالاک اسقدر ہو کر جرح سوالات میں مجروح نہو تلاش شرط ہے ڈھونڈے سے کیا نہیں ملتا۔ جو یندہ یا بندہ حسن اتفاق سے یا مہدی حسین کی کم نصیبی کہئے کہ ایک بنگالی ایس، ایس مترا نے جو روٹیوں کی تلاش میں حیدر آباد آیا تھا اور جس نے بعد ختم مقدمہ حیدر آباد میں چند دن رہ کر اپنی کارستانیوں سے بہت دولت کمائی۔ اسکا پتہ یاروں نے لگایا اور اسکو پیسے دئے گئے اور آیندہ کی اُمید دلائی گئی۔ کیونکہ پس پردہ کچھ دولتمند اشخاص ٹٹی کی آڑ میں یہ شکار کھیل رہے تھے۔

مترا کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ اس دستاویز پمفلٹ کا لکھنے والا اپنے تئیں مشہور کرے چنانچہ وہ آمادہ ہو گیا اور خم ٹھونک کر میدان میں آ دھمکا۔ بقول شخصے بھوکا بنگالی کہے بہات بہات اُس کو منہ مانگی مراد ملگئی یا تو وہ ایک بنگالی پروفیسر کے ٹکڑوں پہ پڑا تھا یا اسکی مٹھی خوب گرمائی گئی بڑے بڑے لوگ خاطر و تواضع کرنے لگے وہ ملزم بنایا گیا۔ بڑے بڑے بیرسٹر بلائے گئے

مدراس سے نارتھن اور بمبئی سے انو دا پٹی جنکی روزانہ ہزاروں میں ویجاتی تھی زوروں سے مقدمہ چلا ملزم کی جانب سے بیانات کی صحت ثابت کی گئی۔ مقدمہ خارج ہوا مہدی حسین کا پچاس ساٹھ ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔ تباہ وبرباد ہوکر حیدرآباد سے نکلے راستہ میں گاڑی پر سید عقیل سے جو اب نواب عقیل جنگ صدرالمہام ہیں۔ اس مقدمہ کے متعلق بھی کچھ باتیں رہیں۔

دوسرے دن صبح کو میں نے ایک فہرست اُن زن ومرد عزیزوں اور احباب کی بنائی جنکو کچھ سوغاتیں اور تحایف دینے تھے فہرست بناکر میں نے اپنے بکس کھولے اور اُن اشیا کا جائزہ لیا جو یورپ سے ساتھ لایا تھا تو چیزیں کم پڑیں مجھے خیال آیا کہ بازار ہر حالت میں جانا اپنے لئے کچھ سامان خریدنا ہے۔ اسیوقت کچھ چیزیں چھوٹی موٹی اور خرید لوں گا۔ میرے پاس برٹش انڈین کائن نہ تھے۔ میں یورپ سے آرہا تھا میرے پاس انڈیا کے روپے کہاں سے آتے۔ مگر بچے ہوئے چوبیس انگلش ساورن یعنی (پاونڈ) میرے پاس تھے اور کچھ شیلنگ تھے۔ میں نے مسٹر فیروزشاہ مینجر کو بلایا اور پوچھا کہ آجکل بمبئی میں ساورن کا بھاؤ کیا ہے یعنے ایک ساورن توڑانے پر کتنے روپئے ملتے ہیں اُنہوں نے کہا میں ابھی بازار جاکر دریافت کرکے آتا ہوں۔ چنانچہ وہ بازار گئے اور دریافت کرکے آئے اور کہا کہ ساڑھے اٹھارہ کا بھاؤ ہے۔ میں نے کہا یہ کیا میرے پاس جو ڈیڑھ ماہ کے قبل انڈیا سے بنک آف انگلینڈ کے نام بینک آف بنگال (حال امپریل بینک) شلخ پٹنہ سے ڈرافٹ آیا تھا تو اُنیس کے بھاؤ سے آیا تھا۔ اس لئے مجھکو فی ساورن اُنیس روپئے ملنے چاہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ڈیڑھ دو برس سے یہی گڑ بڑ ہے کبھی ساورن کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ کبھی گھٹ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب میں یورپ جارہا تھا تقریباً چار سال بیشتر تو سولہ کا بھاؤ تھا پھر بڑھتے بڑھتے اُنیس ہوگیا جسکی وجہ سے ہندی طلبا کو بڑا نقصان ہورہا تھا کہاں سولہ کہاں انیس۔ سولہ کے قبل تیرہ چودہ اس کے قبل صرف دس روپیہ ساورن کی قیمت تھی۔ ایک شلنگ آٹھ آنہ کے برابر تھی اس زمانہ میں جس طالب العلم کو دوسو روپئے انڈیا سے کوئی بھیجتا تو اس کو بیس ساورن ملتے۔ برعکس اس کے میرے زمانہ میں دوسو کے تقریباً گیارہ ساورن ملتے جو طالب العلم میرے زمانہ میں تیس پونڈ ماہانہ انگلستان میں صرف کرتا تو اسکے لئے تقریباً چھ سو روپیوں کے تیس پاونڈ بنا کر ڈرافٹ جاتا تھا۔ برعکس اس کے جبکہ دس روپیہ کا ساورن تھا تو تیس پونڈ تین سو روپئے میں بن جاتے تھے۔ ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ چنانچہ میں بشرح تیس پاونڈ ماہانہ خرچ کرتا تھا۔

اور بہت کفایت شعاری سے صرف کرتا تھا. جہاں ضرورت ہوتی وہاں بہت روپے صرف کرتا ورنہ دیکھ بھال کر صرف کرتا دو تین ماہ میں معمولی اخراجات سے جو کچھ بینک میں جمع ہو جاتا وہ عمدہ کپڑوں دعوتوں اور تحائف وغیرہ میں صرف کرتا۔ چونکہ بڑے بڑے لوگوں سے میل جول تھا اور ان کی جانب سے میری دعوتیں بھی ہوتی رہتیں اور تھیٹر وغیرہ میں بھی لوگ لیجاتے تو اسکا بدل مجھکو کرنا پڑتا۔ ایک امر مفید مطلب یہ تھا کہ بمقابلہ موجودہ زمانہ کے اس زمانہ میں جہاں ہر جگہ دنیا میں ارزانی تھی انگلستان میں بھی ارزانی تھی اسلئے روزمرہ کے معمولی اخراجات میں روپے کم خرچ ہوتے تھے۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں کسی اچھے محلہ کے بورڈنگ ہاوس میں جہاں صفائی ستھرائی اچھی اور کھانا بھی اچھا ملتا ہے ایک کمرہ کا ڈھائی یا تین ساورن فی ہفتہ دینا ہوتا ہے۔ اسی محلہ اور اسی معیار کے بورڈنگ ہاوس کے ایک کمرہ کا فی ہفتہ تیس شیلنگ یعنی ڈیڑھ پاونڈ اس زمانہ میں دینا ہوتا تھا اسیطرح حوائج ضروری کی مختلف اشیاء کا حال تھا اسوجہ سے معمولی اخراجات میں زیادہ صرف نہیں ہوتا تھا۔ میں جب ۱۹۲۴ء میں انگلستان گیا تو میں نے ۱۹۲۴ء کا ۱۸۹۱ء سے مقابلہ کیا تو بڑا فرق پایا۔

میں نے مسٹر فیروز شاہ سے کہا کہ اب جو بھی نرخ ہو اس کے مطابق میں انگلش ساورن دیتا ہوں اسکے روپے ازراہ مہربانی بنوا کر لا دیجئے۔ چنانچہ میں نے چوبیس ساورن اور چند شیلنگ ان کے حوالہ کئیں۔ جو قلی میرا سامان جہاز سے لایا اور وکٹوریہ فٹن میں رکھا اس کو چار شیلنگ یہ کہہ کر دیدئے کہ میرے پاس ہندی روپیہ نہیں ہے ولایت سے آتے وقت عدن تک تو جہاز پر سوڈا واٹر وغیرہ جو کچھ لیا جاتا ہے اسکی قیمت پاونڈ شیلنگ میں اداکرنی ہوتی ہے۔ عدن سے بمبئی تک جہاز پر جو چیز خریدی جاتی ہے اوسکی قیمت روپیوں میں دینی ہوتی ہے۔ بوجہ روپئے نہ ہونے کے وہاں بھی پاونڈ شیلنگ روپیوں کے برابر دینا پڑا۔ جہاز والوں کے منہ مانگے نرخ کے لحاظ سے روپیوں کا معادل پاونڈ لئے۔ جہاز کی گودی سے جس وکٹوریہ فٹن پر ہوٹل آئے اُس کا کرایہ اور تار جو آتے ہی پٹنہ دیا تھا اُسکی اجرت اور شام کو جو وکٹوریہ پر گیا اوس کا کرایہ۔ یہ سب میں نے ہوٹل کے آفس سے دلوایا تھا اور اپنے حساب میں درج کروا دیا تھا۔

مسٹر فیروز شاہ تھوڑی دیر کے بعد روپئے لیکر آئے تقریباً ساڑھے چار سو تھے میں بازار گیا اور وہاں سے بہت سی چیزیں تحفتہً دینے کیلئے خریدیں۔ مرد عزیز و احباب کیلئے خوبصورت

چھڑیاں سگریٹ اور سگار کیس چمڑے کے رائٹنگ ڈسک مع لکھنے کے لوازمات یعنی اندر عمدہ لفافے کاغذ قلم تراش قینچی۔ کاغذ تراش وغیرہ ایسے کئی نئے مستورات کیلئے عمدہ عمدہ ریل کے کارخانہ کی۔ سینٹ کی شیشیاں صابن ریشمی رومال۔ خوبصورت چمڑے کے جولری باکس سوئنگ باکس جس کے اندر تمام سینے پرونے کشیدہ کاڑھنے وغیرہ کے لوازمات رہتے ہیں اور اپنے لئے ایک ولایتی بنا ہوا ٹفن باکس جس کے اندر چھری کانٹے پلیٹین تھیں۔ علاوہ ان کے ایک ہولڈ آل لیا۔ میرا ہنڈ بیگ جو ولایت جاتے کے وقت لیا تھا۔ پرانا ہو جانے کی وجہ سے وہیں کسی کو دیدیا تھا۔ اس لئے ایک نیا لیا۔ ڈرسنگ کیس چھوٹا تھا اس لئے بڑا لیا۔ اور دو سن ہیٹ یعنی ٹوپیاں لیں ایک مٹوے کی گرے رنگ کی یعنی ہلکا آسمانی رنگ۔ اس زمانہ میں کرزن اور سن ہیٹ وغیرہ کا پتہ دنیا میں نہیں تھا۔ گرے ہیٹ جو میں نے لی تھی اسکی نقل کچھ ترمیم کے ساتھ کرزن ہیٹ بنائی گئی۔ دوسری سن ہیٹ پتہ کی ایل اوڈ کے کارخانہ کی لی علاوہ ان کے ایک اسٹرا ہیٹ جس کو بوٹر کہتے تھے۔ میں نے خریدی ان ٹوپیوں کی یورپ میں نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ بازاروں میں ملتی ہیں ٹراپیکل کنٹری (Tropical Country) میں تمازت آفتاب جہاں زیادہ ہے استعمال میں آتی ہیں۔ یورپ کی چند ٹوپیاں جن کی لندن کی فیشن ایبل سوسائٹی میں ضرورت ہوتی ہے ساتھ لایا تھا۔ ایک تو سیاہ سلک ہیٹ جسکو ٹاپ ہیٹ اور مذاقیہ چمنی پاٹ بھی کہتے تھے۔ بعض لوگ لانج کوٹ یا ڈبل ایفر کوٹ پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کو فرک کوٹ سوٹ یا مارننگ کوٹ سوٹ پر استعمال کرتے ہیں۔ دوسری ٹوپی پارک ہیٹ تھی یہ گرے رنگ کی یعنی نیم یا ہلکا آسمانی رنگ فلٹ کی ٹوپ ہیٹ کی وضع کی ہوتی تھی اور یہ ٹوپی بھی فرک کوٹ سوٹ یا مارننگ سوٹ پر پارک اور باغات وغیرہ میں جانے کے وقت استعمال کی جاتی تھی۔ تیسری ٹوپی فولڈنگ اوپرا ہیٹ تھی جو سیاہ الپاکے کپڑے سے بنائی جاتی تھی۔ وضع تو ٹوپ ہیٹ سے مشابہ مگر فولڈنگ ہوتی تھی یعنی تہ کر لی جاتی تھی اور اوس کو تھیٹر یا اوپرا جاتے وقت ڈریس سوٹ پر پہنتے تھے۔ چھوٹی ٹوپی براون بولر تھی سیاہ رنگ کی بھی ہوتی تھی بانات یا فلٹ سے بنائی جاتی تھی۔ سیاہ رنگ کی عوام یا بڈھے پہنتے تھے۔ لندن میں اب یہ مستعمل نہیں ہے۔ اس کی جگہ سوفٹ فلٹ ہیٹ نے لیلی ہے جو مختلف رنگوں کی ہوتی ہے۔ اور پوشاک کے رنگ سے ملا کر استعمال کی جاتی ہے۔ میری پانچویں ٹوپی یاٹنگ کیپ (Yachtingcap) جو اسٹیمروں اور جہازوں پر استعمال کی جاتی ہے بوٹر ہیٹ صرف لانج سوٹ یا ڈبل دفر سوٹ پر استعمال میں

آتی تھی اور یا ئنگ کیپ برنگ نیوی بلو سرج کے ٹونچ کوٹ سوٹ پر پہنی یا اوڑھی جاتی تھی چونکہ فیشن کا ذکر آگیا ہے اس سلسلہ میں چند باتیں لکھنی مناسب موقع خیال کرتا ہوں۔

سارے یورپ کے ملکوں میں مردوں کے لباس کلاہ و پاپوش وغیرہ کی لندن سے نقل کیجاتی اور عورتوں کے فیشن کی نقل پیرس فرانسیسی طریقہ تلفظ کے لحاظ سے پیری دارالسلطنۃ فرانس کی نقل کی جاتی تھی۔ پھر لندن میں مردوں کے فیشن کے لیڈر قائد اسوقت کے پرنس آف ویلز (بعد کو شاہ انگلستان ایڈورڈ ہفتم) سمجھے جاتے تھے۔ جس قطع و برید کے سوٹ یعنی لباس اور پاپوش و کلاہ وغیرہ پرنس آف ویلز استعمال کرتے سارے یورپ میں مخصوص انگلستان میں اس کی نقالی کیجاتی اور دولتمند لوگ اپنے سوٹ (لباس) انہی درزی سے سلواتے جو پرنس کے کپڑے سیتا اور پاپوش ساز بھی وہی ہوتا جہاں پرنس کے جوتے تیار ہوتے۔ اسی طرح اسی کلاہ ساز و کلاہ فروش سے ٹوپیاں خریدتے جو پرنس موصوف کا ہیٹر یعنی کلاہ فروش ہوتا۔

اسی زمانہ میں پرنس موصوف کا خیاط پول نامی درزی تھا اور پاپوش ساز لاب نامی ایک شخص تھا ان دونوں کی دوکانیں یا کارخانے سنٹ جیمس اسٹریٹ میں قریب قریب تھے وہ کلاہ ساز ہیٹکتھہ نامی تھا۔ اس کی دوکان ہائیڈ پارک کارنر میں تھی یہ لوگ بہت گراں فروش تھے مگر ساتھ ہی اس کے جس قسم کی چیزیں ان کے ہاں ملتیں وہ کمیاب یا نایاب ہوتیں مجھے بھی کچھ دنوں یہ خبط ہوا تھا کہ کئی سوٹ پول سے بنوائے اور دو جوڑے جوتے لاب سے تیار کروائے۔ اپنی اوورا ہیٹ اور ایک پارک ہیٹ ہیٹکتھہ سے خریدی تھی۔ اس جگہ پر یہ بھی قابل ذکر ہے کہ لندن میں میں نے دیکھا کہ جب کسی سے نئی دوستی ہوجاتی تو تھوڑی بے تکلفی کے بعد نیا دوست اپنے نئے دوست سے یہ پوچھتا تھا کہ آپ کا درزی کون ہے اس سے وہ پتہ اپنے نئے دوست کی دولت اور فیشن کا لگاتا۔ پھر دوسرا بھی اس سے یہی سوال کرتا کہ تمہارا درزی کون ہے۔ کہاں یعنے کس محلہ میں اس کی شاپ ہے۔

علاوہ پرنس کے درزی اور پاپوش ساز اور ہیٹر کے جہاں ساری دنیا لندن کی تھوڑا ہی جاتی تھی۔ ایک مقام وسٹ اینڈ ہے یعنی لندن کا مغربی حصہ۔ یہاں کے درزی اور جوتے والوں یا اور پیشہ وروں سے معاملہ کرنا بھی صحیح مذاق اور دولتمندی کی علامت ہوتی۔ وسٹ اینڈ میں ایک مقام برلنگٹن آرکیڈ ہے وہاں کی دوکانوں سے قمیص کالر اور ٹائیاں لینی فیشن میں داخل ہے۔ علاوہ اس سوال کے کہ تمہارا درزی کون ہے۔ اور اس کی دوکان

کہاں ۔ ایک دوسرا سوال بھی نئے دوست سے کیا جاتا ہے ۔ تمہاری سکونت کہاں ہے وسٹ اینڈ یا ڈبلکس یعنی غربی جنوبی محلوں میں جیسے بلگریو اسکوائر کنڈرگن پلیس چیشم پلیس وغیرہ محلوں کے رہنے والے دولتمند بھی ہوتے ہیں ۔ پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ تم کس کلب کے ممبر ہو جس سے دو باتیں مستخرج ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ پالیٹکس یعنے سیاسیات میں شخص مخاطب کے خیالات کس قسم کے ہیں ۔ کنزرویٹو ٹوری میں یا لبرل وریڈیکل ہیں اور پھر اُس کلب کی کیا وقعت ہے ۔

میرے زمانہ میں لبرل اور ریڈیکل یعنے بہت آزاد خیالات کے جو دولتمند اشخاص ہوتے تھے وہ برٹش نیشنل لبرل کلب کے ممبر ہو جاتے تھے جس کے لئے دو ممبروں کی تحریک و تائید کی ضرورت ہوتی تھی ۔ میں رائے بہادر تیج نراین سنگھ کی تحریک اور ڈاکٹر ملک کی تائید سے نیشنل لبرل کلب کا ممبر ہوا تھا ۔ علاوہ اس کے اور بھی لبرل خیالات والوں کے کلب تھے مگر اسقدر وقیع اور موقر نہ تھے ۔ اسی طرح کنسرویٹو خیالات والوں کے بھی بہت سے کلب تھے ۔ مگر سب سے زیادہ وقیع و موقر کارلیٹن کلب تھا جس کے ممبروں میں لارڈ اور ڈیوک شریک تھے ۔ اسکا ممبر ہونا مشکل تھا اور اسکا ہر ایک ممبر بڑی وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا ۔

یہ جو باتیں میں نے ابھی لکھیں ان سے لندن کے تمدن پر روشنی پڑتی ہے ۔ بہر حال میں بازار سے دو سو سے کچھ زیادہ روپیوں کا سامان خرید کر لایا صبح کے دس بجے کا گیا ہوا ایک بجے ہوٹل واپس آکر لنچ کھایا اور تھوڑی دیر قیلولہ کیا تین بجے بیدار ہوا ہوٹل کے مینجر کے آفس سے ٹیلیگرام کے چند فارم منگوائے ایک فارم پر بمبئی سے روانگی کی تاریخ اور وقت اور پٹنہ پہنچنے کی تاریخ وقت لکھہ کر اسکی چند کاپیاں پٹنہ کے بعض عزیزوں اور بعض دوستوں کے نام لکھہ کر مینجر کے دفتر میں بھجوادیں کہ مینجر روانہ کردیں اور جو کچھہ اُجرت ہو دیدیں ۔ اور میرے حساب میں لکھہ دیں روانگی کی تاریخ دوسرے دن کی ڈالی تھی مینجر اپنے آفس میں نہ تھے بٹلر ان کے آفس میں رکھہ کر آیا یہ بھی حسن اتفاق کہ تار روانہ ہونے نہیں پایا تھا کہ اسی اثنا میں بٹلر نے ایک کارڈ لاکر دیا جس پر حکیم ابوالحسن لکھنوی معتمد انجمن اثنا عشری لکھا تھا اور زبانی یہ کہا کہ تین صاحب لوگ آئے ہیں ۔ اُن کو ڈرائینگ روم میں بٹھا کر آیا ہوں میں نے کہا جاکر کہو کہ میں ابھی آتا ہوں ۔ چنانچہ میں نے ڈرسنگ گاؤن پہن لیا اور نیچے گیا ۔ یہ تینوں حضرات مجھکو دیکھہ کر کھڑے ہوگئے اور بہت گرمجوشی سے مصافحہ کیا اس امر پر اظہار مسرت کیا کہ ایک شیعہ برادر بیرسٹر ہوکر آیا ہے ۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کو یہ کسطرح معلوم ہوا کہ میں شیعہ ہوں ۔ اور

میرے بمبئی آنے کا حال کیونکر معلوم ہوا۔ اخبار میں یورپ آنے جانے والے مسافروں کی جو فہرست چھپتی ہے اس سے جہاز نشین میں آپ کے بمبئی آنے کا حال معلوم ہوا اور آپ کا اسم گرامی اور شیعہ ہونے کی کیفیت اسوقت سے معلوم ہے جبکہ آپ یورپ تشریف لے گئے تھے۔ کل جس وقت سے آپ کا نام انڈیا آنے والوں کی فہرست میں پڑھا گیا۔ مختلف ہوٹلوں میں جا جا کر میرے آدمیوں نے دریافت کیا کہ آپ کس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ چنانچہ آج صبح کو اسی ہوٹل کا پتہ لگا اس کے بعد میں نے انجمن اثنا عشری کے حالات اور مقاصد وغیرہ دریافت کئے۔

اُنہوں نے کہا کہ یہ انجمن چھ سات سال سے قائم ہے۔ علاوہ ہندوستانیوں کے بہت سے شیعہ خوجے بھی اس کے ممبر ہیں۔ ایک غرض اور بڑی غرض یہ ہے کہ شیعہ نادار بچوں کی تعلیم میں مالی امداد دی جائے اور جو مومنین و مومنات عتبات عالیات زیارات کو تشریف لے جاتی ہیں۔ ان کو بشرط ضرورت جس قسم کی امداد کی حاجت ہو دی جائے۔

پھر حکیم صاحب نے کہا کہ یہ وفد جو آپ کے سامنے حاضر ہے وہ اس غرض سے آیا ہے کہ آپ کی دعوت چائے نوشی کی انجمن کی جانب سے کی جائے اُمید ہے کہ آپ ہماری دعوت قبول فرمائیں گے۔ اور جو روز و وقت سہولت کا ہو اس سے ایما فرمایا جائے۔ میں نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں نے ابھی تار لکھا ہے۔ جس سے روانگی کی تاریخ کل کی اور وقت شب کے آٹھ بجے کا لکھا ہے۔ کل چار بجے میں آسکتا ہوں۔

ان میں سے کسی صاحب نے کہا کہ ہم لوگوں کی خاطر سے ایک دن اور قیام فرمائیں اور دوسرا تار دیدیں تو بیحد باعث ممنونیت ہوگا کیوں کہ آج کا دن تو گیا شام ہونے کو آئی ہے کل کے چند گھنٹے اس میں انتظام ضروری کرنا اور دعوت نامے ممبروں کے نام بھیجنے بہت وقت طلب امر ہے میں تھوڑی دیر خاموش رہ کر سوچنے لگا کہ کیا کروں۔

پھر یہ خیال آیا کہ منیجر سے دریافت کروں کہ تار روانہ کردیا یا نہیں۔ فوراً ایک بٹلر کو بلا کر کہا کہ منیجر صاحب سے جاکر دریافت کرو کہ میرا تار روانہ کردیا یا نہیں۔ بٹلر نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ تار نہیں گیا ہے۔ کیونکہ منیجر صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور ان کے میز پر چند فارم تار کے آپ کے کمرہ کا ملازم لاکر رکھ کر گیا یہ سن کر مجھے بیحد خوشی ہوئی میں نے کہا کہ وہ فارم سب اُٹھا لاؤ۔ چنانچہ وہ دوڑتا ہوا گیا اور سب فارم اُٹھا لایا۔

میں نے حکیم صاحب سے کہا کہ یہ آپ حضرات کی خوش نیتی کا باعث ہے کہ میرے تار

حسن اتفاق سے مینجر کی عدم موجودگی کی وجہ سے اب تک روانہ نہیں ہوئے۔ میں دو دن کا وقت آپ کو دیتا ہوں اور تاریخ روانگی بڑھا دی اور ان سے کہا کہ پرسوں چار بجے دعوت کا وقت مقرر کیجئے غالباً اسقدر وقت ضروری انتظام اور دعوت ناموں کی تقسیم وغیرہ کے لئے کافی ہو گا۔ میں بعوض کل کے انشاء اللہ چوتھے دن روانہ ہو جاؤں گا۔

ان حضرات نے بمسرت دلی میرا شکریہ ادا کیا اور ایک صاحب نے یہ بھی کہا کہ ممبران انجمن پر بڑا احسان آپ نے کیا اور یہ کہا کہ حقیقی ہمدردی قومی اور ملت پرستی اسی کو کہتے ہیں دو دن کے زیادہ قیام سے ہوٹل کے اخراجات گو آپ کے نزدیک کوئی حقیقت نہ رکھتے ہوں کیوں کہ باری تعالےٰ نے آپ کو صاحب ثروت بنایا ہے لیکن ہم تو اس کو ضرور محسوس کرتے ہیں اور صرف ہم لوگوں کی دلدہی کے خیال سے آپ اس کی پروا نہ کریں گے۔ پھر بہت سے جملے میری توصیف و ثنا کے کہے اور کچھ دعائیہ جملے بھی کہے اور یہ اُمید ظاہر کی کہ آیندہ زندگی میں اپنے مذہب اور برادران دینی کی ترقی دارین کیلئے کوشاں رہوں گا۔

میں نے حکیم صاحب سے کہا کہ اسی ہوٹل میں اندنوں سید عقیل صاحب بلگرامی خلف نواب عماد الملک بہادر بھی مقیم ہیں۔ ان کو میں بلواتا ہوں آپ ان کو بھی مدعو کیجئے۔ حکیم صاحب نے کہا ضرور بلوائیے بسر و چشم ان کو مدعو کروں گا۔

چنانچہ ان کے کمرہ میں سے ان کو بلا کر اُنکا تعارف کروایا۔ ان کو دعوت دی گئی واپس جانے سے قبل کاغذ و قلم دوات منگا کر پتہ مقام کا جہاں دعوت ہونے والی تھی لکھ کر مجھے دیا اور کہا کہ تقریباً ہر وکٹوریہ فٹن کا کوچمین اس مقام سے واقف ہے۔ میں نے ان لوگوں کی تواضع چائے اور کیک وغیرہ سے کی اور سگار اور سگریٹ پیش کئے ان کے بشروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت خوش جا رہے ہیں اور ان کے دل جذبہ تشکر سے لبریز ہیں جب وہ لوگ جا چکے تو میں بیٹھے بیٹھے تار کے دوسرے فارم منگا کر میں نے تاریخ و وقت روانگی لکھ کر مینجر کے آفس میں روانہ کرنے کیلئے بھیجدئے۔ اور پہلے والے فارم چاک کر ڈالے۔

تیسرے پہر کو چار کے بعد یہ لوگ آئے تھے۔ ایک گھنٹہ سے زیادہ بیٹھے۔ مختلف مباحث پر گفتگو ہوتی رہی۔ خصوصاً بمبئی کے شیعوں کی تعلیمی حالت اور نوجوں کی تجارتی ترقی وغیرہ کے متعلق انجمن کی مالی حالت اور تعداد ممبروں کی اور ان میں زیادہ دلچسپی لینے والے کتنے اشخاص ہیں وغیرہ وغیرہ امور میں نے دریافت کئے ان میں سے ایک صاحب سے یہ

معلوم ہوا ہے کہ معتمد انجمن حکیم ابوالحسن صاحب انجمن کے کاروبار سے بہت شغف وانہماک رکھتے ہیں۔ ذریعہ معاش ان کا پیشہ طبابت وحکمت ہے اور مطب ان کا شاہراہ ترقی پر ہے۔ جاڑوں کے دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ شام جلدی ہو گئی۔ ہوا خوری کو جانے کا وقت نہ رہا۔ سید عقیل صاحب اور میں چہل قدمی کیلئے ہوٹل کے باہر گئے اور قریب پاس کی سڑکوں پر ٹہل کر واپس آ گئے اتنے میں ڈنر کا وقت آ گیا۔ صبح کو ایک وکٹوریہ فٹن منگا کر کرافرڈ مارکیٹ میں گئے۔ اور تھوڑے میوے خرید لائے۔

تیسرے پہر کو بذریعہ وکٹوریہ کلابہ وغیرہ کی طرف ہوا خوری کو گئے۔ مسٹر گرین کے رسٹران میں جاکر چائے پی۔ واپسی کے وقت فورٹ (قلعہ) میں جو میکرا پولو اٹالین سگریٹ اور سگار فروش کی دوکان ہے وہاں سے ایک ٹین کا بکس سگریٹ کا خریدا مکرا پولو کی دوکانیں انڈیا کے دوسرے شہروں میں بھی ہیں۔ خصوصاً کلکتہ کی دوکان بہت بڑی ہے۔ بزمانہ قیام کلکتہ میں وہاں سے اکثر سگریٹ خریدتا تھا۔

تیسرے دن سہ پہر کو انجمن اثنا عشری میں جانے کے لئے وکٹوریہ فٹن منگائی اور مسٹر عقیل سے کہا کہ اب چلنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہاں میں نے کہا یاد نہیں انجمن اثنا عشری والوں نے ہم لوگوں کی چائے نوشی کی دعوت کی ہے انہوں نے کہا اچھا تو میں کپڑے پہن لیتا ہوں۔ چنانچہ وہ بھی تیار ہو گئے۔ انجمن کے مکان کا پتہ وکٹوریہ والے کو بتلا کر ہم دونوں آدمی سوار ہو گئے اور انجمن کے مکان میں جو دو منزلہ تھا پہنچے۔ وہاں دروازہ پر چند آدمی ہمارے استقبال کو کھڑے تھے۔ بالاخانہ پر گئے نشست کرسیوں کی نہ تھی صاف ستھرا شطرنجی اور چاندنی کا فرش تھا بہت سے لوگ آ چکے تھے اور اسی فرش پر بیٹھے تھے۔

سب سروقد تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ ہمارے وہاں پہنچنے کے بعد کچھ اور لوگ آئے۔ حکیم ابوالحسن صاحب سکرٹری انجمن بہت پیش پیش تھے۔ چائے اور کیک اور بسکٹ وغیرہ سے سب لوگوں کی تواضع کی گئی۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے ایک صاحب سے کہا کہ آپ کچھ فرمایئے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر ایک تقریر کی۔ انجمن کی غرض وغایت بیان کی۔ پھر شیعوں کی مفلسی اور عام جہالت اور قومی کاموں سے دل چرانے وغیرہ کا مرثیہ پڑھا۔ اسکے بعد کہا کہ یورپ سے تعلیم پاکر جو حضرات آ رہے ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں۔ اور ان کو چاہئے کہ اپنی قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کی ناخدائی کریں۔ پھر میرے متعلق کچھ تعریف کے

کلمے کہے اور کہا کہ قوم کی اُمیدیں میرے جیسے لوگوں سے وابستہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد کھڑے ہو کر میں نے ایک تقریر کی جن امور کا ذکر مقرر نے کیا تھا۔ ان کے متعلق اپنے خیالات بیان کئے اور انجمن اثنا عشری کے وجود کو مفید ملت بتلاتے ہوئے میں نے اُمید ظاہر کی۔ انجمن قوم کی بھلائی اور بہبود کے لئے عملی کام کرتی رہے گی۔ اس کے بعد ممبران انجمن کا شکریہ ادا کیا کہ اُنہوں نے میرے لئے جو زحمت اُٹھائی اور میری دعوت کی جس سے حقیقی جذبۂ اخوت ثابت ہوا وغیرہ وغیرہ۔

میں نے بڑی لمبی چوڑی تقریر کی تھی۔ اسوقت مجھے یاد نہیں ہے کہ کیا کیا کہا تھا میری تقریر ختم ہونے پر دو تین صاحبوں نے میری اردو دانی کی تعریف کی اور بعض نے یہ بھی کہا کہ جو لوگ یورپ سے واپس آتے ہیں یا تو حقیقتاً اردو بھول جاتے ہیں۔ یا اردو میں گفتگو کرنی کسر شان اور صاحبیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور جو بولتے بھی ہیں تو صاحبی اردو بولتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بیرسٹر صاحب کو (مجھکو) اپنی مادری زبان سے اُنس ہے کہ تازہ ولایت ہونے پر اسقدر طویل تقریر زبانی وہ اسقدر روانی سے فرمائی۔ بیرسٹر صاحب نہایت شستہ اور فصیح اردو بولتے ہیں میں چپکا سنتا رہا۔

پھر میں نے کہا کہ ان مسلمان طلبا کی جو بنگالہ یا بمبئی وغیرہ کے متوطن ہیں۔ اگر اچھی اردو نہ بولیں تو قابل معافی ہے۔ لیکن شمالی ہند اور بہار کے رہنے والے جن کی مادری زبان اردو ہے تین چار سال میں اردو بھول جانا ان کے لئے تعجب خیز امر ہے۔ چلتے وقت میں نے حکیم صاحب کو تین کرنسی نوٹ دو دس دس کے اور ایک پانچ کا دیکر کہا کہ انجمن کے فنڈ میں یہ میری حقیر رقم جمع کر دیجئے میں اسوقت مسافرت میں ہوں ورنہ اس سے زیادہ خدمت کرتا انشاء اللہ وطن پہنچنے کے بعد جو کچھ ہو سکے گا وقتاً فوقتاً انجمن کی خدمت کرتا رہوں گا بشرطیکہ انجمن کے حالات اور کاروبار سے آپ مجھے باخبر رکھیں۔ اُنہوں نے پہلے تو نوٹوں کے لینے سے انکار کیا مگر میرے اصرار پر قبول کر لیا۔

بعض حضرات نے دریافت کیا کہ کب اور کس وقت کی ٹرین سے بمبئی سے روانہ ہوں گے۔ قبل اس کے کہ میں جواب دوں۔ حکیم صاحب نے جن کو میری روانگی کا حال ہوٹل میں معلوم ہو چکا تھا بولے کہ انشاء اللہ کل شب کے آٹھ بجے کے میل ٹرین میں بیرسٹر صاحب اپنے وطن تشریف لیجائیں گے۔

دوسرے دن جب میں اسٹیشن آیا تو حکیم ابوالحسن صاحب اور بہت سے ممبران انجمن مجھے رخصت کرنے اور خدا حافظ کہنے اسٹیشن پر پہلے سے موجود تھے۔ ایک بہت بڑا گلدستہ حکیم صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ اور چند لوگوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے۔ مسٹر عقیل بھی مجھے پہنچانے آئے تھے۔ دو تین گجرے میں نے ان کو دیدئے۔ اور ایک انگریز منیجر نام اس کا بھولتا ہوں جہاز میں میرے ہم سفر تھا۔ اور جہاز پر اکثر اس سے باتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ مع اپنی بیوی کے کرکی (پونہ) اسی ٹرین میں جارہا تھا۔ میں نے گلدستہ اس کی میم کو دیدیا بڑے بڑے ٹرنک بریک میں رکھوا دئے گئے جن کا محصول مجھکو الگ دینا پڑا یہ بہت وزنی تھے اور ان میں کتابیں تھیں مخصوص تین موضوع پر میں نے اچھا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ ایک تو سائنس اور مذہب کے متعلق یعنی مذاہب عالم کو سائنس سے تطابق ہے۔ یا تخالف اور مذہب اسلام سائنس جدیدہ کے خلاف ہے یا موافق۔ دوسرا موضوع یہ تھا کہ اسلام کے موافق اور مخالف۔ جسقدر لٹریچر مجھکو مل سکا تیسرا موضوع انگریز قوم کے متعلق تھا۔ انگریزوں کی معاشرتی اور سیاسی زندگی پر خود انگریز مصنفوں اور غیر اقوام نے جو تنقیدیں کی ہیں۔ علاوہ ان کے جنرل لٹریچر تواریخ ناول ڈرامے۔ شاعری وغیرہ کے متعلق پانچسو سے زیادہ کتابیں تھیں۔

پٹنہ پہنچے

سب سے رخصت ہوا ٹرین نے سیٹی دی تیسرے دن جب میری ٹرین مغلسرا دن کے دو بجے پہنچی تو اسٹیشن پر میرے بھانجے سید محمد حسین مرحوم اور برادرزادہ سید احمد علیخان بہادر موجود تھے مجھکو دیکھکر بے انتہا خوش ہوئے۔ میرے خانہ میں آگئے خوب گلے ملے اور میرے ساتھ پٹنہ چلے۔ جب میری ٹرین داناپور اسٹیشن پر پہنچی تو چار پانچ احباب وہاں پیش قدمی اور استقبال کے لئے پہلے سے موجود تھے جن میں ایک سید محمد صالح رئیس بارہ ساکن پٹنہ جن کے فرزند سید محمد اعظم ایم۔ اے اڈیٹر ادیب ہیں۔ جو رسالہ لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ اور محمد اعظم لکھنؤ کے کسی کالج یا اسکول میں پروفیسر ہیں۔ دوسرے نواب سید احمد حسین خان رئیس گذری پٹنہ میرے مخصوص دوستوں میں تھے۔ مجھے دیکھکر ان لوگوں کی خوشی بے پایاں تھی۔ یہ بھی میرے خانہ میں آگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب بانکی پور ٹرین پہنچی تو وہاں بھی چند احباب میرے ٹرین کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان میں دو نام یاد ہیں۔ نند کشور اور مدن موہن لال جو بچپنے سے سٹی اسکول کے ہر کلاس میں میرے

ساتھ تھے ۔ اور یورپ جاتے وقت تک ان کے سارے خاندان والوں سے اور مجھ سے بہت خلوص واتحاد تھا ۔

سر مغرب ٹرین منزل مقصود بیگم پور اسٹیشن پہنچی پلیٹ فارم پر ایک دریا انڈا ہوا تھا ۔ بہت سے لوگ تلے اوپر میرے خانہ میں گھسے جہاں پہلے ہی سے بہت عزیز واحباب بیٹھے تھے بمشکل میں باہر نکلا ۔ ہر شخص چاہتا تھا مجھے گلے لگائے چار پانچ آدمیوں نے مجھے حلقہ میں لے لیا ورنہ نہ معلوم میرا کیا حال ہوتا ۔ میرے خیال میں تین چار سو آدمیوں کا مجمع تھا جنہیں ہندو مسلمان روسا مختلف عمر کے تھے ۔ سو سوا سو پٹنہ سٹی ہائی اسکول کے طلبا اور بہت سے اساتذہ تھے یہ وہی اسکول جو میرا قایم کیا ہوا تھا ۔ اتنے لوگوں کے آنے کا سبب یہ ہوا کہ بہت سے تو میرے والد مرحوم کے دوست اور میرے اسکول اور کالج کے دوست تھے ۔

علاوہ ازیں بعد کو معلوم ہوا کہ میرے آنے کی اطلاع کے متعلق میرے پھوپھی زاد بھائی ڈپٹی ہادی علیخان صاحب نے اور سید منجھلے نواب صاحب نے رقعے تقسیم کر کے لوگوں کو مدعو کیا تھا ۔ سید منجھلے نواب صاحب اپنا چوکڑا بڑی ویگنٹ گاڑی میں چار گھوڑے جتے ہوئے اور خود ہانکتے ہوئے میرے لینے کو آئے تھے اسکول کے لڑکوں نے کہا کہ گھوڑے علحدہ کیے جائیں ہم لوگ گاڑی چلا کر منجھلے صاحب کو پہنچائیں گے گاڑی میں آنے کے بعد میں کھڑا ہو گیا اور مختصر تقریر کے ذریعہ سب لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں نے اسکول اس لئے قایم کیا کہ انسانی صفات وخصلت تم میں آئے نہ کہ آدمی سے جانور بن کر گھوڑوں کا کام کرو ۔ اس پر بہت قہقہہ لگا ۔ جس راستہ سے میرا چوکڑا گیا کوٹھوں پر کچھ لوگ بیٹھے تھے ان لوگوں نے وہیں سے بڑے زور سے چیرز دیے یعنی تصفیق کے نعرے لگائے تھری چیرز فار مسٹر ہمایون مرزا سیف ریٹرن اینڈ ویلکم ٹو ہوم Three Cheers for Mr Humayun Mirza safe return and welcome to home

میں نے ان لوگوں کو پہچانا نہیں یہ کون لوگ تھے رات آ چکی تھی گو چاندنی چھٹکی تھی مگر گرد دھندلی اور گاڑی تیز جا رہی تھی منجھلے نواب صاحب جو میرے برابر بیٹھے گاڑی ہانک رہے تھے ان سے پوچھا کہ آپ نے پہچانا یہ کون لوگ ہیں انہوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی جب گھر پر پہنچا تو وہاں بھی بہت سے لوگ جمع تھے جن میں میرے شفیق استاد مرحوم اعظم علیخان صاحب بھی تھے

ان کو کسی کام میں دیر ہوگئی اسٹیشن نہ آسکے تھے مجھے گلے سے لگایا اور خوشی کے آنسوان کی آنکھوں سے جاری تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد زنانہ میں گیا مستورات کی خوشی کا احاطہ ناممکن تھا صبح سے لوگ ملنے کو آنا شروع ہوئے۔ وہ لوگ جو اسٹیشن گئے تھے اور روا روی میں مجھ سے مل نہ سکے اور جو اسٹیشن نہ گئے تھے وہ بھی آتے رہے۔

تیسرے دن سے پارٹیوں کا سلسلہ شروع ہوا چونکہ میں پہلا شخص خاص پٹنہ شہر کا باشندہ اور ایک قدیم و معزز خاندان کا رکن تھا۔ اسلئے پٹنہ والوں نے پرجوش میرا خیر مقدم کیا چنانچہ ایک پارٹی میں ایک صاحب نے تقریر کرتے وقت یہ جملہ کہا تھا کہ پٹنہ کے قرب وجوار کے کچھ طلبا یورپ سے تعلیم حاصل کرکے آئے ہیں۔ لیکن خاص پٹنہ شہر کے ہندو اور مسلمان باشندوں میں سے مسٹر ہمایون مرزا پہلے شخص ہیں خصوصاً جس نامی گرامی باپ کے یہ فرزند ہیں اور جس خاندان عالی کے یہ رکن ہیں اسکی نظیر تو سارے صوبہ بہار میں نہیں نکلیگی اسٹیشن پر جو لوگوں نے میرا استقبال کیا اسکی کیفیت پٹنہ کے مارننگ پوسٹ اخبار اور لاہور کے پیسہ اخبار نے بشرح وبسط شایع کی تھی اور دبدبہ سکندری وغیرہ اخبار میں بھی انگلستان سے کامیاب واپس آنیکا تذکرہ درج تھا۔ میری تصویر بھی نکلی تھی۔ میری واپسی کے چھٹے یا ساتویں دن پٹنہ سٹی ہائی اسکول کی جانب سے لڑکوں اور اساتذہ نے ایک بڑی ٹی پارٹی دی۔ اس زمانہ میں ایٹ ہوم کی تقریب پٹنہ میں جاری نہیں ہوئی تھی۔ البتہ میں لندن میں بہت سے ایٹ ہوم میں شریک ہوا اور وہاں تیسرے پہر کے علاوہ راتوں کو بھی ایٹ ہوم دیا جاتا تھا۔ اور کارڈ میں وقت تعین کیا جاتا تھا یعنی رات کے آٹھ سے دس تک یا شام کے چار سے چھ تک پٹنہ میں جتنی پارٹیاں مجھکو دیگئیں وہ سب تیسرے پہر کو اور ٹی پارٹی کے نام سے نامزد کی گئیں۔

اسکول کی پارٹی میں اسوقت کے ہڈ ماسٹر مسٹر گپتا ایم۔اے نے انگریزی میں منظوم ایڈریس دیا اور چھپی ہوئی کاپیاں حاضرین کو تقسیم کیں۔ علاوہ اس منظوم ایڈریس کے پہلے زبانی تقریر مسٹر گپتا نے کی۔ اور اسکول کے قیام اور اسکی ترقی میں جو کچھ کوشش میں نے کی تھی اوسکا ذکر کیا۔ اور میرے غیاب میں چار سال تک اسکول نے جو کچھ ترقی کی لڑکے جتنے سال بسال انٹرنس (میٹرک) میں کامیاب ہوے سبکا ذکر کیا اور آیندہ کی اسکول کی ترقی میرے دامن سے وابستہ کی اور بہت کچھ امیدیں ظاہر کیں میں نے بھی انکی تقریر کا جواب انگریزی میں دیا (نوٹ) وہ اسکول ابتک عالم وجود میں ہے اور ہندوں کے ہاتھ میں ہوگیا ہے۔ نام اسکا نہ معلوم کیوں پٹنہ سٹی ہائی اسکول سے

بدل کر سلور جوبلی اسکول رکھا گیا ہے) سید منجھلے نواب صاحب کو جہاں دنیا بھر کی چیزوں سے شوق ہے دریا گنگا کی دیولی گھاٹ پر ایک بڑا اسٹیمر بھی ان کا رہتا تھا جس کے لئے ایک خاص عملہ مقرر تھا ایک انجنیئر اور چند اور ملازمین تھے۔ اسٹیمر میں کراکری وغیرہ رہتی تھی جب صبح یا تیسرے پہر کو چائے یا ناشتہ کرنا یا دوپہر کا کھانا نواب صاحب کو یہیں منظور ہوتا تو باورچی اور خانساماں وغیرہ کوٹھی سے آجاتے تھے کئی روز علی الصباح منجھلے نواب صاحب مجھکو لے کر اسٹیمر پر گئے وہیں صبح کا ناشتہ کیا اور دور تک گنگا کی سیر کر کے واپس آگئے۔

میرے عزیزوں اور دوستوں کا پہلے یہ مشورہ ہوا کہ میں پٹنہ ہی میں وکالت شروع کروں اور بعض کا خیال ہوا کہ میں کلکتہ کے ہائیکورٹ میں وکالت شروع کروں آخر میں سب لوگ اسی پر متفق ہوئے کیونکہ ہمیشہ سے میرا خیال عالی و اولوالعزم طبیعت واقع ہوئی ہے اسلئے میری خواہش بھی یہی تھی کہ کلکتہ کے ہائیکورٹ میں وکالت کروں۔ چنانچہ دو ہفتے پٹنہ میں رہ کر کلکتہ گئے اور ہائیکورٹ میں ینرول ہوئے یہ امر قابل ذکر ہے کہ کلکتہ ہائیکورٹ میں ازروئے لٹرپٹینٹ اور جنل سائڈ میں یعنی اجلاس ابتدائی میں وہی جج اجلاس کرنے کا مستحق ہوتا ہے جو بیرسٹر سے جج مقرر کیا گیا ہو۔ تین گروہ کے لوگ جج بنائے جاتے ہیں ایک تو سویلین جو لوگ کہ ولایت سے تقابل کا امتحان سول سروس پاس کر کے آتے ہیں اور جب وہ ترقی کرتے ہوئے ضلع کے سول سیشن جج ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے جو سینئر اور قابل ہوتا ہے اس کا انتخاب ہائیکورٹ کی ججی پر کیا جاتا ہے۔ میرے زمانہ تک جتنے سویلین اضلاع سے ہائیکورٹ میں آئے وہ سب انگریز تھے۔

دوسرا گروہ ہائیکورٹ کے وکیلوں کا ہے جس میں سے سینئر اور قابل وکیل ہائیکورٹ کی ججی کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ میرے زمانہ تک چند انڈین ہائیکورٹ کے جج ہوئے وہ سب وکیلوں کے گروہ سے ہوئے اور سب کے سب ہندو بنگالی تھے۔ باستثنیٰ ایک کشمیری پنڈت سمبھوناتھ کے جنکا ذکر اوپر کہیں آچکا ہے۔ گروہ بھی وکیل اور ہندو تھے۔ جتنے انڈین ہائیکورٹ کے جج ہوئے وہ سب ہندو وکیل تھے۔

تیسرا گروہ بیرسٹروں کا ہے جس میں سینئر اور قابل فرد ججی کے لئے منتخب کیجاتی ہے چنانچہ بہت سے بیرسٹر وقتاً فوقتاً ہائیکورٹ کے جج منتخب ہوئے۔ گروہ سب انگریز تھے۔ کوئی انڈین بیرسٹر اس وقت تک ہائیکورٹ کا جج نہیں ہوا تھا۔ اور نہ کوئی مسلمان وکیل ہائیکورٹ کا جج ہوا تھا۔ مسٹر سید امیر علی پہلے انڈین بیرسٹر اور

پہلے مسلمان تھے جو کلکتہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے ان کے قبل الہ آباد ہائی کورٹ میں مسٹر سید محمود مرحوم کے سوا انڈیا کے کسی ہائی کورٹ میں کوئی مسلمان جج نہیں ہوا تھا نہ طبقہ وکلا میں سے نہ بیرسٹروں کے طبقہ سے نہ سولین کے طبقہ سے اول تو اس زمانہ میں صرف ایک سولین مسلمان تھا یعنی محسن طیب جی خلف بدرالدین طیب جی بیرسٹر جو بعد کو بمبئی ہائی کورٹ کے جج ہوئے چونکہ کلکتہ ہائی کورٹ میں اس وقت تک جتنے انڈین جج معدودے چند ہوئے وہ سب وکلا کے گروہ میں سے تھے اور اس لئے از روئے قاعدہ اوریجنل سائڈ یعنی جلسہ ابتدائی میں کبھی اجلاس نہیں کیا یہ بھی قاعدہ ہے کہ جو بیرسٹر ہائی کورٹ میں انرول ہوتا ہے تو اس کو اوتھ آف ایلیجنس لینا ہوتا ہے یعنی اس امر کی قسم کھانی ہوتی ہے کہ وہ تاج برطانیہ کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہیگا اور کبھی بغاوت نہیں کرے گا وغیرہ یہ چند مقررہ جملے ہیں جن کا اعادہ حلفیہ کرنا ہوتا ہے اور جو نیا بیرسٹر انرول ہوتا ہے یعنی ہائی کورٹ کے خاص رجسٹر میں پانسو روپیے فیس دینے کے بعد نام درج رجسٹر بحیثیت ایڈوکیٹ ہائی کورٹ کیا جاتا ہے تو یہ رسم اوریجنل سائڈ کے جج کے روبرو ادا کی جاتی ہے یعنی ایک قسم کی قسم کھائی جاتی ہے۔

سید امیر علی صاحب چونکہ بیرسٹر سے جج ہوئے تھے تو حسن اتفاق سے اس زمانہ میں اوریجنل سائڈ میں اجلاس کر رہے تھے یہ بھی عجیب بات کہ جب سے وہ اوریجنل سائڈ پر آئے تھے کسی نئے بیرسٹر نے اوتھ آف ایلیجنس ان کے ہاتھ پر نہیں لیا تھا میں پہلا بیرسٹر تھا جس نے ان کے ہاتھ پر اوتھ آف ایلیجنس لیا اور صرف پہلا بیرسٹر ہی نہیں بلکہ پہلا انڈین بیرسٹر اور پہلا مسلمان بیرسٹر تھا یہ ایک اور اولیت مجھ کو حاصل ہوئی اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

راجہ رام موہن رائے کے موسوم بنام برسٹل انوز سمٹری جتنے زائرین ۱۸۹۱ء تک گئے تھے ان میں پہلا مسلمان میں تھا اور پٹنہ کے شہریوں میں سے بشمول ہندو مسلمان میں پہلا شہری تھا جو بیرسٹر ہو کر انگلستان سے آیا تھا اور بھی کئی اولیتیں مجھ کو حاصل ہوئیں ہیں جن کا ذکر بر وقت آئے گا۔ جب میں اوتھ آف ایلجنس لے چکا تو صرف رسمیہ نہیں بلکہ دل سے سید امیر علی صاحب نے مجھ کو مبارکباد دی میں علاوہ پہلا بیرسٹر ہونے کے جس نے امیر علی صاحب کے دست مبارک پر اوتھ آف ایلجنس لیا یعنی بیعت کی میرے لئے یہ بڑا فخر تھا کہ جس اوریجنل سائڈ کے جج کے ہاتھ پر بیعت کی وہ پکا مسلمان سید اور مومن تھا اور جس کی قابلیت کی مسلمانوں میں نظیر نہ تھی اور جس نے مسلمانوں کی ایسی خدمت کی جو اس پنج کی کسی اور نے نہیں کی مجموعی حیثیت سے ایک بے مثل ہستی کے ہاتھ پر اللہ نے بیعت کرائی۔

کلکتہ میں پریکٹس شروع کی | اس دن سے بحیثیت ایڈوکیٹ کلکتہ ہائیکورٹ میں نے کلکتہ میں پریکٹس

یعنی وکالت شروع کی پہلے میں نے بہت سی قانون کی کتابیں جاکر خریدیں جو برٹش انڈیا میں رائج ہیں ضابطہ فوجداری ضابطہ دیوانی وغیرہ بیرسٹری کی پڑھائی میں جو ضابطے پڑھائے جاتے ہیں وہ انڈیا میں بیکار ہیں علاوہ اس کے بہت سے قوانین جو وہاں پڑھے تھے ریل پراپرٹی پرسنل پراپرٹی وغیرہ کا تعلق انڈیا سے نہیں ہے اصول قانون شہادت اصول قانون معاہدہ وغیرہ سے انڈیا میں مدد ملتی ہے مگر یہ قوانین یہاں کوڈیفائڈ کئے گئے ہیں یعنی اصول کو دفعات کی شکل میں بناکر ایکٹ بنا دیا گیا ہے غرض ان قوانین کی کتابیں جن کی انڈیا میں ضرورت ہے خریدنی پڑیں چند کتابیں دیوانی و فوجداری کے ضابطے قانون شہادت و معاہدہ وغیرہ لے کر پڑھنا شروع کیا بقیہ کتابیں رفتہ رفتہ خریدتا رہا قانون دریائے ذخار ہے سیکڑوں کتابیں قوانین اصلی کی اور نظائر وغیرہ کی ہر وکالت پیشہ کو مدت العمر خریدنی پڑتی ہیں کلکتہ بار اس زمانہ میں بھی بیرسٹروں اور وکلا سے بھرا تھا وکلا تو عموماً ہندو بنگالی تھے اور چند مسلمان تھے، بیرسٹروں میں زیادہ انگریز وارمینین اور ہندو بنگالی تھے چند مسلمان تھے سولیسٹر ایک مسلمان مسٹر سلطان عالم وہ بھی ایک انگریز کے ساتھ کام کرتے تھے بقیہ سولیسٹر انگلستان کے تعلیم یافتہ انگریز اور چند ہندو بنگالی تھے کلکتہ ہائی کورٹ کے مقدمات اور جنل سائڈ کے یعنی جلسہ ابتدائی کے عموماً وکلا اور سولیسٹروں کے توسط سے بیرسٹروں کے پاس آتے ہیں مسلمان جو چند بیرسٹر تھے وہ اس لئے گھاٹے میں رہتے تھے کہ مسلمان سولیسٹروں کا فقدان تھا ہندو سولیسٹر مقدمات ہندو بیرسٹروں کو دیتے تھے اور انگریز اور ارمینین سولیسٹر اپنی قوم والوں کو دیتے تھے مسلمان بیرسٹر دل تو گنتی کے تھے اُن میں بھی کوئی قابل اور نام بر آوردہ نہ تھا جیسے بنگالی تھے بنگالی سینیر بیرسٹروں میں سب سے زیادہ آمدنی تیس ہزار روپے ماہانہ ڈبلو سی بونرجی کی تھی دس دس بارہ بارہ ہزار ماہانہ کے بھی چند ہندو بنگالی تھے۔ مثلاً مسٹر من موہن گھوش مسٹر پالٹ آر ان مترا وغیرہ تھے مسلمان سینیر بیرسٹروں میں مسٹر عبدالرحمٰن (بعد کو نواب خلف نواب عبداللطیف خان بہادر تھے مگر ان کی آمدنی ماہانہ چھ سات سو سے زیادہ نہ تھی اس لئے انھوں نے عدالت خفیفہ کی بعد کو ججی کرلی تھی ان کے بعد کے مسٹر یوسف علی چندہ کار مگر یہ بھی پانچ چھ سو سے زیادہ نہیں پیدا کرتے تھے اس سے ظاہر ہوگا کہ یہ دونوں لائق اور قابل نہ تھے جونیر بنگالی بیرسٹروں میں مسٹر ایس پی سنہا جو بعد کو لارڈ اور گورنر بہار ہوئے اور مسٹر سی آر داس۔ مسٹر اے جے ڈی بوس مسٹر نونی چٹرجی مسٹر بنرجی وغیرہم تھے مسلمان جونیر بیرسٹروں میں مسٹر عبدالرحیم (بعد کو مدراس ہائی کورٹ کے جج اور سر ہوئے) مسٹر محمد سلیمان مسٹر عزیز احمد مسٹر محمود الحق مسٹر نہال حسین مسٹر مظہر حسین تھے یہ سب جونیر تھے ان میں سے مسٹر عزیز احمد مسٹر رحیم بہت لائق تھے مگر اس وقت ان میں سے ہر ایک کی آمدنی چھ سات سو سے زیادہ

نہ تھی نہال حسین و مظہر حسین مرحوم کی اس سے بھی کم تھی ان جونیر ہندو و مسلمان بیرسٹروں میں بعض تو
میرے ہمعصر طالب علم اور بعض مجھ سے دو سال ایک سال سینیر تھے نئے بیرسٹر کے لئے خصوصًا مسلمان
کے لئے مقدمات کا ملنا ایس مشکل دکاریست دشوار تھا یورپ میں چند سال رہنے سے معاشرت بدل
جاتی اور مغربی طرز کی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اخراجات کثیر ہوتے ہیں پھر بیرسٹری کے پوزیشن کا رکھ
رکھاؤ کوٹھی بڑی ہو سواری اچھی ہو ملازمین میں خانساماں بیرا ٹیبل بوائے وغیرہ رکھنا شعار صاحبیت
کے علاوہ مغربی طرز زندگی کے لئے لوازمات سے ہے علاوہ اس کے کلکتہ ایک گراں مقام تھا اور اب
بھی ہے اس لئے نئے بیرسٹر کو بڑی دشواری ہوتی ہے میرے رہنے کے لئے منجھلے نواب صاحب کی
سجی سجائی کوٹھی نمبر ۴۸ ویلزلی اسٹریٹ میں ملی یہ کوٹھی ایک لاکھ کئی ہزار کو خریدی گئی تھی اور مسز س
اسٹورٹ اینڈ کو انگریز ڈکوریٹرس (Decorators) نے بائیس تئیس ہزار روپے لیکر کمروں کو سجایا
تھا اور کرسی وغیرہ سب پر حتی کہ چھری کانٹوں پر نواب صاحب کا مونوگرام بنایا گیا تھا گراکری وغیرہ اعلےٰ
درجہ کی تھی نواب صاحب جاڑوں میں کلکتہ سیزن کے موقع پر چند ہفتے کے لئے پٹنہ سے آکر یہاں قیام کرتے
تھے مجھے اتنا عالی شان اور اس قدر قیمتی سامان سے آراستہ مکان مفت ملا اور سواری بھی مفت ملی
چند جوڑی کے گھوڑے اور چند سلف ڈرائنگ (Self driving) گاڑیوں کے گھوڑے ہمیشہ کلکتہ
میں رہتے تھے اور چند گاڑیاں قابل دید ڈیکس (Dykes) کے کارخانہ کی بھی وہاں رہتی تھیں جوڑیوں
کی گاڑیوں میں ایک لینڈو ایک بیروش ایک گرنشیلڈ ایک ایک پارک فٹن ایک وز آوی ایک بروہم
ایک سوشیل سلف ڈرائنگ میں ایک ہکی ایک وایٹ چاپل ایک ریلی کارٹ ایک میل فٹن ایک گگ
ایک بگی تھی علاوہ ان کے میرے آفس یعنی ہائی کورٹ جانے کے لئے ایک آفس کوپی اسٹورٹ
کوتج بلڈرس کے ہاں سے خریدی گئی اس زمانہ میں بیرسٹر و وکلا و جج ہائیکورٹ ایک گھوڑے کی گاڑی میں
یا تو آفس جان یا آفس کوپی میں جاتے تھے اور شام کو ہوا خوری یا دوستوں کی ملاقات یا پارٹی وغیرہ
میں جوڑیوں پر جاتے تھے نواب صاحب کے اصطبل میں ایک سے ایک گھوڑے تئیس راس تھے جن میں چھ
یا سات ریسرس تھے (Racers) یعنی گھوڑوں کی شرطوں میں دوڑائے جاتے تھے تین جوڑیوں کے
چھ گھوڑے اور چار سلف ڈرائونگ کے جملہ دس گھوڑے دوازدہ ماہ کلکتہ میں رہتے تھے بقیہ سب پٹنہ میں
شرطوں کے گھوڑے جب کلکتہ میں گھوڑدوڑ ہوتی تھی تو لائے جاتے تھے جیتر وغیرہ کی گھوڑ دوڑیں بھی دوڑتے
تھے ان گھوڑوں کی بڑی نگہداشت ہوتی تھی ایک بڑا عملہ تھا جوکی اور ٹرینر وغیرہ سب پٹنہ میں رہتے تھے
جو کرائے میں جو گھوڑے جوتے جاتے تھے وہ بھی پٹنہ میں رہتے تھے کئی کوچبان تھے جن کا صدر ایک انگریز

کوچبین و ورٹن نامی تھا اور کلکتہ میں جو گھوڑے گاڑیاں تھیں وہ بھی لائق دید کلکتہ کے گھوڑوں میں کچھ انگلش ہارس تھے اور کچھ ہرکاب تھے تین گھوڑے خالص انگریزی نسل کے مع پیڈیگری یعنی ان کے نسب ناموں کے بقیمت بارہ ہزار لندن سے میں نے بھیجے تھے روپیے نواب صاحب نے مجھے بھجوا دیئے تھے اور تاکیداً لکھا تھا کہ عمدہ اور مستند نسل کے گھوڑے لے کر بھیجے چنانچہ لندن کے لانگ ایکر (Long acre) سے خرید کر یہ گھوڑے بھیجے تھے یہ تینوں گھوڑے بھی ان دس گھوڑوں میں تھے جو کلکتہ میں رہتے تھے گرمیوں میں دارجلنگ پہاڑ پر بھیجدیئے جاتے تھے جہاں نواب صاحب کی ایک کوٹھی تھی اور کلکتہ سے قریب بھی ہے۔ لفٹنٹ گورنر بنگالہ حال گورنر اور بہت سے اعیان و عمائد کلکتہ کے گرمیوں میں دارجلنگ جایا کرتے تھے اور اب بھی جاتے ہیں غرض کلکتہ کی گاڑیاں اور گھوڑے بھی میرے استعمال کے لیے تھے اس لئے کلکتہ میں جس طرح میں رہتا تھا اس وقت بڑے بڑے سینیر بنگالی بیرسٹر بھی نہیں رہتے تھے اور نہ کوئی ہائیکورٹ کا جج اتنی بڑی عالیشان اور اس قدر آراستہ کوٹھی میں رہتا تھا اس کوٹھی میں رہتا تھا اس کوٹھی کی جس میں رہتا تھا چمن بندی سڑک پر سے لوگ دیکھا کرتے تھے ہائی کورٹ تو میں آفس کوپی پر جایا کرتا تھا اور روزانہ شام کو چو رنگی ہوکر ٹھنڈی سڑک اور چیپارن گھاٹ اور قلعہ کے قریب تک ہوا خوری کو جب جاتا تو کسی روز وکٹوریہ پر تو کسی دن بیروش پر کسی دن لینڈو پر غرض اتنی گاڑیاں تھیں بدل بدل کر جایا کرتا سائیس کوچبان کی وردیاں بھی زرق برق رہتیں شام کو چیپارن گھاٹ کے کنارہ اور ٹھنڈی سڑک پر سیکڑوں گاڑیاں آتیں ہائیکورٹ کے جج اور بیرسٹر وکلا اور بنگالی اور مسلمان اعلیٰ عہدہ دار و امرا ہوا خوری کو آیا کرتے جوڑیوں پر اور بعض خود ہانکتے ہوئے آتے کلکتہ بھاگرتی دریا کے کنارہ واقع ہے چیپارن گھاٹ کے کنارہ کنارہ بڑی لمبی سڑک چلی گئی ہے زیادہ لوگ ہوا خوری کی غرض سے اسی طرف آیا کرتے ہیں یہاں پر ایک نہایت بڑا باغ جو ایڈن گارڈن مشہور تھا جس میں بینڈ اسٹانڈ وغیرہ تھا روز شام کو بینڈ بجتا تھا لوگ گاڑیوں سے اتر کر باغ میں چہل قدمی کرتے میرے ٹرن اوٹ یعنی گاڑی گھوڑے کو بہت سے لوگ دیکھا کرتے تھے جوڑیوں کا ساز بھی بہت قیمتی و نمائشی و ولایتی کٹبرٹن ہارنس میکر کے کارخانہ کا یا لندن سے منگایا ہوا تھا بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ گورنمنٹ ہاؤس ایوان وائسرائے کی پارٹیوں میں جب میں جانے کو ہوتا یا بلویڈیر کی پارٹیوں میں جہاں لفٹنٹ گورنر رہتا تھا تو بعض احباب یعنی عدالت خفیفہ کے جج یا چوبیس پرگنہ کے ڈپٹی مجسٹریٹ وغیرہ مجھ سے کہتے کہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا کیونکہ تمہارا ٹرن اوٹ بہت شیین ہوتا ہے مجھے جو خط سر اسٹورٹ کالون بیلی نے بنگالہ کے لفٹنٹ گورنر کے نام تعارفی کا دیا تھا وہ میں نے سر چارلس ایلیٹ اس وقت کے لفٹنٹ گورنر کو دیدیا تھا

جس کی وجہ سے وہ میری بہت آؤ بھگت کرتے تھے جس مکان میں لفٹنٹ گورنر رہتا تھا اس کا نام بلوڈیر تھا اب تو گورنر بنگالہ اس مکان میں رہتا ہے جس میں اس زمانہ میں وائسرائے رہتا تھا۔ بلوڈیر کی پارٹیوں میں بعض دفعہ وائسرائے بھی آتے تھے اس زمانہ میں لارڈ ایلگن وائسرائے وگورنر جنرل تھے ایک پارٹی میں سر چارلس ایلیٹ نے بطور خاص مجھ کو وائسرائے سے یہ کہہ کر ملایا کہ سر اسٹورٹ کالون بیلی نے ان کی بہت تعریف لکھی ہے اس کا اثر وائسرائے پر اچھا ہوا تھا یوں تو میں وزٹنگ بک میں جو گورنمنٹ ہوس میں یعنی ایوان وائسرائے میں رہتی ہے اپنا نام لکھ کر آیا تھا تو گورنمنٹ ہاؤس میں جو فنکشن (تقریب) ہوتا اس کی وجہ سے اور نیز اس تعارف خاص کی وجہ سے مجھے برابر دعوت نامے آتے تھے علاوہ پارٹیوں کی شرکت کے کبھی کبھی یوں بھی سر چارلس ایلیٹ لفٹنٹ گورنر سے میں ملنے جایا کرتا تھا ایکدفعہ باتوں باتوں میں سر چارلس ایلیٹ نے مجھ سے کہا کہ کلکتہ ہائی کورٹ میں بہت بیرسٹر کام کرتے ہیں جن میں بڑے بڑے قابل قابل سینیر لوگ ہیں اور ان سے مقابلہ خصوصًا جونیر بیرسٹروں کے لئے دقت سے خالی نہیں ہے کلکتہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ایک زمانہ تک نہایت استقلال وصبر کے ساتھ کام کرنے کے بعد جونیر بیرسٹر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لایق ہوتا ہے اگر آپ کا خیال زمرہ ملازمت میں داخل ہونے کا ہے تو میں آپ کو ڈپٹی کلکٹری کی خدمت سکتا ہوں جونیر بیرسٹر جو ڈیشل لائن میں داخل ہوتے ہیں تو ان کو منصفی کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا ہے۔ اور ایگزیکٹو لائن میں ایک جونیر بیرسٹر کو ڈپٹی کلکٹری کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا ہے مجھ سے چیف جسٹس نے کہا کہ منصفی کے سیکڑوں امیدوار درج رجسٹر ہیں ایک زمانہ کی امیدواری کے بعد نمبر آتا ہے ڈپٹی کلکٹری کی بھی یہی حالت ہے اس کے بھی بہت لوگ میرے پاس امیدوار ہیں۔ ہر دو خدمت کے لئے وکلا اور بیرسٹر دونوں طبقوں کے لوگ ہیں مگر آپ کو درج رجسٹر کرنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد کوئی جگہ نکال کر بہار یا بنگالہ کسی ضلع پر بھیجدوں گا میں نے سر چارلس کی اس نوازش کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ سردست تو مجھے ملازمت کا خیال نہیں ہے میں طبعًا آزادی پسند ہوں یہی وجہ ہے جو میں نے پیشہ بیرسٹری اختیار کیا مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کلکتہ بار میں سخت تقابل کا سامنا ہے اور سلف سپورٹنگ ہونے کے لئے بھی بہت دقت اور محنت استقلال سے کام کرنے کی ضرورت ہے بایں ہمہ میں ان سب دقتوں کا سامنا کرنے کے لئے آمادہ وتیار ہوں کیونکہ ایک تو کلکتہ میں لائق قانون دانوں کی صحبت قابل قدر چیز ہے پھر ان کے ساتھ یا ان کے مقابلہ میں کام کرنے سے تجربہ وقابلیت میں افزایش ہوتی ہے اس ہائی کورٹ میں جو کامیاب نام برآوردہ ہوجاتا ہے تو وہ دولت بھی حاصل کرتا ہے اور گورنمنٹ اور پبلک میں محترم ومعزز ہوتا ہے انڈیا کے

تمام ہائی کورٹوں میں کلکتہ کا بار اور بنچ بہت ممتاز اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے سر چارلس میری گفتگو سنتے جاتے تھے اور مسکراتے جاتے تھے جب میں اپنی تقریر ختم کر چکا تو بولے تمہارے خیالات بہت عالی اور اولوالعزم انسانوں کے سے ہیں۔ سر اسٹورٹ نے جو تمہاری ذہانت وغیرہ کے متعلق لکھا ہے بہت بجا لکھا ہے میں امید کرتا ہوں کہ ایک دن تم کو ایک کامیاب اور نامی کونسل دیکھوں گا میں نے شکریہ ادا کیا سر چارلس کے ملنے کے طریقہ سے میں سمجھتا تھا کہ مجھ پر خاص عنایت رکھتے ہیں بعض دفعہ میں نے یہ دیکھا کہ کسی اور جگہ گارڈن پارٹی یا سوائری میں سر چارلس آئے اور میں کچھ تھوڑے فاصلہ پر ان کو دکھائی دیا تو ادھر سے میں بڑھتا اور ادھر سے وہ خود بھی چند قدم آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کرتے تھے اور خیریت دریافت کرتے بعض دفعہ یہ بھی پوچھا کہ کام کیا چل رہا ہے جس کا میں نے شکریہ ادا کیا اس زمانہ کے لحاظ سے یہ بڑی چیز تھی کہ لفٹننٹ گورنر شیک ہینڈ یعنی مصافحہ کے لئے آگے بڑھے مگر اس زمانہ میں میرے پولیٹکل خیالات انگریزوں کے بہت مخالف تھے ایک تو لندن ہی سے میں کانگرسٹ بن کر آیا تھا اس زمانہ میں ہر کانگریس مین کو کانگرس سے تعلق رکھنے والے انسان کو انگریز دل میں باغی سمجھتے تھے۔

کلکتہ میں بنگالی وکلاء اور بیرسٹر عموماً حامیان کانگرس تھے اور میں ان بنگالی بیرسٹروں سے بہت ملتا جلتا رہتا تھا اس لئے بھی میرے خیالات انگریزوں کے خلاف تھے گو انگریزوں کی ملازمت کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا بنگالی بیرسٹروں میں یوں تو سینیئر جونیئر سب سے ملاقات ہوگئی تھی اس وقت کے جونیئر بنگالی بیرسٹروں میں چکرورتی ایس پی سنہا آشوتوس چودھری بعد کو ہائیکورٹ جج اور سرہوئے یہ چار بھائی تھے ان سب سے اچھی طرح کی ملاقات تھی سنہا (بعد کو لارڈ) نے مجھے اپنے مکان ٹالی گنج میں چائے کی دعوت بھی دی تھی اس وقت ان کی آمدنی معمولی سی تھی کیونکہ سٹی کالج میں لا پروفیسر ڈیڑھ سو یا دو سو ماہانہ کے ہوئے تھے اور ان کا مکان بھی چھوٹا سا تھا بہت زیادہ ملنا جلنا شیلی بونرجی خلف ڈبلوسی بونرجی سے تھا۔ ان کی بیوی انگریزن پروفیسر جانس کی لڑکی تھیں یہ دونوں میاں بیوی مجھے کھانے کی دعوت دے کر بلاتے اور مسٹر پی ال رائے یعنی پیارے لعل رائے اس وقت ہائیکورٹ کے ڈپٹی لیگل ریمبرنسر تھے ان سے مجھ سے پہلی دفعہ لندن میں ملاقات ہوئی تھی ان کے خسر ڈاکٹر گنڈا پو چکرورتی تھے جنھوں نے لندن میں شادی کی تھی انگریزن بیوی سے ایک بیٹا اور چند لڑکیاں تھیں ان میں بعض سے مجھ سے لندن میں ملاقات ہوگئی تھی ان کا مکان سدرلینڈ ایونیو میں تھا اور میرا مکان مسکونہ ایلگن ایونیو میں بالکل قریب تھا مسٹر و مسز پی ال رائے کے ہاں میں کلکتہ میں اکثر جاتا ٹینس روزانہ ان کے ہاں ہوتا اس میں شرکت کرتا اور جب کوئی پارٹی مسز رائے دیتیں تو میری شرکت لازمی تھی کئی دفعہ

پکنک کے لئے کلکتہ کے بوٹینکل گارڈن وغیرہ میں مختصر پارٹی کے ساتھ مسٹر و مسز رائے جب جب گئے مجھے ضرور ساتھ لیتے گئے روزانہ علی الصبح مسٹر رائے اور مسٹر جسٹس چندر ادیپ گھوش (بعد کو سر ہوئے) جن کے مکانات میری کوٹھی ولزلی اسٹریٹ کے قریب تھے میرے ہاں آتے میں مورننگ ٹی پی کر تیار رہتا تھا مجھ کو ہمراہ لے کر یہ دونوں صاحب کانسٹی ٹیوشنل یعنی پیدل ہوا خوری کے لئے چورنگی کی طرف نکل جاتے تین چار میل کا چکر دے کر آفتاب طلوع ہونے سے قبل ہی اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے مسٹر پی ال رائے جن کا شمار اس زمانہ میں سینیروں میں تھا نہ جونیروں میں بلکہ سینیر ہونے کے قریب بلحاظ آغاز مدت پریکٹس تھا اور فوجداری مقدمات میں بعد مسٹر منموہن گھوش کے اور انگریزوں میں مسٹر جیکسن پلی کے انھیں کا درجہ تھا جب یہ ڈپٹی لیگل رممبرنسر یعنی سرکاری مشیر قانونی تھے اس وقت مسٹر کلبی لیگل رممبرنسر تھے میرے کلکتہ چھوڑنے کے بعد مسٹر رائے لیگل رممبرنسر ہو گئے تھے اس عہدہ کی ماہوار ڈہائی تین ہزار ہوتی ہے اور ڈپٹی لیگل رممبرنسر کی تنخواہ اس زمانہ پندرہ سو تھی علاوہ پندرہ سو کے مسٹر رائے کی آمدنی وکالت سے تین چار ہزار روپیہ ماہانہ تھی ان کے کوئی اولاد نہ تھی آمدنی اچھی خاصی تھی اس لئے بڑی شان سے رہتے تھے دونوں میاں بیوی بہت متواضع اور مہمان نواز ہمیشہ کوئی نہ کوئی پارٹی اُن کے ہاں ہوتی رہتی یہ دونوں میرے ساتھ خاص محبت سے پیش آتے میں ان کا ڈدل ہو گیا تھا سینیر بیرسٹر کے ساتھ کام سیکھنے کی غرض سے کوئی جونیر بیرسٹر بہ حیثیت تائید کے جو کام کرتا ہے اس کو ڈِدل کہتے ہیں لندن میں جو کوئی ڈِدل ہوتا ہے بونس سیکڑوں پاونڈ سالانہ دینا پڑتا ہے اول تو بیرسٹر بڑے نامی گرامی اور سینیر ہو جاتے ہیں وہ کسی کو جلدی ڈِدل بناتے بھی نہیں ہیں بڑی سفارشوں اور بڑی رقم سالانہ دینے پر اپنا ڈِدل بنا لیتے ہیں مسٹر رائے نے مجھ کو بخوشی اپنا ڈِدل بنایا تھا اور بغیر کوئی رقم لئے ہوئے انگلستان میں کئی بڑے بیرسٹر کیو سی .Q. C اب کے سی کا ڈِدل بننے میں بھی ایک وقار جونیر کے لئے سمجھا جاتا تھا کیو سی .Q. C سے مراد کوئینس کانسل (Queens Council) اس زمانہ میں ملکہ وکٹوریہ فرمانروائے برطانیہ عظمیٰ تھیں اس لئے بہت قابل و نام برآور وہ سینیر بیرسٹر کو یہ اعزازی خطاب یعنی قانونی مشیر ملکہ دیا جاتا تھا اب چونکہ بادشاہ سریرآرائے سلطنت برطانیہ ہے اس لئے کنگس کانسل (Kings Council) قانونی مشیر بادشاہ کا لقب دیا جاتا ہے چاہے کنگ یا کوئین ایک دفعہ بھی مشورہ نہ کریں مگر اس خطاب والے کی حیثیت بہت ممتاز ہو جاتی ہے متعدد سربیرسٹر میرے زمانہ میں جبکہ ملکہ وکٹوریہ زندہ تھیں کوئینس کانسل کے اعزاز سے سرفراز کئے گئے تھے اب کنگس کانسل بنائے جاتے ہیں یوں تو قابل اور ممتاز بیرسٹروں کو اقسام کے خطاب انڈیا میں نائٹ ہڈ کے سی ای آئی

کے سی ایس آئی وغیرہ دیئے جاتے ہیں اور لندن میں سی بی کے سی بی وغیرہ لیکن لقب کنگس کانسل ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جس کا تعلق پیشہ وکالت سے ہے اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بہت بڑا قانون دان ہے زمانہ سابق میں سینیر اور ممتاز بیرسٹروں کو ہائی کورٹ سے سارجنٹ کا لقب بھی دیا جاتا تھا چنانچہ مشہور و معروف بیرسٹر سارجنٹ بیالنٹین تھے جن کو سابق گیکوار برودہ نے بلایا تھا ان کا نام کھانڈے راؤ تھا۔ حال فرمانروا کو جنھوں نے گود لے کر اپنا جانشین بنایا تھا ان پر ایک مقدمہ فوجداری کا اس الزام کے ساتھ کہ رزیڈنٹ کا قتل ان کے اشارے سے ہوا گورنمنٹ آف انڈیا نے قائم کیا تھا جو امد ہی کے لئے ۱۸۷۵ء میں سارجنٹ بیالنٹین بلائے گئے تھے اور لاکھوں روپیے ان کی فیس اخراجات سفر وغیرہ میں برودہ اسٹیٹ کے صرف ہوئے ایک بہت لائق اور ممتاز کونسل کو منتخب کر کے لندن سے لانے کے لئے مسٹر چنتامنی جو دربار برودہ میں بہت با رسوخ اور ممتاز شخص تھے بھیجے گئے تھے مسٹر چنتامنی اس سلسلہ میں کئی دفعہ لندن آئے گئے اور لندن ان کو اس قدر پسند آگیا کہ اپنے خیال میں انڈیا سے ہجرت کر کے معہ اہل و عیال وہیں جا کر رہنے لگے تھے اور ان کے مرتے دم تک وہیں ان کا خاندان رہا لندن سے پندرہ بیس میل کے فاصلہ پر کنٹری یعنی دیہات میں ایک مکان لے لیا تھا جس میں کچھ باغیت بھی تھی ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں مسٹر چنتامنی نے وہاں تجارت شروع کی تھی اور بڑے فرزند بہت اچھے آرٹسٹ تھے ایک ایک آئیل پینٹنگ تصویر ان کی سوا سو پاؤنڈ میں بکتی اور ان سے بنوائی جاتی تھی ایک اسٹوڈیو انھوں نے اپنے مکان میں قائم کر رکھا تھا اور بیرسٹری کے لئے بھی پڑھ رہے تھے مجھ سے اور مسٹر چنتامنی کے بڑے فرزند سے پہلے مڈل ٹیمپل کے ڈائننگ ہال میں ملاقات ہوئی پھر انھوں نے اپنے گھر پر کئی دفعہ میری دعوت کی اور اپنی ماں بہنوں اور باپ سے ملایا بہت گہری ملاقات ان لوگوں سے مجھ سے ہوگئی تھی بڑے مسٹر چنتامنی اور ان کے بڑے بیٹے جو بہت خوبصورت اور جوان تھے لندن ہی میں مرے ان دونوں کے مرنے کے بعد ان کا خاندان کلکتہ چلا آیا تھا بڑی لڑکی مس جمنا بائی نے کلکتہ ہی میں ایک بنگالی ڈپٹی کلکٹر مسٹر بنرجی سے شادی کرلی تھی میں جب ۱۹۱۲ء میں کلکتہ گیا تو یہ لوگ ٹالی گنج میں رہتے تھے اتفاق سے چھوٹے بیٹے دادا بھائی چنتامنی سے اور مجھ سے ایک سڑک پر ملاقات ہوگئی پھر مجھ کو وہ اپنے گھر لے گئے ان کی چھوٹی بہن مس گنگا بائی چنتامنی اور ان کی والدہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور میری بیوی کی اور میری دعوت کی اس دعوت میں مسز بنرجی (سابق مس جمنا بائی چنتامنی) بھی شریک تھیں ہم دونوں ایک دوسرے کو عرصہ مدید کے بعد دیکھ کر بہت خوش ہوئے گو بعض واقعات

مختلہ جن کے ایک کا میں نے یہاں تذکرہ کیا ہے غیر متعلق معلوم ہوں گے مگر مجھے پُرانے زمانے کی باتوں کا ذکر کرنے میں ایک خاص لطف آتا اور بڑی دلچسپی ہوتی ہے میرا مکان ولزلی اسٹریٹ میں تھا نمبر ۴۸ تھا سید امیر علی صاحب اس زمانہ میں فیرنگٹن روڈ نمبر ۱۹ میں رہتے تھے جو میرے مکان سے قریب تھا اس لئے کبھی میں ٹہلتا ہوا بھی ان سے ملنے کو بروز یکشنبہ جایا کرتا تھا۔

سنٹرل محمڈن نیشنل ایسوسیشن

انھوں نے ایک دن پوچھا کہ تم سنٹرل محمڈن نیشنل ایسوسیشن کے ممبر ہوگئے میں نے کہا نہیں۔

یہ کہہ کر خود (Central mohamedan national Association) انھوں نے کہا ضرور ہونا چاہئے۔ یہ کہہ کر خود ہی کہا کہ نواب امیر حسن خاں اب جو مجھ سے ملنے آئیں گے تو میں اُن سے کہونگا کہ آیندہ جلسہ میں تحریک پیش کر کے تم کو ممبر بنالیں چنانچہ ہفتہ عشرہ کے بعد ہی میرے پاس ایک مراسلہ ایسوسیشن کے معتمد کے پاس سے آیا کہ میں ممبر بنالیا گیا اس زمانہ میں عائد مسلمانان کلکتہ کی دو انجمنیں تھیں ایک کا نام انجمن مذاکرہ علمیہ یہ قدیم ترتھی اس کے بانی اور سکرٹری نواب بہادر نواب عبداللطیف خاں سی آئی ای تھے اور پریسیڈنٹ (صدر انجمن) شہزادہ سر مرزا جہاں قدر بہادر حضرت واجد علی شاہ مرحوم خاتم خاندان شاہان اودھ کے برادر زادہ و داماد تھے اس میں بھی ممبر بہت تھے دوسری انجمن سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن جس کے بانی سید امیر علی صاحب تھے زمانہ دراز تک سکرٹری بھی یہی رہے بعد کو نواب بہادر نواب سید امیر حسن خاں ہوئے اس کے پریسیڈنٹ شہزادہ فرخ شاہ نبیرہ فتح علی ٹیپو سلطان سابق فرمانروائے میسور تھے اس کی شاخیں اور شہروں میں بھی تھیں ایک خصوصیت اس انجمن کی یہ تھی کہ کلکتہ میں جتنے مسلمان بیرسٹر وکالت کر رہے ان میں کے تین حصّے اس کے ممبر تھے اور چوتھائی حصہ انجمن مذاکرہ علمیہ کا تھا انجمن مذاکرہ علمیہ کے نام سے جیسا ظاہر ہے یہ ایک علمی مجلس تھی جس میں مباحث علمیہ ہوتے اور علمیہ مضامین ممبران لکھ کرلے جاتے اور پڑھے جاتے اور اراکین ان مضامین کی نسبت اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے موافق و مخالف رائیں ہوتیں یہ تھی ایک علمی انجمن مگر بعض اوقات سیاسیات میں دخل دیتی انجمن کی جانب سے کسی معاملہ میں میموریل یعنی عرضداشت وغیرہ وایسرائے کے پاس بھیجی جاتی یہ سرکار کی خوشامدی انجمن تھی جو رائے گورنمنٹ کی ہوتی مفید یا مضر ملک ہو اس میں ہاں میں ہاں ملاتی سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کا مقصد مسلمانوں کی سود و بہبود کا خیال رکھنا گورنمنٹ کو مسلمانوں کی ضرورتوں کی جانب متوجہ کرنا گورنمنٹ کے معاملات میں آزادانہ رائے دینا وغیرہ اس لئے یہ سیاسی انجمن تھی گو ادعا تو یہ تھا کہ یہ ایسوسیشن

گورنمنٹ کی چاپلوسی نہیں کرتی ہے اور اپنی رائے آزادانہ دیتی ہے مگر مسلمانوں میں خصوصاً اس زمانہ میں یہ اسپرٹ کہاں تھی مسلمان عموماً من حیث قوم گورنمنٹ سے دبتے اور گورنمنٹ کی ہر بات میں چاپلوسی کرتے البتہ بنگالی ہندو ہی ایک قوم تھی باستثنائے ملازمت پیشہ بنگالیوں کے جو گورنمنٹ سے مطلق نہیں دبتی تھی اس وقت انڈیا میں جو لوگ سیاسیات سے دلچسپی لیتے اور بالکل آزادانہ رائے رکھتے تھے جن میں بیداری پیدا ہوگئی تھی وہ ہندو بنگالی تھے سوا بنگالہ کے کسی اور صوبہ میں نہ آزادی تھی نہ بیداری کے آثار تھے مغربی تعلیم پھیلی نہ تھی بنگالی ہندو سب کے سرغنہ تھے کل ہندیوں میں بنگالی ہندو ہی ابتدائی عملداری انگریزی سے زیادہ تعداد میں انگلستان بغرض تعلیم جاتے رہے کسی اور صوبہ مدراس پنجاب وبمبئی وغیرہ کے ہندو اس وقت مغربی تعلیم یافتہ کہیں کہیں گنتی کے نظر آتے تھے عدم تعلیم یافتگی کی وجہ سے اپنے حقوق اور گورنمنٹ کے فرائض سے ناواقف تھے گورنمنٹ سے بہت دبتے تھے گو ۱۸۸۵ء میں نیشنل کانگرس قائم ہوچکی تھی مگر اس کے ممبروں میں زیادہ تر بنگالی تھے دیگر صوبوں کے بھی یکا دکا کانگرس میں شریک ہوگئے تھے بمبئی وگجرات وغیرہ کے پارسی من حیث قوم ہمیشہ انگریزوں کے مطیع ومنقاد رہے گنتی کے دو تین پارسی مثلاً دادا بھائی نوروزجی فیروزشاہ مہتہ کانگرس میں شریک ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ بڑی دلیری سے ملک کی ترقی وحقوق کی حفاظت کے لئے گورنمنٹ سے لڑتے تھے مسلمان تو کانگرس کا نام لیتے ڈرتے تھے گنتی کے مسلمان مثلاً بمبئی پریسیڈنسی کے سیٹھ علی محمد لکھنؤ کے بیرسٹر حامد علی پٹنہ کے بیرسٹر مسٹر سید شرف الدین (بعد کو کلکتہ ہائی کورٹ کے جج) ازیں قبیل دو ایک اور مسلمان کانگرس میں ایک زمانہ کے بعد مسٹر بدرالدین طیب جی بمبئی کے مشہور بیرسٹر بعد کو ہائی کورٹ بمبئی کے جج کانگرس میں شریک اور ایک سیشن میں اس کے پریسیڈنٹ بھی ہوئے تھے ورنہ عام طور سے مسلمان کانگرس سے بہت خائف تھے انگریز نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان شریک ہوں سر سید احمد خاں مرحوم بانی علی گڑھ کالج مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے سے باز رکھتے تھے۔

چنانچہ سنٹرل محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن کا بھی یہی مسلک تھا کہ مسلمان کانگرس میں شریک نہ ہوں۔ سید امیر علی صاحب ۱۸۷۳ء میں انگلستان سے بیرسٹری کی سند لے کر کلکتہ آئے اور اس کے چند سال کے بعد ایسوسی ایشن قائم کی اور اس وقت کی حالت کے لحاظ سے ایسوسی ایشن کے قواعد بنائے جس میں سال بہ سال عہدہ داروں کا انتخاب شامل تھا لیکن سکرٹری بدلا جائے یا نہ بدلا جائے اس کی نسبت قواعد ساکت تھے جس وقت سے یہ انجمن قائم ہوئی امیر علی صاحب اس کے سکرٹری اسوقت

تک رہے جب تک وکالت کرتے رہے ۱۸۸۹ء میں یہ ہائی کورٹ کی ججی پر فائز ہوئے اس وقت سے نواب امیر حسن خاں اس کے سکرٹری تھے اور کل سیاہ و سفید کے مالک تھے جتنے ممبر تھے ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے تھے وجہ یہ تھی کہ مغربی تعلیم یافتہ مسلمان گنتی کے کلکتہ میں تھے اور نہ مسلمان بیرسٹرس کی معقول تعداد تھی یورپ جانے اور مغربی تعلیم حاصل کرنے میں بمبئی کے طیب جی سلیمانی پورہ والوں کا خاندان پیش پیش رہا۔ انگلستان سے سولیسٹر قمرالدین طیب جی ۱۸۶۰ء یا اس کے کچھ قبل انڈیا واپس آئے۔ اس لئے پہلے مسلمان سولیسٹر یہ تھے پھر ۱۸۶۹ء میں ان کے برادر خورد مسٹر بدرالدین طیب جی بیرسٹر ہوکر آئے مسلمانوں میں یہ پہلے بیرسٹر اسی طرح انڈین سول سروس پاس کرکے جو پہلا مسلمان آیا وہ بدرالدین طیب جی کے بڑے فرزند محسن طیب جی تھے۔ مسلمان بیرسٹروں میں سب سے پہلے بدرالدین طیب جی تھے۔ ان کے بعد نواب سید اصغر علیخاں دلیر جنگ اور ان کے چھوٹے بھائی نواب سید احمد علیخاں نوابان چیت پور جن کو گورنمنٹ نے کلکتہ سے بغرض تعلیم ۱۸۶۶ء میں انگلستان بھیجا تھا سات سال کے قیام کے بعد ۱۸۷۲ء میں وارد کلکتہ ہوئے لیکن ان دونوں بھائیوں میں سے کسی نے بھی وکالت نہیں کی ہائیکورٹ میں انرول ہوگئے تھے کبھی کبھی تفریح ہائی کورٹ کے بیرسٹروں کے کمرہ میں نواب دلیر جنگ بہادر آجایا کرتے تھے جب میں کلکتہ کے ہائی کورٹ میں وکالت کرتا تھا تو نواب دلیر جنگ بہادر سی ایس ای کبھی کبھی ہائی کورٹ آکر بیرسٹروں سے مل ملاکر چھیں لگاکر چلے جاتے تھے ۱۸۷۳ء میں امیر علی صاحب آئے ۱۸۷۳ء کے بعد ۱۸۸۰ء میں مسلمان بیرسٹروں کا ایک بڑا ریج آیا جس میں چند بنگالی مسلمان اور دو وہ شمالی ہند کے اور بہاری مسلمان شریک تھے۔ بنگالی مسلمانوں میں مسٹر بعد نواب عبدالرحمن خلف نواب عبداللطیف خاں مسٹر یوسف علی چندہ کار مسٹر لطف الرحمن۔ شمالی ہند کے مسلمانوں میں مسٹر حامد علی ساکن امروہہ محمد رفیق ساکن دہلی بعد کو الہ آباد ہائی کورٹ کے جج انڈیا کانسل کے ممبر ہوئے مسٹر حبیب اللہ بعد کو مجسٹریٹ ضلع و مسٹر نبی اللہ ساکنان کڑا مانکپور (الہ آباد) بہاریوں میں مسٹر سید شرف الدین بعد جج ہائیکورٹ کلکتہ مسٹر احسن الدین احمد بعد کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ وغیرہ مسٹر ابوالحسن خاں بعد کو جج عدالت خفیفہ کلکتہ مسٹر سید نورالہدیٰ بعد کو ڈسٹرکٹ جج ۱۸۸۰ء کے بعد سے مسلمانان ہند مختلف اقطاع سے بڑی تعداد میں بیرسٹری کے لیے جانے لگے خصوصاً صوبہ بہار سے بہت گئے اس لکھنے سے میری غرض یہ دکھانا ہے کہ اول تو مسلمانان ہند کی مغربی تعلیم کب سے شروع ہوئی اور کیا رفتار رہی دوسرے یہ کہ شائقین کی ہسٹری اور ان کے نام اور مختصر حالات ایک جگہ محفوظ رہیں کلکتہ کے سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے قیام کے زمانہ سے عرصہ دراز تک سوا سید امیر علی صاحب بانی انجمن کے اور کوئی مسلمان بیرسٹر کلکتہ میں موجود نہ رہنے

کی وجہ سے رکنیت میں شریک نہ تھا گو ۱۸۸۸ء میں تین بنگالی مسلمان بیرسٹر ہو کر آ گئے تھے ان
میں سے ایک نواب عبدالرحمٰن اپنے والد کی انجمن مذاکرہ علمیہ میں شریک ہو گئے تھے اور مسٹر لطف الرحمٰن
مظفر پور میں وکالت کرنے کو چلے گئے مسٹر چندہ کار کو اس طرف توجہ نہیں ہوئی ۱۸۹۰ء سے بیرسٹروں کا
شروع ہوئے جنوری ۱۸۹۵ء میں کلکتہ کے ہائی کورٹ میں میں انرول ہوا۔ اس وقت تک ہماری
بیرسٹروں میں محمود الحق نہال حسین مسٹر عزیز احمد مسٹر محمد سلیمان۔ بنگالی بیرسٹروں میں عبدالرحیم حال سر
عبدالرحیم سابق جج مدراس ہائی کورٹ مظہر حسین چندہ کار اور نواب عبدالرحمٰن تھے ان میں سے صرف مسٹر
عزیز احمد مسٹر عبدالرحیم اور مسٹر سلیمان اور مسٹر محمود الحق سنٹرل محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن میں میری شرکت
کے قبل شریک ہو چکے تھے علاوہ ان بیرسٹروں کے اس ایسوسی ایشن میں پچاس ساٹھ دیگر حضرات کچھ
مسلمان عہدہ داران سرکاری کچھ تجارت پیشہ اشخاص کچھ زمیندار کلکتہ کے اطراف و اکناف کے اراکین
تھے مگر دلچسپی لینے والے چند ہی نفوس تھے بہت سے لوگ نواب بہادر سید امیر حسن خاں کے اثرات سے
شریک ہو گئے تھے نواب صاحب بوجہ پریسیڈنسی مجسٹریٹ ہونے کے ذی اثر تھے روح رواں اس انجمن کے
وہی تھے مجھ کو جو دلچسپی لیتے ہوئے دیکھا تو منیجنگ کمیٹی (جلسہ انتظامیہ) کا ممبر بنا لیا یہ ایسوسی ایشن
بظاہر تو پبلک کی آواز رسانی کا ذریعہ تھی مگر حقیقی معنوں میں سرکاری ادارہ تھا گورنمنٹ کے ہر قول و عمل
پر آمنا صدقنا کہنے والی تھی سکرٹری نواب امیر حسن نے اس کے ذریعہ سے گورنمنٹ میں بہت رسوخ
پیدا کیا تھا جہاں گورنمنٹ بنگالہ یا گورنمنٹ ہند نے کوئی قانون وغیرہ خواہ مفید ملک ہو خواہ مضر
ملک ہو پاس کیا اس کی تائید اس انجمن سے ہوتی اگر کوئی بات گورنمنٹ کی جانب سے مضر ملک
بھی ہوتی اور جس پر ہندو بنگالی چیختے چلاتے اور ہائے واویلا مچاتے مگر اس انجمن کی جانب سے گورنمنٹ
کی تائید ہوتی رزولیوشن گورنمنٹ کی تائید میں پاس کئے جاتے اور انگلش اخباروں میں جو انگریزوں
کے ہاتھوں میں ہوتے ان میں شائع کر دیئے جاتے جس سے ظاہر کیا جاتا کہ تمام مسلمان گورنمنٹ کے ساتھ
ہیں ایک دفعہ گورنمنٹ آف بنگالہ کی جانب سے ایک سرکولر (گشتی) ایسا مضمون پاس ہوا کہ گائے
کا گوشت نوکروں میں لے کر بغرض فروخت جو قصائی گلی کوچوں میں پھرتے ہیں آئندہ سے نہ پھرا
کریں عام و خاص ہندو بنگالی تو بہت خوش ہوئے مگر عام طور سے مسلمانوں میں ناراضی پیدا ہو رہی تھی
مگر اس اسلامی انجمن نے گورنمنٹ میں ایک میموریل بھیجا کہ گورنمنٹ نے بہت اچھا کیا جو گائے قصاب
کا پھیری کو نکلنا موقوف کیا اس سے ہندو مسلمانوں میں اتحاد ہوگا اور آئندہ کوئی جھگڑا فساد بین الفریقین
نہیں ہوگا اس قسم کے میموریل وغیرہ سکرٹری صاحب خود لکھ کر گورنمنٹ میں بھیجا کرتے تھے کبھی کبھا

جلسہ انتظامیہ کے آگے گلہ بانے کو پیش بھی کر دیا جاتا اور انتظامیہ کمیٹی میں جو ممبر شریک ہوتے ان کو سکرٹری کی رائے سے اختلاف کرنے کی جرات نہیں ہوتی گائے کے گوشت کے متعلق گورنمنٹ کی تائید میں جو رزولیوشن پاس کیا گیا اور جس کی بنا پر میموریل گورنمنٹ میں بھیجا گیا اس کی خبر کانوں کان مجھ کو بھی نہیں ہوئی باوجودیکہ میں انتظامی کمیٹی کا ممبر بنایا جا چکا تھا مگر اس جلسہ کی جس میں یہ رزولیوشن پاس ہونے والا تھا مجھ کو اطلاع نہیں دی گئی میموریل بھیجنے کے بعد اخباروں میں جب یہ خبر نکلی تو جس طرح عام وخاص سب کو اطلاع ہوئی مجھ کو بھی ہوئی اور ان چند بیرسٹروں کو جو ایسوسی ایشن کے ممبر تھے اس زمانہ میں مسلمانوں کے ہاتھ میں اردو گائیڈ ایک اخبار تھا جو پندرہ بیس سال قبل سے شائع ہو رہا تھا جس کو مولوی کبیرالدین احمد چلا رہے تھے یہ بھی سرکاری آدمی تھے اور گورنمنٹ کی ہاں میں ہاں ملانے والے تھے اس اخبار نے بھی ایسوسی ایشن کی اس کارروائی کی تائید کی مگر ایک اخبار انگریزی زبان میں اس زمانہ میں نکلنا شروع ہوا تھا اسکا نام محمڈن آبزرور تھا Mohamadon Observer اس کو چند نئی روشنی کے گریجویٹ مسلمان چلا رہے تھے اس نے گورنمنٹ کے اور ایسوسی ایشن کے خلاف آرٹیکل پر آرٹیکل لکھے میں نے بھی شکایت کے لہجہ ان بیرسٹروں سے جو ایسوسی ایشن کے ممبر تھے اس کارروائی کا ذکر کیا ان لوگوں نے بیک زبان یہی کہا کہ جب تک نواب امیر حسن سکرٹری اس ایسوسی ایشن کے رہیں گے یہ انجمن گورنمنٹ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنی رہے گی افسوس کہ مسلمانوں کی ایک ہی انجمن ہے جو بہت ممتاز پبلک اور گورنمنٹ کی نظروں میں ہے اس کی یہ حالت ہے یہ بھی مجھ سے لوگوں نے کہا کہ نواب امیر حسن کی سکرٹری کے عہدہ سے علیحدگی بہت دشوار و مشکل ہے انجمن کے دستورالعمل کے ضوابط و قواعد میں جہاں عہدہ داروں کا سالانہ انتخاب رکھا گیا ہے سکرٹری کے انتخاب کے متعلق کوئی قاعدہ نہیں ہے میں نے کہا کہ اس کے لئے تو کانسٹی ٹیوشن کو ریویزڈ کرنا ہوگا یعنی دستورالعمل پر نظرثانی کرنی ہوگی اور اس وقت جو ترمیم کی جائے اس میں یہ بڑھا دیا جائے مثل دیگر عہدہ داروں کے سکرٹری کا بھی سالانہ انتخاب عمل میں آئے گا مگر دستورالعمل کی نظرثانی کی نسبت تحریک کون کرے گا ممکن ہے نواب امیر حسن جھک جائیں کہ اس تحریک میں کچھ دال میں کالا ہے یہ گفتگو مسٹر عزیز احمد بیرسٹر کے مکان میں ہوئی اس تحریک کے پیش کرنے کے متعلق کسی کا آگے قدم نہیں بڑھ رہا تھا مسٹر عبدالرحیم نے کہا نہ معلوم طنزاً یا بخلوص دلی کہ ہمایوں مرزا ہی اس کام کے لئے موزوں ہیں یہ کسی سے دبتے دبتے نہیں ہیں میں نے جواب دیا کہ یہ حقیقت حال ہے کہ میں سوا اپنے خالق اور اس کے رسول پاک کے کسی سے نہیں ڈرتا نہ دبتا خصوصاً ایک ایسے کام کے کرنے میں جو ہر طرح سے مسلمانوں کے حق میں مفید ہو اس کی تکمیل کے لئے ہر قسم کی قربانی

کرنے کو میں تیار ہوں میں اُس دادا کا پوتا ہوں جس نے کربلا میں حق و صداقت کے لئے بہتر نفوس سے ہزاروں کا مقابلہ کیا گو اپنی اور اپنے عزیز و انصار کی جانیں دیں مگر اسلام کی ڈوبتی ہوئی کشتی پار لگائی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ تیرہ سو سال سے عشرہ محرم دنیا کے مختلف ملکوں میں کس شان و شوکت سے منایا جاتا ہے میرے اس کہنے پر ایک قہقہہ لگایا گیا اور عزیز احمد نے زور سے میری پیٹھ ٹھونکی یہ کہہ کر یہ بڑا جوشیلا سید ہے رگ ہاشمی جوش میں آ ہی گئی مختصر یہ کہ یہ بات طے پا گئی کہ میں ایک خط نواب امیر حسن سکرٹری کو اس مضمون کا لکھوں کہ ایک جلسہ عام عنقریب منعقد کیا جائے جس میں میں یہ تحریک پیش کروں گا کہ دستور العمل ایسوسی ایشن کی نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے کیونکہ عرصہ مدید گذرا کہ اس وقت کی ضرورتوں کے لحاظ سے کانسٹی ٹیوشن مرتب ہوا تھا اب دنیا دوسری ہو گئی ہے حالات بدل گئے ہیں اس لئے دستور العمل میں جو زمانہ موجودہ کے لحاظ سے نقایص ہیں ان کا دور کرنا ضروری ہے اس صحبت میں علاوہ میرے مسٹر عزیز احمد مسٹر نہال حسین مسٹر محمد سلیمان اور مسٹر عبدالرحیم شریک تھے افسوس ہے کہ ان میں سے اب صرف سر عبدالرحیم زندہ ہیں اور یہ راقم نفس شماری کر رہا ہے۔ میں نے کہا کل ہی میں نواب امیر حسن خاں کو خط لکھتا ہوں مگر ضرورت اس کی ہے کہ میری تحریک بغلبہ آرا پاس ہو یعنی یہ امر تسلیم کر لیا جائے کہ دستور العمل کی نظر ثانی کی درحقیقت ضرورت ہے یہ مانا کہ میری تحریک کی تم میں سے کوئی ایک شخص تائید کرے گا اس طرح میں تحریک بذریعہ ایک معقول تقریر کے پیش کروں گا سوال یہ ہے کہ بکثرت و بغلبہ آرا اس کو حاضرین منظور کریں اس غرض کی تکمیل کے لئے اسی وقت ایک فہرست ہم لوگوں نے ان لوگوں کے ناموں کی بنائی جو ذرا آزاد خیال ممبر تھے اور جن کو ہم لوگ سمجھتے تھے کہ وہ ہمارا ساتھ دینگے اور ان کو یہ معلوم نہ ہونے دیں گے کہ اس نظر ثانی سے اصل مقصد ہمارا کیا ہے اب ضرورت کانوسنگ کی ہوئی یعنی ممبروں کے گھروں پر جا کر ان کو تائید کے لئے آمادہ کرنا اور ان سے کیا کسی سے بھی اپنا اصلی مقصد ظاہر نہیں کرنا کہ نظر ثانی سے غرض سکرٹری کا سالانہ انتخاب مد نظر ہے یہ امر بالکل راز میں رکھا گیا میں نے دوسرے دن اپنی تحریک جلسہ عام کے انعقاد کی استدعا کے ساتھ سکرٹری صاحب کو بھیجدیا اور روزانہ ہائی کورٹ سے واپس آنے کے بعد ہم میں سے دو آدمی مل کر ان ممبروں کے ہاں جن کے نام فہرست میں شریک تھے جانے لگے کسی کے ہاں میں اور سلیمان مرحوم کسی کے ہاں عزیز احمد اور رحیم کسی کے ہاں نہال حسین اور سلیمان اور اس طرح سے گفتگو کرتے کہ جیسے کوئی بالکل معمولی بات ہے ان سے کہتے کہ کہ قبل سے اس لئے آگاہ کر دیتے ہیں کہ اس جلسہ میں ضرور شرکت اور تائید کی جائے کیونکہ مسئلہ دستور العمل کی نظر ثانی کا ضروری امر ہے بعض نے تو وعدہ حتمی شریک ہونے اور تائید کرنے کا کیا اور بعض نے عذر

علالت یا دوسری مصروفیت کا کیا مگر بہت سے لوگوں نے شرکت کا وعدہ کیا بروز جلسہ میری تحریک کی تائید سید نہال حسین مرحوم نے کی اس کے بعد میں نے تقریر کی اور تحریک پیش کر دی اس پر سے نواب امیر حسن خاں جو ایک دور بین شخص تھے کچھ کہنا چاہتے تھے کہ شہزادہ فرخ شاہ صدر نشین نے کل حاضرین کو مخاطب کرکے کہا کہ اس تحریک میں تو کوئی بات ایسی نہیں ہے کہ کسی کو کچھ عذر ہو۔ بہتر ہے کہ دستور العمل پر نظر ثانی کر دی جیسا کہ مسٹر ہمایوں مرزا نے اپنی تقریر میں ابھی کہا کہ زمانہ پلٹ گیا اور جبکہ دستور العمل مرتب کیا گیا تھا اس وقت کی اور فضا تھی اور اب کی اور حالت ہے (ہنستے ہوئے) اب ہماری انجمن میں روشن خیال یورپ میں تعلیم پائے ہوئے بفضل خدا چند مسلمان بیرسٹر شریک ہو گئے ہیں ان لوگوں کے خیالات سے ہم کو فائدہ اٹھانا چاہئے بہتر ہوگا کہ ہمارے نوجوان دوست یورپین خیالات کی روشنی میں دستور العمل پر نظر ثانی کریں کوئی بات نکالنے کے لائق ہو اس کو نکال دیں اور بڑھانے کے لائق ہو بڑھا دیں اس میں کسی کو کیا عذر ہو سکتا ہے کیوں حضرات آپ صاحبوں کی کیا رائے ہے سب نے بیک زبان کہا جی ہاں کوئی مضائقہ نہیں دستور العمل کی نظر ثانی کی جائے نواب امیر حسن خاں مرحوم بالکل خاموش تھے مگر چہرہ متغیر تھا غرض باتفاق آرا ہماری تحریک پاس ہوئی لوگوں نے تالیاں بجائیں پرنس فرخ شاہ کے ریمارک نے جان ڈالدی اس کو ہم تائید من اللہ سمجھے درحقیقت بظاہر کوئی امر لائق عذر نہ تھا نہ اس کا تعلق کسی ممبر سے تھا نہ کسی کے خلاف یہ تحریک تھی نہ خلاف عقل و قیاس تھی ہم لوگوں نے جو ممبروں کے گھروں پر جا جا کر کینوسنگ کیا وہ فعل بنظر احتیاط تھا جب میری یہ تحریک منظور ہو گئی تو میں نے ایک یہ تحریک پیش کی کہ ایک سب کمیٹی پانچ یا سات ممبروں کی بنائی جائے جو دستور العمل موجودہ پر غور کرنے کے بعد بشرط ضرورت ترمیم یا ترمیمات کرکے رپورٹ معہ مرممہ دستور العمل کے جنرل میٹنگ (جلسہ عام) میں پیش کر دے۔ ایجنڈا سے معلوم ہو جائے گا کہ دستور العمل مرممہ پیش ہونے والا ہے چونکہ وہ ایک اہم معاملہ ہے اس لئے اس جنرل میٹنگ میں ممبران انجمن میں ضرور شریک ہوں یہ تحریک بھی پاس ہو گئی چند اشخاص سب کمیٹی کے ممبر مقرر کئے گئے کچھ نام کسی نے پیش کئے کسی نے کسی کا نام پیش کیا میں نے مسٹر عزیز احمد اور مسٹر رحیم کے نام پیش کئے کیونکہ بیرسٹر ممبروں میں سب سے زیادہ قابل و ہوشیار یہ دونوں تھے خود صدر نشین نے مسکرا کر مجھ سے کہا کہ آپ اپنا نام تو پیش کیجئے ایک صاحب نے کہا کہ مسٹر ہمایوں مرزا کا نام تو ممبران سب کمیٹی میں بلا شک و شبہ پیش ہونا چاہئے یہ تو بانی مبانی اس مسئلہ کے ہیں پھر اور چند لوگوں نے بھی یہی کہا۔ بیشک بیشک غرض میرا نام بھی شریک ہو گیا چونکہ تحریک میری پیش کردہ تھی اس لئے بھی پرنس فرخ شاہ نے

تحریک کی تائید میں ریمارک کیا واضح ہو کہ پرنس فرخ شاہ فتح علی ٹیپو سلطان کے سب سے چھوٹے فرزند شہزادہ غلام محمد مرحوم کے پوتے تھے جن کی مسجد عالیشان کلکتہ کے محلہ دھرم تلہ میں اس وقت بھی موجود ہے چورنگی روڈ کے کنارہ پر واقع ہے کو ٹولہ کو جو راستہ گیا ہے موڑ پر ہے۔

شہزادہ حلیم کا ذکر شہزادہ غلام محمد کے فرزند شہزادہ حلیم مرحوم تھے جنھوں نے اثنا عشری مذہب اختیار کیا تھا اور ان کے شیعہ ہونے کے متعلق ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا کہ جب اپنے والد کی زندگی میں یہ شیعہ ہو گئے اور بمقام چیچڑا جہاں اُن کی سکونت تھی بہت بڑی عمارت عاشور خانہ کے لئے تعمیر کی تھی اور وہاں پر محرم میں بہت دھوم سے تعزیہ داری کرتے تھے شہزادہ غلام محمد مرحوم کو اپنے فرزند کو اپنا آبائی مذہب ترک کرتے دیکھ کر بُرا معلوم ہوا یہ بہت صاحب دولت تھے سرکار انگریزی سے ماہانہ دس ہزار جو ملتے تھے اس میں سے پس انداز کرتے اور لاکھوں کے جواہرا جو میسور سے ساتھ لائے تھے اس کو فروخت کر کے بہت سی جائداد غیر منقولہ خریدی تھی ہزاروں کی ماہانہ آمدنی ان جائدادوں سے بھی تھی غرض لکھ پتی تھے اور میرے والد مرحوم سے اور شہزادہ غلام محمد مرحوم سے بڑی گہری دوستی تھی جس سے کہ پرنس فرخ شاہ خوب واقف تھے اس لئے جب میں کلکتہ میں پریکٹس کر رہا تھا تو مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے تھے گو بلحاظ عمر کوئی مناسبت نہ تھی میں ان کے فرزند کے ہم عمر تھا مگر ہر تقریب میں مجھ کو مدعو کرنا ضروری امر تھا ان کے فرزند کا نام ان کے پردادا کے نام پر غلام محمد تھا عرف جانی نواب تھا ان سے اور مجھ سے بڑی بے تکلفی تھی دوستی ہو گئی تھی ان سے ان کے والد نے کہا تھا کہ ہم لوگ خاندانی دوست ہیں غرض شہزادہ غلام محمد مرحوم اپنے فرزند شہزادہ حلیم پدر پرنس فرخ شاہ سے بہت ناراض رہنے لگے پرنس غلام محمد اس قدر علیل ہو گئے کہ زیست سے مایوسی ہو گئی تو انھوں نے ایک وصیت نامہ انگریزی میں اپنے انگریز سولیسٹر سے لکھوایا اور نہایت حزم و احتیاط سے اس کے مضمون کو مخفی رکھا اس وصیت نامہ میں اپنی کل جائداد لاکھوں کی مالیت کی اپنے داماد گورے صاحب کے نام پر لکھدی اور اپنے فرزند کو بالکل محروم کر دیا صرف پانچ سو روپیہ ماہانہ نقد دیا جانا لکھا تاکہ بیٹا بھوکوں نہ مرے اسی وصیت نامہ پر انگریز سولیسٹر کلکتہ والے کے دستخط تھے اور مرحوم الحاشیہ میں بڑے باوقار اشخاص کی دستخطیں اور گواہیاں تھیں ایسے اشخاص جن سے شہزادہ غلام محمد مرحوم سے بہت اتحاد و دوستانہ تھا اور جن کو ہر طرح سے لائق اعتماد سمجھتے تھے وہ تین اشخاص یہ تھے نواب سید امیر علیخاں فخر الملک جن کا نام نامی اس میں کئی جگہ آچکا ہے دوسرے مولوی عباس علیخاں قاضی القضاۃ اس زمانہ میں انسپکٹر جنرل رجسٹریشن کے عہدہ کو قاضی القضاۃ کہتے تھے یہ بہت ہی معزز

عہدہ تصور ہوتا تھا۔ تیسرے میرے والد مرحوم تھے۔ یہ دستاویز بہت احتیاط کے ساتھ ایک صندوقچی میں سربمہر کر کے رکھی گئی اور وہ صندوقچی ایک بڑے فولادی بکس میں مقفل کیگئی اور اس پر پانچ ناموں کی چٹھیاں چاروں اشخاص نے یعنی ایک کاتب دستاویز انگریز سولیسٹر نے اور تین گواہان مرقوم الحاشیہ نے چسپاں کردیں اور یہ فولادی بکس بڑی احتیاط سے سرولیم میڈرک ڈپوٹی گورنر بنگالہ کے پاس رکھوا یا گیا اور اس ہدایت کے ساتھ کہ جس وقت شہزادہ غلام محمد کے انتقال کی تحقیق ہو اور سولیسٹر طلب کرے تو یہ بکس بھیجد یا جائے۔ اب تو بنگالہ اور صوبہ کا حاکم گورنر کہلاتا ہے اس کے قبل لفٹنٹ گورنر کہلاتا تھا۔ یہ اس کے قبل ڈپوٹی گورنر لقب تھا نہیں معلوم اس وصیت نامہ کے اس مضمون کی اطلاع کہ شہزادہ غلام محمدؒ نے اپنے فرزند کو محروم الارث کر کے اپنے داماد گورے صاحب کے نام سب جائداد لکھدی ہے اور انہیں کو اپنا قائم مقام بنایا ہے۔ شہزادہ حلیم کو کیونکر ملی یا قیاس کی بنیاد پر کہ باپ بوجہ ناراضگی کے محروم الارث کر دیں گے۔ یہ ممکن ہے کہ قبل اس دستاویز کی تکمیل کے حالت غصہ میں شہزادہ غلام محمد مرحوم کی زبان سے یہ نکل گیا ہو کہ میں اپنا جانشین اپنے داماد کو بناؤں گا اور یہ خبر غلام محمد مرحوم کے مصاحبوں میں سے کسی نے شہزادہ حلیم کو دیدی ہو اور وہ اپنے باپ سے بدگمان ہوگئے ہوں۔ بہرحال جب کہ شہزادہ غلام محمد مرحوم کی علالت نے طوالت کھینچی تو شہزادہ حلیم مرحوم اپنے امام باڑہ میں معتکف ہوئے۔ یعنی شبانہ روز باستثنائے اوقات حوائج ضروری کے امام باڑہ میں رہتے اور کوئی دعا وغیرہ پڑھتے رہتے تھے۔ تا اینکہ شہزادہ غلام محمد کا انتقال ہوا۔ کل عمائد کلکتہ تجہیز و تکفین کیلئے جمع ہوئے۔ سولیسٹر نے کسی معتبر شخص کو گورنمنٹ ہاؤس بھیجکر وہ فولادی بکس جس میں وصیت نامہ تھا طلب کیا۔ مرقوم الحاشیہ لوگوں کو بھی طلب کیا اور اب چپکے سے گورے صاحب کو سولیسٹر نے مبارکباد دی اور کہا تھوڑی دیر میں وصیت نامہ آئے گا اور آپ جز و کل کے مالک و مختار ہو جائیں گے۔ یہ خود سولیسٹر نے بعد کو والد مرحوم سے کہا تھا اور والد مرحوم فرماتے تھے کہ یہاں تو جنازہ شہزادہ غلام محمد مرحوم کا بے گور و کفن پڑا ہے اور گورے صاحب کے چہرے سے خوشی کے آثار نمودار تھے۔ میں یہ سمجھا کہ شاید ان کو وصیت نامہ کے مضمون کی اطلاع ہوگئی ہے کہ کوئی دم میں لکھپتی رئیس بن جائیں گے۔ لوگ انہیں کو پرسا دیرہے تھے کیونکہ بیٹے کا اس وقت کہیں پتہ نہیں تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس سے وہ

فولادی بکس لانے کو جو شخص بھیجا گیا تھا وہ گاڑی پر بھیجا گیا تھا وہ اسی گاڑی میں بکس لیکر آیا اور اس کے ساتھ گورنمنٹ ہوس کے دو فوجی سوار ساتھ آئے۔ اور سولیسٹر کی رسید اور دستخط لیکر واپس گئے۔ سب لوگوں کی موجودگی میں مرقوم الحاشیہ لوگوں کو وہ بکس دیکھایا گیا جس پر چپھیاں چسپاں تھیں۔ والد فرماتے تھے ہم لوگوں نے اچھی طرح دیکھا کہ جس طرح وہ چپھیاں جسپر ہماری دستخطیں تھیں۔ ایسی حالت میں ہیں جسطرح وہ لگائی گئی تھیں۔

کنجی سولیسٹر کے پاس تھی اس نے وہ بکس کھولکر صندوقچی کھولی جس کے اندر وصیت نامہ تھا۔ اس کا مضمون سولیسٹر باواز بلند پڑھنے لگا۔

تمہید وغیرہ کے پڑھنے کے بعد اس کی حیرت کی جد کو ہم لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ گورے صاحب کے نام کی جگہ شہزادہ حلیم کا نام دیکھا اور جہاں شہزادہ حلیم کا نام تھا کہ ماہانہ پانچ سو روپیہ ان کو دئیے جائیں۔ اس جگہ گورے صاحب کا نام لکھا ہوا پایا۔ سولیسٹر کہتا تھا کہ میں اندھا تو نہیں ہو گیا ہوں یا میرے دماغ میں کوئی خلل آ گیا ہے کہ عبارت اچھی طرح پڑھی نہیں جاتی ہے۔ اس کے چہرہ کی کچھ عجیب کیفیت تھی اس نے دوسرے دو انگریزی داںوں سے جو اس وقت موجود تھے وصیت نامہ پڑھوایا۔ ایک کے بعد دوسرے سے پڑھوایا۔ سولیسٹر نے ان لوگوں سے کہا آپ باواز بلند پڑھیں تاکہ سب حضرات سنیں۔ ان لوگوں نے بھی وہی پڑھا جہاں جہاں گورے صاحب کا نام لکھا گیا تھا اور تین چار مقام پر گورے صاحب کے نام لکھنے کی ضرورت ہوئی تھی۔ ہر مقام پر بعوض گورے صاحب کے شہزادہ حلیم کا نام اور ایک جگہ جہاں شہزادہ حلیم کا نام تھا وہاں گورے صاحب کا نام لوگوں کو جب کہ سولیسٹر نے اصل واقعہ سے آگاہ کیا۔ ہر شخص سراپا حیرت تھا۔ اور انگشت بدندان تھا۔ گورے صاحب کی صورت پر مردنی چھا گئی تھی۔ والد مرحوم فرماتے تھے کہ بیساختہ میری زبان سے یہ شعر نکل گیا۔ مجھے اسوقت اس شعر کا صرف ایک مصرعہ یاد رہگیا ہے وہ یہ ہے کہ

"چاہیں تو انقلاب مقدر کریں علی"

بعض لوگ والد مرحوم کا منھ دیکھنے لگے۔ فوراً ایک آدمی بیچڑہ روانہ کیا گیا کہ شہزادہ حلیم کو لائے۔ والد مرحوم تو چلے آئے۔ تجہیز و تکفین میں شہزادہ حلیم کا انتظار ہونے لگا

چیچڑہ کلکتہ کے اس پار ہے۔ اور بھی بعض لوگ بغیر شرکت تجہیز و تکفین کے چلے گئے تھے۔ غرض ساری دولت و ثروت شہزادہ حلیم وارث جائز کو خدا نے پہنچا دی۔ حق بحقدار رسید کا مقولہ صادق آیا۔ یہ واقعہ فی الواقع عجیب و غریب ہے۔ لیکن اسی قسم کے ہزاروں واقعات دنیا میں پیش آئے اور آرہے ہیں۔ میں اس جلسہ کی کارروائی لکھتے لکھتے کہاں سے کہاں ہو گیا۔

غرض ایک سب کمیٹی پانچ ممبروں کی بنائی گئی۔ جلسہ کے اختتام کے بعد ہم لوگوں کی خوشی کی جو اصل راز سے واقف تھے انتہا نہ تھی۔ میرے دوستوں نے میری پیٹھ ٹھونکی اور کہا کہ آج تو تم نے بڑا کام کیا۔ جب مرممہ قواعد جنرل میٹنگ سے پاس ہو جائینگے تو دوسرا یہی کام ہوگا کہ سکرٹری کو ہم لوگ بدلیں گے۔ میں نے کہا کہ اب جس کسی کو سکرٹری منتخب کریں گے وہ ایسا شخص ہوگا جو گورنمنٹ کا پٹھو نہ ہو اور گورنمنٹ کا ملازم نہ ہو ورنہ پھر یہی لیل و نہار شروع ہو جائیں گے۔ غرض میرے زمانۂ قیام کلکتہ میں ایک بڑا کام مجھ سے ہوا۔ اس جلسہ کے تین چار دن کے بعد مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر اور میں نواب امیر حسن خاں صاحب سے ملنے گئے۔ نہیں معلوم کس طرح ان کو اس کی بھنک معلوم ہو گئی کہ دستورالعمل کی نظر ثانی سے اصل مقصد سکرٹری کا بدلنا ہے۔ چنانچہ نواب صاحب بولے میں ایک زمانہ سے چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی ایسوسی ایشن سے دست بردار ہو جاؤں۔ میرے دوسرے مشاغل اس قدر ہیں کہ کافی فرصت نہیں ملتی کہ سکرٹری کے فرائض انجام دوں لیکن بعض ممبروں نے مجھ کو باصرار رہنے دیا۔ میں نے کہا کہ دستورالعمل پر نظر ثانی سے یہ مطلب آپ نے کیونکر نکالا کہ ہم لوگ آپ کو علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ بولے ابھی آپ صاحبزادے ہیں۔

من خوب می شناسم پیران پارسا را

میں نے کہا نواب صاحب معاف فرمایئے۔ آپ کو ناحق بھی ہم لوگوں سے بدظنی پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ وقتہ وقتہ سے سب کمیٹی کا اجلاس کبھی میرے مکان میں کبھی مسٹر عزیز احمد کے مکان میں کبھی مسٹر (حال سر) عبدالرحیم کے مکان میں ہوتا رہا۔ اور کمیٹی کے پانچ ممبر تھے۔ تین کی شرکت سے کورم (نصاب) قائم ہو جاتا اور کارروائی ہوتی۔ پرانے دستورالعمل میں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں اور سکرٹری کا بھی مثل دیگر عہدہ دار کے سالانہ انتخاب رکھا گیا۔ رپورٹ معہ مرممہ دستورالعمل کے سب کمیٹی نے بھیج دیا چونکہ سالانہ

انتخاب ہوکر تین یا چار مہینے ہوئے تھے۔ اس لئے جب تک کہ پورا سال ختم نہ ہولیتا سکریٹری کو صرف بدلنا خلاف ضابطہ تھا۔ افسوس کہ سالانہ انتخاب کو جب کہ چند ہفتے رہ گئے تھے اور مجھے کلکتہ چھوڑنا پڑا جس کا ذکر آگے آئیگا۔

مسٹر ابوالحسن خاں متوفی صوبہ بہار برادر خورد خان بہادر خدابخش خاں سی۔آئی ای۔ جو ۱۸۸۰ء میں انگلستان سے بیرسٹر ہوکر آئے تھے اور کلکتہ میں پریکٹس کرتے تھے وہ تقریباً ۱۸۹۰ء میں کلکتہ کے عدالت خفیفہ کے رجسٹرار مقرر ہوئے تھے۔ بتدریج ترقی کرتے کرتے ۱۸۹۰ء میں یعنی میرے زمانۂ قیام کلکتہ میں سکنڈ جج ہو گئے تھے۔ عدالت خفیفہ میں اس زمانہ میں پانچ جج ہوتے تھے۔ مسٹر ابوالحسنؒ خاں دوم تھے۔ اونہوں نے مسلمان یتیم بچوں کیلئے ایک یتیم خانہ بامداد و مشورہ چند دوستوں کے جس میں دو تین بیرسٹر تھے اور چند تجارت پیشہ اشخاص تھے قائم کیا۔ ایک شخص الٰہی بخش سی۔ آئی۔ ای دہلوی مرحوم تھے جنہوں نے لاکھوں روپیہ سگرٹ کی تجارت میں پیدا کئے خصوصاً سرزمین سگرٹ قینچی چھاپ سگریٹ فروخت کرنے کے لئے لندن اور برسٹل کی سگریٹ فیکٹری کے مالکوں ویلس وغیرہ نے دہ سالہ مناپولی دیدی تھی۔ یعنی سوا الٰہی بخش کے تمام انڈیا میں کوئی دوسرا شخص یہ سگریٹ نہ بیچنے پائے اور جو بیچے ان سے خرید کر فروخت کرے۔ اس وجہ سے الٰہی بخش مرحوم نے لاکھوں روپیے پیدا کئے اونہوں نے یتیم خانہ کی عمارت تعمیر کرنے کے لئے چوبیس ہزار روپیے کا گراں بہا عطیہ دیا اور کولوٹولہ میں جس محلہ میں بخش الٰہی مرحوم رہتے تھے اور جہاں اُن کا دفتر تھا زمین بارہ ہزار میں خریدی گئی۔ پہلے تو کرایہ کے مکان میں یتیم خانہ قائم کردیا گیا۔

اخباروں کے ذریعہ پبلک کو یتیم خانہ کے قیام کی خبر دیگئی۔ مسلمانوں سے استدعار کی گئی کہ عطیہ اور ماہانہ چندہ دیں اور یتیم لڑکوں کو یتیم خانہ میں بھیجیں۔ مسٹر ابوالحسنؒ خاں کلکتہ کے پولیس کمشنر سے جاکر ملے اور اون سے کہا کہ آپ تمام عرض وطول کلکتہ میں پولیس کے عہدہ داروں کے نام احکام جاری کریں کہ لاوارث بچے مسلمانوں کے یتیم خانہ میں بھیجے جائیں۔ پہلے تو ہر اتوار کو مسٹر ابوالحسنؒ اپنے مکان میں میٹنگ (جلسہ) کرکے عمائد اور تجار کو مدعو کرتے۔ جن لوگوں نے ممبر ہونا قبول کیا اُن لوگوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی بہت سے لوگوں نے عطیے دئے اور ممبران کمیٹی میں سے کسی نے ماہانہ پانچ روپیہ چندہ۔ کسی نے دو روپیہ۔ کسی نے ایک روپیہ دینا منظور کیا۔ ممبر سو سوا سو ہو گئے۔ ایک منیجنگ

کمیٹی پندرہ ممبروں کی قائم کیگئی۔ میں بھی مینجنگ کمیٹی کا ایک ممبر منتخب کیا گیا۔ میری کوٹھی ولزلی اسٹریٹ نمبر ۸۴ میں تھی۔ ایک عرصہ دراز کے بعد جب میں حیدرآباد میں تھا یہ کوٹھی منجھلے نواب صاحب نے مہاراجہ محمود آباد کے ہاتھ ایک لاکھ کچھ ہزار میں فروخت کی تھی۔ میری کوٹھی کے سامنے پارک لین میں مسٹر ابوالحسن خاں کی کوٹھی تھی۔ تقریباً ہر سال شام کو میں وہاں جایا کرتا اور اس یتیم خانہ کی آیندہ ترقی کے متعلق مسٹر ابوالحسن مجھ سے مشورہ کرتے۔ جلسہ انتظامیہ کا اجلاس ہر دو ہفتہ میں اور معمولی مٹنگ کا اجلاس ماہانہ ہوتا۔

بہرحال کچھ قلیل عرصہ میں ہم لوگوں کی گہری دلچسپیوں کی وجہ سے یتیم خانہ چل نکلا بچے بھی بہت جمع ہو گئے۔ ان کو کلام پاک بامعنی پڑھایا جاتا۔ صوم وصلواۃ کی پابندی ان پر عائد کی گئی۔ بہت سے ہنر سکھائے جانے لگے۔ ٹین گری یعنی ٹین کے بکس وغیرہ بنانا خیاطی کا پیشہ۔ کارچوب نکالنا بید بافی۔ چند شعبے مختلف صناعی کے قائم کئے گئے۔ ادھر مکان کی تعمیر ہونے لگی۔ بارہ ہزار کے علاوہ بعض ہمدرد ملت نے تعمیر مکان کیلئے بھی عطیہ دئیے۔ میرے قیام کلکتہ تک عمارت کا بہت بڑا حصہ تیار ہو چکا تھا۔ اور یتیم خانہ اس میں منتقل بھی کر دیا گیا تھا کرایہ کے بار سے سبکدوشی ہوی۔ میں اکثر مسٹر خان کے ہمراہ بروز تعطیل یتیم خانہ دیکھنے جایا کرتا تھا۔ کار حسنہ سمجھکر جو مجھ سے ہو سکتا تھا اس یتیم خانہ کیلئے کرتا تھا۔ میرے دوران قیام کلکتہ میں مسلمانوں کے سود و بہبود کے لئے کوئی کام یا میٹنگ وغیرہ ہوتی اس میں لوگ مجھ کو ضرور مدعو و شریک کرتے۔ مسلمانان اہل کلکتہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں ملکی و ملی کاموں میں دلچسپی لیتا ہوں۔ علاوہ مسلمانوں کے ہندو بنگالی بیرسٹر خصوصاً مجھ کو اپنے کاموں میں دلچسپی لیتا ہوتی۔ علاوہ مسلمانوں کے ہندو بنگالی بیرسٹر خصوصاً مجھ کو اپنے کاموں میں بھی شریک کرتے چونکہ اس زمانہ میں کانگرس کا میں بڑا حامی تھا اور گورنمنٹ کے مخالف لوگوں سے بھی ملتا جلتا رہتا تھا۔ بنگالی وکلاء اور بیرسٹروں میں قومی کاموں کا بڑا جوش تھا۔ اس زمانہ میں گوکھلے اور تلک وغیرہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بمبئی میں مرہٹوں سے اور نہ مدراس میں برہمن اور غیر برہمن اشخاص نے علمی ترقی کی تھی اودھ میں پنڈت اجودھیا ناتھ آنجہانی کشمیری پنڈت کی قابلیت اور قومی کاموں میں حصہ لینے کی شہرت تھی۔ موتی لال نہرو اور سپرو وغیرہ کشمیری پنڈت مشہور نہیں ہوے تھے۔ پارسیوں میں بھی

میں مسٹر دادا بھائی نوروزجی کے بعد سر فیروز شاہ مہتا مشہور بیرسٹر کا نمبر تھا اور قومی کاموں میں پیش پیش تھے۔ دادا بھائی تو لندن میں تھے۔ انڈیا میں سر فیروز شاہ مہتا بہت کچھ کام کرتے تھے اسی طرح انڈیا کے بعض صوبوں میں لیڈر کا کوئی جان نثار ملک و قوم قابلیت تاب نظر آتا تھا۔

صوبۂ بنگال میں عام بیداری تھی اور بہت لوگ قابل اور مغربی تعلیم سے بہرور تھے۔ انڈیا کے بیرسٹروں میں پہلے شخص بنگالی ڈبلیو سی بنرجی تھے جو ۱۸۶۸ء میں بیرسٹر ہوکر آئے۔ ان کے بعد بہت سے ہندو بنگالی بیرسٹر ہو کر آئے۔ اسی طرح ای سی ایس یعنی انڈیا سول سروس میں بھی انڈیا کا پہلا سیویلین بنگالی تھا۔ حال ڈاکٹر رو بندر وناتھ ٹیگور کے حقیقی چچا پہلے انڈین سیویلین تھے۔ ان کے بعد کے سویلینوں میں مسٹر (بعد سر) سریندر وناتھ بنرجی مسٹر بی ال گپتا رومیش چندر دت مصنف کتاب دی اینشنٹ انڈیا مسٹر (بعد سر) کرشن گپتا وغیرہ سول سروس میں داخل ہوتے گئے۔ اسی طرح ای ام ایس کے امتحان میں بھی بنگالیوں نے سبقت کی۔ کرنل موز مدار پہلے انڈین ای ام ایس تھے۔ غرض میرے زمانہ قیام کلکتہ تک سینکڑوں ہندو بنگالی بیرسٹر اور ای سی ایس۔ ہوکر یورپ سے تعلیم پاکر آچکے تھے جو یورپ کے تعلیم یافتہ نہ بھی تھے لیکن کلکتہ یونیورسٹی کے بی اے ام اے وغیرہ ہزاروں کی تعداد میں تھے اور سب کے دلوں میں جوش حب وطن تھا جو ملازمت میں تھے گو عموماً وہ بذریعہ تحریر و تقریر کے اپنے خیالات گورنمنٹ کے خوف سے نہ ظاہر کرتے ہوں تاہم مئے حب وطن سے سرشار تھے۔ بعض ملازم پیشہ اپنے جذبات کا اظہار کر بھی دیتے تھے جس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا سر سریندرناتھ بنرجی جو اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے اور اپنے زمانہ میں بہت نام و نشان پیدا کیا جن کو بادشاہ بغیر تاج کا لقب دیا گیا تھا اپنے آخر زمانہ میں گورنر بنگالہ کے کونسل کے ممبر بھی رہے اور سر ہوئے۔ سریندرو بابو سیویلین تھے۔ جس زمانہ میں یہ زمرہ ملازمت میں تھے اور بنگال کے کسی ضلع میں جوائنٹ مجسٹریٹ تھے اُن سے دلی جذبات نہ رُکے اور ایک موقع پر اپنی تقریر میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ کہا تھا تو اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور ایک ماہ قید سادہ کی سزا دیگئی۔ ملازمت سے علیحدہ کردیئے گئے۔ جب سریندرو بابو کو سزا سُنائی گئی تو لوگوں میں خصوصاً بنگالیوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوگیا۔ ہندو اخباروں نے گورنمنٹ کی

خوب خبر لی اور سریندر و بابو کے گورنمنٹ کے مخالف ریمارکس کو حق بجانب تبلایا۔
سب بنگالیوں نے داہنے ہاتھ کی کوٹ کی آستینوں پر مورننگ بیج لگایا یعنی سیاہ پٹی
ایک مہینے تک جب تک سریندرو بابو قید میں رہے باندھ کر باہر نکلتے رہے۔ اس سے
بنگالیوں کی یکجہتی اور حب وطنی پر روشنی پڑتی ہے۔ غالباً یہ واقعہ ۱۸۸۳ء کا ہے بمبئی کے
سر فیروز شاہ مہتا وائسرائے کے کانسل قانون سازی کے ممبر ہوکر ۱۸۹۲ء میں کلکتہ آئے
تھے۔ اس زمانہ میں وائسرائے کی اور ہر صوبہ کے لفٹنٹ گورنر کی ایک ہی کانسل قانون
سازی ہوتی تھی زمانہ موجودہ کی طرح دو کانسلیں ایک اکزیکیٹو دوسری لجسلیٹو نہیں اور
نہ انتخاب کا طریقہ رائج تھا بذریعہ نامنشن ممبر مقرر کئے جاتے تھے اور لفٹنٹ گورنر کے اور وائسرائے
کے لجسلیٹو کانسل کے سب ممبر آنریبل کہلاتے تھے اور کانسلوں کا ممبر ہونا بڑا اعزاز سمجھا
جاتا تھا۔ بہر حال سر فیروز شاہ مہتا بڑے آزاد خیال اور منہ پھٹ شخص تھے موجودہ اخبار
بمبئی کرانیکل انہوں نے جاری کیا تھا۔ ایک لائف انشورنس کمپنی بھی ان کی یادگار ہے۔
وائسریگل کانسل کے کسی اجلاس میں جس میں لفٹنٹ گورنر بنگالہ سر چارلس ایلیٹ۔ ای
سی۔ ایس۔ اور بھی چند آئی۔ سی۔ ایس شریک تھے۔ سر فیروز شاہ مہتا نے ممبران انڈین
سول سروس کے خلاف کچھ ریمارک کئے۔ گو اپنی جگہ پر وہ ریمارکس ٹھیک تھے۔ مگر
سویلینوں کی ہتک ہوتی تھی۔ ان ریمارک نے صاحب بہادروں کو بہت برانگیختہ کیا۔ سر
چارلس ایلیٹ نے بر وقت کچھ جواب منجانب ممبران سول سروس دیا۔ کچھ تو تو میں میں
بھی ہوگئی۔ وہ انگریزی اخبارات جو انگریزوں کے ہاتھ میں تھے سویلینوں کی جانب سے
سر فیروز شاہ کی خوب لے دے کی جس کا جواب انگریزی اخباروں نے ترکی بہ ترکی دیا۔
چونکہ سر فیروز شاہ مہتا بہت ممتاز و موقر بیرسٹر بھی تھے۔ کلکتہ ہائی کورٹ میں
پریکٹس کرنیوالے بنگالی بیرسٹروں نے ایک جلسہ ٹاون ہال میں کیا اور سر فیروز شاہ کی
حمایت میں خوب تقریریں ہوئیں۔ اس جلسہ میں چند مسلمان بیرسٹر جو گورنمنٹ سے دبتے
نہ تھے شریک ہوئے۔ میں بھی اس جلسہ میں شریک کیا گیا وہیں یہ بھی طے پایا کہ کلکتہ کے
کے ممبران بار کیجانب سے سر فیروز شاہ کو ایک بنکویٹ دیا جائے یعنی ضیافت کیجائے
ہندو وکلا بھی شریک ہوئے۔ فی کس پندرہ روپیہ چندہ مقرر کیا
گیا۔ اس کے لئے ایک اسپشل کمیٹی دس یا بارہ آدمیوں کی قائم کیگئی میں بھی ایک ممبر اسپشل

کمیٹی کا (کمیٹی استقبالیہ) بنالیا گیا۔ اس کمیٹی کے چند ممبر سر فیروز شاہ کی خدمت میں دعوت دینے کو گئے اور دعوت کی شب کو سر فیروز شاہ کی اقامت گاہ (ہوٹل) سے لانے کیلئے بھی چار ممبر گئے بقیہ ٹاؤن ہال (جہاں دعوت دی گئی تھی) کے گیٹ کے پاس منتظر رہے۔ جب گاڑی سے سر فیروز شاہ اترے تو اون کے ہمراہ ممبران ریسپشن کمیٹی ہال میں داخل ہوئے۔ فراغت طعام کے بعد دہواں دہار تقریریں ہوئی۔ سر فیروز شاہ کی حمایت کیگئی خصوصًا وہ تقریر جس کے ذریعہ آپ کا ٹوسٹ پروپوز کیا گیا یعنی جام صحت پیا گیا جس کا جواب بھی سر فیروز شاہ نے بہت مدلل و پرمغز دیا اخباروں کے رپورٹر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ صبح کے اخباروں میں تقریریں سب آگئیں۔ بنگالی اخباروں میں تو مدح سرائیاں تھیں اور انگریزوں کے اخباروں میں مذمت تھی۔ یہہ ڈنر معرکتہ الارا تقریب تھی۔ کیونکہ گورنمنٹ کے خلاف تھی۔ یہہ زمانہ وہ تھا کہ گورنمنٹ کے خلاف اشارۃً وکنایۃً کچھ کہتے ہوئے لوگ ترساں و خوف زدہ ہوتے تھے۔ بنگالیوں میں کرسوڈاس پال ڈبلوسی بانرجی لال موہن گھوش سریندر ناتھ۔ من موہن گھوش۔ چندر پال بڑے اعلیٰ درجہ کے مقررین تھے اور اسی زمانہ میں گورنمنٹ کے افعال و اقوال کی نہایت سنجیدہ پیرایہ میں تنقیدیں کرتے تھے۔ یہہ سب بڑے قانون دان تھے۔ قانون کے زد میں نہیں آتے تھے۔ جو لوگ اس بنکویٹ میں شریک ہوئے وہ جھنڈے پر اور گورنمنٹ کی نظروں میں چڑھ گئے۔ چنانچہ ایک ملاقات میں سر چارلس الیٹ نے اس ڈنر کا مجھہ سے ذکر نہایت توہین آمیز لہجہ میں کیا۔ سب شرکاء کو برا بھلا کج فہم کہا جو فہرست شرکاء کے ناموں کی پیش کیگئی ہوگی میرا نام بھی ہوگا لیکن خلاف اخلاق سمجھکر بخیال نزاکت موقع میرا ذکر نہیں کیا جسوقت سر چارلس کی زبان پر اس ڈنر کا نام آیا۔ میں بہت گھبرایا اور چوکنا ہوگیا۔ اس خیال سے کہ کہیں میری شرکت کا ذکر نہ کریں۔ مگر جب ساری گفتگو اس خصوص میں بغیر میرا ذکر و نام آئے اونھوں نے ختم کی تو میں نے اطمینان کی سانس لی چونکہ میں عمومًا بنگالیوں سے زیادہ میل جول رکھتا تھا اور باستثنی چند بنگالیوں کے اور ملازمت پیشہ بنگالیوں کے سوا بقیہ بنگالیوں کا گروہ گورنمنٹ کے مخالف سمجھا جاتا تھا اور اون کی گورنمنٹ کے خلاف جو میٹنگ اور تقریریں وغیرہ ہوتی تھیں ان میں میں اکثر شرکت کرتا تھا تو میں نے پرائیوٹ ملاقاتیں انگریز عہدہ داروں سے کم کردی تھیں۔ کیونکہ بقول کسی شاعر کے

دو رنگی چھوڑ دے یکرنگ ہو جا ٭ سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

گورنمنٹ ہاوس سے یعنی وائسرائے کے ہاں سے یا بلویڈیر سے یعنی لفٹنٹ گورنر کے ہاں سے جو دعوتیں آئی تھیں ان میں گورنمنٹ کے مخالف و موافق مقررین سب ہی شریک ہوتے تھے۔ میں بھی شریک ہوا کرتا۔ میری پریکٹس کی حالت یہ تھی۔ ہنوز میرا شمار بگینرس (Beginners) یعنی مبتدیوں میں تھا۔ مقدمات کا ملنا کارے وارد جیسا میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ ہائیکورٹ کے مقدمات بذریعہ وکلا یا اٹرنی یا سولیسٹر بیرسٹروں کے پاس آتے تھے جو نامی گرامی بیرسٹر تھے ان کی نسبت تو خود موکل اپنے سولیسٹر یا اٹرنی سے کہتا کہ میرا مقدمہ فلاں کانسل کو دو۔ بعض حالتوں میں یہ بھی تھا کہ جو بیرسٹر کسی سولیسٹر کے دوست ہوتے تو سولیسٹر اپنے دوست بیرسٹر کو اپنے کسی مقدمہ میں شریک کرلیتا۔ کلکتہ کے ہائیکورٹ کے اوریجنل سائیڈ میں صرف بیرسٹر وکالت کے مجاز تھے البتہ ڈیوزنل بنچ یعنی جلسہ متفقہ میں جو دو ججوں کے اجلاس بنتا ہے۔ اس میں ہائیکورٹ کے وکلا بھی پیروی کے مجاز تھے۔ اٹرنی اور سولیسٹر ہائیکورٹ میں پیروی وکالت کے مجاز نہیں ہیں۔ ان کے پاس جو مقدمات ہائیکورٹ کے آتے ہیں وہ بریف بنا کر یعنی مقدمہ کا خلاصہ لکھکر کسی بیرسٹر کو دیتے ہیں۔ دو عیسائی سولیسٹر مسٹر مینول اور مسٹر برگ کے پاس پریسیڈنسی کورٹ کے بہت مقدمات آئے تھے۔ وہاں وکالت کرنے کے یہ دونوں خود بھی مجاز تھے اور کسی بڑے مقدمہ میں کسی بیرسٹر کو بھی کرلیتے تھے۔ اس زمانہ میں پریسیڈنسی کورٹ صرف دو مجسٹریٹ ہوتے تھے بعد کو اضافہ ہوا۔ میرے زمانہ میں دو ہی پریسیڈنسی مجسٹریٹ تھے۔ سارے شہر کلکتہ کی تقسیم دو سمتوں میں تھی۔ نارتھ ڈیویژن (شمالی سمت) اور ساوتھ ڈیویژن (جنوبی سمت) شمالی سمت میں انگریزوں کی سکونت عام طور سے تھی۔ بعض انڈین معززین خصوصاً مغربی معاشرت والے بھی رہتے تھے۔ نارتھ ڈیویژن کیلئے ایک انگریز مجسٹریٹ مقرر کیا جاتا اور ساوتھ ڈیویژن کیلئے کوئی انڈین میرے زمانہ قیام میں ساوتھ ڈیویژن کے مجسٹریٹ نواب امیر حسن خاں تھے اور نارتھ ڈیویژن کا مجسٹریٹ ایک انگریز بیرسٹر پیٹرسن نامی تھا اس سے اور مجھ سے اچھی خاصی ملاقات ہوگئی تھی۔ اس نے دونوں سولیسٹروں مسٹر مینول اور مسٹر برگ سے اچھی طرح میری سفارش کی کہ مسٹر ہمایوں مرزا کو مقدمے دیا کرو۔ پھر کیا تھا جب مجسٹریٹ خود سفارش کرے تو اسکی خوشی کیلئے لازماً مجھے پریسیڈنسی کورٹ کے مقدمے دونوں سولیسٹر دینے لگے اپنے نام کے کارڈ کے

ساتھ موکل کو میرے پاس بھیج دیا کرتے
اور ہائیکورٹ کے ڈویژنل بنچ کے مقدمات گاہے گاہے مجھکو مسٹر سلطان عالم سولیسٹر دیتے اور بیچارے خود آکر سمجھا بھی دیتے۔

مسٹر سلطان عالم ٹیپو سلطانؒ کے خاندان کے ایک رکن تھے۔ علاوہ ان کے صوبہ بہار کے گنتی کے چند مسلمان علاوہ خان بہادر مولوی یوسفؒ نامی گرامی وکیل کے جو کلکتہ ہائیکورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ ایک میر لطافت حسینؒ تھے وہ مجھکو کبھی کبھار اپنے ساتھ لے لیتے تھے اور جنل سائیڈ (جلسۂ ابتدائی) میں مجھے بہت کم کام کرنیکی نوبت آئی وہ بھی سینیر بیرسٹروں کے ساتھ مسٹر بی ال رائے زیادہ تر فوجداری مقدمات ڈیویژنل سائیڈ کے لئے تھے انکے ساتھ بھی رہتا تھا مگر ان مقدمات میں مجھے کوئی فیس نہیں ملتی تھی۔ میں نے جب کلکتہ میں وکالت جنوری ۱۹۰۸ء میں شروع کی تھی گو والد مرحوم کے انتقال کو اور کلکتہ چھوڑے عرصہ گذر چکا تھا۔ مگر اسوقت تک کلکتہ کے بہت سے عمائد کے دلوں سے میرے والد مرحوم کی یاد محو نہیں ہوئی تھی۔ گو بہت بڑی تعداد ان کے دوستوں اور شناساؤں کی دنیا سے جا چکی تھی جو حضرات باقی رہ گئے تھے وہ مجھے بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھتے اور مجھے بخلوص ملتے۔ مثلاً سید امیر علیؒ صاحب نواب بہادر عبداللطیف خاں۔ نواب سید امیر حسنؒ خاں۔ مولوی محمدؒ جان صاحب میر منشی گورنر جنرل شہزادہ بختیار شاہ ذوالفقار الدولہ مرزا محمدؒ باقر شیرازی۔ شیخ محمود اصفہانی۔ شہزادہ سر مرزا جہان قدر داماد و برادر زادہ حضرت واجد علیشاہ مرحوم شہزادہ قمر قدر خلف واجد علیشاہ نواب ولیر جنگ نواب محمد علیخاں جلیس الدولہ وغیرہم گو شہزادہ قمر قدر واجد علیشاہ کے فرزند تھے اور پولیٹیکل پنشن بھی معقول پانچہزار ماہانہ پاتے تھے۔ مگر سر جہاں قدر مرزا مرحوم گورنمنٹ اور پبلک میں بہت ممدوح تھے۔ انہیں گورنمنٹ نے سر پرست خاندان اودھ بنایا تھا۔ کیونکہ علاوہ داماد و برادرزادہ ہونے کے قابل و لایق تھے شہزادہ جہاں قدر مرحوم مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے تھے۔

کلکتہ آکر قلیل عرصہ ہوا تھا کہ وائیسرائے کی ایک پارٹی میں نواب سید احمدؒ علیخاں بیرسٹر نواب جیت پور نے بہت سے لوگوں سے ملایا اور وہیں شہزادہ جہاں قدر بہادر سے بھی ملایا اور ان سے میرے والد کا نام بتلایا۔ یا تو مجھ سے پہلے مصافحہ کیا تھا مگر جب والد مرحوم کا نام سنا تو مجھکو سینہ سے لگا لیا۔ اور فرمایا انگلستان سے کب آئے اور یہاں کہاں ٹھہرے

مجھ سے ابتک کیوں نہیں ملے۔ بہرحال اس پارٹی کے تیسرے یا چوتھے دن میں مٹیا برج قمر قدر بہادر اور جہاں قدر بہادر سے ملنے گیا۔ مٹیا برج کو گارڈن ریچ (Garden Range) بھی کہتے ہیں۔ چند میل کا رقبہ حضرت واجد علیشاہ کے رہنے کیلئے انگریزوں نے دیا تھا۔ بادشاہ کے اخراجات کیلئے پولٹیکل پنشن کے نام سے سالانہ بارہ لاکھ یعنی ماہانہ ایک لاکھ روپیہ انگریز دیتے تھے مگر ان کے اخراجات اسقدر تھے کہ یہ رقم کافی نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ اپنے ساتھ کروڑہا روپیہ کے جواہرات لائے تھے جو ہمیشہ فروخت ہوتے رہتے تھے۔ لکھنؤ سے بادشاہ کو لاکر پہلے تو فورٹ سینٹ ولیم (Fort Saint William) کلکتہ کا قلعہ میں نظر بند کچھ دنوں رکھا اس کے بعد یہہ رقبہ اراضی دیا۔ یہاں عالیشان عمارتیں اور باغات وغیرہ متعدد بادشاہ کیلئے تیار ہوئے اور یہہ بادشاہ کے مصاحبوں اور لکھنؤ کے بعض امراء نے یہیں کوٹھیاں بنائیں بہت سے پیشہ ور لکھنؤ کے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ آٹھ نو میل کے رقبہ میں ایک شہر آباد کیا گیا۔ بہت سے شعراء و علماء لکھنؤ کے یہاں چلے آئے تھے۔ غرض بادشاہ کی زندگی تک تو بڑی چہل پہل یہاں تھی۔ ان کی رحلت کے بعد ان کی اولادیں یہیں رہتی تھیں مرجہاں قدر بہادر سے جب میں ملکر آیا تو اس کے دوسرے دن شہزادہ صاحب بازدید کو تشریف لائے اور بہت دیر تک والد مرحوم کا ذکر فرماتے رہے۔ اس واقعہ کے دو تین دن کے بعد ایک خط انگریزی میں اپنے دست مبارک سے لکھکر بھیجا۔ عام طور سے انکا پرائیوٹ سکرٹری جو ایک انگریز تھا ان کی جانب سے لوگوں کو خط لکھتا تھا میرے ساتھ یہہ خاص عنایت تھی کہ اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ فلاں روز فلاں وقت میرے ساتھ بریکفاسٹ کھائیے۔ چنانچہ میں تاریخ مقررہ میں گیا۔ شہزادہ صاحب نے پندرہ سولہ معززین کو اس دعوت میں مجھ سے ملانے کے لئے مدعو کیا تھا۔ سب سے مجھکو ملایا۔ ان میں سے بعض تو میرے والد سے واقف تھے۔ جن سے نواب دلیر جنگ وغیرہ اور بعض ناواقف تھے سب سے والد مرحوم کے کمالات اور عالیخاندانی کا تذکرہ کیا۔ اس تاریخ سے کبھی کبھی میں مٹیا برج شہزادہ صاحب سے ملنے جایا کرتا۔ میرے مکان سے مٹیا برج چھ سات میل کے فاصلہ پر تھا۔ میں جب جاتا تو بروز یکشنبہ جاتا۔ اس دن ہائیکورٹ اور تمام دفتروں کو تعطیل ہوتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شہزادہ صاحب مجھے دن بھر اپنے پاس رکھتے۔ دن کے خاصہ میں باصرار شریک فرمائے

چند مصاحبین اور حضرت کے داماد شہزادہ مرزا قیوم وغیرہ بھی شریک دستر خوان ہوتے۔ حسب دستور ایک دفعہ میں ملنے گیا۔ عید الفطر کو دو تین دن باقی تھے فرمایا کہ ہر عید کو بالعموم میں چند دوستوں کی دعوت کرتا ہوں آپ بھی عید میرے ساتھ منایئے۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا میں، تو عید ملنے کو یوں بھی آتا اور نماز عید بھی یہیں پڑھنے کا خیال ہے۔ فرمایا اس سے کیا بہتر آپ کو یہاں مومنین کی جماعت بھی ملیگی۔ ٹھیک صبح کے نو بجے نماز شروع ہو جائیگی۔ چنانچہ میں بروز عید لمبا فروک کوٹ اور بعوض ہیٹ کے ایرانی ٹوپی جو چند روز قبل ایک ایرانی کلاہ ساز کے پاس سے خریدی تھی پہنکر گیا اور نماز جماعت میں شرکت کی۔ نماز ایک شیعہ عالم نے پڑھائی اس کے بعد بہت سے لوگ منتشر ہو گئے۔ اور کچھ لوگ شہزادہ صاحب کے دولت خانہ گوشۂ سلطانی میں بعد کو آئے۔ نماز میں بہت سے شہزادگان اودھ اور لکھنؤ کے خوش باش لوگ جو مٹیا برج میں رہتے تھے۔ شریک تھے۔ مجھے اپنے ساتھ شہزادہ صاحب اپنے دولت خانہ میں لیتے آئے ایک لمبے برآمدہ میں نشست کیلئے بہت سی کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک کرسی پر شہزادہ صاحب رونق افروز ہوئے۔ ملازمین اور غیر ملازمین بہت سے لوگوں نے یکے بعد دیگرے نذریں دیں ان میں واجد علی شاہ مرحوم کے بعض مصاحبین بھی تھے جو اس وقت تک زندہ تھے مثلاً گلشن الدولہ وغیرہ بعض شہزادگان بھی تھے جو رشتہ اور عمر میں جہاں قدر بہادر سے کم تر تھے۔ زیادہ تر لوگوں کی نذروں میں ہاتھ رکھتے گئے۔ بعض کی نذریں قبول بھی کیں اسی اثناء میں ایک چوبدار نے عرض کیا کہ مہاراجہ راجو دیبا بہادر حاضر ہیں۔ فرمایا بلاؤ۔ مہاراجہ راجو دیبا بڑے ٹھاٹ کے کپڑے پہنے اور جواہرات میں لدے ہوئے تھے۔ چند مصاحبین ان کے ہمراہ تھے۔ مہاراجہ راجو دیبا سے بھی اس زمانہ میں وایسرائے لارڈ ایلگین کے کانسل کے ممبر تھے اور شہزادہ صاحب بھی وائسرائے کے کانسل کے ممبر تھے اس لحاظ سے درجہ میں اتفاق زمانہ کی وجہ سے مساوی تھے۔ جب مہاراجہ قریب آگئے تو شہزادہ صاحب کو جھک کر آداب بجا لائے۔ شہزادہ صاحب خلق مجسم تھے۔ جھٹ کھڑے ہو کر مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا۔ مہاراجہ نے دست بوسی کی اور جیب میں سے چند اشرفیاں نکال کر ایک رومال پر رکھ کر نذر پیش کی۔ شہزادہ صاحب نے فرمایا اب ہمارے وہ دن نہیں ہیں مہاراجہ کہ میں آپ سے نذر لوں۔ انہوں نے کہا غلام تو اپنے تئیں ویسا ہی موروثی خانہ زاد

و جان نثار سمجھتا ہے۔ شہزادہ صاحب نے فرمایا یہ آپکی سعادت مندی و کسرنفسی ہے۔ شہزادہ صاحب نے نذر پر ہاتھ رکھ دیا مگر مہاراجہ نے بڑے اصرار سے عرض کیا کہ نذر قبول فرمائی جائے۔ ایک مصاحب سامنے کھڑے تھے جو نذریں لیلی جاتیں۔ ان کے حوالہ شہزادہ صاحب کرتے جاتے تھے۔ مہاراجہ کی نذر بھی لیکر ان کے حوالہ کی اور قریب بلاکر ان کے کان میں کچھ کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نقروی کشتی میں ایک بسنتی رنگ کا کشمیری دوشالہ قلم کاری کام کا میرے خیال میں ہزار بارہ سو روپیہ کی قیمت کا ہوگا لایا گیا جس کو شہزادہ صاحب نے لیکر مہاراجہ کو اپنے ہاتھوں سے اوڑھایا۔ یہ فرماکر یہ عید کا خلعت ہے جو ہمیشہ آپ کے اجداد کو اگلے زمانہ میں میرے اجداد نے دیا۔ مہاراجہ نے جھک کر تسلیم کیں اور جیب میں سے چند اشرفیاں نکال کر ایک رومال پر رکھ کر گزرانیں۔ شہزادہ صاحب مسکرائے وہ نذر بھی لیلی اس کے بعد مہاراجہ کی موجودگی میں جن لوگوں کی دعوت کی تھی وہ لوگ بھی آنا شروع ہوئے۔ مہاراجہ رخصت ہونے لگے تو شہزادہ صاحب نے فرمایا ابھی کب تک آپ کا قیام کلکتہ میں رہیگا۔ غالباً ختم سشن تک تو آپ کلکتہ ہی میں رہیں گے۔ انہوں نے عرض کیا حضور ہاں اس زمانہ میں کونسل کے اجلاس ہو رہے تھے۔ ایک بڑے کمرے میں دستر خوان بچھا اور دسترخوان کنارے بیچ میں مسند بچھی تھی عموماً شہزادہ کے نشست کیلئے ایک چھوٹی سوزنی بچھتی تھی جبکہ کوئی مہمان باہر کا نہیں رہتا تھا۔ صرف گھر کے لوگ رہتے تھے۔ دو تین دفعہ میں بھی شریک ہوگیا تھا۔ غالباً عید کی وجہ سے مسند بچھائی گئی تھی۔ گنتی کے چند مہمان تھے۔ شہزادہ مرزا بابر۔ ٹیپو سلطان کے خاندان کے چند شہزادے جو ٹیپو سلطان کے بڑے اور منجھلے بیٹے کی اولاد سے تھے کو لوٹولہ کے دو تین کچھی تجار ایک کا نام مجھے یاد ہے۔ مجھ سے ان سے پہلے ملاقات تھی۔ ہاشم ولی سیٹھ ان کا نام تھا ولی سیٹھ۔ بہت سے جہاز کے مالک تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی قاسم ولی سے بھی مجھ سے ملاقات تھی۔ سورت کے رہنے والے تھے۔ ہوڑہ کے ڈپٹی کلکٹر مسٹر عبدالسلام سے بھی مجھ سے پہلے ملاقات تھی۔ اسیطرح چوبیس پرگنہ کے ڈپٹی مجسٹریٹ مسٹر عبدالقادر سے بھی مجھ سے اچھی طرح ملاقات تھی۔ شہزادہ بابر کو میں خوب جانتا تھا۔ یہ لوگ جس جس طرح آتے گئے سب سے کھڑے ہوکر شہزادہ صاحب مصافحہ کرتے گئے اور مجھ کو ملاتے گئے۔ ان میں سے جو جو مجھ سے واقف تھے انہوں نے خود کہا میں مل چکا ہوں۔ جب سب مدعومین آچکے تو سب کو لیکر کھانے کے کمرہ میں شہزادہ صاحب داخل ہوئے۔ مجھے اپنی داہنی طرف بٹھایا اور فرمایا کہ حضرات سید ہمایوں مرزا صاحب کا جو

میں اسقدر احترام کرتا ہوں تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ یہ بیرسٹر ہو کر ولایت سے آئے ہیں۔ کلکتہ میں چند مسلمان بیرسٹر اسوقت موجود ہیں۔ مگر ان کی حالت اور خصوصیت اور ہی کچھ ہے۔ یہ اسی خاندان کے رکن رکین ہیں۔ جن کے اجداد کو سلاطین مغلیہ نے نذریں دی تھیں اور باؤں کے موزے اتارے تھے۔ جبکہ مجھے بریکفاسٹ کی دعوت شہزادہ صاحب نے دی تھی تو کرسیوں کی نشست تھی اور انگریزی قاعدہ کے لحاظ سے مجھے اپنی داہنی جانب بٹھایا تھا۔ کیونکہ خاص میری دعوت تھی اور دو تین دفعہ جو میں اُن کے روز مرہ کے خاصہ میں دن کو شریک ہوا تو جب بھی اپنی سوزنی پر داہنی جانب مجھکو بٹھاتے رہے۔ غرض مجھ سے بہت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ کوئی تقریب ایسی نہیں ان کے ہاں ہوتی جو مجھے نہ بلاتے ہوں کئی دفعہ ایوننگ پارٹی انہوں نے بڑے پیمانہ پر دی جس میں بڑے بڑے کیپتی بنگالی راجگان وزمیندار اور نوابان انگریز اعلیٰ عہدہ داران ہائیکورٹ کے سکرٹری سب ہی شریک ہوتے تھے۔ ایک موقع پر لفٹنٹ گورنر بھی آئے تھے۔ شہزادہ صاحب محرم میں عزا داری الشہداءؑ مظلوم کربلا اہتمام کے ساتھ کرتے تھے۔ اربعین کی مجلس میں علاوہ مٹیا برج والوں کے کلکتہ کے بہت سے عمائد کو مدعو کرتے تھے۔ اربعین کی مجلس شاہی عاشور خانہ میں کرتے تھے۔ ایک مجلس اربعین کا ذکر میں خاص طور سے کرتا ہوں جس میں علاوہ تکیہ کے مرثیہ خوان سوزخوان کے ممبر پر مرزا محمد جعفر صاحب اوجؔ مرحوم خلف مرزا دبیرؔ صاحب علی اللہ مقامہ پڑھتے تھے۔ جب مجلس ختم ہو چکی اور مرزا اوجؔ مرحوم ممبر سے اُتر کر زیارت پڑھ کر بیٹھنے کو تھے کہ شہزادہ صاحب نے فرمایا۔

ہمایوں مرزا صاحب ذرا ادہر تشریف لائیے یہ کہکر مرزا اوجؔ صاحب مرحوم سے مجھ کو ملایا اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ان کے نام سے تو آپ واقف ہوں گے اور بچپنے میں ممکن ہے۔ آپ نے ان کو دیکھا بھی ہو۔ مگر فراموش کر گئے ہوں۔ ان کے والد بزرگوار کا نام بتلاؤں تو آپ سمجھیں گے یہ حضرت شاہ الفت حسینؒ صاحب فریادؔ کے فرزند ہیں۔ شاہزادہ صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ مرزا اوجؔ صاحب مرحوم کی باچھیں کھل گئیں اور مجھے مخاطب ہو کر بولے آج اربعین ہے ورنہ آپ کو گلے سے لگاتا۔ آئیے مصافحہ کریں۔ پھر فرمایا بیشک میں نے آپ کو بچپنے میں پٹنہ میں بہت دیکھا۔ مگر نام بھول گیا تھا۔ یہ کہکر پھر شہزادہ صاحب سے مخاطب ہو کر بولے مجھے حضرت شاہ صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ والد مرحوم جب کلکتہ آنکھ کے علاج کے لئے تشریف لائے تھے واپسی میں چند روز

کیلئے پٹنہ میں قیام فرمایا۔ یوں تو ہر محرم میں امام باندی بیگم صاحبہ کے امام باڑہ میں والد مرحوم پڑھنے کیلئے پٹنہ جایا کرتے تھے۔ مگر یہ محرم کے ایام نہ تھے۔ والد مرحوم کا معمول تھا جب پٹنہ تشریف لیجاتے تو حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں بھی ملنے کو ضرور جاتے ہیں بھی ہمراہ رہتا۔ آنکھیں درست کروا کر کلکتہ سے جب عظیم آباد آئے تو میں نے ایک سلام اسی زمانہ میں کہا تھا اور وہ میرا پہلا سلام تھا۔ والد مرحوم نے جب میرا سلام سن لیا تو فرمایا کہ کل میں حضرت شاہ صاحب سے ملنے جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلنا اور یہ سلام ساتھ رکھنا۔ میں نے عرض کیا بہت خوب چنانچہ دوسرے دن والد مرحوم کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تھوڑی دیر ادہر ادہر کی گفتگو کے بعد والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا تم اپنا سلام لائے ہو۔ میں نے عرض کیا حضور ہاں فرمایا پڑھو اور شاہ صاحب سے فرمایا یہ ان کا پہلا سلام ہے۔ حضرت شاہ صاحب غور سے سنتے رہے۔ جب میں ختم کرچکا تو فرمایا ماشاءاللہ خوب کہا۔ کیوں نہ کس فردیگانہ کے فرزند ہو۔ والد مرحوم نے شاہ صاحب سے فرمایا اسپر آپ اصلاح فرمادیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا واہ مرزا صاحب آپ کے رہتے ہوئے میں کیا دیکھوں۔ والد مرحوم نے باصرار فرمایا آپ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کا دیکھنا باعث برکت بھی ہوگا۔ چنانچہ حضرت سید شاہ صاحب نے میرے ہاتھ سے سلام لیکر بڑا قلمدان ہمیشہ حضرت کے نزدیک ہی رہتا تھا چند اشعار کے کچھ الفاظ بدلے اس کے بعد مجھ سے فرمایا اس کو باآواز بلند پڑھو اپنا شعر بھی پڑھتے جاؤ اور جو تغیر میں نے کیا ہے وہ بھی پڑھو۔ جب میں پڑھ چکا تو والد مرحوم نے فرمایا کیا خوب اصلاح فرمائی ہے۔ مجھ سے شاہ صاحب نے فرمایا۔ تم سمجھے فلاں لفظ میں نے کیوں بدلا میرے جو خیال میں آتا گیا۔ عرض کرتا گیا۔ اسی پر سے حضرت نے فرمایا اس کا سبب یہ نہیں ہے۔ پھر مرزا اوج صاحب بولے وہ سلام حضرت شاہ صاحب کے دست مرتعش کا اصلاح کیا ہوا۔ اب تک میرے قلمدان میں محفوظ ہے۔ اس واقعہ کے لکھنے سے میری غرض یہ ہے کہ مرزا دبیر صاحب مرحوم اپنے فن میں اکمل تھے وہ میرے والد مرحوم کو کیا سمجھتے تھے اور مرزا اوج مرحوم جو خود بھی کامل اور مسلم الثبوت استاد ہوئے۔ وہ والد مرحوم سے تلمذ حاصل کرنیکا فخر کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مرزا اوج صاحب کو مرزا فیاض علیخاں مرحوم حیدرآباد میں کئی سال مجلسیں پڑھنے بلایا کئے۔ جب میں مرزا اوج صاحب سے ملنے جاتا

تو بہت احترام سے مجھ سے پیش آتے۔ خانگی ملاقاتوں میں جس جگہ خود بیٹھے ہوتے وہاں سے اٹھ جاتے اور صدر میں مجھ کو بٹھاتے اور لوگ ان کی صحبت میں اس وقت موجود رہتے ان سے فرماتے۔ یہ میرے استاد زادہ ہیں اور پھر والد مرحوم کے کمالات کا ذکر دیر تک کرتے۔ مرزا فیاض علیخاں مرحوم نے مرزا آوج کو اس طرح میرا احترام کرتے اپنی آنکھوں سے جب دیکھا تو میری بہت قدر و منزلت کرنے لگے۔ مرزا آوج صاحب پاندان منگاکر اپنے ہاتھوں سے گلوریاں بناکر مجھ کو دیتے۔ افسوس میرے جاننے والوں میں اب کوئی نہ رہا۔ میرے زمانہ قیام کلکتہ میں انجمن مذاکرہ علمیہ کی سوارئیز بہت تکلف کے ساتھ ٹاون حال میں منجانب بانی انجمن نواب بہادر نواب عبداللطیف خاں اور ممبران انجمن ہوتی تھی جس میں تقریبًا تمام عمائد کلکتہ بوجہ نواب عبداللطیف خاں کے رسوخ و وقار کے شریک ہوتے خود لفٹنٹ گورنر بھی تھوڑی دیر کیلئے آجاتے۔ نواب عبداللطیف خاں بہادر کو بھی میرے والد سے تلمذ تھا اس لئے مجھ سے خاص طور سے شرکت کی دعوت زبانی بھی دیتے۔ علاوہ کارڈ بھیجنے کے میرے کلکتہ آتے پر نواب عبداللطیف خاں شہزادہ جہاں قدر بہادر سید امیر علی صاحب وغیرہ کے جو والد سے خوب واقف تھے ان لوگوں سے جو میرے زمانہ وکالت میں کلکتہ میں نام برآوردہ ہو چکے تھے۔ مجھ سے جب ملایا تو میرے خاندانی اور حالات وغیرہ کہے۔ میں نے اوپر چند مسلمان ہائیکورٹ وکلاء کا جو صوبہ بہار کے رہنے والے تھے ذکر کیا ہے۔ بنگالہ کے مسلمان وکلاء ہائیکورٹ میں مولوی عبدالسلام (بعد کو نواب) مولوی شمس الہدیٰ (بعد کو نواب اور سر اور ہائیکورٹ کے جج ہوئے) نامی وکلاء میں تھے۔

انگلستان سے واپسی کے بعد اپنے وطن پٹنہ میں میرا قیام چند روزہ ہوا۔ دو ہفتہ کے قریب رہا تھا۔ اس قلیل مدت میں بہت سی جگہ سے میری نسبتیں آئی تھیں۔ اسی طرح کلکتہ میں بھی چند نامی لوگوں نے نسبتیں مسٹر ابوالمحسن خاں جج عدالت خفیفہ کے ذریعہ بھیجی تھیں میرا استمزاج لینے کو مسٹر ابوالمحسن خاں مجھ سے تذکرہ کرتے اور وہ اس طرح سے فلاں شخص کی لڑکی سے شادی کروگے۔ میں نے برابر انکار کیا۔ میں چاہتا تھا کہ میری ہونیوالی بیوی شریف الخاندان ہو۔ یعنی دادھیال ننھیال دونوں جانب سے نجیب الطرفین ہو اور اگر عالیخاندان ہو تو نور علیٰ نور علاوہ عالی خاندانی کے بہت حسین ہو اور تعلیم یافتہ ہو جہاں سے پٹنہ میں اور کلکتہ میں نسبتیں آئیں مجھے ایک بھی پسند نہیں آئی۔ اس میں کلام نہیں کہ بڑے بڑے دولتمندوں اور اعلیٰ

عہدہ داروں نامی وکلاء کے ہاں سے میری بات آئی مگر کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہوتی اور میں بعد تحقیقات کوئی لم لگاتا اور مین میخ نکالتا تھا مثلاً لڑکی باپ کی جانب سے شریف و دولتمند لیکن نانہیال عیب دار یا دونوں جانب سے بے عیب یعنی نجیب الطرفین مگر صورت اچھی نہیں بعض میں دولت تھی شرافت بھی مگر علم ندارد اور صورت بھی اچھی نہیں غرض ایک بات بھی اچھی نہیں۔ پٹنہ میں ایک بڑے دولتمند گھرانے سے نسبت آئی اور بعید میرے احباب میرے پیچھے پڑے مگر لڑکی کی ماں عیب دار تھی۔ میں نے صاف انکار کیا۔ لڑکی کے باپ نے یہاں تک کہا کہ میری لڑکی سے ہمایوں مرزا شادی کرلیں۔ بعد کو میں خود ایک شریف الخاندان صورت دار سیدانی بیاہ لاؤں گا۔ تاکہ ان کی نسل خراب نہ ہو۔ ان کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ سے زیادہ تھی اور دو ہی لڑکیاں وارث تھیں۔ میں دو بیبیوں کا شوہر ہونا پسند نہیں کرتا۔ میرا خیال اسوقت بھی یہ تھا کہ میاں آپس میں لیلیٰ مجنوں بنکر بمصداق اس شعر کے رہیں۔

من تن شدم تو جاں شدی من جاں شدم تو تن شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اور یہ بات دو عورتیں رکھنے والے مرد کو نصیب نہیں ہوسکتی۔ اسلام نے خاص حالتوں کے تحت بیک وقت چار عورتوں سے نکاح جائز رکھا ہے۔ بڑی کڑی شرط عدل کی ہے اور خدا خود فرماتا ہے کہ اگر خوف ہے کہ عدل نہ ہوسکیگا تو بہتر ہے کہ ایک عورت کی جائے۔ ظاہر ہے کہ عدل ایک سے زیادہ عورت کے ساتھ ناممکن العمل ہے۔ عدل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یکساں لباس و غذا اور رہائش کا سامان ہو۔ دل کے دو ٹکڑے ہو نہیں سکتے حالت مجبوری کا ذکر نہیں کہ ایک ہی بیوی کسی کی ہے اور وہ دائم المرض ہے یا کسی ایسی بیماری میں گرفتار ہے کہ مفارقت طبًا ممنوع ہے اور مرد جوان اور دولتمند ہے اور لاولد ہے گو وہ طلاق دیکر دوسری عورت کرسکتا ہے مگر رواج خاندان کی وجہ سے یا پہلے کی رشتہ داری وغیرہ کی وجہ سے طلاق دے بھی نہیں سکتا ہے۔ ایسی حالت میں پہلی بیوی کی موجودگی میں مجبوری دوسرا عقد کرے تو ناز یبا نہیں ہے ورنہ جو لوگ ایسی بیوی کے رہتے ہوئے جو صاحب اولاد بھی ہو، عالی نسب اور شکیل و تندرست بھی ہو۔ دوسری عورت سے نکاح یا متعہ کریں تو سراسر حماقت اور اپنے تئیں اور دوسروں کو مصیبت میں مبتلا کرنا ہے۔ اپنی نفس پرستی نہیں بلکہ ہوس کی

کیلئے عورتوں کی نفس کشی کرتا ہے اور ان پر ظلم کرتا ہے۔ غرض میں اس امر پر رضامند نہیں ہوا کہ صرف دولت حاصل کرنے کیلئے دولتمند نواب صاحب کی لڑکی سے شادی کرنیکے بعد ایک اور شریف خاندان کی عورت سے عقد کر کے دو بے منہ کے جانوروں کو آلام و مصائب میں مبتلا کروں اور عدل نہ کر کے پیش خدا اور رسولؐ بھی گنہگار ہوں اور اپنے نفس پر لعنت بھیجتا رہا ہوں۔ بعوض مقابلانہ مسرت آمیز زندگی بسر کرنے کے قعر مذلت میں گر پڑوں اور دائمی روگ مول لوں جیسا میں نے اوپر لکھا۔ کلکتہ میں بھی بڑے بڑے گھرانوں سے پیغام آئے اور میں نے ٹھکرا دیا۔ ساتھ ہی اس کے تنہائی کاٹے کھاتے تھی۔ دل چاہتا تھا کہ کوئی مونس و غمخوار ہم مذاق و ہم خیال رفیق زندگی میرے پہلو میں ہو جس سے لطف زندگی حاصل ہو۔ میں اس وقت تازہ ولایت بھی تھا۔ لنڈن کے مڈل کلاس یعنی متوسط طبقہ کی شوہروں کی فدائی بیویاں میری نظروں کے سامنے پھر رہی تھیں۔ میں نے جو لنڈن میں کسی سے شادی نہیں کی اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ہندوستان سے چلتے وقت جب میں سامان سفر درست کرنے کیلئے کلکتہ گیا تھا اور سید امیر علیؒ صاحب سے بھی ملنے خدا حافظ کہنے اور ان کے انگلستان کے دوستوں کے نام ان سے تعارفی کے خطوط لینے گیا تھا تو سید امیر علی صاحب نے مجھ سے بار بار فرمایا تھا کہ دیکھو یورپین عورت سے شادی نہ کرنا۔ خصوصاً انگلستان کی عورت سے ہرگز ہرگز بیاہ نہ کرنا۔ اور یہ بھی انہوں نے فرمایا تھا کہ اگر لنڈن یا انگلستان کے کسی شہر یا قصبہ میں دائمی سکونت اختیار کرنے کا مقصد ہو تو وہیں کے مڈل کلاس کی لڑکی سے شادی کر لینے میں مضایقہ نہیں۔ چونکہ امیر علیؒ صاحب کی بیوی ایک متوسط شریف گھرانے کی اور تعلیم یافتہ انگلش لیڈی تھیں اور اس پر امیر علیؒ صاحب کا یہ کہنا کہ انگریزوں سے شادی نہ کرنا اور کرنا تو وہیں دائمی سکونت اختیار کر لینا ایسی نصیحت تھی اور ایسا چبھتا ہوا پر مغز جملہ تھا کہ مجھے اس پر عمل کرنا ہر طرح لازم تھا جب تک میں انگلستان میں رہا یہ جملہ میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ درحالیکہ کئی مواقع ایسے پیش آئے کہ میں کافر اداؤں کی زلف گرہ گیر کے سودے میں مبتلا ہوتے ہوتے رہ گیا اور دل کی تڑپن پر پتھر کی سل رکھ لی۔

دل نہ بچتا کبھی حسینوں سے ؎ بڑی مشکل سے میں بچالایا۔

اب کلکتہ میں بھی خیالات دامنگیر تھے کہ بیوی ملے تو ایسی ہو اور ایسی ہو اور ویسی ہو یعنی جیسی لنڈن میں میری نگاہوں پر چڑھی تھی لیکن جھونپڑی میں رہ کر محل کا خواب۔ "ایں خیال است و محال است و جنوں" اسی ادھیڑبن میں زندگی کٹھن اور وبال جان ہو گئی تھی۔ اسی اثنا میں

پٹنہ سے ایک تار سید احمد رضا خاں صاحب حیدرآباد کے ہائیکورٹ کے جج کا بایں مفہوم آیا کہ گرمیوں کی تعطیل میں حیدرآباد سے میں پٹنہ آیا ہوں، جب سے تم انگلستان سے واپس آئے ہو میں نے تمہیں دیکھا نہیں، یہ موقع غنیمت ہے۔

کلکتہ سے پٹنہ کو روانگی

اگر ممکن ہو تو ہفتہ عشرہ کیلئے پٹنہ آجاؤ۔ میری خوشی کا باعث ہوگا بات جو ہونیوالی ہوتی ہے اس کے اسباب غیب سے پیدا ہوتے ہیں۔ خدا کے کارخانوں کے سمجھنے میں عقل انسانی کام نہیں کر سکتی اور مشیت ایزدی ہو کے رہتی ہے اس وقت میں کیونکر سمجھ سکتا تھا کہ یہ تار وقوع میں آنیوالے کسی واقعہ کا پیش خیمہ ہے۔ غرض اس تار کو دیکھکر میرا دل بیساختہ اچھل پڑا۔ حافظ صاحب کی محبت آمیز طلبی سے دل خوش ہوگیا کہ ان کو کس قدر میرا خیال ہے۔ حالانکہ میرے ان کے کوئی خونی رشتہ نہ تھا یہ میرے حقیقی پھوپھا نواب سید مہدی علیخاں مرحوم کے چچا تھے۔ حافظ سید احمد رضا خاں صاحب کا وطن تو پٹنہ تھا لیکن کسی زمانہ میں گیا میں وکالت کرتے تھے اور بہت نامی گرامی وکیلوں میں تھے۔ پیشہ وکالت سے لاکھوں پیدا کئے۔ گورنمنٹ میں بھی بہت معزز و باوقار تھے۔ اسی وجہ سے بھوپال کی ریاست کے وزیر اعظم گورنمنٹ ہند کی تحریک پر دو ہزار ماہوار پر مقرر ہوئے تھے۔ اس وقت کی فرماں روا شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ کی ان سے ناچاقی اور ان بن ہوگئی تو راجپوتانہ کے ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل نے اس وقت کے رزیڈنٹ حیدرآباد سے انکی پرزور سفارش کی اور حافظ صاحب حیدرآباد کے ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ جب میں انگلستان بغرض تعلیم پٹنہ سے جا رہا تھا تو حافظ صاحب ماہ تیر مطابق ماہ مئی کی تعطیل میں جبکہ حیدرآباد کا ہائیکورٹ بند ہوتا ہے۔ پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں صرف ایک مہینہ ماہ تیر مئی میں ہائیکورٹ بند ہوتا تھا ادھر کئی سال سے دو مہینے گرمیوں میں بند رہتا ہے یعنی خورداد و تیر مطابق اپریل و مئی۔ چونکہ میرے انگلستان جانیکے زمانہ میں حافظ صاحب پٹنہ میں تھے تو ریلوے اسٹیشن بیگم پور میں مجھے رخصت کرنے کیلئے تشریف لائے تھے۔ بہرحال میں تار پانیکے دوسرے دن کلکتہ سے روانہ ہوگیا اور پٹنہ پہونچگیا لوگوں کو مسرت خیز حیرت ہوئی کہ میرا ایک بیک پٹنہ کیونکر آنا ہوا۔ میں نے حافظ صاحب کا تار دکھلایا کہ انہوں نے محبت سے بلایا مجھے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے اس لئے آیا۔ اس زمانہ میں حافظ صاحب قبلہ اپنے اندرون شہر والے آبائی مکان میں مقیم نہیں تھے بلکہ محلہ سبزی باغ میں مسٹر سید نور الہدیٰ

کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ مسٹر نورالہدیٰ بیرسٹر خود پٹنہ میں نہ تھے۔ کسی ضلع میں جائنٹ مجسٹریٹی کی خدمت پر مامور تھے۔ بعد میں سشن جج ہو کر پنشن لی۔ بفضل خدا ابتک وہ زندہ ہیں۔ باغ میرے مکان سے جو اندرون شہر ہے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ میں پٹنہ صبح کو پہونچا تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ اسی وقت حافظ صاحب سے جاکر ملوں۔ مگر گرمیوں کا موسم تھا۔ شدت کی گرمی تھی تیسرے پہر کو لو چلتی تھی۔ اس لئے سر شام گیا۔ مجھے دیکھ کر حافظ صاحب نے فوراً کھڑے ہو کر مجھے گلے سے لگایا۔ چونکہ سال بھر میں ایک دفعہ ان کا وطن آنا ہوتا تھا اور ملنے والے بکثرت تھے۔ تلے اوپر لوگ آرہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بیٹھکر چلے جاتے تھے۔ حافظ صاحب مجھے سب سے ملاتے گئے تقریباً سب ہی لوگ میرے والد کے نام سے اور بعض مجھ سے واقف تھے تو دنیا بھر کے سوالات انگلستان کے متعلق وہاں کی معاشرت وغیرہ کے متعلق مجھ سے لوگوں نے کئے حافظ صاحب کو مجھ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔ شب کے دس بجے کے قریب سب لوگ جب چلے گئے میں بھی یہ کہکر رخصت ہونے لگا کہ کل صبح بہت سویرے حاضر ہوں گا اور بہت دیر تک بیٹھوں گا۔ حافظ صاحب نے فرمایا اس وقت جانے کی کیا ضرورت ہے کھانا تیار ہے کھاکر آرام کرو۔ گاڑی واپس کردو۔ کل شام کو میں اپنی گاڑی میں پہنچوا دونگا تم سے مجھے ابھی بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ اس وقت تو لوگوں نے تم سے بات چیت کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اپنے ایک شاگرد پیشہ کو حکم دیا کہ بیرسٹر صاحب کی گاڑی واپس کردو پھر مجھے لیکر کھانے کے کمرے میں گئے۔ میز چنا ہوا تھا۔ حافظ صاحب ہمیشہ میز و کرسی کے ذریعہ کھاتے تھے۔ دو تین آدمی ان کے عزیزوں میں تھے وہ بھی شریک طعام ہو گئے۔ انگلستان کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کرتے رہے۔ میری خانگی مالی حالت وغیرہ کا ذکر آیا جس پر سے انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں تم پٹنہ چلے آؤ۔ کلکتہ بہت بڑی جگہ اور گراں مقام ہے۔ پھر میری شادی کا ذکر آیا۔ مولوی سید فضل امام مرحوم (سر سید علی امام مرحوم کے چھوٹے چچا) نے حافظ صاحب سے یہ واقعہ کہہ دیا تھا جو پٹنہ کے ایک لکھپتی رئیس مجھے اپنی لڑکی دینے کے بہت خواہشمند و متمنی تھے مگر میں نے لڑکی کی خامی نسب کی وجہ سے انکار کر دیا تھا۔ حافظ صاحب نے ان رئیس کا نام لیکر فرمایا کہ تم نے جو ان کی لڑکی سے شادی کرنا پسند نہیں کیا میں یہ سنکر بہت خوش ہوا۔ کیوں نہ ہو کس آبا بیٹھے ہو۔ علاوہ خاندان میں بٹہ لگنے کے لوگ تمہیں پست ہمت اور بیوی کے دانہ کھانے والوں میں شمار کرتے اور لڑکی کثیر دولت لیکر آتی تو تم سے دبتی بھی نہیں اور تم کو دنیا بھر کا آرام مفت ملنے

لگتا تو تم سے وکالت کی انجام دہی میں محنت نہیں ہوتی اور ایک کاہل الوجود نواب بنجاتے۔ آئندہ کیلئے علمی ترقی کا دروازہ بند ہو جاتا۔ میں نے کہا جو کچھ آپ نے فرمایا بہت بجا اور درست ہے۔ میں نے بھی انہیں امور کے خیال سے انکاری جواب دیدیا۔ حافظ صاحب بولے کہ جس وقت مجھ سے مولوی فضل امام صاحب نے ان کا ذکر کیا تو میں نے چھوٹتے ہی پوچھا کہ ہمایوں مرزا نے کیا کہا تو بولے کہ انہوں نے انکار کر دیا۔ میں یہ سنکر بہت خوش ہوا۔ فضل امام (خان بہادر بعد کو آنریبل رکن مجلس وضع قوانین لفٹننٹ گورنر بنگالہ) بھی مجھے خوش نظر آئے۔ فضل امام ہی پر موقوف نہیں ہے۔ تمہارے سب عزیز تمہارے شریفانہ خیال سے خوش ہوئے۔ مجھ سے ہادی علیخاں سے بھی کل ہی اس کا ذکر آیا تھا۔ اوس پر سے میں نے کہا کہ شادی کا مسئلہ ایسا نازک اور اہم ہے کہ میں بہت پریشان ہوں۔ پٹنہ کے اور جو دو تین پیغام آئے تھے انکا اور کلکتہ کے پیغاموں کا میں نے ذکر کیا۔ حافظ صاحب نے پٹنہ کے ایک مقام کو اور کلکتہ کے ایک پیغام کو بہت پسند فرماکر کہا تم کو اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہاں رشتہ و پیوند ہونا برا نہیں ہے۔ پٹنہ کے پیغام کے متعلق میں نے کہا کہ ایک تو لڑکی بہت چھوٹی ہے۔ نو یا دس سال کی ہے اور اس کو تعلیم بھی نہیں دیجارہی ہے۔ حالانکہ لڑکی کے باپ کے پاس لوگ کہتے ہیں بہت پیسہ ہے۔ اور ماہانہ آمدنی تو ظاہر ہے گیارہ بارہ سو روپیہ کی ہے مگر لڑکی کی تعلیم کیجانب متوجہ نہیں ہیں۔ حالانکہ خود ایک گونہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ایف اے پاس کر چکے تھے۔ جب ان کا علاقہ کورٹ سے چھوٹا تھا اس وقت میں انٹرنس میں پڑھتا تھا اور کلکتہ والی نسبت کی نسبت میں نے کہا کہ وہ لڑکی بھی جاہل ہے اور میں نے سنا ہے کہ صورت بھی اچھی نہیں ہے۔ حافظ صاحب فرمانے لگے افسوس ہے کہ مسلمان تعلیم سے بالکل غافل ہیں۔ جب لڑکوں کو تعلیم نہیں دیجاتی تو لڑکیاں کس شمار میں ہیں۔ صوبہ بہار اور بنگالہ کے مسلمانوں میں تم کو تعلیم یافتہ لڑکی جیسی تم چاہتے ہو شاید ہی ملے۔ خود ہی فرمایا کہ البتہ حیدرآباد میں تعلیم نسواں کا چرچا اب کچھ ہو چلا ہے۔ اعلیٰحضرت نے ایک زنانہ مدرسہ بھی قائم کروادیا ہے۔ میرے علم میں دو لڑکیاں ہیں تعلیم یافتہ اور اب بھی ان کی تعلیم جاری ہے۔ مگر اتنی دور لڑکیوں کے ماں باپ اپنی لڑکی دینا پسند نہیں کریں گے۔ کہاں حیدرآباد۔ کہاں کلکتہ یا پٹنہ۔ ایشیائی والدین خصوصًا مسلمان انگریز تو ہیں نہیں کہ لڑکی نے جس کو پسند کیا اس سے شادی کر لی اور شوہر کے ساتھ کالے کوسوں چلی گئی۔ والدین اُف نہیں کرتے حقیقت یہ ہے کہ مسلمان والدین کو انس و الفت

اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے۔ دوسری قوموں میں اسکی نظیر کمیاب بلکہ عنقا ہے۔ میں نے کہا حیدرآباد
کی جن دو لڑکیوں کا ابھی آپ نے ذکر فرمایا۔ ان کے والدین کون ہیں۔ حسب نسب کیا ہے
تعلیم کہاں تک لڑکیوں نے پائی ہے جس پر سے اونہوں نے لڑکیوں کے باپ کے نام لیکر کہا
کہ ایک تو میرے دوستوں میں ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کے نسب میں کوئی نہیں ہے
ایک نے میٹرک پاس کیا ہے اور دوسری میٹرک میں ہے۔ لڑکیوں کے اخلاق اور صورت و شکل
کی تعریف کر کے کہا میرے گھر میں ان لڑکیوں میں سے ایک کو دیکھا ہے۔ وہ تعریف کرتی تھیں۔ ایک
ان میں سے اخباروں میں مضمون بھی لکھتی ہے اور پنجاب کے امتحان منشی فاضل کی تیاری کر رہی ہے
یہ نام جو میں نے لئے ان میں سے ان میں سے ایک بھی خاص حیدرآبادی خاندان نہیں ہے۔ یہ سب
باہر کے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ مگر ان سب کی عالی نسبی میں کلام نہیں۔ سچ پوچھو تو تمہیں کون بیٹی
نہیں دیگا۔ تمہاری عالی خاندانی تمہاری صورت شکل۔ تمہاری لیاقت اس پر سے بیارسٹری کا
پوزیشن۔ مسلمان بیارسٹر سارے انڈیا میں گنتی کے ہیں۔ لڑکیوں کے باپ تو خدا سے چاہتے ہیں کہ
ان کو بیارسٹر داماد ملے۔ اتنے میں کھانا ختم ہو گیا اور ذرا دیر نشست کے کمرے میں بیٹھکر حافظ
صاحب نے حقہ پیا۔ اور ایک آدمی سے میری نسبت کہا کہ کمرے میں ان کو لیجاؤ۔ مجھے کہا جاؤ
آرام کرو خدا حافظ شب بخیر۔ میں آداب بجالایا اور چلا گیا۔ ہمارے ہاں کے آداب معاشرت
کے لحاظ سے سونے کو جاتے ہوئے چھوٹے بڑوں کو خدا حافظ نہیں کہتے ہیں بلکہ بڑے یا برابر والے
آپس میں ایک دوسرے کو کہتے ہیں اور چھوٹے جس طرح صبح کو آداب بجالاتے ہیں اسی طرح
شب کو بھی آداب بجالاتے ہیں اور منہ سے کچھ نہیں کہتے کہ آداب عرض کرتا ہوں یا تسلیم بجالاتا ہوں
بلکہ جھک کر تین تسلیمیں کرتے ہیں اور سلاطین وغیرہ کے مراتب کے لوگوں کو جھک کر سات آداب
بجالاتے ہیں لیکن جلدی جلدی نہیں کہ جس طرح کوئی مکھیاں اڑاتا ہو۔ علاوہ مغربی طرز معاشرت و
آداب مجلس کے جن کو زمانہ قیام انگلستان کے میں نے اچھی طرح دیکھا اور سیکھا۔ انڈیا کے قدیم مسلمان
امیر گھرانوں کی طرز معاشرت آداب و قواعد مجلس اور آداب شاہی سے مجھے واقفیت ہے۔ ایک
تو میری ننھیال کا تعلق نظامت بنگالہ سے ہے۔ دوسرے حضرت واجد علیشاہ اودھ کو میں نے
اچھی طرح دیکھا۔ جب وہ نواب فخر الملک وزیر السلطان کے ہاں رمضان المبارک کی انیسویں
یا بیسویں کو دن بھر کے لئے تشریف لاکر روزہ وہیں افطار فرماتے تو امراء کس قاعدہ سے
آداب بجالاتے اور سامنے حاضر رہتے مجھے اس کا بھی شرف ہے کہ حضرت واجد علی شاہ نے

مجھکو اور احسن الدولہ خلف خرد فخرالملک مرحوم کو ایک دفعہ اپنے قریب بٹھاکر پیار بھی کیا اور سیب سنترہ دینے کا حکم کیا۔ اسوقت میری عمر کوئی پانچ چھ سال کی تھی اور احسن الدولہ مجھ سے دو تین سال بڑے تھے۔ میرا حافظہ خدا نے ایسا اچھا بنایا تھا۔ ہائے سارا سماں میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جہاں پناہ کرسی پر جلوہ افروز نہیں رہتے تھے۔ تختوں کے چوکوں کے فرش پر مخملی مسند پر رونق افروز رہتے۔ اور سامنے دو کرسیاں رہتی تھیں۔ نواب فخرالملک مرحوم ان کرسیو میں سے کسی ایک پر بیٹھے دست بستہ باتیں کرتے رہتے۔ بادشاہ بعض وقت مسکراتے رہتے۔ مٹیا برج سے کلکتہ تک حضرت کی سواری بادبہاری بہت بڑی بروم گاڑی میں آتی۔ سواروں کا ایک دستہ برہنہ شمشیر اسکارٹ میں رہتا۔ غرض میں شب کا رخصتی آداب حافظ صاحب کو بجالاکر اپنے کمرۂ خوابگاہ مقررہ میں چلا آیا۔ کپڑے بدلکر پلنگ پر لیٹ گیا مگر دیر تک حیدرآباد کی جن نسبتوں کا حافظ صاحب نے مجھ سے ذکر فرمایا تھا وہ نسبتیں میرے دماغ میں چکر لگاتی رہیں اور شیخ چلی کی مشہور مثل کی طرح کچھ خیالی پلاؤ بھی پکایا۔ یعنی ان لڑکیوں میں سے ایک جو مجھے زیادہ پسند آئی تھی اس سے میری شادی ہوگی۔ اور وہ ایک مہ لقا دیری جمال ہمکمہ با مذاق شاعرہ مضمون نگار حاضر جواب ہے۔ مکان کی آراستگی سجاوٹ اور صفائی ستھرائی پسند انگریزی طرز معاشرت سے بھی واقف اور بہت ذہین ذکی وغیرہ وغیرہ ہے جس کی وجہ سے لطف زندگی حاصل ہوا۔ اس زمانہ میں کسی مسلمان لڑکی کا میٹرک پاس کرنا نادر بات تھی۔ یہ خیالی پلاؤ پکاتے پکاتے نیند آگئی اور صبح کو جو اٹھا تو ساری باتیں خواب و خیال تھیں۔ صبح کو چھوٹی حاضری کھانے کے لئے گھنٹی بجی۔ ایک ملازم نے آکر کہا سرکار چائے پینے کے لئے یاد فرماتے ہیں۔ میں پہلے سے حوائج ضروری سے فارغ ہوکر کپڑے پہنکر تیار بیٹھا تھا۔ حافظ صاحب صوم وصلواۃ کے بہت پابند تھے۔ اور مغربی معاشرت سے بھی واقف تھے۔ اور گھر کا رویہ مشرقی و مغربی دونوں تھا۔ جس طرح قد و قامت بالا و بلند چھ فیٹ سے کم قد نہ تھا۔ اسی طرح جسامت و تن و توش بھی خوب تھا اور چہرہ پر رعب و داب تھا یہ نہ تھا کہ ہاتھ پاؤں دیاسلائی نام فضل الہی۔ غذا بھی خوب تھی۔ ان کے عالم شباب میں ان کی زیادہ خوری ضرب المثل پٹنہ میں تھی۔ اس زمانہ میں جبکہ ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ قوٰی ان کے بہت اچھے تھے اور غذا بھی خوب کھاتے تھے۔ ساٹھا اور پاٹھا کے پورے مصداق تھے۔ غذا بھی اقسام کی اور لذیذ یوروپین اور ہندوستانی دونو طرح کی ہوتی تھی۔ شب کے ڈنر میں بھی میں نے دیکھا کہ پہلے یوروپین طرح کے کھانے سوپ اور

رفش اور چند سائڈ ڈشنز کے بعد طرح طرح کے ہندوستانی کھانے یکے بعد دیگرے آتے گئے۔ حافظ صاحب کے مزاج میں رکھ رکھاؤ بہت تھا اور ہر چیز پر تکلف ہوتی۔ غذا لباس سواری سب پر شان و شوکت بزمانۂ وکالت بھی یہی حال رہا اور بھوپال کے وزیر اعظم جب تھے یہی کیفیت جب بھی تھی۔ حیدر آباد کی ہائیکورٹ کی ججی کے زمانہ میں وہی ٹھاٹ رہے۔ جو کوٹھی حیدر آباد میں اپنے لئے بنوائی تھی وہ ان کے حیدر آباد سے وظیفہ لیکر جانے کے بعد ایک لاکھ آٹھ ہزار کو موتی لعل شیو لعل نے خریدی تھی۔ حیدر آباد میں بھی بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے اور بہت ڈنر یا برنچ اسٹ دیا کرتے تھے۔ حیدر آباد کے ججوں کی ماہوار اسی زمانہ میں پندرہ سو ماہانہ تھی اب چھ ہزار ہوگئی ہے لیکن یہہ پندرہ سو ان کے لئے کافی نہ تھے۔ ان کی خانگی زمینداری کی آمدنی پچیس تیس ہزار سالانہ کی تھی۔ وہ سب خرچ کر ڈالتے تھے۔ کوئی ہائیکورٹ کا جج یا سکرٹری حیدر آباد میں اوس وقت سے اس وقت تک اس شان و شوکت سے نہیں رہا۔ میں جب حیدر آباد آچکا تھا بدر الدین طیب جی بمبئی کے مشہور بیرسٹر بعد کو ہائی کورٹ کے جج ہوئے تھے۔ اور ایک مقدمہ کی پیروی میں حیدر آباد آئے ہوئے تھے۔ ان کی دعوت حافظ صاحب نے ڈنر کی دی۔ مسٹر طیب جی نے جب حافظ صاحب کی کوٹھی اسکی آرائشگی وغیرہ دیکھی تو دنگ ہوگئے۔ اور کہنے لگے معاف فرمائیگا۔ نواب صاحب یہہ شان نمو داری وغیرہ ہم بیرسٹروں کا شیوہ ہے۔ کیونکہ ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو دکھائیں کہ ہماری بہت آمدنی ہے۔ جب ہی تو اس ٹھاٹ سے رہتے تھے اور زیادہ آمدنی سے قابلیت کا اندازہ ہو یا نہ ہو مگر یہہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ وکالت خوب چلی ہوئی ہے۔ اور اس کی ضرورت ہر وکیل کو رہتی ہے۔ وکیلوں کی آمدنی کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اگر ہم ماہانہ ایک ہزار پیدا کرتے ہیں تو اپنے ظاہری ٹھاٹ اور نمائشی باتوں سے دکھا سکتے اور کہہ سکتے ہیں کہ دس ہزار پیدا کرتے ہیں اور کسی کو مان لینے میں تامل بھی نہیں ہو سکتا ہے ملازمت پیشہ اشخاص کی تنخواہ کا حال تو سب کو معلوم ہوتا ہے۔ وہ چاہے دو ہزار تنخواہ پائے اور خرچ پانسو کرے تو وہی دو ہزار پانیوالا سمجھا جائیگا۔ یا چار ہزار خرچ کرے تو وہی دو ہزار والا سمجھا جائیگا۔ اس حالت میں لوگ شک کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ یہہ کیا یہ ایک قسم کی چوٹ تھی۔ حافظ صاحب تاڑ گئے اور بولے کہ جس کو خدا نے نوازا اور بڑے گھرانے میں پیدا کیا اور بچپنے سے جس طرز معاشرت کا عادی تھا وہ کہیں بھی رہے وہ باتیں اور لوازمات زندگی اس کی جان کیساتھ ہیں یہ۔ منعم بہ کوہ و دشت و بیابان غریب نیست؛ ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت "

مسٹر طیب جی آپ سمجھے ہوں گے کہ میرا گزر جی کی تنخواہ پر ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ پندرہ سو میرے پندرہ دن کا خرچ ہے۔ ڈھائی ہزار ماہانہ میری زمینداری کی آمدنی ہے جس کا بہت قلیل حصہ وطن کے ملازمین کی تنخواہ وغیرہ پر صرف ہوتا ہے۔

بدرالدین طیب جی بولے آپ کی حالت جداگانہ ہے۔ میں عام حالت سے گفتگو کر رہا تھا۔ غرض یہ کہ حافظ صاحب کے یہاں کل امور پر تکلف تھے۔ دسترخوان بھی وسیع پر تکلف یعنی اون کے کھانے کے میز پر اقسام کی نعمتیں رہتی تھیں۔

حافظ صاحب کھانے کے کمرہ میں آکر بیٹھ چکے تھے اور بھی چند لوگ جو اون کے ہاں رہتے تھے آچکے تھے۔ صرف میرا انتظار تھا۔ میں آکر صبح کا آداب بجالایا۔ حافظ صاحب نے فرمایا جیتے رہو۔ میں تو چھوٹی حاضری کھانے کیلئے آیا تھا اور یہہ سمجھا ہوا تھا کہ انڈوں کا آملٹ یا بورچ ہوگا۔

نان پاؤ کے ٹوسٹ ہوں گے۔ کسی میوہ کا جیم یا سنسروں کا مارملیڈ ہوگا۔ انگلستان میں عموماً یہی چیزیں ہوتی ہیں۔ بعض جگہ علاوہ ان کے میکرل فش ہوتی ہے ایک قسم کی مچھلی تلی ہوئی نہیں بھونی ہوی بڑے مزیدار ہوتی ہے مگر یہاں جو دیکھتا ہوں تو انڈے مختلف اقسام کے بکس کپوں میں بہت نیم جوش انڈے رکھے ہوے ڈشوں میں انڈوں کے نیم برش ستارے تلے ہوے آملٹ الگ۔ ہندوستانی طریقہ کا خاگینہ جدا۔ دکھنی خاگینہ اور ہوتا ہے۔ کئی قسم کے جیم۔ اسٹرابری و گرینگیج وغیرہ کے نان پاؤ کے سلایس (ٹکڑے) مکھن (حیدرآبادی اصطلاح میں مسکہ) بادام پستے اور چلغوزے گھی میں بریاں کیئے ہوئے۔ کالی مرچ نمک چھڑکا ہوا۔ علیحدہ علیحدہ پلیٹوں میں رکھے ہوے ٹوسٹ۔ ریکون پر نان پاؤ کے ٹوسٹ۔ متعدد تلی ہوی مچھلی کے کھنڈے۔ دو قابوں میں۔ مشروبات میں چائے۔ کافی کوکو۔

حافظ صاحب پہلے بادام پستے اور چلغوزے کے پھنکے لگانے لگے۔ مجھ سے پوچھتے گئے پہلے کیا کھاؤ گے۔ دو تین ٹیبل بوائز وردیاں پہنے ہوئے جو شخص جو چیز مانگتا اوس کو وہ دیتے جاتے۔ چھوٹی حاضری پر زیادہ تر انگلستان کی معاشرت کے متعلق گفتگو رہی۔ حافظ صاحب میں جو بیدگی کا بڑا مادہ تھا ان امور کی دریافت وتفتیش سے انکی غرض یہہ تھی کہ یورپ کی طرز معاشرت کی معلومات محصلہ میں اضافہ ہو

جب میز سے اٹھنے لگے تو حافظ صاحب نے فرمایا آج بہت سی نئی باتیں مجھے تم سے معلوم ہوئیں۔ ایک طرف دیوار سے لگا ہوا ایک میز تھا جس پر سرخ بانات زیر انداز بچھا ہوا تھا اور اس پر سیلابچی آفتابہ۔ صابن دان۔ بیسن دان رکھا ہوا تھا جس طرح رات کو وہیں جاکر ہم لوگوں نے کلی وغیرہ کی تھی۔ پہلے حافظ صاحب گئے تھے۔ اون کے بعد ہم لوگ یکے بعد دیگرے گئے۔ اسی طرح چھوٹی حاضری کھانے کے بعد گو ہاتھ دھونے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ چھری کانٹے سے غذا کھائی گئی تھی مگر بخیال صفائی و نفاست حافظ صاحب نے ہاتھ دھوئے اور کلی کی۔ ہم لوگوں نے اون کی تقلید و تتبع کی۔

پشت کے کمرے میں حافظ صاحب تشریف لائے اور ایک بڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ آدمی نے فتح پیچ حقہ لاکر رکھدیا۔ میں بھی پیچھے پیچھے ساتھ آیا اور لوگ اپنی جگہ پر چلے گئے۔ حافظ صاحب نے ہنسکر فرمایا آئیے بیارسٹر صاحب۔ جب میں اٹھ چکا تو والد مرحوم کا ذکر کرنے لگے اور تاسف و حیرت سے کہا کہ مجھے حضرت کی صحبت سے فیض اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ میں اپنے دھندوں میں گیا میں رہا اور حضرت کا قیام اس زمانہ میں کلکتہ میں تھا۔ میں دو دفعہ کلکتہ میں ملا تھا اور حضرت کے پٹنہ آجانے پر صرف ایک دفعہ پٹنہ میں ملا۔ گیا۔ میں وکالت کی مصروفیت اس قدر تھی کہ اپنے وطن پٹنہ میں جب کبھی عزیزوں سے ملنے کو آتا تو دو چار روز سے زیادہ قیام کا موقع نہیں ملتا۔ اس کے بعد والد مرحوم کے چند شعر اونہوں نے پڑھے اور ساتھ ہی یہہ بھی کہا کہ امیرنامہ کی جو تقریظ حضرت نے لکھی ہے اس میں کے یہہ اشعار مجھے یاد رہ گئے سخن کی تعریف میں ایک چھوٹی مثنوی بھی اس میں ہے۔ اس میں کا ایک شعر حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا ہے۔ سہ

در آں منزل کہ ممکن افتا بود ؛ نبی بود و سخن بود و خدا بود

صنعت بالغہ میں سخن کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہوسکتی۔ مبالغہ جو واقعیت پر مبنی ہو اس کا نظم کرنا مشکل ہے۔ جس طرح میر انیس مرحوم نے تلوار کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا اور ایک واقعہ نظم کیا۔

"وہ شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے"

اس کا دوسرا مصرعہ جو حافظ صاحب نے پڑھا تھا مجھے اسوقت یاد نہیں رہا۔ اس سے بہتر تلوار کی تعریف ممکن نہیں ہے۔ یہ الہامی مضامین ہیں۔ جب حافظ صاحب ذرا خاموش ہوئے تو میں نے حیدر آباد کی لڑکیوں کا ذکر چھیڑا۔ رات سے میرے دل میں ایک کھلبلی سی پڑی تھی۔

حافظ صاحب فرمانے لگے کہ یہ دونوں لڑکیاں جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے زمانہ موجودہ کے لحاظ سے مسلمان لڑکیوں میں بہت شایستہ و تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی تمہارے حسب دلخواہ ضرور ہوگی۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے والدین بھی اس امر پر ہرگز رضامند نہ ہونگے کہ اس قدر فاصلہ پر لڑکی بیاہ کر جائے۔ میں نے کہا کہ اگر میں حیدر آباد ہی میں رہجاؤں تب تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ حافظ صاحب بولے جب تو بیشک کوئی عذر نہ ہوگا۔ میں تو تم سے خود یہ کہنے کو تھا کہ تم حیدر آباد آکر پریکٹس کرو۔ تمہاری مالی حالت کے لحاظ سے شب کو میں نے کہا تھا کہ پٹنہ آکر پریکٹس کرو۔ کلکتہ بہت گراں مقام ہے کل ہی مجھے حیدر آباد کا خیال آیا تھا مگر بایں خیال کہ شاید تم اتنی دور آنا پسند نکرو۔ میں نے پٹنہ آجانے کو کہا۔ حیدر آباد تمہارے لئے بہت مناسب ہوگا۔ خدا بخش خاں بھی چیف جسٹس ہوکر حیدر آباد آگئے ہیں۔ وہ تمہارے والد کے شاگرد بھی ہیں۔ ایک زمانہ ہوا حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کا ذکر خانصاحب سے آیا تھا تو وہ بولے کہ میں نے بھی حضرت سے پڑھا ہے اور میرے والد نے بھی پڑھا تھا خدا بخش خاں تمہاری ممکنہ امداد سے دریغ نہ کریں گے۔ پھر میں نے کہا کہ اگر میں حیدر آباد آجاؤں تو فلاں جگہ میری نسبت ہو جائے گی۔ حافظ صاحب بولے صرف آجانے سے کیا ہوتا ہے۔ بیٹی والے غالباً یہ شرط کریں گے کہ تم اپنی دائمی سکونت اختیار کرو میرے خیال میں تمہارے لئے حیدر آباد بہت مناسب ہوگا۔ یہاں کوئی بیرسٹر ہے بھی نہیں۔ اور وکالت کا میدان بہت وسیع ہے۔ پھر حافظ صاحب نے حیدر آباد کی عدالتوں کا ذکر کیا اور پائیگاہوں کی عدالتوں کا ذکر کرکے کہا چند دنوں میں تم وہاں نام بر آور وہ ہو جاؤ گے۔ تم ماشاءاللہ ہو بھی بہت ذہین اور تمہاری اردو بھی شستہ ہے اور وہاں کی دفتری اور عدالتی زبان اردو ہے۔ تم کو وہاں جلد کامیابی حاصل

کرنے کا خوب موقع ملیگا ۔ میں نے پوچھا آپ حیدرآباد کب تشریف لیجائینگے ۔ بولے ابھی دس بارہ دن اور یہاں رہوں گا ۔ وہاں رہنے کا تم اپنے دل میں پہلے قصد کرلو اپنی ہمشیر وغیرہ سے بھی مشورہ کرلو ۔ پھر مجھکو تم لکھو ۔ اتنے میں ملنے والے اشخاص آنے لگے اور جو آیا اس کو مجھ سے حافظ صاحب نے ملایا ۔ میں نے برکفسٹ یعنے ایک بجے کا کھانا حافظ صاحب کے ساتھ ایک بجے کھایا ۔ کئی کمروں میں خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی تھیں اور فرشی پنکھے بھی ہر کمرہ میں آویزاں تھے ۔ ایک بجے کے قریب برکفاسٹ سے فرصت ہوئی ۔ متعدد کورسس انگریزی اور ہندوستانی یکے بعد دیگرے آتے رہے اور باتیں بھی ہوتی رہیں ۔ میں نے قصداً حیدرآباد کے حالات دریافت کرنا شروع کئے ۔

حضور مرحوم کے حالات دربار کس قسم سے ہوتا ہے ۔ امرا کے حالات ہائی کورٹ میں کتنے جج ہیں اور کس قابلیت کے لوگ ہیں وغیرہ وغیرہ ۔ حافظ صاحب سب باتوں کے جوابات نہایت تفصیل اور صراحت سے دیتے رہے ۔ حافظ صاحب ایک تو زمانہ تک وکالت کرچکے تھے ۔ اور فطرتاً بھی قوت گویائی بھی ان میں خوب تھی ان کی گفتگو نہایت مسلسل ربوط اور روان ہوتی تھی ۔ کھانے سے فارغ ہونیکے بعد حافظ صاحب سیدھے خوابگاہ کے کمرے میں چلے گئے ۔ حقہ بردار نے پہلے ہی سے لیجاکر رکھدیا تھا ۔ مجھے فرمایا جاؤ تم بھی آرام کرو ۔ ایک آدمی سے کہا کہ ایک کہار (حیدرآباد کی اصطلاح میں بھوئی) کو پنکھے پر بھیجدو ۔ مجھے کہا تم تو دن کے سونے کے عادی نہیں ہونگے ۔ تمہارا ہائی کورٹ تو گرمیوں میں بند نہیں ہوتا ہے ۔ میں نے کہا گرمیوں میں بند نہیں ہوتا ہے ۔ جاڑوں میں درگا پوجا کی تقریب وغیرہ ملاکر ڈہائی مہینے ہائی کورٹ بند رہتا ہے ۔ میں تیسرے پہر کو چار کے بعد اٹھا ۔ منھ ہاتھ دھویا ۔ پانچ کے قریب چائے پی کچھ میوے کیک اور بسکٹ چائے کے ساتھ کھائے ۔ لو ن چل رہی تھی ۔ ہمت نہیں ہوتی تھی کہ شہر جاؤں ۔

حافظ صاحب نے پوچھا کہ گاڑی منگوادوں ۔ میں نے کہا ذرا ٹھہر کر جاؤنگا ڈرائنگ روم میں ہم لوگ بیٹھے تھے ۔ دو دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگی تھیں ۔ پنکھا چلرہا تھا ۔ وہاں سے باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا ۔ چھ کے بعد چمن کے قریب پانی

کا چھڑکاؤ ہوا اور شطرنجی بچھاکر تپائیاں اور کرسیاں آدمیوں نے رکھدیں ہم لوگ باہر آئے۔ حافظ صاحب سے سات بجے میں نے کہا آپ گاڑی منگوادیجئے چنانچہ میں بیرون شہر اپنے مکان پر آرہا۔ دوسرے دن رات کی گاڑی سے جو شب کے آٹھ بجے پٹنہ سے چلتی ہے کلکتہ روانہ ہوا۔ اور علی الصبح ہوڑہ کے اسٹیشن پر پہونچگیا۔ اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا مگر حیدرآباد کی للک دل سے لگی تھی۔ رہ رہ کر دل کو یہہ خیال آتا تھا کہ حافظ صاحب حیدرآباد اب جائیں گے تب جائینگے۔ وہ وہاں پہونچ لیں تو ان کو خط لکھوں۔ اونہوں نے کہا تھا کہ دس بارہ دن کے بعد جاؤں گا۔ جب وہ دس بارہ دن گزر چکے تو رستہ کے چار روز کا انتظار کیا۔ میں نے اون سے پوچھ چکا تھا کہ حیدرآباد پٹنہ سے کئی دن میں پہونچتے ہیں۔ انہوں نے تین دن کہے تھے۔ اس پر میں نے اور ایک روز کلکتہ سے روانگی کا رکھا اور پھر یہہ خیال کیا کہ ان کے ہاں پہونچتے ہی میرا خط ان کو ملنا بدنما سا ہے۔ غرض اور ایک ہفتہ اسی پر ٹالا۔ کلکتہ پہونچنے کے تقریبًا ایک ماہ بعد میں نے حافظ صاحب کو خط لکھا اور اس خط میں اپنی خیریت لکھی اور ان کی خیریت دریافت کی جس کا جواب مجھے گیارہ بارہ دن کے بعد ملگیا۔

دو تین ہفتہ کے بعد ایک خط پھر لکھا۔ اس میں میں نے اپنا مدعائے دلی لکھا کہ جن دو لڑکیوں کا آپ نے ذکر فرمایا تھا ان کے بزرگوں سے میرا تذکرہ کیجئے اور عذر یہ لیجئے کہ وہ لڑکی کو شادی کے بعد کلکتہ میں رہنے دینگے۔ درحالیکہ انکار کریں تو پھر کہئے کہ اگر لڑکا حیدرآباد میں سکونت اختیار کرے اور یہیں پریکٹس کرے تو اس صورت میں لڑکی کے بیاہ دینے میں کوئی عذر تو نہ ہوگا۔

خدا خدا کرکے اس خط کا جواب تقریبًا ایک مہینے کے بعد آیا۔ یہاں انتظار کی گھڑیاں گنتے گنتے میرا بلپتین نکل گیا۔ "الانتظار اشد من الموت" انتظار ہر حالت میں تکلیف دہ ہوتا ہے نہ کہ ایسے معاملہ میں جس کا اشتیاق ہو اور جس کی دل کو لگن ہو۔ میری ایک غزل کا یہہ مطلع ہے۔

انتظارِ خط نے ایسا زار کر ڈالا مجھے ؛ خود مجھی سے پوچھتا ہے نامہ بر میرا مجھے

کیا بتاؤں کہ ایک مہینہ کس طرح گزارا۔ جس وقت حافظ صاحب کا خط میرے ہاتھ میں آیا دل کی دھڑکن کا عجیب عالم تھا۔ امید و بیم کے دونوں پہلو تھے۔ امید تو اس امر کی کہ لڑکی کے والدین رضامند ہو گئے ہوں گے خوف اس کا کہ انکار نہ کر دیا ہو۔

غرض دھڑکتے دل سے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنا شروع کیا جس کا ماحصل یہ تھا۔ پہلے تو جواب دینے میں جو تاخیر ہوئی اوس کے اسباب لکھے تھے۔ پہلا سبب یہ کہ حافظ صاحب کو نواب سرو قارالامراء اپنے ہمراہ رکاب شملہ لیگئے تھے۔ نواب سرو قارالامراء کو وائسرائے سے ملنا تھا۔ بوجہ موسم گرما کے وائسرائے کلکتہ سے شملہ چلے گئے تھے۔ سرو قارالامراء وہیں اون سے ملنے گئے۔ حافظ صاحب کو بھی اپنے اسٹاف میں لیتے گئے۔ یہ خاص عنایت سرو قارالامراء کی حافظ صاحب کے ساتھ تھی۔ کیونکہ یہ تو ہائی کورٹ کے جج تھے اون کو مصاحبت سے کیا واسطہ۔ لیکن چونکہ حافظ صاحب کی ایک تو باوقار شخصیت اور علم مجلس سے خوب واقف شگفتہ طبیعت با مذاق گفتگو مفید معلومات سے لبریز۔ اس لئے سرو قارالامراء ان کو بہت پسند کرتے تھے۔ جواب کی ادائیگی میں دوسری وجہ یہ ہوئی کہ صاحب معاملہ اشخاص سے ملنا دیر میں ہوا۔

بہرحال دونوں صاحبوں سے میرے خصوص میں جو گفتگو ہوئی اس کا لب لباب و خلاصہ یہ تھا کہ ایک صاحب نے تو صاف جواب دیا اور کہا کہ عزیزوں میں سے کئی پیام آچکے ہیں۔ لڑکی دیجائیگی تو کسی عزیز کو جو تعلیم یافتہ اور صاحب ثروت ہوگا۔ دوسرے صاحب نے یہ جواب دیا کہ لڑکا آکر حیدرآباد میں کچھ دن رہے اگر نوکری کی خواہش ہے تو اوس کی بھی کوشش کی جائیگی حسب دلخواہ کوئی ملازمت ملے وکالت کا اگر شوق ہے تو یہاں وکالت کرکے اپنا جوہر دکھائے۔ یہاں کے قیام سے اس کا چال چلن دیکھا جائیگا۔ اور لڑکی کے دور دراز مقام پر بھیجنے کیلئے ماں رضامند نہیں ہے۔ یہ سب لکھنے کے بعد حافظ صاحب نے اپنی رائے لکھی تھی کہ نسبت بہت معقول ہے۔ بشرطیکہ تم یہاں آکر رہو۔ یہ بھی لکھا تھا کہ ممکن ہے کہ شادی کے چند دنوں

کے بعد جب تم پر ان لوگوں کا بھروسا اور اعتبار ہو جائے گا تو کیا عجب ہے کہ لڑکی کو رخصت کرنے اور کلکتہ بھیجنے پر آمادہ ہو جائیں۔ ان کے لب و لہجہ سے میں نے یہ مستخرج کیا کہ پہلے تو کچھ دنوں تمہارا رویہ اور اخلاق وغیرہ لڑکی کے باپ اور ان کے عزیز و اقارب دیکھیں گے پھر عقد نکاح کر کے حیدرآباد میں تم کو رکھیں گے۔ اگر ملازمت ہو گئی تو تم ہی کلکتہ کا رخ نہیں کرو گے۔ درحالیکہ ملازمت کا تمہیں خیال نہیں ہے جیسا تمہاری طرز گفتگو سے مجھے پٹنہ میں معلوم ہوا تھا کہ تم ملازمت پسند نہیں کرتے ہو۔ اس صورت میں وکالت پہلے شروع کر دینا۔ اگر کام چل جائے تو یہاں رہنے میں کیا مضائقہ ورنہ کلکتہ چلے جانا اور جب لڑکی تم سے خوش رہے گی اور تم اوس سے خوش رہو گے تو جہاں چاہو گے اپنی بیوی کو لیجا سکو گے روکنے والا کون ہے۔ شوہر کے اختیارات میں کوئی دخیل نہیں ہو سکتا سب کہنے کی باتیں ہیں کہ لڑکی کو رخصت نہ کریں گے پس اگر تم اس لڑکی سے نسبت کرنا چاہتے ہو تو بسم اللہ کہکر چلے آؤ۔ اس دفعہ آخر میں سید احمد رضا لکھنے کی جگہ سکندر نواز جنگ لکھا تھا جس سے میں سمجھ گیا کہ حافظ صاحب کو سکندر نواز جنگ کا حال ہی میں خطاب حضور نظام نے دیا ہے اس خط کے جواب میں خط لکھنے کی زحمت کشی کا شکریہ ادا کیا اور اون کی خطاب یابی پر مبارکباد دی اور یہ لکھا کہ درگاہ پوجا کی تعطیل آئندہ دن کے بعد سے شروع ہونیوالی ہے۔ انشاءاللہ تعطیل شروع ہوتے ہی حاضر خدمت ہوتا ہوں۔ نیز یہ دریافت کیا کہ سر وقار الامراء کے ساتھ یا تنہا حیدرآباد کے باہر تو آپ ماہ اگسٹ کے وسط میں کہیں نہیں تشریف لیجائیں گے۔ دس گیارہ دن کے بعد مجھے اپنے خط کا جواب ملگیا۔ اس خط میں حافظ صاحب نے یہ لکھا تھا میں باہر کہیں نہیں جاؤں گا۔ خیال بہت اچھا ہے ضرور آؤ اور یہاں تم خدابخش خانصاحب چیف جسٹس کے ہاں قیام کرو۔ ان کو ایک خط یہ لکھکر بھیجو کہ ہائی کورٹ کلکتہ کا بند ہونے والا ہے۔ میں نے حیدرآباد کی تعریف سنی ہے۔ حیدرآباد دیکھنے اور آپ لوگوں سے ملنے کو آنا چاہتا ہوں۔ آپ کے ہاں قیام کروں گا۔ آپ کو اسمیں کوئی عذر تو نہیں ہے۔ میں نے جو یہ لکھا کہ تم خدابخش خاں صاحب کے ہاں

قیام کرو۔ اس سے برا نہ مانو۔ میں تو ہر حال میں تمہارا عزیز ہوں اور تمہارا ہوں۔ خدابخش خاں صاحب کے ہاں قیام کرنے سے کئی مطلب نکلیں گے ایک تو جن کے ہاں نسبت میں ٹھہرانے والا ہوں اون لوگوں پر اچھا اثر ہوگا دوسرے یہہ کہ اگر میں نے وکالت یہاں شروع کی تو مقدمات ہائی کورٹ کے جلد ملنے لگیں گے۔

لوگوں کو جب یہہ معلوم ہو جائے گا کہ تم میر مجلس صاحب کے دوست ہو یا اون سے گہرے تعلقات ہیں متحاصین خود بخود رجوع ہونگے۔ ورنہ میرا گھر حاضر ہے تم سے کوئی غیریت نہیں ہے۔ ہرگز کوئی اور خیال نہ کرنا میں نے حافظ صاحب کا یہہ خط دیکھتے ہی خدا بخش صاحب کو ایک خط اسی مضمون کا لکھا جیسا حافظ صاحب نے مجھے لکھنے کہا تھا۔ دسویں یا گیارہویں دن خدابخش خاں صاحب کا خط میرے خط کے جواب میں میرے حسب منشا آگیا۔

کلکتہ سے حیدرآباد کو روانگی

میں نے پٹنہ اپنے عزیزوں کو خط لکھے اور حیدرآباد بغرض سیاحت درگاپوجا کی چھٹیوں میں جانے کی اطلاع دیدی کلکتہ کے خاص خاص دوستوں سے ملکر کہا کہ تعطیل میں چند دنوں کے لئے حیدرآباد جانے کا قصد ہے۔ سب سے رخصت ہوا۔ جانے سے دو روز قبل سے باندھا بوندھا شروع کر دیا۔ کتابیں سب جو کھلے ہوئے شلفوں پر رکھی تھیں سب بڑے بڑے بکسوں میں جنھیں لندن سے لایا تھا بند کر دیں۔ کپڑے ٹائیاں وغیرہ پورٹ منٹوں میں مقفل کر دیں۔ یہہ کل سامان اور چیزیں مختلف کمروں میں پھیلی پڑی تھیں وہ سب بھی ایک کمرے میں رکھکر چلتے وقت اسی کمرہ کو مقفل کر دیا چونکہ ارادہ اس سفر میں حیدرآباد میں رہنے کا نہیں تھا بلکہ مطلب یہہ تھا کہ اگر نسبت میرے حسب دلخواہ ہوئے اور مقرر ہوگئی اور وہیں رہنے کا سامان ہوگیا تو سامان سب کلکتہ سے آکر لیجا ئینگے ورنہ واپس چلے آئینگے۔

میں اپنے ساتھ چند جوڑے کپڑے ایک چمڑے کے پورٹ منٹو میں اور

چند ضروری چیزیں اسٹیل ٹرنک میں رکھ لیں۔ یہہ دو بکس رکھلئے۔ ایک ہولڈال میں بستر کیا۔ ایک ہیٹ باکس میں انگریزی ٹوپیاں رکھیں اور ایک ٹفن بیاسکٹ ساتھ لیا۔ بس اتنے سرو سامان کے ساتھ میں نے کلکتہ کو خدا حافظ کہا۔ اور بیک بینی او ر دوگوش کے ساتھ حیدر آباد آیا۔ ایک ملازم ساتھ لیلیا۔ اور تین مہینے کا ریٹرن ٹکٹ لیا جو ۱۲؍اگسٹ کو کلکتہ سے روانہ ہوا۔ چلتے وقت خدا بخش خاں کو روانگی کا تار دیا۔ اس وقت ہوڑہ سے کٹک اور دالیٹر ہوکر کوسٹ لائن نہیں نکلی تھی۔ پٹنہ الہ آباد بھوساول۔ شولاپور وغیرہ ہوکر حیدرآباد آنا ہوتا تھا۔ تیسرے دن بڈگی میں جب ٹرین پہونچی تو غیب سے صدا آئی ہالٹ یعنے ٹھرو۔ مسافروں سے اسٹیشن ماسٹر نے آکر کہا کہ آپ لوگ اتر جائے۔ یہہ ٹرین آگے نہیں جاسکتی۔

شدت بارش کی وجہ سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر آگے دو پل ٹوٹ گئے ہیں۔ ندیاں زوروں پر چل رہی ہیں۔ کشتیوں کا جب انتظام ہو جائے گا تو آپ لوگوں کو سوار کریں گے۔ یعنی اسٹیشن ماسٹر سے دریافت کیا کہ آخر کب کشتیوں کا انتظام ہوگا۔ اور کب تک یہاں ٹھرنا پڑے گا اس نے کہا کہ اس کا جواب کل دیں گے۔

ہم لوگ غافل نہیں ہیں۔ آج ہی کا واقعہ ہے جو پل کے ٹوٹنے کی خبر آئی میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہہ تو بڑی بدشگونی ہے۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ جس معاملہ کے لئے جارہا ہوں نہ معلوم اوس کا کیا حشر ہوتا ہے۔ میں نے اپنے آدمی سے کہا کہ سامان اتار وا اور ویٹنگ روم میں رکھو۔ دوسرے خانہ سے اور بھی دو مسافر سکنڈ کلاس کے اس ویٹنگ روم میں بسترا لیئے آئے۔ میں نے ایک تار اوسی وقت خدا بخش خاں صاحب کو دیا۔ پلوں کے ٹوٹنے اور اپنے رک جانے کی اطلاع دی۔ تاکہ کلکتہ کے تار کے خیال سے اسٹیشن پر کسی کو نہ بھیجدیں اور میرا انتظار نہ کریں اور میرے بر وقت نہ پہنچنے پر ان کو انتشار نہو۔

یہہ بھی اس تار میں میں نے لکھدیا تھا کہ دوسرے تار کا انتظار کیجئے تیسرے

پہر کا وقت تھا۔ چار بج چکے تھے۔ ابر محیط تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شام ہوگئی۔ میں باتھ روم میں گیا اور منھ ہاتھ دھویا۔ ٹفن باسکٹ میں ایک چھوٹا سا اسٹو (Stove) رکھ لیا تھا۔ آدمی نے چار بنا کر دی چار پی کر تازہ دم ہوا یہ دونوں حضرات جو اسی ٹرین میں تھے باہر کہیں ٹہلنے کو چلے گئے تھے کیونکہ میں نے جب چائے پی تو ان کا اسٹیشن پر کہیں پتہ نہ تھا۔ ان کا سامان البتہ ویٹنگ روم میں رکھا تھا۔

میں نے ڈرائنگ روم میں سے کرسی منگا کر باہر رکھوائی اور اخبار پڑھنے لگا تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ یہ دونوں حضرات آپس میں باتیں کرتے سامنے آرہے ہیں۔ ایک صاحب بالکل صاحب بہادر تھے۔ بوٹ سوٹ اور ہیٹ میں تھے رنگ سانولا گرد داڑھی۔ نوکیلی نپولین فیشن کی۔ دوسرے صاحب چیلواری کی شیروانی اور اسی کپڑے کا تنگ موریوں کا حیدرآبادی وضع کا پائجامہ ترکی ٹوپی زیب سر۔ ترکی ٹوپی والے صاحب میرے قریب آئے تو میں خلافاً کھڑا ہوگیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا آپ اردو بولتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اردو میری مادری زبان ہے۔ تو بولے صاف زبان ہے میں کچھ اور سمجھا ہوا تھا۔

آپ کا اسم شریف کیا ہے۔ میں نے کہا۔ سید ہمایوں مرزا۔ وہ صاحب بولے آپ بیارسٹر ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں۔ تو بولے آپ قاضی کبیرالدین سے واقف ہیں۔ میں نے کہا بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ تو بولے جس وقت میں نے آپ کو دیکھا تو میرے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ یہ صورت میں نے کہیں دیکھی ہے۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں دیکھی۔ کیونکہ تصویر کا ایک بڑا گروپ کبیرالدین نے لندن سے مجھے بھیجا تھا۔ اس میں آپ بھی ہیں۔ اوس وقت آپ کا نام بھی یاد آگیا۔ ہر تصویر پر نمبر ہے۔ نیچے نام لکھے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ کچھ اور نام اس گروپ کے آپ کو یاد ہیں۔ انہوں نے دماغ پر ذرا زور دیکر کہا اس میں کوئی صاحب دہلوی ہیں ایک مولوی رفیع الدین ہیں جن کا نام اخباروں میں میں نے پڑھا ہے۔

پھر کہا ایک اور بھی کوئی مولوی ہیں۔ باقی نام یاد نہیں۔ میں نے کہا

مولوی برکت اللہ تو نہیں ۔ بولے جی ہاں ۔ جی ہاں ۔ وہی صاحب ہیں ۔ سمجھ گیا یہ کون گروپ اور کب ہم لوگوں نے لیا تھا ۔ اس کے بعد میں نے پوچھا قاضی کبیر الدین صاحب سے اور آپ سے صرف دوستی ہے یا عزیز داری بھی ۔ وہ بولے کبیر الدین میرا حقیقی چھوٹا بھائی ہے ۔ تب میں نے کہا کہ آئیے آپ ہم گلے ملیں ۔

کبیر الدین میرے خاص دوستوں میں ہے ۔ اب میں نے پوچھا آپ کا اسم شریف کیا ہے ۔ اور آپ کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں تشریف لیجائیں گے ۔

بولے میرا نام خداداد ہے ۔ میں بمبئی سے آرہا ہوں ۔ کبیر الدین سے ملنے گیا تھا اب حیدر آباد واپس جا رہا ہوں ۔

واضح ہو کہ خداداد مرحوم کی صاحبزادی بعد کو مسٹر عبد الصمد مخاطب بہ نواب صمد یار جنگ بہادر حال معتمد فوج سے بیاہی گئیں تھیں اور کئی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر راہی ملک بقا ہوئیں ۔ خدا مرحومہ کو بخشے ۔ خداداد مرحوم اس زمانہ سے بڑی مدت گی میں پہلی دفعہ سے ملے ۔ تاحیات گا ہے ما ہے میرے پاس ضرور آتے تھے ۔ پانچ چھ سال ہوئے کہ انتقال کر گئے ۔ ایک فرزند اون کی یادگار ہے ۔

میں نے اون سے پوچھا کہ دوسرے صاحب جن سے آپ باتیں کرتے آرہے تھے کون بزرگ ہیں تو بولے آپ نہیں جانتے یہ تو بڑے مشہور و معروف آدمی ہیں ۔ آپ نے اخباروں میں حیدر آباد کے مہدی حسن فتح نواز جنگ والے مقدمہ کا حال تو پڑھا ہوگا ۔ یہ وہی مسٹر مترا ہیں ۔ جو مقدمہ میں ملزم بنے تھے ۔ میں نے کہا میں نے ان کا نام اس مقدمہ کے سلسلہ میں پڑھا تھا ۔ اب یہ یہاں سے آرہے ہیں ۔ بولے یہ بھی بمبئی سے آرہے ہیں ۔ مجھ سے ان سے زیادہ ملاقات نہیں ہے ۔ اس سفر میں اتفاقیہ طور پر ملاقات ہوگئی ۔ ایک ہی ڈبہ (یعنی خانہ) میں بمبئی سے آرہے ہیں ۔

مسٹر مترا جو پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہے تھے ۔ جب نزدیک آگئے

خداداد صاحب نے اُن سے میرا تعارف کروایا۔ اور اُن سے کہا کہ مسٹر ہمایوں مرزا میرے چھوٹے بھائی کے بہت دوست ہیں۔

مسٹر مترا نے مجھ سے مصافحہ کیا اور نہایت شستہ اردو میں مجھ سے گفتگو کرنے لگے۔ میں نے مسٹر مترا سے کہا کہ معاف کیجئے گا۔ نام کے لحاظ سے میں سمجھتا ہوں آپ بنگالی ہیں۔ مگر آپ کی اردو بنگلہ نما اردو نہیں ہے۔

اس پر انہوں نے بنگلہ نما کے لفظ پر غالبًا بڑا قہقہہ لگایا اور کہا بے شک میں بنگالی ہونے کا فخر کرتا ہوں۔ جب کہ اہل ہند اپنی کوششوں سے تو انگریزی یا فرنچ وغیرہ شل مادری زبان کے بول سکتے ہیں تو کوئی بنگالی ہندوستی کی مادری زبان بنگلہ ہے اگر کوشش کرے تو کیوں نہیں اردو بول سکیگا۔

اردو تو نہایت پیاری زبان ہے۔ انڈیا کے دیگر مقامات میں بھی اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ میں تو اردو کو انڈیا کا لنگوفرینکا سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا آپ کا خیال بہت صحیح اور مستحسن ہے۔ جس پر انہوں نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے میں اردو کا اتنا بڑا اسکالر (Scholar) نہیں ہوں کہ اتنے موٹے موٹے لفظ سمجھوں۔

آپ نے کہا صحیح۔ میں نے کہا مستحسن۔ بولے اس لفظ کے کیا معنی میں نے کہا لفظ حسن اس کا مادہ ہے۔ اس کے معنی اچھائی کے ہیں۔ میں نے کہا کہ اردو کے بارے میں جیسا آپ کا خیال ہے خدا کرے سب ہندوستان کا ایسا ہی ہوتا تو پھر اردو اور ناگری کی جنگ لکھنو میں ہندو اور مسلمان کے درمیان نہیں ہوتی۔ جو چند سال بیشتر ہوئی اور بیچاری اردو ذبح کردی گئی۔

لارڈ مکڈانلڈ سابق لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی۔ خدا بھلا کرے دفتری زبان بجائے اردو کے ناگری کردی۔ اس پر سے مسٹر مترا نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے آپ تو بیارسٹر ہیں۔ آپ مجھ سے بہتر پولٹکس سمجھتے ہیں۔ صاحب بہادروں کو اس میں مزا آتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو لڑا کر تماشا دیکھیں اور اس میں ان کا فائدہ ہے۔ ڈیوائیڈ اینڈ رول (Divide and rule)

آپس میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔ انکو کوئی اور بہانہ ملنا چاہیئے۔ اردو اور ناگری کا بھی ایک بہانہ مل گیا۔ دونوں ہمسایہ قوموں میں اختلاف ڈالدیا اور ہم ہندی ایسے بیوقوف ہیں کہ اپنے نفع ونقصان کو نہیں سمجھتے۔ میں نے ان لوگوں سے دریافت کیا کہ آپ صاحبوں نے چائے پی تو مسٹر متر ا بولے کہاں کی چائے ابھی تک میں نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا۔ کیا آپ چائے پلائینگے۔ میں نے کہا اگر آپ چائے پینا چاہتے ہیں تو بخوشی تمام۔ مسٹر متر ا بولے نیکی اور پوچھ پوچھ میں نے اپنے آدمی سے کہا کہ چائے بنا کر لاؤ اور تھوڑے سے بسکٹ بھی لاؤ۔ مسٹر متر ا نے پھر ایک زبردست قہقہہ لگایا اور بولے واہ واہ چوپڑی اور دو دو کیا مزے کی بات ہے۔ خداداد صاحب نے مخاطب ہو کر بولے ہمسفر ہو تو مسٹر مرزا سا ہو اور مجھے تو آپ کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ آپ نے یہاں کے ایک دوست کو جنگل میں ڈھونڈ نکالا اور مجھے اُن سے ملا بھی دیا۔ میں نے مسٹر متر ا سے کہا کہ آپ تو اردو کے خوب محاورے بولتے ہیں۔ یہہ سب آپ لوگوں کی صحبت کا طفیل ہے۔ مجھے اپنا وطن بنگالہ چھوڑے زمانہ ہوا۔ بہت زمانہ تک لکھنو میں رہا اور اب تو بود و باش حیدرآباد میں اختیار کرلی ہے جہاں ہر طرف اردو ہی اردو ہے۔ یہہ سب باتیں ٹہلتے ٹہلتے ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنے ملازم سے کہا اور دو کرسیاں اندر سے لے آؤ کہ جس پر سے مسٹر متر ا بولے میں ذرا منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں اُن کے پیچھے خداداد صاحب بھی گئے۔ غرض چائے پی اور میں نے بھی اون لوگوں کا ساتھ دیا۔

دو دن ہاڑگی میں قیام رہا۔ ریفرشمنٹ روم میں جا کر کھا لیا کرتے چائے بھی ناشتہ بھی وہیں ہوتا۔

مسٹر متھرا کی صحبت میں وقت اچھی طرح کٹی ہنسی مذاق میں کٹتا یہہ حضرت ضرورت سے زیادہ تیز جہاندیدہ شگفتہ طبیعت اور بڑا معلومات تھے مہدی حسن والے مقدمہ کی بھی تفصیلی گفتگو اُن سے رہی جب تک یہہ حیدرآباد میں رہے مجھ سے بہت دوستانہ تعلقات رہے گو حیدرآباد کے لوگ عام طور سے ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے ایک اخبار دکن پوسٹ (The Deccan Post) نکالا تھا اور اس کی اشاعت بمبئی سے ہوتی تھی اور یہہ بہت بڑا ذریعہ پیسے کمانے کا تھا۔ حیدرآباد کی دنیا بھر کی خبریں یہہ شخص خدا جانے کن کن ذریعوں سے حاصل کرتا تھا اور اعلیٰ عہدہ داروں کے کچے چھٹے۔ رزیڈنسی کی خبریں۔ اعلیحضرت کی نج کے حالات سب معلوم اور عہدہ داروں کو ڈرا دھمکا کر روپیہ اینٹھنے کی خوب ترکیبیں یاد تھیں ہائیکورٹ کی سند وکالت بھی حاصل کرلی تھی۔ ڈنلاپ سابق صدر ناظم مال کو بھی گانٹھ رکھا تھا اور

اُن کے راز دار دوستوں میں ہوگئے تھے۔ حیدرآباد میں چند سال کے قیام کے بعد جب دولت اچھی طرح پیدا کرلی تو انگلستان جاکر دائمی سکونت وہاں اختیار کرلی۔ وہاں سے بھی دو تین خط مجھ کو بھیجے تھے وہیں انتقال کیا۔ تیسرے دن ہڈگی کے اسٹیشن پر ماسٹر نے آکر ہم لوگوں سے کہاکہ صاحب اب آپ لوگ جاسکتے ہیں کشتیوں کا بندوبست دونوں ندیوں کے لئے ہوگیا۔ ٹرین بھی اس پار تیار ہے۔

چنانچہ ہم لوگوں نے اپنا بوریا بدھنا سمیٹا اور پیدل تھوڑی دور جانے کے بعد کشتی میں سوار ہوکر اس پر گئے۔ ٹرین تیار کھڑی تھی سوار ہوگئے۔ تھوڑی دور ٹرین میں جانے کے بعد پھر اترے اور کشتی میں سوار ہوئے۔ دوسرے کنارہ پر کشتی سے اتر کر ٹرین میں سوار ہوگئے۔ ندیاں لبالب چل رہی تھیں پھر ایک کشتی پر ملاح آدھ پون گھنٹہ صرف ہوا کشتی ایک دم عرضاً سیدھی آرپار نہیں ہوسکتی تھی۔ دور تک ملاح طولاً لیجاکر ترکیب سے پلٹتے تھے۔

پل کا ٹوٹنا

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ہم لوگوں کے ہڈگی پہونچنے کے بہت قبل ایک ٹرین جب ہڈگی سے چلی اور ہڈگی کے قریب والی ندی سے پار ہوگئی تو پل گر گیا۔ ٹرین بچ گئی۔ دو تین اسٹیشن جانے کے بعد وہ ٹرین رو کدی گئی کیونکہ آگے اور ایک ندی تھی اس کا پل بھی ٹوٹ گیا خدانے جانوں کی خیر کی۔ ہڈگی سے روانہ ہونے کے قبل میں نے اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ لیا تھاکہ کس ٹرین میں ہم لوگ اس وقت جائینگے دوسرے دن حیدرآباد کس وقت پہونچے گی۔ اس نے کہاکہ صبح کے آٹھ بجے چنانچہ میں نے ایک تار خدابخش خاں صاحب کو اس مضمون کا دیدیا۔ یہاں سے ہم تینوں آدمی ٹرین کے ایک ہی خانہ (ڈبہ) میں بیٹھ گئے۔

حیدرآباد پہونچا

صبح کے آٹھ بجے ٹرین حیدرآباد کے نامپلی اسٹیشن پر پہونچی۔ دونوں ہمسفر صاحبوں نے خدا حافظ کہا اور جو گاڑی میرے لئے مولوی خدابخش خانصاحب نے بھیجی تھی اس پر میں سوار ہوگیا۔ میرے لینے کے لئے خاں صاحب نے اپنے چھوٹے فرزند ولی الدین کو اور اپنے قدیم مصاحب و ملازم مولوی مسیح اللہ کو بھیجا تھا اور خود نہ آنے کی معذرت کہلا بھیجی تھی۔ مجھکو دیکھکر خانصاحب بہت خوش ہوئے۔ بغل گیر ہوئے اور بولے ہم لوگوں نے آپ کے انتظار میں اب تک چائے نہیں پی ہے اور کہا منھ ہاتھ دھوکر آیئے۔ چنانچہ میں نے منھ ہاتھ دھویا اور فوراً ہی اُن کے پاس آگیا۔ ہم سب کھانے کے کمرہ میں جاکر چائے پینے لگے۔ پہلے تو راستہ میں پلوں کے ٹوٹنے وغیرہ کا ذکر رہا اور انہوں نے مجھ سے دریافت کیاکہ ہڈگی میں کوئی تکلیف کسی قسم کی تو نہیں ہوئی میں نے اپنے ہمسفروں کا ذکر کیا۔ متراکا تذکرہ آتے ہی بہت ہنسے اور بولے۔ میرے ساتھ بہت

ٹھیک ہے ورنہ اکثر عہدہ دار اونچی جو اس کا ساتھ نہیں دیتے خبر لیتا رہتا ہے اور بولے کہ یہ بڑے ذات شریف ہیں۔ اُن کو سند وکالت بھی دی گئی ہے۔ میں نے پوچھا کہ بغیر امتحان پاس کئے سند مل گئی۔ خانصاحب بولے ایسا یہاں بہت ہوتا ہے۔ یہاں کی بہت سی باتیں سن سن کر تم تعجب کروگے مگر سن کر خاموش ہو جانا ریمارک وغیرہ نہ کرنا۔ بہار و بنگلہ کے حالات اور ہیں اور یہاں کی کیفیت کچھ اور ہے۔ میں خاموش ہو رہا۔ گیارہ کے قبل خانصاحب بریکفاسٹ کھانے کے بعد کچہری چلے گئے۔ میں حمام کرکے خانصاحب کے ساتھ بریکفاسٹ میں شریک ہوا اور خانصاحب کے کچہری جانے کے بعد میں سو گیا۔ پانچ بجے خانصاحب جب کچہری سے آئے اور چائے سے ہم دونوں آدمی فارغ ہو چکے تو میں نے خانصاحب سے کہا کہ اپنی گاڑی دیجئے۔ حافظ احمد رضا خاں صاحب سے ملکر آتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی گاڑی منگوا دی۔ میں سیف آباد حافظ صاحب سے ملنے گیا۔ حافظ صاحب مجھے دیکھکر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کل میں لڑکی کے پھوپا کو جن کا میرے ہاں بہت آنا جانا ہے بلوا بھیجوں گا اور جو کچھ گفتگو ہوگی میں خانصاحب کے ہاں آکر تم سے کہوں گا۔ یا تم کو بلوا لوں گا۔ میں شب کے آٹھ کے قریب اپنے مسکن پر واپس آیا۔ خانصاحب کے پاس چند اصحاب بیٹھے تھے۔ خانصاحب نے جن سے میرا تعارف کرایا۔ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے وہ یہ تھے۔ نواب سر بلند جنگ جج ہائی کورٹ۔ امر اللہ شاہ مخاطب بہ معتضد جنگ شریک معتمد فوج تھے۔ ڈاکٹر سید احمد[۱] جن کو فیملی ڈاکٹر کے طور پر خانصاحب نے رکھ لیا تھا ماہانہ کچھ دیتے تھے اور حافظ احمد رضا خانصاحب کے ہاں سے بھی ماہانہ اُن کو کچھ ملتا تھا۔ بہر حال یہ تینوں اشخاص حیدرآباد کے میرے پہلے دن کے ملاقاتی تھے۔ جب تک یہ تینوں زندہ رہے میرے ساتھ خاص مراسم رہے میرے آنے کے چوتھے روز حافظ احمد رضا خاں صاحب نے میری دعوت بریکفاسٹ کی اور چونکہ یہ سر وقار الامراء سابق وزیر اعظم حیدرآباد کی حافظ صاحب پر خاص نظر عنایت تھی تو ان لوگوں کو مدعو کیا جو سر وقار الامرائے سے وابستہ یا اُن کے ہاں ملازم تھے۔ مثلاً نواب اقبال یار جنگ مرحوم یہ اس وقت کمشنر انعام تھے۔ مگر سر وقار الامراء کو شاید پڑھایا بھی تھا اور ان کے بڑے خیر خواہ تھے۔ ان کے فرزند عبدالرحیم دوم تعلقدار بھی شریک تھے۔ نواب عزیز جنگ بعد کو ادبی خدمات کے صلہ میں شمس العلما اور خان بہادر کے خطابات انگریزی سے ملے تھے) اس زمانہ میں پائیگاہ سر وقار الامراء کے صدر تعلقدار و معتمد تھے۔ مولوی وحید الزماں خاں مخاطب بہ نواب وقار نواز جنگ بہادر معتمد دفتر ملکی تھے۔ یہ کسی زمانہ میں پائیگاہ سر وقار الامراء میں ملازم تھے۔ ڈاکٹر محمد عباس مخاطب با نظام جنگ

---

[۱] - محمد اعظم صاحب کے والد

بہادر اسٹاف سرجن سرو قارالامراء ۔ خدا بخش خانصاحب اور میں اور مسٹر معین الدین وکیل ہائیکورٹ جو حافظ صاحب کے خاص آدمیوں میں تھے اور بھوپال سے ان کے ساتھ حیدرآباد آئے تھے اور سند وکالت حاصل کر کے وکالت کر رہے تھے ۔ حافظ صاحب اپنے سب مہمانوں سے میرا تعارف کروایا اور یہہ بھی کہا کہ میرے قریبی رشتہ دار ہیں ۔ اس روز جمعہ تھا اور جمعہ کا خیال کر کے بریکفاسٹ کی دعوت دی تھی ۔ بارہ کے قریب کھانے سے فرصت ہوگئی اور باطمینان تمام ایک بجے تک صحبت رہی ۔ بعض اشخاص زیادہ تر مجھ سے مخاطب تھے اور مختلف عنوان پر گفتگو کرتے رہے ۔ غالباً غرض و غایت یہہ تھی کہ میرا مبلغ علم دریافت کریں ۔ مجھ سے زیادہ باتیں کرنے والوں میں نواب عزیز جنگ مرحوم اور نواب وقار نواز جنگ مرحوم تھے ۔ یہہ دونوں اپنے اپنے طور پر بڑی قابلیت و علمیت و پایہ کی ہستیاں تھیں ۔ مصنفان و مولفان کتب کثیرہ تھے ۔

نواب عزیز جنگ مرحوم کا ذکر

نواب عزیز جنگ مرحوم کی تالیف قوانین مال یہہ بہت مفید و کثیر ذخیرہ ہے ۔ اور قانون والوں کی نظروں میں مستند ہے اور اب بھی استعمال میں ہے ۔ علاوہ اس کے تاریخ نوایت اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے ۔ فن باغبانی و زراعت وغیرہ پر بھی ان کی تالیفات ہیں ۔ افسوس ہے کہ آصف اللغات زیر تالیفات تھی کہ قلب کی شکایت سے انتقال کر گئے ۔ اس تالیف کی ہر جلد پر جو ایک ایک حرف پر مشتمل ہے ۔ سرکار انگریزی سے پانسو اور سرکار عالی سے پانسو بطور انعام کے ان کو ملتے تھے ۔ دس یا گیارہ حروف ختم کئے تھے ۔ ایک ایک حرف بڑی تقطیع کے چار پانچ سو صفحے ہیں اور قیمت فی جلد پانچ روپیہ جس وقت کوئی جلد منطبع ہو جاتی تو اس کی ایک کاپی ضرور بضرور مجھے بلاقیمت بھیجتے ۔ اپنی تصانیف میں سے بعد طبع کسی کی ایک کاپی خود لاکر دی یا بھیجدی ۔ چنانچہ ستائیس یا اٹھائیس سال قبل تاریخ نوایت جو تالیف کی تھی بعد چھپنے کے اس کی ایک کاپی خود لاکر مجھے دی تھی یہہ شاعر بھی تھے تخلص ولا تھا ۔ فارسی زیادہ ریختہ کمتر کہتے تھے ۔ ایک مجموعہ مرثیوں و سلام کا بہت ہی ضخیم تصنیف کیا تھا ۔ باظہار خوش عقیدگی جس کی جلدیں بھی پرتکلف قیمتی بنوائی تھیں ۔ اس کی بھی ایک کاپی خود لاکر مجھ کو دی تھی جسے آٹھ نو سال ہوتے ہیں ۔ اس مجموعہ سے ولا مرحوم کے عقائد پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ غلامان آل عبا سے تھے ۔ ان کا آبائی وطن مدراس تھا ۔ انتقال بعمر ۶۵ سال ہوا ۔ اور مولوی وحیدالزماں خاں وقار نواز جنگ تو مسلم الثبوت بڑے پایہ کے محدث و فقیہ حنفی مذہب کے تھے ۔ بخاری کے تیس پاروں کا ان کا ترجمہ بہت مقبول و مشہور ہے ان کی تصنیفات و تالیفات مذہبی امور تھیں ۔ ان کا وطن کانپور تھا ۔ صغیرسنی میں بعد غدر ۱۸۵۷ء

اپنے والد کے ہمراہ حیدرآباد آئے اور حیدرآباد کو اپنا وطن بنایا۔ ابتداء میں ان کے عقائد اہل حدیثوں کے تھے پھر حنفی المذہب ہوئے۔ جب کہ بخاری کا ترجمہ وغیرہ کیا تھا جو بہتر بہتر سال کی عمر میں انتقال کیا۔ رحلت کے دس گیارہ سال قبل ان کے عقائد میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ حب اہل بیت کو جزو ایمان سمجھنے لگے اور پکے تفضیلیہ ہوگئے تھے۔ پیسہ اخبار میں کئی مضامین لکھے کہ حضرت اسداللہ الغالب علی مرتضیٰ کو اور صحابہ پر فضیلت حاصل ہے۔ مولوی ثناءاللہ صاحب امرتسری اور نواب وقار نواز جنگ بہادر مرحوم سے تحریری معرکۃ الآرا مباحث ہوئے۔

حافظ صاحب کے ہاں بریکفاسٹ کھا کر میں خدابخش خاں صاحب[۱] اپنے میزبان کے ہمراہ اپنے مسکن پر آیا۔ اس بریکفاسٹ کی دعوت کے بعد اور کئی صاحبوں نے میری دعوت کی وہ اسلئے کہ چیف جسٹس کا معزز مہمان تھا۔ غالباً ان کے خوش کرنے کے لئے بعض وکلا نے دعوتیں کیں مثلاً مولوی حافظ لطف اللہ مرحوم جو اس زمانہ میں بڑے مشہور و معروف وکیل تھے اور دولت بھی بہت پیدا کی تھی۔ انہوں نے نظام کلب میں میری دعوت کی اور بہت سے وکلا کو مدعو کیا۔ انگریزی طریقہ کا ڈنر دیا تھا۔ حافظ لطف اللہ مرحوم مسٹر انوار اللہ حال ڈیوژنل انجینئر حیدرآباد کے والد تھے۔ مولوی سید خواجہ حسن مرحوم بھی بہت ممتاز اور بہت مشہور وکیل تھے جن سے بعد کو مجھے بہت مخلصانہ روابط ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے باغ میں میری ہندوستانی طریقہ کی پرتکلف دعوت کی۔ مولوی ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم جو اس زمانہ میں معتمد تعمیرات و معدنیات وغیرہ تھے میری دعوت بریکفاسٹ کی دی اور بہت سے عہدہ داروں کو مدعو کیا۔ انہوں نے جو دعوت کی وہ اس لئے نہیں کہ میں خدابخش خانصاحب کا مہمان تھا بلکہ وہ اس لئے کہ میرے والد مرحوم سے اور ان کے والد مرحوم مولوی زین الدین حسین خاں مرحوم سے بہت دوستانہ تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے دادا مولوی سید کرم حسین خاں مرحوم کلکتہ میں اودھ کی جانب سے وکیل السلطنۃ تھے اور جب ان کا آخر زمانہ تھا۔ میرے والد مرحوم سفیر و نائب سلطنت نظامت بنگالہ کی جانب سے کلکتہ میں مامور ہوئے۔ گو میرے والد مرحوم انسے عمر میں بہت چھوٹے بلکہ ان کے چھوٹے فرزند مولوی زین الدین حسن خاں مرحوم کے ہم عمر تھے لیکن والد مرحوم کا بہت احترام کرتے تھے اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اس کا علم سید علی صاحب مرحوم کو تھا اس لئے وہ مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے رہے۔ مولوی سید کرم حسین خاں کے بڑے فرزند مولوی اعظم الدین حسین خاں مرحوم تھے۔ یہ اور ان کے چھوٹے بھائی دونوں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ زین الدین حسین خاں مرحوم نے پنشن لیکر پٹنہ ہی میں دائمی سکونت

۱۔ خدابخش خاں حیدرآبادی چیف جسٹس یعنی میر مجلس ہیں۔

اختیار کر لی تھی کہ سر اسٹورٹ کالون بیلی جو دو دفعہ حیدر آباد میں رزیڈنٹ ہو کر آئے تھے۔ ایک دفعہ نواب سالار جنگ اول کی زندگی میں دوسری دفعہ نواب سالار جنگ کی وفات کے بعد حالات حیدر آباد کو درست کرنے کو گورنمنٹ نے بھیجا تھا۔ بہر حال جب کہ سر اسٹورٹ سالار جنگ اول مرحوم کی زندگی میں آئے تھے تو انہوں نے اپنے قدیم مولوی زین الدین حسین خاں مرحوم کی سفارش سر سالار جنگ سے کر کے ان کو حیدر آباد بلوایا تھا اور کمشنر انعام مسٹر جاربلی کے ساتھ کام کرنے کو مقرر کئے گئے اور حیدر آباد میں انتقال کیا۔

عماد الملک مرحوم کا ذکر

مولوی زین الدین خاں مرحوم کے بڑے فرزند مولوی سید حسین صاحب مخاطب بہ نواب عماد الملک حیدر آباد پہلے سے آچکے تھے۔ مختار الملک مرحوم ان کو لکھنو سے اپنے ہمراہ لائے تھے اور پہلے اپنا پرائیوٹ سکرٹری بنایا اور سفر یورپ میں اپنے ساتھ لیگئے تھے۔ مولوی سید حسین صاحب سے بھی خدا بخش خاں صاحب نے مجھے بھیجا کر ملا یا تھا اور جب میں نے ان سے یہ کہا کہ آپ میرے والد کے دوستوں میں ہیں تو بولے آپ کے والد کا خرد تھا۔ میں جب کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج میں پڑھتا تھا تو حضرت کے حضور میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ میرے بزرگوں کے ملنے والوں میں تھے۔ سید علی صاحب خدا بخش خاں صاحب کے ہاں اکثر آیا کرتے تھے اور سید علی صاحب سے بھی جبکہ بی اے پاس کرنے کے بعد پٹنہ کالج میں پروفیسر تھے تو خدا بخش صاحب اور سید علی صاحب کے کل خاندان والوں سے بہت ربط تھا یہی وجہ تھی کہ خدا بخش خاں صاحب کے حیدر آباد آنے کے سبب وہی ہوئے۔ ایک مقدمہ فاروق یار جنگ تاجر چرم بمقابلہ عالم علی خاں دلاور نواز جنگ جمعدار نظم جمیعت سے ایک کمیشن کے آگے زیر تحقیقات تھا اور سید علی صاحب اس کمیشن کے ایک رکن تھے۔ دلاور نواز جنگ سے کہکر انکی جانب سے پیروی کرنے کے لیئے خدا بخش خانصاحب کو دس ہزار فیس پر بلایا تھا۔ اب سید علی صاحب کو اور خدا بخش خاں صاحب کو یہہ فکر ہوئی کہ حیدر آباد میں رہ جائیں۔ ایک زمانہ میں خدا بخش خاں صاحب نے بحیثیت ایک لائق اور قانون داں ہونے کے وکالت میں بہت فروغ پٹنہ میں ہوا تھا اور بہت دولت بھی کمائی تھی مگر اخیر زمانہ میں ان کی وکالت بیٹھ گئی تھی اس لیئے چاہتے تھے کہ بغیر جانفشانی کے کافی مستقل آمدنی ہو جائے اور یہی صورت اس کی نکالی گئی کہ حیدر آباد ہائی کورٹ کے میر مجلس جو اس زمانہ میں تقرر طلب تھی ان کو ملجائے۔ مولوی سید افضل حسین مرحوم منصرم میر مجلس تھے۔ سید علی صاحب نے خان صاحب کی سفارش آغا مرزا بیگ مخاطب بہ سرور الملک جو غفرانمکان مرحوم کے

استاد بھی رہ چکے تھے اور اس زمانہ میں معتمد پیشی ہی کیا مختار کل تھے۔ سابق حضور نظام محبوب علیخاں مرحوم ومغفور ان پر بہت بھروسہ کرتے تھے اور نواب سرورالملک مرحوم بھی بڑے ہی خیر خواہ وجان نثار اپنے آقا کے تھے۔ غرض سرورالملک مرحوم نے رزیڈنسی کو لکھا کہ کلکتہ ہائی کورٹ کو لکھکر چند نام نامی گرامی مسلمان وکلاء اور جوڈیشل عہدہ داروں کے طلب کئے جائیں اور کلکتہ ہائی کورٹ کے ججوں میں جسٹس یعنی میر مجلس خدا بخش خاں صاحب کا بڑا مربی تھا۔ دکھانے کے لئے چند نام آے۔ حالانکہ خدا بخش خانصاحب کلکتہ ہائی کورٹ کے وکیل نہ تھے بلکہ پٹنہ کی ہائیکورٹ میں مدت العمر تک کی لیکن ان کا نام بھی کلکتہ ہائی کورٹ سے آگیا۔ چونکہ سرورالملک بہادر نے خدا بخش خاں صاحب کو دیکھ لیا تھا اور مقدمہ کی پیروی حسن قابلیت سے کی۔ اس سے بھی واقف ہوچکے تھے اور سید علی صاحب کی جو اس زمانہ میں سرورالملک مرحوم کے بڑے دوست تھے پرزور سفارش کی تھی۔ خدا بخش خاں صاحب کا تقرر تین سال کیلئے کر لیا گیا۔ اگر سرورالملک مرحوم حیدرآباد سے علیحدہ ہو جاتے تو خدا بخش خاں صاحب مستقل چیف جسٹس ہو جاتے۔ بہرحال تین برس رہے اور مدت ملازمت میں توسیع تک بھی نہ ملی۔ بعد انقضائے مدت سہ سالہ خدا بخش خانصاحب پٹنہ واپس چلے گئے۔

سید علی بلگرامی مرحوم کا ذکر

جب خدا بخش خاں صاحب نے مجھ کو سید علی صاحب بلگرامی سے ملایا اور میرے والد کا نام بتلایا تو بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ملے اور یہ کہا کہ میں آپ کے والد سے خوب واقف ہوں۔ جب ہم لوگ پٹنہ میں تھے تو کئی دفعہ اپنے والد مرحوم کے ساتھ میں آپ کے والد کی خدمت میں گیا تھا۔ صرف ایک ہی دعوت پر قناعت نہیں کی بمتعدد بار سید علی صاحب بلگرامی اس مضمون کا انگریزی میں رقعہ مجھکو لکھتے کہ اگر کھانا نہیں کھایا تو میرے ساتھ آکر کھاؤ۔ جب تک ان کا تعلق حیدرآباد سے رہا زمانہ ملازمت میں نیز جب کہ پنشن لینے کے بعد انگلستان جاکر بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے آئے اور بیرسٹری یہاں شروع کی۔ مجھ سے بہ خلوص ملتے تھے۔ یہ پہلے سے بھی وکالت کے مجاز تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے بی۔اے۔ بی۔ال تھے۔ بی اے کے امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی بھر میں فرسٹ آئے تھے۔ سب بنگالیوں کو دبایا اور یونیورسٹی مڈل طلائی تمغہ انعام میں ملا تھا۔ سید علی صاحب بلگرامی نے بی۔اے کا امتحان غالباً ۱۸۶۹ء میں پٹنہ کالج سے پاس کیا تھا۔ اس کے بعد کو حیدرآباد اپنے والد کے آنے کے بعد آئے اور انگلستان حیدرآباد سے بھیجے گئے۔

معدنیات کی ڈگری ۱۸۷۶ء میں لیکر آئے مگر بی۔ال ۱۸۹۰ء میں پاس کیا۔ ال۔ال ڈی

کی ڈگری بھی ان کو ملی تھی سنسکرت کے ام۔ اے۔ کا ممتحن مدراس یونیورسٹی نے ۱۸۹۲ء میں بنایا تھا مختلف زبانیں جانتے تھے۔ فرنچ زبان سے تمدن عرب۔ تمدن ہند کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ایک مسلمان کے لئے سنسکرت کا ممتحن وہ بھی ام۔ اے کا بننا قابل فخر ہے۔

زیادہ تر اشخاص جو غیر ذمہ دارانہ طریقہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں سہ

وہ صورتیں کہاں ہیں کس دیس بستیاں ہیں ؛؛ اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

جہاں ایسی ہستیاں بھی گزریں جن کے لئے آٹھ آٹھ آنسو بہاتے ہیں اور اب بھی ایسے پاکیزہ نفوس موجود ہیں جن کی دل سے قدر کرنی چاہئے۔ مگر زیادہ تر وہ اشخاص جو غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دنیا بھی کیا ..... جس کی گوناگوں دلچسپیوں سے ساکنان دنیا کو ایسا موہ لیا اور لوبھا رکھا ہے کہ عموماً لوگوں نے آنکھوں پر غفلت کی پٹیاں باندھی ہیں۔ من مانے الٹے سیدھے راہ بغیر خیال سزا و جزا چلتے ہیں خصوصاً جس کو دولت، ثروت، حکومت و قدرت کا نشہ ہے۔ انکی اس مستانہ رفتار سے کسی بیکس کا حق پامال ہو یا کوئی بے بس پسے یا دبے ان کی پاپوش کو خبر تک نہیں ہوتی۔ فرعون بے سامان نہیں بلکہ باسامان بنے بیٹھے ہیں۔ یہ سمجھ لیا ہے کہ عاقبت کا بوریا بدنا ہمیٹ لے آئے ہیں۔ آہ سہ

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں ؛؛ سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں

کیا خوب کسی نے کہا ہے۔

ہم کیا بتائیں تم کو یہ پیر زال کیا ہے ؛؛ یہ حسرتوں کا گھر ہے عبرت سرا ہی دنیا

نسبت منقرر کرنیکا ذکر

اب میں پھر اپنی کہانی کا سلسلہ شروع کرتا ہوں مگر اسطرح کی کہانی نہیں جو میر و سودا و حسن کی تھی۔ میر تقی صاحب فرماتے ہیں۔ سہ جس سے کھوئی تھی نیند میر کی کل ؛؛ ابتدا پھر وہی کہانی کی۔ مرزا رفیع سودا کہتے ہیں سہ سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر ؛؛ اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ سے میر حسن دہلوی کہتے ہیں سہ پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ ؛؛ بس آج کی شب بھی سو چکے ہم۔ غرض حافظ صاحب قبلہ نے لڑکی کے پھوپا کو بلوایا۔ میرے حیدرآباد آجانے کی اطلاع دی۔ چونکہ حافظ صاحب وکالت کا دماغ و دل رکھتے تھے۔ اس قدر صرف کثیر سے حیدرآباد آنا اور وکالت کے کاروبار کو معطل کرنا، نقصان مالی اٹھانا (کلکتہ ہائی کورٹ کی تعطیل کا حال ان بیچارہ لڑکی کے پھوپا کو کیا معلوم) یہ سب کا ذمہ دار انہیں کو گردانا۔ ان سے کہا کہ آپ کے اشارہ پر میں نے انکو یہاں بلایا ہے

کیوں کہ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ہمایوں مرزا کچھ دنوں حیدرآباد آکر رہیں وغیرہ وغیرہ بعد کو ساری گفتگو کا اعادہ حافظ صاحب نے مجھ سے کیا تھا۔ لڑکی کے پھوپا نے کہا کہ کل ہمایوں مرزا کو اپنے ہاں بلوائیے میں بھی آؤنگا۔ اونکو دیکھ بھی لونگا۔ اوران سے دو بدو گفتگو کر کے کچھ حالات اور قابلیت کی کیفیت تھوڑی بہت معلوم کروں گا۔ غرض دوسرے دن حافظ صاحب نے ایک رقعہ بھیجکر مجھکو بلوایا۔ شام کے قریب میں بھی گیا اور وہ بھی آئے۔ گو ان کی علمی لیاقت معمولی تھی مگر مسن اور جہاندیدہ اور امراء وغیرہ بڑے لوگوں کے صحبت یافتہ تھے۔ مجھ سے جو سوالات کئے اون سے وہ میرے خاندانی حالات اور میری ذہانت معلومات عامہ وغیرہ کا اندازہ کر رہے تھے ان کے بشرہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ میرے جوابات ان کے لئے تشفی بخش ہیں۔ جب رخصت ہونے لگے تو مجھ سے کہا کہ کل تیسرے پہر کو فلاں مقام پر زحمت فرما کر آپ تشریف لائیے۔ میرے برادر نسبتی (یعنی لڑکی کے والد) کا مکان ہے وہ بھی آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے بعض احباب بھی آپ سے ملیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن تبلائے ہوئے مقام پر بوقت مقررہ میں پہونچا وہاں بہ مصلحت خانصاحب کی گاڑی پر نہیں گیا۔ کیونکہ اب تک خدابخش خاں صاحب سے میں نے اپنی نسبت کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ ان کو تو یہ معلوم تھا جیسا میں نے کہا تھا کہ حیدرآباد دیکھنے اور یہاں کے لوگوں سے ملنے کو آیا ہوں۔ اس لئے کرایہ کی فٹن پر گیا تھا۔ لڑکی کے والد کے مکان پر اور بھی چند لوگ بیٹھے تھے لڑکی کے دونوں بھائی تھے، ان کے دو عزیز اور چند دوست تھے۔ لڑکی کے والد کے جو دوست وہاں تھے ان میں سے ایک مولوی عنایت الرحمٰن خاں صاحب جو حیدرآباد کے ناظم تعلیمات نواب عماد الملک مرحوم کے قبل تھے اور بھی اعلیٰ خدمتوں پر رہ چکے اور اب پنشن لے لی تھی۔ دوسرے مولوی نعمت اللہ خاں مرحوم تھے جو دفتر پیشی خداوندی کے منتظم یا مددگار تھے اور نواب سرور الملک مرحوم کے عزیز قریب اور جواں مرگ عظمت اللہ خاں مرحوم نظامت تعلیمات کے سابق مددگار کے والد تھے اور ایک صاحب تھے جن کا نام اسوقت یاد نہیں آرہا ہے۔ حالانکہ بعد کو ان سے متعدد بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ کورٹ آف وارڈز میں کوئی اہلکار تھے۔ یہ میرے والد کے نام سے خوب واقف تھے جس کا سبب یہ تھا کہ ان کے والد متوطن نوکڑے مانکپور ضلع الہ آباد کے تھے، مگر زمانہ شاہی میں کانپور کے کوتوال تھے۔ اُن کا نام میر پرورش علی اور تخلص سخی تھا۔ انتزاع اودھ کے بعد بقیہ ایام زندگی پٹنہ اور کلکتہ میں گزار دیا اور بزمانہ قیام کلکتہ والد مرحوم کی صحبت میں بہت رہتے تھے۔ ہاتھ میں اُن کے ایک لمبا ڈنڈا رہتا تھا۔ اس کو میں گھوڑا بنا کر پھرتا تھا۔ غرض میر پرورش علی سخی کے فرزند اپنے والد کے خطوں سے

والد مرحوم کا نام برا برسنا کرتے تھے۔ اس امر کا اظہار اس صحبت میں انہوں نے کیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو لڑکی کے پھوپا نے پہلے تو لڑکی کے والد سے ملایا پھر بھائیوں سے۔ پھر یکے بعد دیگرے اور حاضرین سے لڑکی کے والد تو بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ مولوی عنایت الرحمٰن خاں مرحوم مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں کشتیوں میں چائے خوری کا سامان آیا اور کیک پیسٹری وغیرہ تھی۔ پس پردہ عورتیں مجھکو دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت اصل معاملہ میں کوئی گفتگو مجھ سے نہیں ہوئی۔ تقریباً دو گھنٹے میں وہاں بیٹھا پھر رخصت ہو کر چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے اس صحبت کا ذکر حافظ صاحب سے کیا۔ مجھ سے کہلا بھیجا کہ لڑکی منشی فاضل کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہے اور امتحان کو تین مہینے باقی ہیں۔ محنت بہت کی ہے۔ بعد انفراغ امتحان عقد نکاح کر دیا جائیگا۔

گر شرط یہ ہے کہ بعد شادی دلہن پٹنہ یا کلکتہ نہیں جائیگی۔ میں تو اس کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ بایں خیال کہ انگریزی میں میٹرک پاس اور اس پر مستزاد منشی فاضل مسلمان لڑکی کہاں ملیگی۔ میں نے تین مہینے انتظار کرنا قبول کیا۔ پھر میرے پاس ایک پیغام آیا کہ جبکہ حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کرنے کو میں رضامند ہوں تو ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دینی چاہئے جس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ مجھ میں صلاحیت وکالت کرنے اور روپیہ پیدا کرنے کی بھی ہے یا نہیں۔ میں نے کہلا بھیجا کہ اس کا جواب سوچکر دونگا۔

ذکر قلعہ گولکنڈہ

مجھے حیدرآباد پہونچکر گیارہ بارہ دن ہوئے تھے جب کہ یہ پیغام میرے پاس آیا۔ لڑکی کے پھوپا حافظ صاحب سے جو کچھ آکر کہتے تھے وہ مجھ سے بلاکر کہتے تھے۔ خدا بخش خاں صاحب کو اب تک اس نامہ و پیغام اور میری نسبت کا کوئی علم نہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے ایک دن کہا جبکہ آپ حیدرآباد آئے ہیں یہاں کی چند چیزیں جو قابل دید ہیں وہ تو آپ نے دیکھی نہیں۔ یہ بھی کہا کہ مجھے فرصت نہیں۔ دوسرے بڈھا آدمی ہوں ورنہ خود لیجا کر دکھاتا۔ پھر خود ہی کہا کہ مسٹر معین الدین آئیں تو ان سے کہونگا وہ اپنے ساتھ آپ کو لیجا کر قلعہ گولکنڈہ قطب شاہی گنبد۔ مکہ مسجد۔ چار مینار وغیرہ دکھائینگے۔ چنانچہ مسٹر معین الدین جو دوسرے تیسرے دن آیا کرتے تھے۔ خانصاحب نے کہا کہ بیرسٹر صاحب کو یہ سب چیزیں لیجا کر دکھائیے۔ انہوں نے کہا آئندہ جمعہ کو صبح کے نو بجے آکر بیرسٹر صاحب کو لیجاؤں گا۔ چنانچہ وہ حسب وعدہ جمعہ کو آئے اور مجھکو ہمراہ لیجا کر اس دن قلعہ اور بالا حصار اور گنبد وغیرہ دکھلائے اور کہا کل ہفتہ ہے ہائی کورٹ میں جلسہ انتظامی ہوتا ہے۔ مجھے فرصت ہے کل صبح کو مکہ مسجد چار مینار وغیرہ دکھائینگے۔ دوسرے دن

آکر یہ سب دیکھا یا ۔ لڑکی کے پھوپانے حافظ صاحب سے آکر پوچھا کہ بیرسٹر صاحب نے کیا تصفیہ کیا ۔ یہاں وکالت کرنے کو رضامند ہیں ۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم اور بیرسٹر صاحب کئی روز سے آتے نہیں ہیں ۔ میں بلواکر دریافت کرکے آپ کو جواب دوں گا ۔ چنانچہ حافظ صاحب نے مجھے بذریعہ رقعہ کے بلوابھیجا اور مجھ سے میرا عندیہ لیا ۔ میں نے عرض کیا آپ ہی فرمائیے کیا کروں ۔ کلکتہ ہائی کورٹ تو ابھی اور دو مہینے بند رہیگا ۔ اونہوں نے فرمایا میری رائے تو یہ ہے کہ اللہ کا نام لیکر یہاں وکالت شروع کردو ۔ البتہ پانسو روپیہ داخل کرنے پڑینگے ۔ تمہارے پاس اس قدر روپیہ ہیں ۔ میں نے کہا نہیں ۔ ایک ہزار روپیہ ساتھ لیکر کلکتہ سے چلا تھا جس میں سے کچھ کرایہ ریل میں صرف ہوا ۔ اور کرایہ کی گاڑیوں میں دس پندرہ یہاں صرف ہوئے انہوں نے کہا کہ قبل اس کے یہاں کے ہائی کورٹ میں انرول ہونے کی درخواست دوانسب ہوگا کہ میں خدا بخش خاں صاحب سے اس معاملہ میں گفتگو کروں ۔ کل شام کو میں خانصاحب کے ہاں آؤں گا ۔ تم تو وہیں رہوگے ۔ تمہاری موجودگی میں اس خصوص میں گفتگو کروں گا ۔ دوسرے دن حسب قرار داد حافظ صاحب خاں صاحب کے ہاں تشریف لائے ۔ اس وقت چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے ۔ جن میں محمد زماں خاں چیف سٹی مجسٹریٹ بھی تھے ۔ یہ پہلے وکالت کرتے تھے بعد کو مجسٹریٹ ہوئے ۔ یہ بھی حافظ صاحب کے خاص آدمیوں میں تھے ۔ جب خاں صاحب بھوپال میں وزیر تھے محمد زماں خاں وہاں فوجداری کے ناظم تھے اور حافظ صاحب ان کے ہاں مربی تھے ۔ حافظ صاحب کے یہاں چلے آنے پر وہ بھی چلے آئے ۔ ان کو بھی مسٹر معین الدین کی طرح وکالت کی سند دلوائی ۔ جو لوگ خاں صاحب کے پاس بیٹھے تھے جانے لگے تو محمد زماں خان بھی اٹھے ۔ حافظ صاحب نے فرمایا آپ ذرا ٹہرئیے ۔ آپ سے کچھ کہنا ہے ۔ حافظ صاحب خدا بخش خاں صاحب کے برابر والی کرسی پر جا بیٹھے اور آہستہ آہستہ ان سے کچھ باتیں کرنے لگے ۔ خاں صاحب بھی گردن ہلاتے گئے ۔ دو چار الفاظ بلند آواز سے کہے جو میں نے بھی سنے ۔ وہ الفاظ یہ تھے " بہت مناسب میرا بھی یہی خیال تھا ۔ پھر محمد زماں خاں کو حافظ صاحب نے اپنے قریب بلاکر بٹھایا اور ان سے کہا کہ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ہمایوں مرزا مجھ سے قرابت قریب رکھتے ہیں اور میر مجلس صاحب نے ہمایوں مرزا کے والد سے پڑھا بھی ہے اس لحاظ سے ہمایوں مرزا میر مجلس صاحب کے استاد زادے ہیں ۔ ہم دونوں آدمیوں کو یہ خیال ہے کہ ہمایوں مرزا حیدرآباد میں وکالت کریں ۔ ان دنوں یہ کلکتہ کے ہائی کورٹ میں کام کررہے

ہیں مگر بچند وجوہ کلکتہ ان کیلئے مناسب جا ل نہیں ہے۔ آپ کا یہ خیال ہے۔ محمد زماں خاں صاحب نے کہا کہ آپ حضرات بیرسٹر صاحب سے اور ان کے حالات سے خوب واقف ہیں اور ان کے بزرگ ہیں۔ ان کے حق میں جو مناسب سمجھیں وہ کریں۔ اس میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے اور میری رائے کیا۔ میرے خیال میں بیارسٹر صاحب کو بھی کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر حافظ صاحب نے فرمایا۔ جو میری رائے تھی خانصاحب کی بھی وہی رائے ہے کہ تم کلکتہ چھوڑ دو اور یہیں وکالت کرو۔ خانصاحب بولے کہ میرے چھوٹے بھائی ابو الحسن خاں جب بیرسٹر ہو کر آئے تو انہوں نے کلکتہ ہائیکوٹ میں وکالت شروع کی۔ دو تین سال تک تو ان کو ایک مقدمہ بھی نہیں ملا۔ میں برابر پانسو روپیہ ماہانہ بھیجتا رہا اور یہہ روپیہ ان کے لئے کافی نہیں ہوتے تھے پھر جب کام کچھ چل نکلا تو خود ہی لکھکر تین سو ماہانہ منگوانے لگے۔ کئی سال کے بعد جب ٹٹو نہ چلا تو بڑی کوشش سے میں نے عدالت خفیفہ کی رجسٹراری پانسو کی دلوائی اب تو عنایت الٰہی سے سکنڈ جج ہیں اور بارہ سو پاتے ہیں۔ مگر کلکتہ کے اخراجات اس قدر مختلف النوع ہیں اور جوں جوں زینہ بڑھتا جاتا ہے اخراجات بڑھتے جاتے ہیں۔ گو ابو الحسن بارہ سو ماہانہ پاتے ہیں مگر اب بھی وقتاً فوقتاً مالی امداد مجھے کرنی ہوتی ہے۔ پھر مجھ سے خان صاحب بولے کہئے آپ کی کیا رائے ہے آپ ہم لوگوں کی رائے سے متفق ہیں۔ میں نے کہا۔ میں آپ بزرگوں کی رائے میں کیا دخل دیسکتا ہوں۔ حافظ صاحب مسکرا کر کہنے لگے عنقریب ان کی شادی ہم لوگ کر دیں گے پھر تو ان کا دل خود بھی یہاں لگ جائے گا۔ اس کے بعد حافظ صاحب نے کہا ہم لوگوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہمارے کہنے سے حیدر آباد میں وکالت کرنے پر یہہ رضامند ہو گئے ہیں۔ اس لیئے ہم تینوں آدمیوں کو جو اس صحبت میں ہیں ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ تاکہ ان کی وکالت کو فروغ ہو (ہنسکر) ورنہ یہہ ہم لوگوں کو گالیاں دیں گے۔ خاں صاحب بولے انشاء اللہ دعا دینگے۔ اس واقعہ کے دو تین دن کے بعد میں سید علی صاحب بلگرامی کے پاس گیا اور ان سے یہہ سب قصہ کہا اونہوں نے کہا میں ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ آپ وکالت تو شروع کیجئے۔ میں نے سید علی صاحب بلگرامی سے کہا کہ سر دست کوئی بنگلہ کرایہ پر لینا مناسب نہیں سمجھتا ہوں۔ کیونکہ پانسو روپیہ ہائی کورٹ میں داخل کرنے ہیں اور کرایہ کے مکان کے لئے فرنیچر وغیرہ خریدنا پڑے گا جس کے لئے کم از کم تین چار سو روپیہ درکار ہوں گے اور ساتھ ہی اس کے خدابخش خاں صاحب کے ہاں بہ حیثیت مہمان کے رہنا بھی کھلتا ہے۔ خصوصاً جب کہ وکالت شروع کروں گا تو چیف

جسٹس کے مکان میں رہکر وکالت کرنی ان کے لئے بھی اور میرے لئے بھی ناز یبا ہے اور ایسی حالت میں خانصاحب میری مدد نہیں کریں گے۔ پندرہ سولہ دن سے زیادہ ان کے ہاں ہوگئے۔ گو ان پر میں بارگراں نہیں ہوں مگر مصلحتاً مجھکو اب وہاں رہنا نہیں چاہیئے۔ سید علی صاحب بلگرامی بولے بیشک آپ کی رائے صائب ہے۔ اب خاں صاحب کے ہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ میں اپنے پاس آپ کو بلالیتا مگر میرا مکان خود میرے لئے کافی نہیں ہے۔ جلدی میں میں نے یہہ مکان لے لیا ہے (نوٹ۔ سید علی صاحب اسی زمانہ میں اپنا مکان مولوی اسیر افضل حسین صاحب کے ہاتھ فروخت کر کے مولوی چراغ علی کی گلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں جاکر رہ گئے تھے) اور فرنیچر وغیرہ کے لئے ہائی کورٹ کی فیس دینے کے لئے روپیوں کی ضرورت ہے تو میں حاضر ہوں۔ میں نے اون کا شکریہ دل سے ادا کیا۔ پھر بولے کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ سردست نظام کلب میں جاکر رہجاؤں۔ اور ایک کرایہ کی گاڑی رکھہ لوں جس پر ہائی کورٹ آیا جایا کروں۔ کچہ مقدمات ملنے لگیں تو کرایہ کا بنگلہ لونگا۔ مگر سوال یہہ ہے کہ نظام کلب میں اپنے رہنے کا بند و بست کس کے ذریعہ سے کراوں اور وہاں کے منتظمین مجھکو کب تک رہنے دینگے۔ یہہ بھی نہیں معلوم منتظمین ہیں کون۔ شام کو کئی دفعہ خدابخش خاں صاحب کے ہمراہ نظام کلب گیا ہوں مگر دریافت نہیں کیا کہ منتظمین کون ہیں۔ مکان تو اچھا خاصہ وسیع ہے۔ کئی کمرے سجے سجائے مہمانوں کے لئے ہیں۔ ان میں سے ایک کمرہ مجھہ کو ملجائے تو میں گزارہ کرلوں گا۔ وہاں جو خانساماں وغیرہ ہوگا اس سے کھانے کا انتظام کرلوں گا۔ حافظ لطف اللہ صاحب وکیل نے مجھے ڈنر وہاں دیا تھا تو کھانے انگریزی اور ہندوستانی دونوں اچھے پکے تھے۔ سید علی صاحب بلگرامی بولے کہ اس کا ذکر خاں صاحب سے آپ نے کیا کہ آپ نظام کلب میں رہنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں میں نے ابھی تک ایک لفظ بھی ان سے نہیں کہا کہ میں ان کا مکان چھوڑنا چاہتا ہوں سید علی صاحب بلگرامی بولے میں آپ کو ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ آپ میرے بڑے بھائی صاحب سے مل چکے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں۔ سید علی صاحب بلگرامی بولے۔ آپ ان سے یہہ سارے واقعات کہئے اور اپنا عندیہ ظاہر کیجئے۔ مگر میرا ذکر ان سے نہ کیجئے گا کہ میں نے آپ کو ان کے پاس جانے کو کہا ہے۔ پھر بولے اگر بڑے بھائی صاحب چاہینگے تو کوئی بات نہیں ہے۔ ہر ممبر اس امر کا مجاز ہے کہ اپنے دوست یا عزیز کو ہفتہ عشرہ اپنا

مہمان بناکر کلب میں رکھ سکتے ہیں۔ میں بھی آپ کو وہاں رکھ سکتا ہوں۔ لیکن سید حسین صاحب بلگرامی کمیٹی انتظامیہ کے پریزیڈنٹ ہیں اور مولوی نظام الدین حسن (پدر ناظر یار جنگ) سکرٹری ہیں۔ سید حسین صاحب بلگرامی۔ مولوی نظام الدین حسن کو ایک رقعہ لکھدیں کہ مسٹر ہمایوں مرزا کو میں اپنے مہمان کی حیثیت سے چند دنوں کے لئے کلب میں رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اجازت دیدیں۔ پھر تو آپ ہفتہ عشرہ کیا عمر بھر وہاں رہیں۔ پوچھنے والا کون ہے۔ مجھ سے جو اس وقت گفتگو ہوی ہے۔ خدا بخش خاں صاحب سے نہ کہئے۔ پہلے سید حسین صاحب بلگرامی (عماد الملک مرحوم) سے ملکر انتظام کر لیجئے۔ پھر ان سے کہئے۔ چنانچہ دوسرے دن نواب عماد الملک مرحوم سے جاکر ملا اور انہوں نے نہایت خوشی سے ایک خط مولوی نظام الدین حسن مرحوم کے نام لکھدیا۔ میں وہ خط لیکر نظام الدین حسن صاحب سے ملا۔ انہوں نے نظام کلب کے خانساماں کے نام رقعہ لکھدیا۔ یہ سب کرنے کے بعد میں نے خدا بخش خاں صاحب سے سارے واقعات بیان کئے وہ کھل کھلا کر خوب ہنسے۔ پھر بولے ماشاءاللہ آپ بہت ذہین اور تیز ہیں۔ آپ وکالت کے لئے بہت موزوں ہیں۔ بیشک آپ کا خیال صحیح ہے۔ میرے ساتھ رہکر وکالت کرنی بدنمائی پیدا کرے گی۔ خدا کے لئے یہ خیال ہرگز نہ کیجئے گا کہ آپ کا رہنا کسی طرح بھی میرے لئے گراں ہے۔ پھر میں کلب گیا اور ایک کمرہ میں بلڈنگ میں جس کے متصل ایک باتھ روم تھا پسند کر لیا۔ نظام کلب اس زمانہ میں چارلی والے مکان میں تھا جس جگہ اب محبوبیہ گرل اسکول ہے اور اب تو وہاں ایک عالیشان قصر شاہی ہے۔ پہلے برآمدہ کے بعد بڑا ہال تھا جو ڈرینگ روم کی ترکیب کا تھا۔ اسکے نصف حصہ میں بلیریڈ ٹیبل تھا۔ اس کے بعد کا کمرہ ڈرائینگ روم تھا۔ ہر دو طرف دو دو کمرے تھے۔ اندر داخل ہونے کے وقت بائیں جانب کے کمرے میں ریڈنگ روم تھا جو ضروری فرنیچر سے آراستہ تھا۔ یہی کمرہ میں نے پسند کیا۔ لیکن بلڈنگ کے دونوں جانب دو ونگ تھے جن میں بھی کمرے تھے۔ مولانا حالی مرحوم جب ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد آئے تھے تو پشت کی طرف بائیں جانب کی ونگ میں فروکش تھے۔ حسن اتفاق سے کلب کا جو خانساماں تھا وہ صوبہ بہار کا رہنے والا تھا۔ اس کا وطن سہسرام تھا۔ کیٹرر ایک عیسائی مائیکل نامی تھا اور کوک (باورچی) رنگیا نامی تھا۔ جس کو میں نے کلب چھوڑنے کے بعد اپنے پاس ملازم رکھ لیا تھا۔ میرے پاس سے علیحدہ ہونے کے بعد ڈاکٹر سراج یار جنگ کے پاس عرصہ دراز تک ملا

انگریزی و مغلئی دونوں طرح کے کھانے پکاتا تھا اور لذیذ پکاتا تھا۔ میں نے مائیکل سے انتظام کرلیا تھا۔ وہ صبح کا ناشتہ اور چائے تیار کرتا۔ دس بجے بریکفاسٹ دیتا۔ چار بجے کی چائے دیتا اور شب کے آٹھ بجے ڈنر دیتا اور جو کچھ صرف ہوتا اس کا بل بنا کر دوسرے دن پیش کرتا میں روپیہ دیدیتا۔ روزانہ دو سوا دو کبھی ڈھائی روپیہ کی بل ہوتی۔ ایک فٹن گاڑی لیے لی۔ یعنی ایک گھوڑے کی ساٹھ روپیہ ماہانہ پر نوکر رکھ لی تھی جو مجھے کچہری لیجا کر چھوڑ دیتی اور پھر چار بجے لیجانے آتی۔ دن بھر اور کہیں کرایہ پر جاتی۔ جو صحبت خدا بخش خاں صاحب کے مکان پر شام کو ہوی تھی جس میں محمد زماں خاں بھی شریک تھے۔ دوسرے یا تیسرے دن لڑکی کے پھوپا کو بلوا کر کہلوا یا تھا کہ بیاسٹر صاحب یہاں وکالت پر رضامند ہو گئے ہیں۔

میرے کلب میں منتقل ہونے کے دو چار روز بعد ہنوز میں نے درخواست انرول ہونیکی نسبت پیش نہیں کی تھی کہ . . . . . کورٹ کے بینے عدالت بیرون بلدہ کے جو بعد کو سٹی سول کورٹ چینی خانہ کی کچہری میں ضم کر دی گئی۔ سکنڈ جج نے دو ماہ کے لئے رخصت کی درخواست پیش کی۔ قبل اس کے کہ خانصاحب اس درخواست کا تصفیہ اور اس جگہ کا کوئی انتظام کریں۔ مجھسے مشورہ کیا اور یوں گویا ہوے۔ اچھا موقع ہاتھ آیا ہے۔ عدالت بیرون بلدہ کے سکنڈ جج نے دو مہینہ کے لئے رخصت چاہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو سکنڈ جج (منصرم ناظم) مقرر کردوں۔ حافظ صاحب تو اپنے ہی آدمی ہیں وہ تو میری رائے سے اتفاق کرلینگے۔ میں نے کلب میں دیکھا کہ یسین خاں بہت اچھی طرح ملتے ہیں اور مولوی نظام الدین حسن بھی آپ کے دوست ہو گئے ہیں۔ آپ کو تو انہوں نے ڈنر کی دعوت بھی دی۔ مجھکو تو مرد آدمی نے ایک پیالی چائے بھی کبھی نہیں پلائی۔

(نوٹ:۔ کلب میں میرے منتقل ہونے کے دوسرے دن مولوی نظام الدین حسن مرحوم نے مجھے ڈنر کی دعوت اپنے بنگلہ میں دی تھی۔ اس وقت وہ باغ عامہ کے متصل اس بنگلہ میں رہتے تھے جس میں مسٹر یزدانی رہتے ہیں۔ اس ڈنر میں مولوی نظام الدین حسن مرحوم نے اور میرے سوا دو آدمی اور تھے۔ ایک ان کے فرزند ڈاکٹر ناظر یار جنگ جو اب ہائی کورٹ کے جج ہیں اس زمانہ میں وہ علیگڈھ کالج میں پڑھتے تھے اور چھٹیوں میں حیدر آباد آئے ہوئے تھے۔ دوسرے صاحب یاد نہیں کون تھے) یہ دونوں جج کوئی عذر نہ کریں گے۔ بخشی رگھوناتھ پرشاد بھی میرے کہنے کو مان لیں گے۔ رہے مولوی افضل حسین وہ مجھ سے ذرا کشیدہ ہیں کیونکہ مجلس کا

جائزہ ان سے میں نے لیا اور وہ اس خدمت پر خود منتقل ہونا چاہتے تھے۔ گر مشبت یزدی یہی تھی کہ میں سینکڑوں میل کے فاصلہ سے اگران پر مسلط ہو جاؤں مضایقہ نہیں۔ صرف ایک جج کے اختلاف سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ یہہ تو کہئے کہ آپ مولوی افضل حسین کے پاس جاکر کال کر آئے۔ بخشی جی اور تیلین خاں کے ہاں بھی کال کیا یا نہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے ان میں سے کسی کے ہاں بھی کال نہیں کیا۔ میرا یہہ بھی خیال تھا کہ ہائی کورٹ میں جیسا کلکتہ کا قاعدہ ہے ہر ایک جج کے ہاں جاکر کال کروں (یعنی ملوں) اور اب تک میں انرول نہیں ہوا ہوں اس لئے کسی کے ہاں گیا ہی نہیں۔ ساتھ ہی اس کے یہہ بھی کہا کہ میں آپ کا بدل شکرگزار ہوں کہ آپ میری بھلائی کے خیال سے بیرون بلدہ کی سکنڈ ججی پر میرا تقرر کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر میں ملازمت کے لئے تیار نہیں ہوں ورنہ میں کبھی کا ڈپوٹی کلکٹر ہو گیا ہوتا۔ اس کے بعد میں نے سر چارلس الیٹ سابق لفٹنٹ گورنر جو مجھے اس خدمت پر مامور کرنا چاہتے تھے اس کا ذکر کیا خاں صاحب بولے آپ نے غلطی کی۔ وکالت کرنی اور اس میں کامیابی حاصل کرنی منہ کا نوالہ نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں خود وکیل ہوں اور میرا بھائی بیارسٹر ہے۔ آپ کو میں یقین دلاتا ہوں کہ جہاں یہہ پیشہ نہایت معزز اور ممتاز ہے وہاں اس میں لوہے کے چنے چبانے ہوتے ہیں۔ آپ میری بات مانئے اس خدمت کو قبول کر لیجئے۔ پردیس کا واسطہ ہے نہ معلوم وکالت چلے یا نہ چلے۔ یا کیا صورت پیش آئے۔ اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔ گو سردست آپ کا دو مہینے کے لئے منصرمانہ تقرر ہوگا مگر آیندہ آپ کے لئے ملازمت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہاں کیا اور برٹش انڈیا کیا۔ ملازمت بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائیگا اس میں اور سختی ہوتی جائیگی۔ اس وقت کی اس منصرمی سے آیندہ آپ کو ملازمت پانیکا استحقاق ہو جائیگا۔ اور پایہ بڑھ ہی جائے گا۔ آپ مطلق پس و پیش نہ کیجئے۔ مجھ بڈھے کا کہا مانئے۔ اگر آپ آیندہ ملازمت کرنا چاہیں تو بھی یہہ کیا کم فائدہ ہوگا کہ آپ کو یہاں کے قانون سے آگاہی ہو جائے گی۔ گو برٹش انڈیا کے قوانین سے یہاں کے قوانین ماخوذ ہیں۔ مگر جب بھی بہت فرق ہے۔ یہاں کے طریقہ کار و ضابطہ سے واقفیت ہو جائیگی۔ فریقین کے وکلاء جو بحث کرینگے اور قوانین پیش کریں گے اُن سے آپ کی معلومات قانونی میں بڑا اضافہ ہوگا۔ بہت سے وکیلوں سے ملاقات ہو جائیگی۔"

میں خاں صاحب کے ہمدردانہ پند و نصائح چپکا سنا کیا اور اپنے حالات پر غور کرتا رہا۔ سب کچھ مگر میں نے یہہ جواب دیا جو میرے لئے آپ بہتر سمجھتے ہیں وہ کیجئے۔ میں نے اپنی جگہ پر

یہہ خیال کیا کہ ملازمت مستقل آیندہ اگر نہ ملے تو وکالت کرنے میں خان صاحب سے مدد ملے گی۔ اگر میں اس وقت ان کا کہنا مان لوں گا ورنہ ناراض ہو جائینگے اور ایک نئے بیارسٹر کے لیے چیف جسٹس اور ججوں کی مہربانی بڑی چیز ہے۔ اس گفتگو کے دوسرے دن خان صاحب نے میرا منصرمانہ تقرر بیرون بلدہ کی عدالت پر کر دیا۔ یہہ میری خوش قسمتی ہے کہ کل ججوں نے میرے لیے بہت اچھی رائیں لکھیں۔ یٰسین خان مرحوم نے ایک صفحہ سے زیادہ میری تعریف لکھی اور یہہ لکھا کہ ایسے لوگوں کے تقرر سے صیغہ عدالت کو زینت ہوتی ہے۔ مولوی سید افضل حسین صاحب مرحوم نے بھی اتفاق کیا۔ گو صرف دو سطریں لکھیں مگر بہت جامع۔ مجھ کو وہ مثل خدا بخش خان صاحب نے اپنے چیمبر میں دکھائی اور کہا کہ آپ پڑھ لیجئے۔ وہ مثل عدالت العالیہ کے محافظ خانہ میں موجود ہوگی۔ یہہ بھی خان صاحب نے کہا۔ ابتک ایسی زبردست سفارش کسی کیلئے ہائی کورٹ نے نہیں کی۔ محکمۂ سرکار کو اب کیا عذر ہو سکتا ہے۔ بامید منظوری ہم لوگوں نے آپکا تقرر کیا ہے۔ آج ہی آپ کو مراسلہ تقرر کا مل جائیگا۔ آپ کل جائزہ اپنی خدمت کا لیکر بسم اللہ کہکر کام شروع کیجئے۔ مجھے امید ہے کہ اپنے کام سے آپ ہائی کورٹ کو اور پبلک کو خوش کریں گے اور جو توقعات آپ سے کیگئی ہیں وہ پوری ہونگی۔ حافظ صاحب نے یہہ کہا کہ بروز جمعہ آیندہ سب ججوں کے گھروں پر جاکر شکریہ ادا کیجئے۔ میں نے کہا وہ تو میرا فرض ہے۔ پھر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چیمبر کے باہر آیا۔ مگر اس دن مراسلہ نہ ملا تو دوسرے دن میں ہائی کورٹ گیا اور برآمدہ میں ٹہل رہا تھا۔ کمرہ جس میں رجسٹرار ہائی کورٹ کا اجلاس تھا سامنے تھا۔ بادشاہ حسین مرحوم سابق رجسٹرار نے مجھے دیکھہ لیا اور چپراسی بھیجکر مجھکو بلوایا اور مراسلہ جو تیار میز پر رکھا تھا مجھکو دیکر کہا۔ لیجئے مبارک ہو۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بادشاہ حسن صاحب نے کہا یہہ مراسلہ کل ہی تیار ہو گیا تھا مگر صیغہ کی غلطی سے یا کاہلی سے آپ کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ آج دفتر آتے ہی میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نہیں گیا ہے۔ میں اہلکار پر خفا ہوا اور وہ مراسلہ اپنے پاس منگوا لیا اور ابھی چپراسی کو دینے والا تھا کہ نظام کلب میں آپ کو دے کر اتنے میں آپ مجھے نظر آ گئے۔ آپ اس وقت عدالت بیرون بلدہ تشریف لیجائیے۔ اور مولوی سید احمد صاحب سے جائزہ لیجئے۔ ان کے نام کا مراسلہ ابھی سوار کے ذریعہ سے بھیجتا ہوں۔ آپ کو بیرون بلدہ کی کچہری معلوم ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں تو۔ انہوں نے پتہ بتلا یا۔ میں یہہ خط مستقیم لیکر بیرون بلدہ کی کچہری گیا۔ میں نے صاحب موصوف سے جائزہ لیا۔ بیرون بلدہ کی کچہری اس مکان میں تھی جس میں کسی زمانہ میں

روز اینڈ کمپنی دوا فروشوں کی دوکان تھی۔ اور ایک عرصہ دراز تک اس میں نظامیہ ہوٹل اور رسٹران Restaurant تھا اور وہیں سے یہ ہوٹل میرے مکان موسوم بہ ہمایوں منزل محاذی صدر ڈاک خانہ انگریزی میں ۱۹۳۳ء کے اوائل میں منتقل ہوا۔ المختصر میں نے دو مہینے سکنڈ ججی کی خدمت انجام دی۔ اس عرصہ مدت میں میرے منصرمانہ تقرر کی کارروائی ہائیکورٹ سے محکمۂ سرکار میں بذریعہ ہوم سکرٹری گئی اور سرکار والا تبار نواب وقارالامراء (بعد کو سر کے سی۔ ای۔ ائی) وزیر اعظم وقت نے بمشورہ ہوم سکرٹری ہرمزجی وکیل سابق سولیسٹر بمبئی (بعد کو ہرمز جنگ) نے کارروائی کا یوں خاتمہ کیا کہ ہائی کورٹ نے بامید منظوری سرکار جو میرا تقرر کیا تھا اس کو نامنظور کیا اور ان الفاظ میں نامنظور کیا کہ صیغہ عدالت میں کام کرنے والے ملکی لوگ موجود ہیں اس لئے ترجیح کسی ملکی کو دینی چاہئے اور مسٹر ہمایوں مرزا بیارسٹر کو کوئی ایسی خدمت دیجائے جس کا کوئی ملکی اہل نہ ہو۔ نہ معلوم اس سے سرکار اور ان کے مشیر کا مافی الضمیر کیا تھا۔ بظاہر مجھے سرکار کی قدر افزائی کا ممنون ہونا چاہئے کہ سرو تجار کی نظروں میں ایک غیر معمولی قابلیت کا آدمی ٹہیرا اور ایک سال ایسی نایاب خدمت کی انجام دہی کی اہلیت رکھنے والا قرار پایا جس کو کوئی ملکی خواہ کیسا ہی ہوشیار و قابل تجربہ کار ہو مگر میرے مقابل میں نااہل تھا اور ساتھ ہی اس کے اس قسم کی خدمت کا اس وقت وجود بھی نہ ہوگا ورنہ میرا تقرر اس پر کردیا جاتا غالباً اس کی تخلیق پیش نظر ہوگی۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی ٹکنیکل خدمت ہو۔ عام اس سے کہ میں قانون کی تعلیم پایا ہوا اس ٹکنیکل کام سے واقف بھی نہ ہوتا لیکن تقرر کردیا جاتا۔ بشرطیکہ ہوم سکرٹری صاحب کی نظر عنایت مجھ پر ہوتی جو یہاں اکثر ہوا کرتا تھا کہ بلا لحاظ اہلیت و قابلیت مخصوصہ اثرات و رعایت کا بول بالا خوش نصیبوں کو نوکریاں ملجاتی تھیں تعلیم کس فن کی کس نے پائی۔ اور خدمت وہ دیگئی جس کا اس سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ مثلاً مرزا محمد علی خاں مرحوم جو صیغہ مال میں صوبیدار تک ہوکر وظیفہ یاب ہوئے۔ انہوں نے اس حیدرآباد کے انجینئرنگ سکول میں تعلیم پائی تھی۔ آغا شیخ محمد شیرازی مرحوم نے بھی یہیں کے انجینئرنگ اسکول میں تعلیم پائی تھی مگر صیغہ مال میں رہے۔ اور اول تعلقدار ہوکر وفات پائی۔ مرزا مہدی خاں کوکب اور سید علی صاحب بلگرامی مرحوم معدنیات کی تعلیم حاصل کرنے منجانب ریاست انگلستان بھیجے گئے تھے۔ مگر ان دونوں سے معدنیات کا کام نہیں لیا گیا صیغہ مال وغیرہ میں کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر حفیظ الدین (بعد کو اقتدار یار جنگ) جو جالنہ وغیرہ

میں اسسٹنٹ سرجن تھے۔ ایک با اقتدار خاندان میں شادی ہوئی تو محکمۂ کروڑگیری (چنگی) میں ایک اعلیٰ خدمت پر منتقل کر دیئے گئے۔ مولوی سید مرتضیٰ فلسفی کیلئے محکمہ علوم و فنون قائم ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد مولوی شبلی نعمانی کو کوئی خدمت دینی تھی تو فلسفی مرحوم کی جگہ مولوی شبلی کو دیگئی اور فلسفی صاحب جو قانون سے نابلد تھے۔ عدالت دیوانی و فوجداری کے ناظم بنائے گئے۔ یہ دونوں غیر ملکی تھے۔ ایسی متعدد مثالیں ہیں۔ یہ لوگ تو کسی فن کے یا علم کے ماہر و عالم بھی تھے۔ یہاں تو سینکڑوں ایسی مثالیں بھی ہیں "پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل" جنہوں نے مڈل تک کا بھی امتحان پاس نہیں کیا۔ خوشامد یا اثرات کے تحت ہزار ہزار بارہ سو کے تنخواہ یاب ہیں۔ میں چونکہ اثرات سے معرا اور فن خوشامد سے بیگانہ تھا کسی حیلہ سے جس کا سر نہ پاؤں یہ کہکر ٹالدیا گیا کہ جب کوئی خدمت غالباً بروز حشر تقرر طلب ہوگی جس کے لئے عرض و طول ممالک محروسہ سرکار عالی میں کوئی ملکی اہل نہ ہوگا اسکی اہلیت صرف مجھی میں پائی جائیگی تب میرا تقرر ہوگا۔ چونکہ دو ماہ تک میری کارروائی کشافلی میں باصطلاح حیدرآباد لرطقی میں پڑی رہی۔ اور میں کیا بلکہ ہائی کورٹ بھی اس سے ناواقف تھا۔ میں اپنے کارہائے مفوضہ کو انجام دیتا رہا۔ دو ماہ کے دوران میں آئی محرم توجہے ہوئے اور مولا کے عرس کی تعطیل بھی۔ دو دن کی اسی زمانہ میں آئی تھی اور کوئی غیر معمولی تعطیل بھی دو دن کی آئی تھی۔ اسی طرح دونوں مہینوں میں سے بارہ روز نکال دیئے جائیں تو ایک ماہ اٹھارہ دن میں نے کام کیا تخمیناً تیس مقدمات میں نے فیصل کئے ان میں سے صرف چار مقدمات کا مرافعہ عدالت العالیہ میں کیا گیا۔ جن میں سے دو بحال اور دو مسترد ہوئے۔ باوجودیکہ میں یہاں کے قوانین سے زیادہ واقف نہیں ہوا تھا تاہم میں فیصلے ایسے مدلل لکھتا تھا کہ موجبات و عذرات مرافعہ کی گنجایش نہیں رہتی تھی۔ میں نے اس کچہری میں کئی چیزوں کا اضافہ کیا اور کئی قاعدے جاری کئے تھے۔ نوٹس بورڈ نہ تھا وہ بنوایا اور وقتاً فوقتاً جو آرڈر میں لکھتا اس کے لئے ...... بنوائی اور بعض احکام کی نقلیں نوٹس بورڈ میں بغرض اطلاع عام چسپاں کرواتا۔ انسپکشن بک (کتاب الرائے) نہ تھی وہ بنوائی اور کیا کیا کام کئے جن کی تفصیل مجھے اس وقت یاد نہیں ہے۔ مجھے فوجداری کا بھی کچھ اختیار تھا۔ بیرون بلدہ کی صفائی کا محکمہ بھی اس زمانہ میں علیحدہ تھا۔ بعد کو جس طرح بیرون بلدہ کی عدالت سٹی سول کورٹ میں ضم کیا گیا۔ اسی زمانہ میں بیرون بلدہ کے صفائی کے چالانی مقدمات

میرے اجلاس پر پیش ہوتے اور سرسری مقدمات Summary Trial کے ذریعہ ان کا فیصلہ کرتا۔ میں ٹھیک نو بجے کچہری میں پہونچتا اور متفرق درخواستیں جو پیش ہوتی جاتیں اون کا تصفیہ بروقت کرتا جاتا۔ دس بجے تک اس سے فارغ ہوکر صفائی کے چالانی مقدمات کا تصفیہ گیارہ تک کرتا۔ اس کے بعد نمبری مقدمات شروع کرتا اور ایک بجے نصف گھنٹہ کے لئے اجلاس برخواست کرتا جیسا کہ برٹش انڈیا کا قاعدہ ہے۔ میں صبح کو چھوٹی حاضری کھاکر آیا کرتا۔ ایک سے ڈیڑھ تک میں لنچ کھاتا جو میرا لوائے میرے مسکن سے لاتا اور وکلا کو بھی تھوڑی فرصت ملتی۔ کہ وہ تازہ دم ہو جائیں۔ میرے اجلاس پر کام کرنے والے وکلا میں جہاں تک میری نظر دوڑتی ہے۔ اب کوئی باقی نہیں ہے۔ الا مولوی مصاحب علی صاحب (حال مصاحب جنگ رکن عدالت العالیہ) یہہ اس زمانہ میں سردار یار جنگ کے ملازم تھے اور بازار سدی عنبر میں مرزا شہسوار بیگ سردار یار جنگ مرحوم کے مکانات اور ملگیاں وغیرہ تھیں جو شہسوار بیگ کا احاطہ کہلاتا تھا اب وہ آرائش بلدہ میں آکر منہدم ہوگیا۔ غرض جب یہہ احاطہ موجود تھا سڑک کے کنارے دو منزلے مکانات تھے جن پر حسن فروشان بازاری رہتی تھیں اور نیچے ملگیات میں پیشہ ورلوگوں کی دوکانیں تھیں۔ ایک پھاٹک اندر داخل ہونیکے لئے تھا۔ اندر بھی چھوٹے چھوٹے سفال پوش مکانات تھے جو لوگ ان میں بستے رہتے اور نادہندگی کی وجہ سے کرایہ باقی رکھتے۔ وصول کرایہ کے دعوے میرے اجلاس پر ہوتے اور مولوی مصاحب علی صاحب پیروی کرتے۔ شہسوار جنگ مرحوم کے ایک بھائی مرزا سردار بیگ تھے جن کا مزار ایک بڑے گنبد کے اندر بھوئی گوڑہ میں ہے وہ پیری مریدی کرتے تھے۔ ان کے نام کی مناسبت سے سردار یار جنگ خطاب ان کے بھتیجے کو ملا۔ سوا مولوی مصاحب علی صاحب کے اور کوئی وکیل نظر نہیں آیا۔ میرے اجلاس پر کام کرنے والوں میں مولوی غیاث الدین مرحوم۔ مولوی غلام محی الدین مرحوم۔ مولوی کمال الدین مرحوم۔ مہتاب علی خاں مرحوم (دہلوی) محمد ابراہیم پانی پتی مرحوم وغیرہم مرحوم تھے۔ یہہ سب وکلاء درجہ اول تھے۔ ان سب کا فیصلہ موت کے ہاتھوں ہوگیا۔ حیدرآباد سے عدم آباد بھیجے گئے۔ دو مہینے جو میں برسرکر رہا۔ بخشی رگھوناتہہ پرشاد صاحب آنجہانی سابق رکن ہائی کورٹ ایک دفعہ معائنہ کیلئے آئے تھے اور کتاب الرائے میں میرے کام کی بڑی تعریف لکھی کہ اتنے قلیل عرصہ میں اتنے فیصلے اور اس قدر اچھا کام جب سے یہہ عدالت قائم ہے کسی نے نہیں کیا مجھے صلہ کیا ملا وہ تو اوپر لکھہ چکا ہوں۔ ہائی کورٹ کی رائے نامنظور ہوگئی اور میں معہ بوریا بدنا ہٹا دیا گیا۔ اس وقت کے

دو انگریزی بڑے اخباروں نے ایک تو دی دکن پوسٹ جس کے مسٹر مترا مالک و ایڈیٹر تھے اور بمبئی سے نکالا کرتا تھا اور دوسرا دی یو و ینگ میل جس کے ایڈیٹر و مالک ایک مسٹر آئنگار تھے۔ ہرمزجی وکیل کی خوب خبر لی اور در پردہ سرو قار کی بھی ماحصل و مفہوم یہ تھا کہ ہائی کورٹ نے ایک ہونہار کمسن بیارسٹر مسٹر ہمایوں مرزا کی شان و قابلیت کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ محکمہ سرکار کو فوراً منظوری دینی چاہئے تھی۔ یہاں کا ہائی کورٹ ایک جزو معطل ہے یو ر ینگ میل نے یہہ بھی لکھہ مارا تھا کہ ہرمزجی وکیل ایک سولیسٹر ہے۔ بیارسٹروں کی بریف بنانیوالا ہے۔ اور مسٹر ہمایوں مرزا بیارسٹر ہیں۔ ان کو اس حیلہ سے الگ کیا کہ یہہ غیر ملکی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ مسٹر ہرمزجی کہاں کے بڑے ملکی ہیں۔ ملکی تو بن چکے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر کسی اچھی صبح کو لوگ مسٹر ہرمزجی کو چمکدار عینک لگائے ہوئے ہاتھوں میں داستانے پہنے مکہ مسجد کے دروازے پر گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھیں کہ ہرمزجی صاحب مسلمان ہونے کیلئے مسجد میں داخل ہو رہے ہیں۔ مسٹر بیلین خاں مرحوم سابق رکن ہائی کورٹ بڑے کلے جبڑے کے آدمی تھے۔ ہائیکورٹ کی رائے جب نامنظور ہوئی تو یہہ سرو قار الامراء کے ہاں گئے اور اتفاق سے ہرمزجی وہاں میں بیٹھے تھے۔ مسٹر بیلین خاں نے سرو قار سے کہا کہ اب ہائی کورٹ بیکار ہے۔ اس کی ہتک اور توہین کی انتہا نہ رہی۔ اور ہرمزجی سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کہاں کے بڑے ملکی ہیں جو اتنی بڑی خدمت پر مامور ہیں۔ بمشکل کی بات ہے کہ نواب کمال خاں آپ کو بمبئی سے اپنا خانگی ملازم بنا کر لائے تھے۔ آپ کی خوش قسمتی ہے۔ سرکار (سرو قار) آپ پر مہربان ہو گئے۔ اس ملاقات اور گفتگو کا اعادہ خود مسٹر بیلین خاں مرحوم نے مجھہ سے کیا تھا۔ میرے تقرر کی نامنظوری سے وہ بہت متاثر تھے۔ سید علی صاحب بلگرامی کو بھی ہرمزجی کی یہہ کارروائی بہت شاق گزری اور مجھہ سے کہا کہ ہماری گورنمنٹ بھی عجب گورنمنٹ ہے۔ اس کو چاہئے تھا کہ چیف کرا اور کو کر آپ کی خدمت خریدلیتی۔ افسوس اس وقت ہوم سکرٹری نہوا۔ یہہ ساری گفتگو سید علیصاحب نے انگریزی میں کی تھی۔ جس کا میں نے ترجمہ لکھا۔ ہرمزجی نے جو مخالفت کی اس کا سبب بعد کو مجھے معلوم ہوا۔ اور وہ یہہ تھا کہ خدا بخش خاں مرحوم نے مجھے ہرمزجی سے جب ملایا تو یہہ کہا تھا "یہہ میرے عزیز ہیں" یہہ جملہ ان کا اخلاقاً اور احترام کا تھا نہ یہہ کہ میں ان کا حقیقت میں عزیز تھا۔ وہ پٹھان میں ایک مظلوم سید۔ چونکہ خدا بخش خاں مرحوم نواب بشیر الملک کے بلائے ہوئے آئے تھے اور انہیں کی مدد سے چیف جسٹس ہوے تھے اور نواب سرو الملک سے

ہرمزجی کو بلا وجہ عناد تھا۔ واقعہ یہہ ہے کہ ہرمزجی کو جب کمال خاں بمبئی سے لائے تو سر وقارالامرا نے اپنی خانگی ملازمت میں رکھ لیا تھا۔ سر وقار جو اسوقت معین المہام تھے کوشش کرکے ہرمزجی کو پہلے مشیر قانونی سرکار عالی مقرر کرادیا جبکہ سر وقار وزیر اعظم ہوگئے تو ان کی یہہ خواہش ہوئی کہ ہرمزجی ہوم سکریٹری ۔ چنانچہ سر وقار الامرار مرحوم نے نواب سرورالملک سے کہکر ہوم سکریٹری بنایا تھا۔ اونہوں نے اپنا مطلب پورا کرنے کے لئے نواب سر وقار کو نواب سرورالملک سے لڑایا جس کی وجہ سے ہرمزجی اور سرورالملک میں باہم کشیدگی پیدا ہوگئی تھی ۔ ہرمزجی کو یہہ گوارا نہ تھا کہ سرورالملک کا کوئی متوسل بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی خدمت پر رہے ۔ بایں وجہ مجھہ سے ناحق و ناروا بھی مخالفت کی تھی ۔ مجھہ سے اس کی جو کچھہ عداوت . . . . . . وہ بغض نکالا . . . ہیں . . . غیر ملکی تھا کہ اتنک اس ملک میں ہوں اور ہرمزجی اس واقعہ کے چند دنوں کے بعد حضرت غفران مکان کے حکم سے شہر بدر کیے گئے ۔ بہرحال جب بھی ملازمت سے علیحدہ ہوا تو جہاں میرے بعض شناساؤں کو رنج ہوا بعض کو خوشی بھی ہوئی ۔ وہ اس لئے کہ جس خدمت پر میرا تقرر کیا گیا تھا اس کو میری قابلیت وغیرہ کے لحاظ سے کم تر سمجھتے تھے ۔ چنانچہ ڈاکٹر اگھور ناتھ آنجہانی نے جو مجھے بہت اچھا سمجھتے تھے مجھہ سے کہا کہ آپ کو خوش ہونا چاہئے ۔ کیوں کہ ملازمت کے تنگ دائرہ میں رہکر آپ زیادہ ترقی نہیں کرسکتے ۔ انگریزی میں یہہ جملہ بھی کہا ۔

اٹ ایز اے بلسنگ انڈر ڈسگیز (It is a blessing under disguise.)

یعنی فضل خدا بھیس بدلے ہوئے ہے ۔ حقیقت حال بھی یہ تھی کہ پروردگار عالم خالق موجودات اپنے بندوں کے لئے جو کچھہ کرتا ہے وہ بھلائی کے لئے اور مناسب حال کرتا ہے ۔ میں نے اس کا اچھی طرح اندازہ کیا کہ میں ملازمت و محکومیت کیلئے پیدا نہیں کیا گیا ۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند ۔ اسی وجہ سے جب سر جارج الیٹ سابق لفٹننٹ بنگالہ مجھکو ڈپٹی کلکٹری کی خدمت دینے پر آمادہ تھے تو اون کی پیش کش میں نے قبول نہیں کی ۔ اب پیشہ وکالت میرے لئے ناگزیر تھا ۔ حافظ صاحب و خدابخش خاں صاحب وغیرہ نے مجھہ سے کہا تھا کہ آپ کے لئے مناسب یہہ ہے کہ ہائی کورٹ میں انرول ہوں ۔ چنانچہ پانچسو روپیہ عدالت العالیہ میں داخل کرکے میں انرول ہوگیا ۔ حیدرآباد میں میرے آنے کے بہت قبل سے لکھنو کے ایک صاحب میر لطف علی مرحوم وکالت کرتے تھے ان کے خسر حکیم سید مہدی صاحب نے گو لکھنو کے تھے

مگر صوبہ بہار شہر گیا۔ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور اب بھی ان کا خاندان گیا ہی میں ہے۔
حکیم سید مہدی صاحب کے ایک فرزند کی شادی پٹنہ میں ہوئی تھی اور میر لطف علی صاحب مرحوم
بھی اپنے برادر نسبتی کی شادی میں پٹنہ گئے تھے۔ اور اس شادی میں ان سے ملاقات ہوئی
تھی۔ یہہ واقعہ اس سال کا ہے جب کہ میں انگلستان بغرض تعلیم جارہا تھا۔ بہرحال جب میں
حیدرآباد آیا تو ان سے ملا اور یہہ میرے ساتھ خلوص ملنے لگے اور تادم زیست اس طرح ملا
کئے۔ میری سکونت اسوقت تک نظام کلب میں تھی میں نے میر صاحب سے کہا کہ میرے لئے کوئی
مکان تلاش کیجئے جو آپ کے مکان کے متصل ہو جبتک میں نظام کلب میں رہوں۔ علاوہ اس کے
ہائی کورٹ اور دیگر کچہریوں سے یہہ مقام بہت فاصلہ پر ہے۔ وکالت کرنے کا جب قصد کر لیا
ہے تو سکونت ایسی جگہ ہونی چاہیے جو کچہریوں سے نزدیک ہو۔ اہل مقدمات کو میرے ہاں
آنے میں سہولت ہو۔ چنانچہ میر لطف علی صاحب مرحوم نے اپنے مکان کے سامنے ایک مختصر سا بنگلہ
ماہانہ پچاس روپیہ کرایہ کا میرے لئے ٹہرایا۔ وہ مختصر بنگلہ اب تک ہے لیکن میر صاحب
جس مکان میں اوس زمانہ میں رہتے تھے وہ محکمہ آرائش بلدہ نے خرید لیا اور اب وہاں سنگ بست
مارکٹ بن رہا ہے۔ اس مقام کا نام مالاکنٹہ ہے۔ میرا بنگلہ سفار خاں سوداگر اسپاں کے طویلہ کے
برابر تھا اور اب وہ بنگلہ بھی اسی جگہ ہے۔ ہنوز میں اس مکان میں منتقل نہیں ہوا تھا اور کلب
ہی میں مقیم تھا کہ ایک دن نواب اقبال یار جنگ مرحوم آئے جن سے میری ملاقات حافظ سید محمد رضا
خاں سکندر نواز جنگ مرحوم نے کرادی تھی۔ جب کہ انہوں نے مجھے بریکفاسٹ کی دعوت دی تھی
ادہر اوہر کی باتیں کرنے کے بعد مجھ سے بولے کہ اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔ ان کو میری علیحدگی
صیغہ ملازمت کی خبر معلوم ہو چکی تھی۔ میں نے کہا انشاء اللہ بیرسٹری کروں گا۔ نواب
اقبال یار جنگ مرحوم بولے کہ ایک مقدمہ کی مثل میں آپ کے پاس کل بھیجونگا آپ اس کو دیکھہ
جائیے اور اپنی رائے دیجئے کہ کس فریق کی جانب مقدمہ زوردار ہے۔ پھر بولے اگر زحمت نہو تو
اس مقدمہ کا خلاصہ لکھکر اپنی رائے لکھئے۔ ممکن ہے کہ اس مقدمہ میں آپکو وکیل مقرر کرا دوں۔ میں
نے کہا بہتر مثل بھیجدیجئے۔ جی میں آیا کہ یہہ کہوں کنسلٹنگ فیس یعنے رائے دینے کی فیس آپ
موکل سے کیا دلوائیں گے۔ مگر پھر خاموش ہو رہا۔ چنانچہ دوسرے دن اقبال یار جنگ مرحوم
مثل مقدمہ لیکر خود آئے اور دیکر بولے ذرا غور و خوض سے دیکھئے۔ اس مقدمہ میں پیچیدگیاں
بھی تھیں عرصۂ دراز سے اس کا دوران ہے مگر یکسوئی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لیکر مثل

رکھی۔ یہ مقدمہ ابتداء میں سلیمان خاں انتظام جنگ اول ان کی بیویوں میں حیدری بیگم اور وزیر بیگم میں ایک جائداد کی نسبت چلا تھا وہ جائداد ہے جس میں نظام کالج عرصہ دراز تک تھا۔ ایک پادری نے سلیمان خاں کو یہ کوٹھی دی تھی۔ وزیر بیگم کا دعویٰ تھا کہ یہ ترکہ سلیمان خاں کا ہے۔ زرمہر اس میں سے دلایا جائے اور حیدری بیگم کا دعویٰ تھا کہ ان کی مہر میں یہ جائداد ہبہ کردی گئی تھی۔ ابتدائی فیصلہ بزبان فارسی فدا حسین خاں مرحوم لکھنوی سابق چیف جسٹس حیدرآباد ہائی کورٹ کا تھا۔ مگر الفاظ فیصلے کے ایسے مبہم تھے کہ ڈگری ہی بے وقت ہو رہی تھی۔ کئی دفعہ یہ مقدمہ ترمیم و تکمیل کیلئے عدالت ابتدائی میں آتا گیا اب جوڈیشل کمیٹی میں بصیغہ نگرانی پیش تھا۔ اس وقت بائیس سال سے اس کا دوران تھا۔
جوڈیشل کمیٹی جو ممبر کہ انگلستان کے پریوی کونسل کے حیدرآباد میں ہے وہ ایک ایڈوئیسری کمیٹی ہے (advisory committee) کام مشورہ دینے کا اور منظوری یا نامنظوری کرنا رئیس وقت کے ہاتھ میں ہے۔ انگلستان کی پریوی کونسل اراکین معین ہیں۔ حیدرآباد میں اس وقت یہ ہوتا تھا کبھی کوئی ممبر بنا دیا گیا۔ کبھی کوئی بنا دیا گیا۔ اس سے بحث نہ تھی کہ عدالتی تجربہ بھی رکھتا ہو۔ معیار صرف تعداد تنخواہ۔ چونکہ ہائی کورٹ کے جلسہ کامل کی نگرانی ہوا کرتی تھی۔ اس لیے جو لوگ ممبر بنائے جاتے تھے ان کی تنخواہ ہائیکورٹ کے ججوں سے کم نہ ہونا چاہیے اور ہائی کورٹ کے اراکین کی تنخواہ پندرہ سو تھی۔ چنانچہ جوڈیشل کمیٹی اس مقدمہ کی سماعت کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے اراکین مولوی علی حسین مرحوم اس زمانہ میں وہ محکمہ فینانس کے سکرٹری تھے جن کو جوڈیشل ٹریننگ سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ دوسرے اراکین نواب اقبال یار جنگ مرحوم تھے۔ جو اس زمانہ میں کمشنر انعام تھے۔ علیٰ ہذا ان کو بھی قانون سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ تیسرے ممبر ہرسرجی وکیل اس وقت کے ہوم سکرٹری۔ ان کو بھی جوڈیشل ٹریننگ بھی نہ تھی۔ یعنے عدالت دیوانی کے کاموں کا تجربہ نہ تھا البتہ حافظ احمد رضا خاں نواب سکندر نواز جنگ مرحوم رکن ہائی کورٹ اور مولوی نظام الدین حسن مرحوم رکن عدالت العالیہ آخرالذکر دونوں اشخاص قانون دان تھے۔ کبھی ہائی کورٹ کے جج بھی۔ جوڈیشل کمیٹی میں شریک کیئے جاتے تھے۔ غرض یہ دونوں صاحبان رہبری کرنے والے تھے۔

اس مقدمہ کے فریقین میں حیدری بیگم کے ورثاء اون کے فرزندوں میں سے منجملہ جن کے ایک فرزند ڈاکٹر محمد عباس انتظام جنگ ثانی سرو قارالامراء مرحوم کے اسٹاف سرجن اور

وزیر بیگم کے ورثا کپٹن اور یس وغیرہ تھے جن کی امداد ڈاکٹر سعید الدین تفضل یاب جنگ کر رہے تھے۔ یہ اپنے تین سلیمان خاں۔ انتظام جنگ کے نواسے کہتے۔ ڈاکٹر عباس ان کے سوتیلے ماموں۔ ڈاکٹر سعید الدین کی والدہ نہ حیدری بیگم کے بطن سے اور نہ وزیر بیگم کے بطن سے تھیں۔

بہر حال ڈاکٹر عباس مرحوم سے ڈاکٹر سعید الدین کو سخت عناد تھا۔ اور اقبال یار جنگ مرحوم جو ایک رکن کمیٹی تھے اور مجھے مثل مقدمہ دی تھی وہ ڈاکٹر عباس کی پشت پناہی کرتے تھے۔ یہ واقعات مجھے بعد کو معلوم ہوئے۔ بہر حال میں نے مثل دیکھنی شروع کی۔ چونکہ بہت ضخیم تھی اور پیچیدگیاں بھی تھیں۔ میرے چار پانچ روز صرف ہوئے۔ میں نے نوٹ لکھ لئے اور اپنی رائے بھی لکھ ڈالی۔ میں نے جو رائے قائم کی تھی وہ حیدری بیگم کے ورثاء کی تائید میں تھی چار پانچ روز کے بعد نواب اقبال یار جنگ مرحوم آئے اور مجھ سے دریافت کیا کہ آیا میں نے مثل دیکھی اور اگر دیکھی تو میری کیا رائے تھی۔ میں نے اپنے سب نوٹ اُن کو پڑھ کر سنائے اور سمجھائے۔ میں نے اُن سے کہا کہ حیدری بیگم کے ورثاء کی جانب مقدمہ زور دار ہے۔ یہ ان کی منہ مانگی مراد تھی۔ میری رائے سنکر بے حد خوش ہوئے۔ مجھ سے کہا کہ کل صبح کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیے اور اپنے مکان کا پتہ بتلایا۔ یہ بھی کہا کہ صبح گیارہ بجے تک آپ جائیں چنانچہ میں بوقت معینہ ان کے ہاں گیا۔ انہوں نے مغلئی دعوت دی تھی۔ سب کھانے مغلئی تھے۔ چند احباب کو بھی بلایا تھا۔ اعظم علی خاں فرخ نگری نواب عزیز جنگ مرحوم ڈاکٹر رگھوناتھ آنجہانی اور ڈاکٹر عباس انتظام جنگ ثانی۔ یوں تو کل حاضرین سے میری تعریف کی۔ لیکن ڈاکٹر عباس مرحوم سے خصوصاً میری ذہانت وغیرہ کی بڑی تعریف کی جب سب لوگ جانے لگے تو میں بھی رخصت ہونے لگا تو نواب اقبال یار جنگ مرحوم نے مجھ سے کہا آپ ذرہ توقف کریں۔ اس طرح ڈاکٹر عباس صاحب سے کہا۔ جب ہم اور ڈاکٹر عباس مرحوم رہ گئے تو اون سے کہا کہ آپ اپنے مقدمہ میں ان کو بھی کر لیجئے اور کہا کہ آپ کا فریق ثانی نارٹن کو کرنے والا ہے۔ اور آپ کے دونوں وکلاء میر قمر الدین اور محمد ابراہیم فاروقی انگریزی سے لابلد ہیں (یہ دونوں وکلاء بعد دیگر حیدرآباد ہائیکورٹ کے جج بھی ہوئے تھے) ایک تو اقبال یار جنگ مرحوم سے اور ڈاکٹر عباس مرحوم سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ دونوں سرو قار الامراء کے خاص لوگوں میں تھے۔ ڈاکٹر عباس اقبال یار جنگ مرحوم کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ عمر کے لحاظ سے بھی اقبال یار جنگ بہت بڑے تھے

مجھے

اور جوڈیشل کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ پھر ڈاکٹر عباس ان کا کہنا کیونکر نہ مانتے۔ انہوں نے فوراً کانسل بقرار داد فی پیشی دو سو روپیہ پر کرلیا۔

پہلا مقدمہ

حیدرآباد میں یہہ میرا پہلا مقدمہ تھا۔ دو پیشیوں پر کوئی کارروائی اس لئے نہیں ہوئی کہ بعض اراکین دوسرے کاموں میں مشغول ہونیکی وجہ سے کمیٹی میں شریک نہ ہو سکے۔ اور پیشیاں بدلنے لگیں۔ مگر مجھکو میری فیس ملگئی۔ تیسری اور چوتھی پیشی پر مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ میرے موکل کی جانب سے میں اور دونوں مذکور الصدر وکلاء تھے......

میر قمرالدین مرحوم اور محمدؐ ابراہیم فاروقی (بعد فاروق یار جنگ) فریق ثانی کی طرف سے مسٹر نارٹن اور نصف درجن وکلاء تھے۔ منجملہ جن کے حافظ سراج الدین مرحوم راما چاری آنجہانی مسٹر معین الدین کے نام یاد ہیں۔ باقی تین کے نام بھول گیا۔ جو چھ وکلاء فریق ثانی کے تھے۔ ان میں صرف معین الدین کچھ انگریزی جانتے تھے۔ مسٹر نارٹن کی بحث کا یہہ ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ پانچ جو اراکین کمیٹی تھے ان میں سے مولوی علی حسن مرحوم۔ مولوی نظام الدین مرحوم اور مسٹر ہرمزجی کپیل انگریزی داں تھے۔ بقیہ دو حضرات نواب سکندر نواز جنگ مرحوم اور نواب اقبال یار جنگ مرحوم انگریزی سے لابلد تھے۔ مسٹر نارٹن کی بحث جو انگریزی میں ہوتی تھی اس کا ترجمہ مسٹر معین الدین کر رہے تھے۔ لیکن اصل اور ترجمہ میں فرق ہوتا تھا۔ وہ بھی جھٹ ترجمہ کرنا کارے دارد۔ مگر معین الدین مرحوم کو اس کی مشق ہوگئی تھی۔ اس لئے ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ میرے لئے وقت طلب یہہ امر تھا کہ اردو میں جو سرکاری اور دفتری زبان ہے مجھے بحث کرنی پڑی۔ پہلے میں نے کبھی اردو میں بحث کی نہ تھی۔ علاوہ ازیں گو مسٹر معین الدین میری بحث کا ماحصل و خلاصہ مسٹر نارٹن کو سمجھاتے جاتے تھے مگر میں جہاں ضرورت دیکھتا یہہ بھی کہتا کہ مسٹر معین الدین نے میری بحث کے کس حصہ کا صحیح ترجمہ نہیں کیا ہے تو مسٹر نارٹن کی تفہیم کے لئے انگریزی ترجمہ اپنی بحث کے اسی حصہ کا کر دیتا۔ دو پیشیوں پر مقدمہ کی سماعت ختم ہوئی۔ اور شکر خدا ہے کہ اراکین نے اپنی رائے میرے موکل کے حق میں لکھی اور مثل نواب غفران مکان کی منظوری کے لئے پیشی خداوندی میں بھیجدی۔ قاعدہ یہہ ہے کہ جو رائے جوڈیشل کمیٹی کے اراکین لکھتے ہیں وہ اس وقت تک ظاہر و شائع نہیں کی جاتی تھی۔ تا وقتیکہ پیشی خداوندی سے مثل واپس آئے۔ میرے مقدمہ میں نواب اقبال یار جنگ مرحوم یکے از اراکین ڈاکٹر عباس انتظام جنگ مرحوم کے بزرگ و مربی تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر عباس مرحوم سے پوشیدہ طور سے کل ممبروں کی رائے کا خلاصہ

لکھدیا تھا اور انہوں نے مجھ سے میری تشفی کے لئے کہکر مجھکو مبارکباد دی کہ میری بحث موثر ہوئی مگر سوا چار پیشیوں کی فیس کے کوئی چیز بطریق شکرانہ نہ ملی۔ برٹش انڈیا میں ایسے پیچیدہ و اہم مقدمہ کی کامیابی پر موکل بیارسٹر اور وکلاء کو بہت کچھ شکرانہ دیتے ہیں۔ وہاں عام طور سے تین طرح سے روپیہ وکلاء کو ملتے ہیں۔ ایک نذرانہ مقدمہ دیتے وقت - پھر محنتانہ روزآنہ کی مقررہ فیس۔ پھر شکرانہ بعد کامیابی علاوہ مقررہ فیس کے مٹھائیاں۔ میوے۔ بعض لوگ دوشالے وغیرہ بھی وکلاء کو شکرانے میں دیتے ہیں۔ میری پہلی بحث کا جو اس مقدمہ میں کی تھی۔ وکلاء پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اور اراکین پر بھی خصوصًا حافظ صاحب مرحوم مجھ سے بہت خوش ہوئے جو بھی پیشی کے بعد جب میں ان کے گھر پر گیا۔ گو کمیٹی کی رائے کا ذکر مجھ سے نہیں کیا۔ مگر میری پیٹھ ٹھوک کر کہا۔ میں تمہاری بحث کے پوائنٹ سے اور اندازو طریقۂ بحث سے بہت محظوظ ہوا۔ خدابخش خاں صاحب سے بھی حافظ صاحب نے میری بحث کا ذکر کیا تھا۔ کیونکہ جب میں ان سے ملا تو انہوں نے بھی اظہار مسرت کرکے مجھے مسکرا کر مبارکباد دی۔ اور بولے کہ یہ بہت اچھا ہوا کہ پہلے مقدمہ میں ایسی معقول اور موثر بحث کی کہ اراکین خوش ہوگئے اور دبی زبان سے کہا کہ آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔ غالبًا حافظ صاحب نے ان سے کمیٹی کی رائے بھی ظاہر کردی ہوگی۔ اس کے بعد ایک مقدمہ اقدام قتل کا متدائرۂ اول تعلقدار میدک سیر لطف علی صاحب مرحوم نے مجھکو دیا۔ اس زمانہ میں بلکہ سر علی امام مرحوم کے زمانہ تک جوڈیشل اور اکزیکیٹو محکمے علیحدہ نہیں ہوئے تھے جس طرح برٹش انڈیا میں اب بھی کلکٹر ضلع یعنی اول تعلقدار مجسٹریٹ ضلع بھی ہوتا ہے۔ وہی عمل در آمد یہاں بھی تھا صوبہ میدک کے اول تعلقدار کا مستقر سنگاریڈی میں ہے۔ اس زمانہ میں مسٹر سہراب جی جمشید جی راجا سر فریدوں الملک کے چھوٹے بھائی اول تعلقدار میدک کے سنگاریڈی میں تھے ان کے اجلاس کا مقدمہ تھا۔ اب جو ناظم ضلع کہلاتا ہے۔ اس وقت مددگار عدالت کہلاتا تھا۔ حکیم سید علی مرحوم نے بحیثیت مددگار عدالت کسی مقدمہ میں چند ملزمین کو سزادی۔ منجملہ جن کے ایک شخص بندہ علی نامی تھا۔ اس کا باپ پولیس میں جمعدار تھا۔ جب اسکے بیٹے کو سزا سنائی گئی تو جمعدار صاحب طیش میں آئے اور سید علی صاحب پر تلوار سے حملہ آور ہوئے۔ مقدمۂ اول تعلقداری میں زیر رجوع تھا مقامی دو وکلاء منجانب ملزم پیروکار تھے۔ میں بحیثیت کونسل کے مقررہ کیا گیا۔ فضل خدا شامل حال تھا۔ میں مقدمہ میں کامیاب ہوا۔ شہادت استغاثہ جو منجانب سرکار پیش ہوئی

تھی اس کو ساقط الاعتبار میں نے بذریعہ جرح کے کردیا۔ گواہ بالکل مجروح ہوئے حقیقت یہ ہے کہ گواہ سب مصنوعی تھے۔ جس وقت سید علی صاحب پر حملہ کیا گیا۔ وہ اپنے مکان کے کسی حجرے میں تنہا تھے۔ جمعدار کو جو برہنہ تلوار کے ساتھ آتے دیکھا تو اندر جاکر دروازہ لگا لیا جمعدار بھی چل دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ اس مقدمہ کی کامیابی نے سنگاریڈی میں میری خوب گرم بازاری کی۔ تابڑتوڑ مددگاری عدالت اور اول تعلقداری کے مقدمات آنے لگے۔ اول تعلقدار اور ان کی بیوی مسٹر سہراب جی جب میں سنگاریڈی جاتا تو ڈنر کی دعوت ضرور دیتے چند دنوں کے بعد فصیح الدین فصیح جنگ مرحوم سنگاریڈی یعنی سوم تعلقداری پر گئے۔ ان سے حیدرآباد میں مجھ سے ربط ہو چکا تھا۔ اُن کے اجلاس کے بھی مقدمات ملنے لگے۔ یہاں بلدہ میں ہائی کورٹ کے مقدمات بھی ملنے لگے اور یہ لازمی امر تھا۔ خدا بخش خاں مرحوم میر مجلس وقت کے ہاں میرے مہمان رہنے کا اور نیز اس افواہ کا کہ میں خدا بخش خاں مرحوم کا داماد ہوں۔ ملک پر بڑا اثر ہوا۔ ایک اخبار شوکت الاسلام نامی حاجی کرتان نکالتے تھے۔ اس میں یہ خبر درج کیگئی تھی کہ نئے میر مجلس صاحب کے داماد ایک بیارسٹر بھی حیدرآباد آئے ہوئے ہیں۔ گو بعد کو اس کی تردید کیگئی۔ مگر تردید بہت سے لوگوں کی نظروں سے نہیں گزری ہو۔ اور پہلی دفعہ جو لکھا گیا اس کو لوگوں نے مان لیا ہوگا علاوہ اس کے حافظ سید احمد رضا خاں سکندر نواز جنگ مرحوم کی جو شفقت بزرگانہ مجھ پر تھی اور بقیہ ججوں میں سر بلند جنگ مرحوم اور یٰسین خاں مرحوم سے مجھ سے بہت گہرے روابط تھے۔ سب باتیں مل جلکر میری شہرت وکامیابی کے لئے ممد ومفید ہوئیں۔ شاید ہی کسی نئے بیارسٹر یا وکیل کے لئے ایسے اسباب مہیا ہوئے ہوں۔ ہائی کورٹ کے تقریباً ہر بڑے مقدمہ میں کسی فریق کی طرف سے میرا کونسل ہونا لازمی امر تھا۔ اس زمانہ میں ایک مقدمہ سننے خنر اپل کمیشن کے سامنے جس کے اراکین مولوی لئیق خاں مرحوم بخشی رگھوناتھ پرشاد آنجہانی اراکین عدالت العالیہ اور مولوی زماں خاں مرحوم فوجداری بلدہ کے ناظم اول تھے چل رہا تھا مختصر واقعات یہ تھے۔

بخشی عبد الغفار خاں (ڈاکٹر فیض جنگ کے منجھلے چچا) جو سر خورشید جاہ مرحوم کی پائیگاہ میں بڑی خدمت پر تھے۔ انھوں نے نواب ظفر جنگ شمس الملک خلف سر خورشید جاہ مرحوم کی جان لینے کی غرض سے چار میں اکونائٹیٹ (aconitine) یعنی بچھناک ملا کر پلانے کے

لئے ایک شاگرد پیشہ کو ہموار کیا تھا۔ مگر قبل از وقت راز کا افشا ہو گیا۔ چار کا تجربہ کیمیائی طریقہ سے کرایا گیا اور اس میں بچناک کا انو نائٹ تھا خوب بات کا بتنگڑ بنایا گیا۔ کئی وکلا مسٹر ٹیمن برگ وغیرہ منجانب شمس الملک مرحوم پیرو کار تھے۔ علاوہ سرکاری پیرو کاروں کے جن کے سرغنہ افضل نور خاں افسر خفیہ پولیس تھے جو اس زمانہ کے کوتوال اکبر جنگ اکبر الملک کے دست راست تھے۔ بڑے شد و مد سے منجانب استغاثہ پیروی ہو رہی تھی تیس سے زیادہ گواہ منجانب استغاثہ پیش ہوئے۔ بہت بڑا حصہ (circumstantial evidence) شہادت قرینہ کا تھا۔ کسی نے کہا کہ بخشی عبدالغفار خاں نے مجھ سے جادو کروایا۔ تاکہ ظفر جنگ مرحوم ہلاک ہوں۔ غرض عجیب و غریب بیانات ان گواہوں کے تھے۔ بعض بڑے معزز گواہ تھے۔ مثلاً مسٹر شاہ پور ویڈیجی چینائی جو سر خورشید جاہ کی پائیگاہ کے جلیل القدر عہدہ دار و جاگیر دار تھے۔ اور مولوی خلیل اللہ نواب ظفر جنگ مرحوم کے استاد تھے۔ یہ دونو گواہ اس بات کے تھے کہ بخشی عبدالغفار خاں کو ظفر جنگ مرحوم سے عناد تھا۔ منجانب ملزم دو وکلا مولوی سید عزیز حسن مرحوم جن کا ایک سال ہوتا ہے کہ انتقال ہوا اور مسٹر اکرجی پیرو کار تھے۔ میری شہرت ہو چکی اور ہو رہی تھی اسلئے میں کونسل منجانب ملزم مقرر کیا گیا۔ میرے ہاتھ میں جب مقدمہ آیا تو اس وقت تک منجملہ تیس بتیس گواہوں کے چھ سات گواہوں کا اظہار قلمبند ہو چکا تھا اور بخشی عبدالغفار خاں مرحوم پولیس کی حراست میں تھے۔ میں نے چند گواہوں پر جرح کر کے اُن کو مجروح کیا اور مولوی خلیل اللہ اور مسٹر اکرجی کا بوجہ معزز ہونے کے حاضری اجلاس سے مستثنیٰ کئے گئے اور بذریعہ کمیشن ان کے اظہارات سر خورشید جاہ مرحوم کی ڈیوڑھی میں قلمبند کئے گئے۔ میں نے ان دونوں پر خوب جرح کی۔ یہاں تک کہ مولوی خلیل اللہ تو بدحواس ہو گئے۔ جرح ختم ہونے کے بعد ایک سوفے پر لیٹ گئے اور ایک آدمی پنکھا جھلنے لگا۔ پانی پیتے جاتے تھے۔ میرے موکل کے کسی پیرو کار نے مجھ سے کہا کہ مولوی خلیل اللہ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ یہ نیا بیاسٹر جو آیا ہے غضب کا آدمی ہے۔ اس نے مجھے بہت پریشان کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کلکتہ ہائی کورٹ میں کام کر چکا تھا اور بڑے بڑے قابل قابل بیارسٹروں اور وکیلوں کو جرح کرتے دیکھ چکا تھا۔ جرح کرنے کا میرا طریقہ ہی اور تھا اور بہت آزادی سے اور بلا جھجک جرح کرتا تھا۔ میرے تقرر کے قبل میں ملزم کی جانب سے دو دو درخواستیں یکے بعد دیگرے کچھ کچھ وقفہ سے ملزم کو ضمانت

پر رہا کرنیکے غرض سے دیجا چکی تھیں جو نامنظور ہوی تھی۔ میں جب چند گواہوں کو مجروح کر چکا جس میں مووی خلیل اللہ اور مسٹر شاہ پورجی بھی مشمول تھے تو مجھے بہت ہمت ہوی یہہ امر ظاہر کرنے کے لئے کہ مقدمہ محض مصنوعی اور لغو ہے۔ چنانچہ میں نے ایک درخواست لکھکر پیش کی اور درخواست کی تائید میں بڑے زور وشور سے بحث کی۔ سینکڑوں آدمی میری بحث سننے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ بخشی عبدالغفار خاں اسوقت ملزموں کے بکس کٹھرے میں کھڑے تھے۔ یاس و حرمان ان کے چہرے سے مترشح تھا۔ انہوں نے بعد کو مجھ سے کہا کہ ان کو یقین نہ تھا کہ میری درخواست منظور ہوگی۔ بہرحال میری بحث سماعت کرنے کے بعد کمشنر لوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور درخواست منظور کر لی گئی۔ وہ سماں بھی دیکھنے کے لائق تھا بخشی عبدالغفار خاں کی ضمانت پر رہائی کا حکم سارے ہائی کورٹ میں آناً فاناً مشتہر ہو گیا اور بعض وکلاء نے مجھکو اور بخشی جی کو مبارک بادی۔ بخشی جی کی خوشی کا پوچھنا کیا۔ ان سے مارے خوشی کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ بقیہ گواہ جو پیش ہونے گئے ان پر بھی جرح کر کے مقدمہ کی ہڈی پسلی میں نے چور کر دی۔ اور چار ماہ کے دوران کے بعد مقدمہ خارج ہو گیا۔

اس مقدمہ کی کامیابی نے میری شہرت میں چار چاند لگا دئے۔ کوئی معمولی مقدمہ نہ تھا ایک تو فریقین معروف و مشہور خصوصاً مستغیث نواب ظفر جنگ شمس الملک جو بعد کو وزیر فوج سرکارعالی ہوئے اور اپنے والد نواب سر خورشید جاہ مرحوم کے انتقال کے بعد امیر پائیگاہ ہوئے ان کی ہستی اور نام و نشان۔ ان کا بہت بلند پایہ کا تھا۔ ان کی جانب سے بڑی کاوشوں سے اور بڑے صرفہ سے مقدمہ چلایا گیا جس میں کوتوالی بلدہ اور افسر خفیہ وغیرہ غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ ایسے استغاثہ کو ہزیمت و شکست میں نے دی۔ صرف یہی ایک مقدمہ نہیں بلکہ چند اعلیٰ ملازمین خورشید جاہی پائیگاہ کے مقدمات میں مجھے کامیابی ہوی ۔ مثلاً مسٹر رائیٹ منتظم دفتر انگریزی اور مسٹر ڈاکاسٹا جو پرائیوٹ سکرٹری نواب ظفر جنگ مرحوم کے تھے۔ جن کی تنخواہ سولہ سترہ سو تھی۔ ان دونوں کے مقابلہ میں فوجداری مقدمات میں مجھے کامیابی ہوی۔ مسٹر برایٹ کے مقدمہ میں مسٹر وار دستغیث کی طرف سے تھا۔ دونوں میں مجھے کامیابی ہوی۔ پھر خورشید جاہی پائیگاہ کے میر مجلس حافظ لطف اللہ سابق وکیل نے منور علی وکیل پر ایک مقدمہ چلایا تھا۔ اس میں میں ملزم کی جانب سے تھا اس میں بھی مجھے کامیابی ہوی اور مُنیز علی والے مقدمہ میں مجھے کامیابی ہوی۔ یہی وجہ تھی کہ نواب ظفر جنگ مرحوم مجھے پائیگاہ کی طرف سے

بقرار داد ایک ہزار ماہوار پر پریکٹس کرنے کی اجازت کیا تھا کانسل مقرر کرنے والے تھے اور اپنی پیشی کے اظہار مولوی رفیع الدین کو میرے پاس بھیجا بھی تھا کہ موت نے . . . . فرصت نہ دی ۔ مگر یہہ واقعہ چند سال بعد کا ہے ۔

غرض خدائے پاک نے مجھے ابتدائے وکالت سے کامیاب ومشہور معروف اپنے پیشہ میں کیا ۔ جہاں میری نسبت ٹھیری تھی ۔ لڑکی والوں نے دو تین ماہ کی مہلت اس لئے چاہی تھی کہ میری قابلیت وغیرہ کا اندازہ کریں اور نیز لڑکی امتحان منشی فاضل دیگر کامیاب ہو جائے لیکن "من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال"۔ لڑکی کے بڑے بھائی کی نسبت عرصہ دراز سے ان کے وطن میں کسی عزیز کی لڑکی سے ٹھری ہوئی تھی ۔ دولہن والوں کا سخت تقاضا ہوا اور ان کا سارا خاندان شادی رچانے کیلئے شمالی ہند روانہ ہوگیا ۔ اور مجھ سے کہا گیا کہ بعد انفراغ شادی وہ لوگ حیدرآباد واپس جب آجائیں گے تو میری شادی ہوگی ۔ میں انتظار میں یہاں دن گن رہا تھا ۔ مجھ سے تو یہ کہا گیا تھا مہینہ ڈیڑھ مہینے میں ان لوگوں کی واپسی حیدرآباد ہوگی ۔ مگر چھ سات ماہ انتظار میں گزرے ۔ لڑکی کے والد وہاں سخت علیل ہوئے جس کا سلسلہ عرصہ دراز تک رہا ۔ آخر زچ ہو کر میں نے نسبت توڑ دی اور آزاد ہوگیا ۔ اس دوران میں میرے وطن سے کئی خط میری طلبی کے آئے اور میں ٹال مٹول کر رہا تھا ۔ چونکہ یہاں میرا کام جم گیا تھا اور حیدرآباد کے آب و دانہ کی کشش اور یہاں خدا کو مجھ سے جو کچھ کام لینے تھے انہوں نے جکڑ بند اور پابگل کردیا اور یہیں کا ہوگیا ۔

متفرق حالات یہاں سے میں ان امور کا ذکر کروں گا جن کا تعلق میرے علمی مشاغل اور ملکی و عملی اور پبلک خدمات سے ہے اور بعض معتقدات کا اور اپنی شادی کا اور سفروں کا تذکرہ باجمال کروں گا ۔ اور بعض مشاہیر کی مہمانداری جو میں نے کی اور پارٹیاں وغیرہ میرے ہاں جو ہوئی تھیں اُن کا بھی کچھ تذکرہ کروں گا ۔ جن مکانات میں منتقل ہوتا گیا اور مخصوص اصحاب کا ذکر اور کچھ متفرق امور کا تذکرہ ۔ یہہ مجھے لکھنا ضرور ہے ورنہ احسان فراموشی ہوگی ۔

جب میں نے وکالت شروع کردی تو چار حضرات کی یعنی ۔ نواب سکندر نواز جنگ مرحوم ۔ خدا بخش خاں مرحوم اور محمد زماں خاں صاحب مرحوم اور سید علی صاحب بلگرامی مرحوم کی دلی خواہش تھی کہ میری وکالت کو فروغ ہو ۔ اول الذکر تین حضرات نے ایک صحبت میں

جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ جب وکالت کرنے کی مجھ کو رائے دی گئی تھی آپس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ تینوں حضرات میری مدد کریں گے۔ اور تینوں صاحبوں کا تعلق عدالت سے تھا ایک چیف جسٹس تھے دوسرے ہائی کورٹ کے جج اور تیسرے عدالت فوجداری بلدہ کے ناظم اول۔ چوتھے صاحب یعنی سید علی صاحب۔ گو ان کا تعلق کسی عدالتی محکمہ سے نہ تھا لیکن بہت موقر و ممتاز تھے۔ معتمد صیغہ ہائے تعمیرات عامہ ریلوے۔ خاندانی تعلقات کے لحاظ سے وہ بھی میرے معاملہ میں دلچسپی لے رہے تھے۔ چنانچہ میرے ارُدل ہونے کے ہفتہ عشرہ کے بعد انہوں نے خدا بخش خاں صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد ایک شب کو تقریباً آٹھ بجے اپنے مکان میں نواب کمال خاں (بعد کو کمال یار جنگ) کو بلوایا اور خدا بخش خان صاحب پہلے سے آچکے تھے۔ نواب کمال خاں کے آنے کا وقت ہوا تو ایک کمرہ میں یہ دونوں صاحب بیٹھے اور مجھے بھی اپنی کرسی کے برابر ایک کرسی پر بٹھایا۔ اتنے میں ایک ملازم نے کہا کہ کمال خاں نواب آئے ہیں۔

نوٹ:۔ حیدرآباد میں عموماً لفظ نواب نام کے بعد استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً عالم علیخاں نواب۔ اکرم الدین خاں نواب وغیرہ۔ جنگ اور دولہ جن کو خطاب ملتے تھے گو جنگی اور دولائی نوابی کیساتھ ملتی ہیں۔ مگر اوس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ کسی خطاب یافتہ جنگ یا دولہ۔ نواب کے لفظ کے ساتھ ذکر نہیں کیا جاتا بلکہ اس طرح پر نصرت جنگ بہادر حسام الدولہ بہادر۔ حتیٰ کہ ملکی کے خطاب یافتہ کو کوئی عموماً نواب نہیں کہتے تھے بلکہ یوں کہتے تھے۔ امین الملک بہادر۔ معین الملک بہادر۔ نواب کا لفظ مخصوص مدارالمہام وقت کے ساتھ۔ مثلاً نواب صاحب نے یہ فرمایا۔ نواب صاحب فلاں مقام پر تشریف لیگئے جس سے غرض مدارالمہام وقت اور لفظ سرکار سے بھی غرض مدارالمہام وقت سے ہوتی تھی) سید علی صاحب نے کہا کہ بلاؤ۔ باوجودیکہ نواب کمال یار جنگ بڑے دولت مند جمعدار نظم جمعیت تھے۔ آوردہ میں کئی سو سوار تھے اور تنخواہ جمعداری دو ہزار ماہانہ جاگیر کی اور مکانات وغیرہ کی آمدنی ہزاروں کی تھی۔ بمبئی میں پچیس تیس لاکھ کی جائداد موسوم بہ گرانٹ بلڈنگ اور کمال خاں بلڈنگ وغیرہ جن سے کئی ہزار ماہانہ کرایہ آتا تھا۔ یہ مشہور تھا کہ اون کے دادا بڈھن خاں کے ہاتھی نقروی زنجیروں سے باندھے جاتے تھے۔ کنگ کوٹھی جو اب ایوانات شاہی کا ایک جز ہے انہیں کی تعمیر کردہ ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ غفران مکان نے جب یہ عمارت دیکھی تو اس کی تعریف کی۔ کمال خاں مرحوم نے نذر دی یا بقیمت دی۔ اس عمارت میں

جو فرنیچر اور کراکری وغیرہ تھی، سب پر کمال خاں کا مونوگرام ک۔ کے لکھا تھا۔ بعض پرکندہ تھا۔ جب یہہ کوٹھی حضرت غفران مکان کے قبضہ میں آئی تو حروف ک۔ کے یعنی انگریزی میں Kamal Khan کمال کہاں لکھتے ہیں تو ان حروف کی کھپت کے لئے حسب تجویز سید حسین صاحب عماد الملک مرحوم عمارت کا نام کنگ کوٹھی رکھا گیا۔ مختصر یہہ کہ کمال یار جنگ مرحوم بڑے شخص تھے۔ مگر جب یہہ کمرہ میں جہاں ہم تین آدمی بیٹھے تھے داخل ہوئے تو فرش آداب بجا لائے۔ ان لوگوں نے بیٹھے بیٹھے کسی نے نہ مصافحہ کیا نہ سروقد تعظیم کی۔ سامنے ایک کرسی رکھی تھی۔ سید علی صاحب نے اشارے سے کہا بیٹھئے۔ جب وہ بیٹھ چکے تو سید علی صاحب یوں گویا ہوئے۔ کمال خاں صاحب میں آپ کو (میری طرف اشارہ کرکے) ان سے ملاتا ہوں یہہ لائق و قابل بیارسٹر ہیں۔ کلکتہ ہائی کورٹ کی وکالت کا بھی تجربہ رکھتے ہیں۔ ہم لوگوں کے مشورے سے انہوں نے سرکار عالی کی عدالتوں میں وکالت شروع کی ہے۔ ان کے والد میرے والد کے بڑے دوست تھے۔ اور میر مجلس صاحب کے یہہ استاد زادہ ہیں۔ اس وقت ہم لوگوں نے آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ آپ سے ان کو ملائیں۔ اور چونکہ آپ کے مقدمات ہمیشہ عدالتوں میں رہتے ہیں۔ آپ مہربانی کرکے ان کو بھی اپنی جانب سے کونسل مقرر کر لیا کیجئے۔ آپ ان کو بہت کارآمد پائینگے اور جو کچھ ان کی مدد آپ کریں گے ہم دونوں آپ کے شکر گزار ہونگے۔ کمال خاں مرحوم نے کہا جو مجھ سے ہو سکے گا میں اس سے دریغ نہ کروں گا۔ میری طرف مخاطب ہوکر کہا کہ کل یا پرسوں جب آپ کو فرصت ہو۔ دس گیارہ تک آپ میرے باغ واقع دہول میٹھ میں تشریف لائیے۔

میں اپنے سولیسٹر مسٹر فراجی (مسٹر ہرمزجی وکیل کی جگہ پر ان کو مقرر کیا تھا) سے ملادونگا وہ ان دنوں بمبئی سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ میرے کل مقدمات کی کیفیت ان کو معلوم ہے جن میں ضرورت سمجھیں گے آپ کو بھی شریک کریں گے۔ پھر خانصاحب اور سید علی صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کچھ ادہر ادہر کی باتیں کیں۔ اور کہا آپ کو تکلیف دی معاف کیجئے۔ بصراحت اس ملاقات کا تذکرہ کرنے سے مجھے دو امور کا اظہار مقصود ہے۔ ایک تو خدا بخش خاں صاحب اور سید علی صاحب مرحوم کو میرے ساتھ جو محبت تھی اس کا اظہار اور نیز یہہ دکھانا تھا کہ سرکاری اعلیٰ عہدہ داروں کی اس زمانہ میں کیا منزلت تھی اور میں ان لوگوں کے ساتھ مساوات سے ملتا جلتا تھا۔ اس صحبت کے تیسرے یا چوتھے دن میں نواب کمال خاں کے باغ میں گیا۔ وہ بہت

تپاک سے پیش آئے۔ انہوں نے مسٹر فرامجی سے ملایا اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ مقامی وکلاء کے مشورے کے بعد وہ کوئی مقدمہ منجملہ زیر دریافت مقدمات کے مجھکو بھی دیں گے۔ پھر نواب کمال خاں مرحوم نے اپنے باغ کا بہت سا حصہ میرے ساتھ ہوکر مجھکو دکھایا۔ ٹہلتے ٹہلتے باتیں بھی کرتے جاتے۔ میرا وطن کہاں ہے۔ میں لندن میں کس سنہ میں گیا تھا، اور کہاں تعلیم پائی پھر اپنے لندن جانے کا حال مجھ سے کہا اور یاد نہیں کیا کیا باتیں رہیں ان سے میں رخصت ہوکر چلا آیا۔ اس تاریخ سے مرتے دم تک نواب کمال یار جنگ مرحوم مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے رہے جس کا ذکر آگے آئیگا۔ اس واقعہ کے دو تین ہفتوں کے بعد کمال یار جنگ کے ملازم وکیل سید محمدؐ ابراہیم مرحوم نے دو مقدمہ لاکر دیئے تھے۔ کمال یار جنگ کی چونکہ کثیر جائداد بمبئی میں تھی۔ اس لیئے ایک سولیسٹر بمبئی کا ان ملازم کا ہمیشہ رہتا تھا۔ جب کہ ہرمزجی وکیل سولیسٹر کو سرو قار نے پہلے اپنی خانگی ملازمت میں لے لیا تو ان کی جگہ مسٹر فرامجی مقرر کیئے گئے تھے۔ یہ گاہے گاہے حیدرآباد بھی آیا کرتے تھے۔ سید ابراہیم صاحب بھی مستقل ملازم تھے۔ چونکہ یہ درجۂ دوم کے وکیل تھے۔ بڑے مقدمات کی پیروی کے لیئے حیدرآباد کے نامی وکلاء مقرر کرلئے جاتے تھے کمال خاں مرحوم اپنے باغ میں اکثر دعوتیں کرتے اور پارٹیاں دیتے رہتے تھے مجھکو ضرور مدعو کرتے مجھے نفط میاں کے ساتھ مخاطب کرتے۔ اس زمانہ کا رنگ کچھ اور تھا۔ امراء کے یہاں مثلاً نواب لشکر جنگ مرحوم دلاور نواز جنگ۔ کمال یار جنگ۔ اعتضاد جنگ۔ نواب زین العابدین خاں مرحوم کے یہاں تقریباً ہر مہینے میں ایک دو جلسے ناچ رنگ کے ہوتے اور بعض دولتمند اور نامی وکلاء انہیں نوجوانوں کی ریس اور پیروی میں ناچ رنگ کے جلسے کرتے جن میں لایق ڈاکٹر خواجہ حسن مرحوم۔ غیاث الدین مرحوم۔ مسٹر معین الدین مرحوم وکلاء میں اور اعلیٰ عہدہ داروں میں ڈنر و بریکفاسٹ وغیرہ کی دعوتیں جو دیتے تھے۔ ان میں سید علی صاحب بلگرامی۔ سکندر نواز جنگ مولوی علی حسن مرحوم خدا بخش خاں مرحوم تھے۔ میں ہر جگہ مدعو ہوتا تھا۔ منجانب مدار المہام وقت سرکاری طور سے ہر مہینہ اٹ ہوم کی دعوت پرائیوٹ مسٹر فریدون جی (بعد کو ملک اور سرو غیرہ) کی طرف سے ہوتی ان میں بھی میں شریک ہوا کرتا۔ ملک پیٹھ میں جو گھوڑ دوڑ ہوتی۔ دس دس و بارہ بارہ روز مسلسل ہوتی امراء اپنے خیمہ بجاتے اور وہاں بھی ناچ رنگ کے جلسے ہوا کرتے دن عید رات شب برات۔ منانے غرض حیدرآباد میں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ آجکل سا جمود اور سناٹا پن نہ تھا۔ میرے حیدرآباد آنے کے ایک سال بعد یعنی سنہ ۱۹۰۸ء میں درجہ اول کی یعنی ہائی کورٹ کی وکالت کے امتحان

کا میں بھی ممتحن مقرر ہوا تھا۔ علاوہ میرے چند اراکین ہائی کورٹ اور وکلاء یعنی میر قمر الدین مرحوم اور مولوی غلام جبار مرحوم۔ جبار یار جنگ بھی ممتحن مقرر کئے گئے۔ یہ دونوں وکلاء پیچھے بعد دیگرے ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ میرا مضمون یا پرچۂ امتحان قانون دادرسی خاص تھا۔ دوسرے سال پھر میں درجہ اول کے امتحان کا ممتحن مقرر ہوا۔ میرا پرچہ قانون شہادت کا تھا۔ دو سال کے بعد پھر میں ممتحن ہوا۔ میرا پرچہ قانونی معاہدہ کا تھا۔ میں اپنے سوالات اس طرح مرتب کرتا جس سے امیدواروں کی قوت حافظہ اور ذہانت معلوم ہو۔ کچھ سوالات تو یاد کے متعلق ہوتے۔ اور کچھ اس ترکیب کے ہوتے جن سے ذہانت ذکاوت معلوم ہو اور سوالات میں اپنی شاعری بھی چھانٹتا تھا۔ تناسب لفظی کی بھی قید رکھتا۔ میرا پرچہ امیدواروں میں تقسیم ہونے کے بعد بہت مقبول ہوتا۔ کیا وکلاء اور کیا امیدوار۔ بار بار پڑھتے اور محظوظ ہوتے۔ لوگ ہاتھوں ہاتھوں لئے پھرتے۔ میری قابلیت و ذہانت کی وکلاء اور اراکین ہائی کورٹ تعریفیں کرتے۔ درجۂ اول اور درجہ دوم کے مضامین ایک ہی ہوتے ہیں۔ نمبر کی تعداد کے لحاظ سے کوئی امیدوار درجہ اول میں نکلتا۔ کوئی درجہ دوم میں پاس ہوتا۔ چونکہ دونوں درجوں کا امتحان ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے سینکڑوں کی تعداد میں امیدوار داخل امتحان ہوتے۔ امتحان میں فارغ ہونے کے بعد جو اشخاص وکیلوں میں نام برآوردہ ہوتے اور اچھی خاصی دولت بھی

اور بعض نے سرکاری اعلیٰ خدمتیں بھی حاصل کیں۔ ان سب کے نام تو مجھے اس وقت یاد نہیں ہیں۔ بعض کے نام جو یاد آ گئے وہ یہ ہیں۔ مولوی عنایت حسین خاں مرحوم مولوی سید فیض حسینا مرحوم۔ مولوی حاجی محمد شیخ مرحوم یہ بعد کو سشن جج بھی ہو گئے تھے۔ جبکہ ان کے دوست مولوی غلام اکبر خاں۔ اکبر یار جنگ ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ مولوی میر لطف حسن مرحوم یہ بھی اعلیٰ وکیل ہوئے۔ مولوی غلام اکبر خاں۔ اکبر یار جنگ جو اب ہائی کورٹ کے جج ہیں اور عرصہ دراز تک ہوم سکریٹری کی خدمت پر بھی فائز رہے۔ مولوی فیض الدین وکیل سرکار بقید حیات ہیں۔ یہ دونوں صاحبان درجہ دوم میں پاس ہوئے تھے۔ قانون وکلاء کے تحت سات سالہ پریکٹس کرنے کے بعد درجہ اول کی سندیں ان دونوں صاحبوں کو ملیں۔ مولوی محمود علی صاحب جو اب نائب کوتوال بلدہ صیغہ خفیہ میں ہیں اور ان کے بڑے بھائی محمد علی منصف یہ دونوں درجۂ اول میں نکلے تھے۔ مولوی سید اعجاز حسین لکھنوی مشہور بہ گلبرگوی درجۂ اول میں پاس ہوئے تھے۔ اوپر جتنے نام میں نے لکھے ہیں یہ سب کے سب پہلی دفعہ جب

میں ممتحن مقرر ہوا تھا پاس ہوئے تھے۔ بعد کے امتحانوں میں جو لوگ پاس ہوئے تھے ان میں کے بعض نام یاد ہیں۔ مولوی احسن خاں مرحوم جو بعد کو مہتمم کوتوالی اضلاع ہوئے تھے مولوی اکرم خاں جو آجکل کہیں منصفی کی خدمت پر ہیں۔ مولوی حافظ عبدالمجید بہت سے کتب قانونی کے بہ مصنف و مولف ہیں۔ اور کہیں منصف ہیں۔ مولوی شاہ مختار احمد مرحوم یہ گلبرگہ میں سشن جج تھے۔ مولوی محمد اسمٰعیل برنی۔ یہ کہیں منصف ہیں۔ برادر بزرگ پروفیسر الیاس برنی۔ بعد کے امتحان کے پاس شدہ لوگوں میں زیادہ لوگ نام برآبرورہ نہیں ہوئے۔ علاوہ ازیں مجھے نام بھی یاد نہیں آرہے ہیں۔

۱۸۹۷ء کے اوائل میں میں نے سید علی صاحب بلگرامی سے کہا کہ آپ صیغہ تعمیرات کے بھی معتمد ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے اس ڈپارٹمنٹ میں یکا دکا کوئی مسلمان انجینیر نظر آتا ہے۔ ورنہ سب عیسائی تھوڑے سے یورپین۔ باقی سب یوروشین بھرے ہوئے ہیں۔ سید علی صاحب نے کہا۔ مسلمان انجینیر ملتے کہاں ہیں۔ میں نے کہا میں دو نام ابھی آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ ایک ان میں سے کوپرہل کے کامیاب شدہ بھی یعنی مسٹر فاضل معراج اور دوسرے مسٹر اسد علیخاں۔ ان میں سے اسد علی خاں تو اپنے سہسرام میں آگئے ہیں اور مسٹر موراج ابھی ولایت ہی میں ہیں۔ سید علی صاحب نے کہا کہ آپ ان دونوں سے دریافت کریں کہ حیدرآباد میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو فوراً چلے آئیں۔ میں نے کہا کہ میں اسد علی خاں کو جو میرے ہم وطن ہیں یعنے صوبہ بہار سہسرام کے متوطن ہیں۔ میں ان سے دریافت کرتا ہوں اور یہ بھی لکھتا ہوں کہ اگر رضامند ہیں تو چلے آئیں۔ مسٹر موراج کو آپ خود لکھئے اور میرا نام لکھئے کہ فلاں شخص سے تمہارا نام اور پتہ معلوم ہوا۔ کوپر کالج کے پرنسپل کے توسط سے ان کو خط لکھئے۔ موراج اس وقت جہاں ہونگے خط ملجائیگا۔ اتنا مجھ کو معلوم ہے کہ واپس نہیں آئے ہیں۔ حیدرآباد کے حالات کے لحاظ سے مسٹر موراج کو خود لکھنا میں نے پسند نہیں کیا۔ بہرحال یہ دونوں آگئے۔ اسد علیخاں مرحوم تو میرے مکان میں کچھ دنوں رہے۔ مسٹر موراج کو آتے ہی چارسو کی خدمت انچارج چادرگھاٹ واٹرورکس کی ملگئی تھی۔ اسد علی خاں مرحوم کو کچھ عرصہ تک امیدواری کرنی پڑی پھر مسٹر محمد یوسف جو اس زمانہ میں سید علی صاحب کے مددگار تھے۔ ان کو کسی ضلع میں منتقل کرکے ان کی جگہ مسٹر موراج کو سید علی صاحب نے اپنا مددگار بنایا تھا۔ اور اسد علی خاں مرحوم کو مسٹر موراج کی جگہ دی تھی۔ اسی زمانہ میں عزیزی سید عطا حسین جو بعد کو ناظم تعمیرات ہوئے اور

اب وظیفہ یاب ہیں۔ روڈ کی سے پاس کرکے آگئے تھے۔ اس واقعہ کے عرصہ دراز سے بعد منجانب سرکار وسٹر احمد علی۔ علی نواز جنگ بہادر حال معتمد تعمیرات اور مسٹر کرامت اللہ کرامت جنگ مرحوم بغرض تعلیم انجینئرنگ کو پرس ہل بھیجے گئے تھے اور مسٹر احسن الزماں حال ناظم محکمہ وڈ بنچ اپنے صرفہ سے کوپرس ہل انجینئرنگ کی تعلیم کو گئے تھے اور ان کے بڑے بھائی لفٹنٹ کرنل محمد اشرف نائب ناظم طبابت ساتھ یورپ گئے تھے۔

۱۸۹۷ء میں انجمن قائم کرنا

۱۸۹۷ء میں مسٹر موراج کے آنے کے بعد میں نے ایک انجمن بنام انجمن ترقی نسواں قائم کی تھی مسٹر موراج اس زمانہ میں جام باغ والی گلی میں رہتے تھے۔ انہیں کے مکان میں اس انجمن کے جلسے منعقد ہوتے تھے اور یہ ممبر بھی تھے۔ میرے آنے کے کچھ عرصہ بعد پٹنہ کے ایک بیارسٹر محمد سلیمان مرحوم بغرض وکالت یہاں آئے تھے۔ یہ میرے عزیز بھی ہوتے تھے اور کچھ عرصہ تک میرے ساتھ رہے۔ یہ بھی اس انجمن کے ممبر ہوگئے تھے۔ مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی حیدر یار جنگ مرحوم کو بھی میں نے ممبر بنایا تھا اور سید علی بہار جو حقیقتاً مخبر دکن کے ایڈیٹر تھے ان کو بھی اور مولوی محب حسین مرحوم اڈیٹر معلم نسواں کو بھی رکنیت میں شریک کیا تھا۔ علاوہ ان اصحاب کے مولوی عبدالحق صاحب خاں اردو کے لکچرار جو اس زمانہ میں مدرسہ آصفیہ ملک پیٹھ میں ٹیچر تھے ان کو بھی رکن بنایا تھا۔ چند ممبر تھے۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے متعلق گفتگو کرنا گناہ میں داخل تھا۔ رسالہ معلم نسواں میں اس انجمن کی روئداد شائع ہوئی تھی۔ مسٹر اسد علیخاں کو بھی ممبر بنایا تھا۔ یہ انجمن ایک سال سے زیادہ نہیں رہی۔ مسٹر موراج کا جب ضلع پر تبادلہ ہوگیا تو تفرقہ پڑگیا۔ بہرحال اس انجمن کے قائم کرنے سے میرے خیالات اور ذہنیت کا پتہ چلتا ہے کہ مجھے عورتوں کی تعلیم کی دھن کب سے ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ پانی کہاں مرتا ہے۔ آج کی لڑکیاں کل کی مائیں ہونگی۔ اگر مائیں جاہل ہیں تو بچے اسی قماش کے ہونگے اور اگر مائیں تعلیم یافتہ ہونگی تو بچوں کی اٹھان بھی اچھی ہوگی۔ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ ماں کی گود پہلی درسگاہ ہے۔ اس لئے میں تقریباً چالیس سال سے آزادی نسواں و اشاعت تعلیم نسواں کی فکر و کوشش میں تن من دھن دیتے اپنی مستعار زندگی گزار رہا ہوں۔ میرے ہم خیال لوگ اس زمانہ میں گنتی کے تھے۔

معلم نسواں ماہانہ رسالہ مولوی محب حسین مرحوم متوطن اٹاوہ تعلیم نسواں کی اشاعت کی اور مروجہ پردہ ترک کرنے کی غرض سے کئی سال تک نکالا کئے۔ ان پر کٹ ملاؤں و تنگ نظر کلمہ گویان محمد

نے بہت کچھ دانت پیسے تھی کہ ان کو حسب دستور کافر تک کہا۔ مولوی محب حسین نے برافروختہ ہو کر اور جل کر ایک مضمون جس کی سرخی اقفال تھی نکالا۔ اس مضمون کا ماحصل یہہ تھا کہ مسلمان اگر اپنی عورتوں سے اس قدر بدگمان ہیں تو ان کو چاہیئے کہ قدیم یونانیوں کی تقلید کریں۔ قدیم یونان میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی مرد باہر کام پر جاتا تو اپنی عورت کے مقام مقصود پر چمڑے کا قفل لگا دیتا۔ اس مضمون نے بعض حلقوں میں کھلبلی پیدا کی۔ مشیر دکن اخبار جو اب بھی نکلتا ہے اس کے اڈیٹر و مالک بظاہر ایک برہمن نامی کشن راؤ تھے۔ مگر در پردہ ایک مسلمان صاحب اخبار کے مدیر تھے۔ اون کو بہت برا معلوم ہوا۔ اونہوں نے مشیر دکن میں مولوی محب حسین مرحوم کی لے دے کی۔ مولوی محب حسین کی تائید پر ایک مقامی اخبار نظارۂ عالم نے مضامین لکھے جس پر سے مشیر دکن نے نظارہ عالم کے ایڈیٹر مولوی قدرت اللہ کو برا بھلا کہا۔ اور ذاتیات پر آ گئے مگر اپنے خیال میں بڑی چالاکی یہہ کی کہ نہ نام اخبار کا لکھا اور نہ ایڈیٹر کا بلکہ اس طرح سے ایڈیٹر کو گالیاں دیں کہ ایک مقامی اخبار کے نالائق بیہودہ وغیرہ ایڈیٹر نے اخبار کے دوسرے صفحہ کی ساتویں سطر میں جو یہہ مضمون دیا ہے اور مولوی محب حسین کی پشت پناہی کی ہے۔ وہ شخص ایسا ویسا نہایت ناشائستہ کلمے تھی ایڈیٹر اور اخبار کی نسبت لکھے۔ قدرت اللہ مشیر دکن کے اس پرچہ کو۔ لئے چند وکلاء کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ مشیر دکن کے ایڈیٹر پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرنا چاہتا ہوں۔ اسوقت کے بعض نامی وکلاء سے اور مولوی قدرت اللہ سے دوستانہ بھی تھا۔ ان سب کو بھی مشیر کا وہ پرچہ دکھا کر ان کی امداد قانونی کے خواستگار ہوئے۔ لیکن بقول قدرت اللہ جس جس وکیل سے انہوں نے مشورہ کیا سب نے بیک زبان یہی کہا کہ مشیر دکن کے اڈیٹر پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ چل نہیں سکتا کیونکہ نہ اس میں اخبار نظارہ عالم کا نام ہے نہ اڈیٹر کا نام ہے۔ قصہ مختصر یہہ کہ وہ میرے پاس آئے اور میرے قدموں پر سر رکھدیا اور کہا کہ میری عزت آپ بچائیں اور رونا شروع کیا۔ میں نے ان کا سر اوٹھایا اور کہا کہ آپ کچھ کہیئے بھی تو واقعہ کیا ہے۔ آپ تو زار و قطار روئے جاتے ہیں اور منھ سے کچھ بولتے نہیں۔ روتے روتے ہچکیاں لگ گئی تھیں۔ میں نے بہت کچھ تسلی و تشفی دی۔ جب اون کے اوسان درست ہوئے تو دونوں اخبار مجھ کو دکھائے اور یہہ بھی کہا کہ میں آپ کی فیس دینے کے لائق نہیں۔ میری مالی حالت آپ پر روشن ہے۔ کیونکہ مولوی قدرت اللہ میرے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ مجھے ان کی مالی حالت کی کسی حد تک اطلاع تھی۔ مگر مجھے اس وقت یہہ نہ کہا کہ بعض وکلاء نے جواب دیا ہے کہ ازالہ حیثیت عرفی کا استغاثہ چل ہی نہیں سکتا۔ قدرت اللہ کے حال پر

ترس کھا کر بغیر ایک حبہ لئے مقدمہ میں نے لیلیا اور منشی سے کہا کہ اس مقدمہ کو داخل رجسٹر کر لو اس زمانہ میں مولوی نظام الدین احمد بعد کو نظامت جنگ اور سر) فوجداری کے ناظم اول تھے۔ مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی ان کے اجلاس پر دائر کیا۔ اس مقدمہ کی بڑی شہرت ہوئی۔ باجی کشن راؤ آنجہانی سابق ایڈیٹر مشیر دکن مستغاث علیہ کی جانب سے چند وکلا پیروی کے لئے آئے منجملہ جن کے مولوی سید محمد مرحوم۔ سرسید احمد خاں مرحوم کی ہمشیرہ کے نواسہ بھی تھے جو الہ آباد ہائی کورٹ کے وکیل تھے اور غالباً وہاں کام نہ چلنے کی وجہ سے حیدر آباد آئے ہوئے تھے انہوں نے ایک چالاکی کی کہ اخبار شوکت اسلام کے اڈیٹر کو ملالیا۔ اس کے ایڈیٹر اور مالک ایک شخص حاجی کرتان تھے۔ کسی زمانہ میں ان کی مالی حالت درست تھی۔ مگر جس زمانہ کا ذکر ہے ان کی مالی حالت پستی پر تھی۔ ان کی حالت یہہ تھی کہ کبھی مہینے ڈیڑھ مہینے پر ان کا ہفتہ وار اخبار اپنی صورت دکھاتا۔ انہوں نے مدراس سے بھی اشاعت کی اجازت لے رکھی تھی اور حیدر آباد سے بھی سید محمد مرحوم نے ایک نمبر شوکت الاسلام کا وہی تاریخ دیکر جو نظارۂ عالم کی اشاعت کی تاریخ تھی نکلوایا اور اس کے دوسرے صفحہ تقریباً اسی قسم کا مضمون جس طرح نظارۂ عالم نے مولوی محب حسین کی بیج پر لکھا تھا۔ اس میں چھپوایا۔

شوکت الاسلام بھی ایک مقامی اخبار تھا جس سے ان کی غرض یہہ تھی کہ مشیر نے لکھا ہے کہ ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر نے جو اس قسم کا مضمون طبع و شائع کیا ہے وہ ایڈیٹر ایسا اور ایسا نالائق اور گدھا وغیرہ ہے۔ لہٰذا یہہ امر مشخص نہیں ہوسکتا کہ مشیر کا روئے سخن اخبار نظارۂ عالم اور اس کے اڈیٹر قدرت اللہ سے تھا۔ اس مقدمہ نے بہت طول کھینچا۔ استغاثہ کی جانب سے بہت سے گواہ میں نے پیش کئے اور بڑے بڑے لوگوں کو بہ حیثیت گواہ میں نے طلب کیا۔ اور ایسے لوگوں کو جو ہر دو اخبار کے خریدار تھے ان کو۔۔۔۔۔ اس لئے کہا مشکل یہ تھی کہ نہ تو نام اخبار کا تھا اور نہ ایڈیٹر کا۔ اس لئے گواہوں سے یہہ ثابت کرنا پڑا کہ دونوں اخباروں پڑھنے کے بعد فوراً یہہ خیال آیا کہ مشیر نے جو حملہ کیا وہ قدرت اللہ اور اس کے اخبار پر سوال identification یعنی تشخیص وتعین کا تھا۔ واضح ہو کہ میرے پیش کردہ ثبوت سے یہہ امر معین و مشخص ہوگیا کہ اڈیٹر مشیر نے مولوی قدرت اللہ کے حق میں کلمات مزیل حیثیت عرفی لکھے اور ان کے اخبار کی توہین و تحقیر کی فرد جرم مجسٹریٹ نے لگادی اور میری جانب سے شہادت پیش ہو رہی تھی۔ ادھر مولوی سید محمد مرحوم وکیل اور مشیر کے دیگر مشیروں نے یہہ ترکیب سوچی جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے کہ شوکت الاسلام

اخبار تیار کرایا گیا۔ لیکن بعد ترتیب فردِ جرم صفائی میں پیش کیا گیا۔ میں نے اس اخبار کا ذکر شروع میں کر دیا ہے۔ لیکن کانوں کان بھی اس کی خبر اس وقت تک ہم لوگوں میں سے کسی کو نہیں تھی جب کہ اخبار شوکت الاسلام صفائی میں پیش کیا گیا اس وقت میں بھی چکرا یا۔ بساطِ شطرنج جب بچھتی ہے اور دو شاطر کھیلتے ہیں تو ہر ایک فریق ایسی چال چلتا ہے کہ جس کا جواب فریق ثانی نہ دیکھے بعینہ یہ حال مقدمہ بازی کا ہے۔ ملزم نہیں بلکہ اپنے مجرم کی جانب سے چال ایسی چلی گئی جس نے مجسٹریٹ کے بھی خیال بدل دئے تھے۔ کیوں کہ دونوں بھی مقامی اخبار تھے یعنی شوکت اسلام اور نظارۂ عالم اور دونوں کے صفحہ پر قریب قریب ایک ہی قسم کا مضمون تھا۔ بظاہر تو یہ چال گھوڑے کی تھی جس کی اردب ناممکن ہے۔ مولوی سید محمد کے اور میرے درمیان تھی وہ بہت زیادہ تجربہ کار اور انگریزی عدالتوں میں وکالت کئے ہوئے عمر میں مجھ سے دوگنی عمر کے تھے تجربہ بھی مجھ سے بڑا ہوا۔ جب شوکت اسلام پیش کیا گیا ۔ اور مولوی سید محمد مرحوم نے اس کو بآواز بلند اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر عدالت کو سنایا۔ اس کے بعد اس پر استدلال کر کے بڑے زور و شور سے بحث کی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جن معزز لوگوں نے منجانب استغاثہ شہادت دی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظروں سے شوکت الاسلام نہیں گزرا اور نہ یہ ممکن تھا کہ ان کا خیال نظارۂ عالم ہی کے متعلق گزرتا۔ جبکہ دو مقامی اخبار اپنے دوسرے صفحہ پر ایک ہی قسم کا مضمون لکھ رہے ہیں۔ پھر اس کا تعین ناممکن ہے۔ انہوں نے تو مجھ کو اپنے خیال میں شکست دے ہی دی ہیں لیکن میں حق پر تھا اور تائید غیبی میرے ساتھ تھی۔ از روئے ضابطہ جواب الجواب مجھکو دینا تھا۔ میں نے شوکت الاسلام کا اخبار لیکر بغور پڑھا تو اس میں کلام نہیں کہ تاریخ اشاعت ایک ہی تھی ۔ اور صفحہ بھی دونوں اخباروں کا دوسرا تھا۔ مشیر نے لکھا تھا۔ ایک مقامی اخبار کی ساتویں سطر سے جو مضمون شروع ہوا ہے برخلاف جس کے شوکت اسلام کے صفحہ دو کی چوتھی سطر سے یہ مضمون شروع ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد" میرا ذہن فوراً منتقل ہوا اور میں نے حساب کیا تو چوتھی سطر سے شوکت الاسلام نے مضمون شروع کیا تھا۔ پھر کیا تھا میں نے چور پکڑ لیا۔ عدالت کی توجہ مبذول کرائی اور بتلایا کہ یہ بڑی جعل سازی کی گئی ہے مگر دروغ کو فروغ نہیں۔ دودھ کا دودھ ہے اور پانی کا پانی۔ اب تو فریق ثانی کے وکلاء چکرائے۔

مجسٹریٹ نے صاف کہہ دیا کہ شوکت الاسلام میں اس قسم کا مضمون بعد میں لکھوا کر چھپوایا گیا ہے اور بڑی چالاکی سے کام لیا گیا مگر سقم رہ گیا۔ صفائی ناقص ہے۔ استغاثہ کی جانب سے مقدمہ

ثابت ہے۔ ملزم کو سزا ہونی لازمی امر ہے۔ بہتر ہے کہ مجرم معافی مانگ لے۔ میں آج مقدمہ ملتوی کرتا ہوں۔ مولوی سید محمدؐ مرحوم کے ہاتھ کے طوطے اوڑ گئے۔ عرق عرق ہو گئے۔ دم بخود ایسے ہوئے کہ منھ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ پیشانی سے پسینہ پوچھ رہے تھے۔ غالباً دل میں سوچ رہے ہوں گے کہ جو گہری چال میں چلا تھا اس میں منھ کی کھانی پڑی۔ بہوش اپنے فریق ثانی کو چیت کرنے کیلئے خود چاروں شانے چیت اکھاڑے پر گر پڑے۔ مجسٹریٹ نے بخیال سٹرفا پروری مجرم کے وکیل سے پھر دریافت کیا کہ آپ کا موکل معافی مانگنے پر رضامند ہے۔ اس کے بعد میری طرف مخاطب ہو کر مجبہ سے دریافت کیا کہ آپ کا موکل اگر معافی مانگے تو معاف کرکے مقدمہ سے دست بردار ہو جاؤنگا۔ فریق ثانی کے وکیل نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں جواب دیا مناسب ہوگا کہ مقدمہ آج ملتوی کیا جائے۔ کوئی تاریخ نزدیک کی اصدار تجویز کے لئے مقرر کردی جائے۔ اس اثنا میں اپنے موکل سے مشورہ کرکے جواب عرض کروں گا۔ پھر میری جانب مخاطب ہو کر مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا آپ کی کیا رائے ہے۔ میں نے کہا میں بھی یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ آج مقدمہ ملتوی ہو۔ دو دن کے فاصلہ سے تاریخ مقرر کیگئی۔ ایک جم غفیر تماشا بینوں کا اجلاس پر جمع تھا۔ فریقین اور فریقین کے وکلاء کا نسل میں علیحدہ گفتگو ہو کر یہ طے پایا کہ دوسرے دن صبح کو آٹھ بجے میرے مکان پر سب جمع ہوں۔ چنانچہ دوسرے دن میرے ہاں مولوی سید محمدؐ اور ان کے رفیق دو وکلاء معہ باجی کشن راؤ کے آئے۔ میرے موکل مولوی قدرت اللہ بھی ذرا قبل آگئے تھے۔ اور مجبہ سے کہدیا تھا کہ جو میں مناسب سمجھوں وہ کروں۔

بہرحال جب سب جمع ہو چکے بطور تاوان میں ایک ہزار مانگ رہا تھا تاکہ میں پانسو فیس لوں اور بقیہ پانسو قدرت اللہ کو دیدوں۔ طلبی گواہان اور دیگر اخراجات عدالتی میں تقریباً سو روپیہ ان کے خرچ ہو گئے تھے۔ بہت کچھ بحثوں کے بعد باجی کشن راؤ آنجہانی پانسو نقد دینے پر اور معافی نامہ عدالت میں داخل کرنے پر رضامند ہو گئے۔ میں نے بھی دیکھا کہ اگر مجرم کو سزا ہو گئی تو میرے غریب موکل کو کیا حاصل ہو گا۔ عدالت میں بروز پیشی مقررہ معافی نامہ داخل کر دیا گیا۔ مقدمہ بربنائے معافی نامہ فیصل کیا گیا۔ اور اس دن صبح کے آٹھ بجے پانسو روپیہ میرے پاس آگئے تھے۔ میں نے اس میں سے ایک حبہ بھی خود نہیں لیا اور کل رقم قدرت اللہ کو دیدیا گو وہ مصر تھے کہ اس میں سے دو سو روپیہ میں لیلوں۔ مگر میں کچھ رقم الیتی اس لئے مناسب نہیں سمجھا کہ حسب نیت سے میں نے ایک مظلوم کی دستگیری کی اور امداد دی تھی تھوڑا یا بہت تھی

معاوضہ یا کسی قسم کا معاوضہ لینے سے وہ اجر نہیں حاصل ہوتا جو درصورت نہیں لینے کے ممکن ہے مجھکو ملا ہو۔ یہ مقدمہ بلحاظ حالات مخصوصہ بڑا سنسنی خیز ہو گیا تھا۔ اس کا دوران تقریبًا دو ڈہائی مہینے رہا اور اس مدت میں مجھ پر بہت زور ڈالا گیا کہ میں مقدمہ سے دست بردار ہو جاؤں جیسا میں نے اوپر لکھا کہ مشیر دکن کے اڈیٹر درپردہ باثر ایک مسلمان صاحب تھے۔ میں نے ان کو بھی گواہی میں اپنی جانب سے طلب کیا تھا اور قرآن پاک ان کے ہاتھ پر رکھ کر پوچھا تھا کہ یہ مضمون آپ کا لکھا ہوا ہے یا نہیں اور آپ کا مطلب اس سے نظارہ عالم کے اڈیٹر پر حملہ کرنا تھا یا نہیں۔ ہائے کیا اسلام ہے کہ صاف انکار کیا وہ صرف مضمون لکھنے ہی سے نہیں بلکہ اس امر کے اظہار سے بھی کہ ان کا تعلق مشیر دکن سے ہے۔ یہ ملازم سرکار بھی تھے اسوقت انکی تنخواہ قلیل تھی۔ غالبًا سو سوا سو ہوگی۔ اب تو پانچ چھ سو ہے۔ ان کی پشت پناہی اور ان کی وجہ سے بعض بڑے عہدہ دار میرے خلاف ہو گئے تھے۔ پہلے تو جیسا اوپر میں نے لکھا ہے مجھپر بہت زور ڈالا گیا کہ مقدمہ کی پیروی سے دست کشی کروں۔ اول تو میرے مسلک کے خلاف یہ امر ہے کہ کسی سے امداد و دستگیری کا وعدہ کرنے کے بعد اس کو ناامید کروں جس میں ایک قسم کی فریب دہی سمجھتا ہوں۔ علاوہ ازیں آداب پیشہ وکالت کے بھی خلاف ہے۔ اس مقدمہ میں وہ اعلیٰ عہدہ داروں کی جانب سے جن میں ایک معتمد سرکار دوسرے ایک رکن ہائیکورٹ کی طرف سے کئی وکلاء میرے پاس آئے اور مجھے ان کے پیغام پہنچائے کہ میں مقدمہ سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ مولوی سلطان محمود جن کا شمار نامی وکلاء میں تھا وہ ایک رکن ہائی کورٹ کی جانب سے آئے تھے۔ میں نے کہا فلاں صاحب کو میرا سلام کہئے اور کہئے کہ بلی کے ڈر سے چوہا شکار کرنا چھوڑ نہیں دیتا ہے علاوہ ازیں میرے پاس تحریری حکم لائے تو اس وقت میں اس پر غور کروں گا۔ میر سلطان محمود بولے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ تحریری پیغام آئے۔ اس کے بعد کچھ تخویف آمیز خدشے دلائے اور لالچ بھی دلایا کہ فلاں صاحب کے اجلاس کے متعدد مقدمات میں لادونگا اس مقدمہ میں آپ کو ملیگا ہی کیا۔ دو چار سو روپیہ ملینگے یا ملے ہوں گے۔ میں نے کہا میر صاحب آپ نے مجھے جانا پہچانا نہیں ہے۔ میں بندۂ زر ہوں نہ بزدلا ہوں نہ دنیا میں کسی سے ڈرتا ہوں۔ صرف اپنے خالق سے ڈرتا ہوں۔ جو انسان خوف خدا رکھتا ہے اس کو کسی سے ڈرنیکی ضرورت نہیں۔ میرے موکل مولوی قدرت اللہ کو یہ سب باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ اس وجہ سے اور بھی وہ میرے معترف ہو گئے تھے۔ بعد ختم مقدمہ اپنے اخبار میں ایک طول طویل آرٹیکل اپنے مقدمہ

کے متعلق اور میری تعریف میں لکھکر شائع کیا تھا جس کی سرخی شیر بنگالہ دی تھی۔ مخبر دکن اخبار جو مدراس سے نکلتا تھا اس نے بھی اپنے اخبار میں میری قابلیت قانون دانی اور ہمدردی انسانی اور ہمت اخلاقی وغیرہ کی تعریف میں دریا بہائے تھے۔ مولوی عبدالقادر مرحوم اڈیٹر مخبر دکن حیدرآباد آکر مجھ سے ملنے آئے اور میری تعریفیں سابق میں سنی تھیں۔ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ بلاوجہ زبان درازی کرکے اڈیٹر مشیر نے قدرت اللہ پر ظلم کیا تھا۔ چونکہ ازالہ حیثیت عرفی کے ایک مقدمہ کا میں نے تذکرہ لکھا ہے اس سلسلہ میں اسی نوعیت کے اور بھی دو مقدمات کا ذکر مناسب موقع سمجھکر کرتا ہوں۔

ایک اس مقدمہ کے قبل اور دوسرا اس کے بعد کا ہے۔ یوں تو پچاسوں مقدمات اسی نوعیت کے میں نے کئے مگر خصوصیت کے ساتھ دو کا یہاں ذکر کرتا ہوں۔ قدرت اللہ والے مقدمہ کے چھ سات ماہ قبل ایک بڑے نامی گرامی دولت مند رئیس کے مقابلہ میں ایک مقدمہ جو میں نے دائر کیا اس کے واقعات یہ ہیں۔

نواب مرزا عباس علیخاں مرحوم نے آبکاری کا ٹھیکہ تمام ممالک محروسہ سرکار عالی کا لاکھوں روپیہ سالانہ پر لیا تھا اور ایک بڑا دفتر بھی قائم کر لیا تھا۔ اپنے ایک مراسلہ میں جو صدر دفتر کے نام بھیجا تھا اس میں ایک ٹھیکہ دار کلالوں میں بہت باوقعت اور باثر کلال موسوم بہ موتی لال کی نسبت لکھا تھا کہ یہ سرخیل بدمعاشان ہے اور سب کلالوں کو بگاڑتا اور مجھ سے منحرف کرتا ہے۔ کسی طرح موتی لال کو اس مراسلہ کا حال معلوم ہو گیا اور دفتر سے اس کی نقل بھی لیلی چونکہ بہت دولت مند تھا۔ اس کے پاس ایک وکیل ہمیشہ ملازم رہتا تھا۔ بہر حال ملازم وکیل کو یہ مراسلہ دکھا کر کہا کہ نواب مرزا فیاض علیخاں پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کرو۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک خانگی مراسلہ ہے۔ اپنے دفتر کے صدر کو انہوں نے متنبہ اور آگاہ کیا ہے کہ آئندہ وہ ہوشیار رہیں۔ ازالہ حیثیت عرفی کا الزام ان پر عائد نہیں ہو سکتا۔ موتی لال کہاں چپ بیٹھنے والا۔ اس زمانہ میں مولوی محمدؐ قاسم صاحب ایک وکیل تھے جو عموماً کلالوں کے مقدمات کیا کرتے تھے۔ یہ صاحب بعد کو عرصہ دراز تک منجانب سرکار وکیل پولیس بھی رہے تھے۔ بہر حال موتی لال ان کے پاس گیا اور اپنے ملازم وکیل کو ساتھ لیکر گیا۔ انہوں نے بھی وہی رائے قائم کی جو ملازم وکیل کی تھی۔ مولوی محمد قاسم نے بقول ان کے اور بھی کئی وکیلوں سے مشورہ کیا۔ پھر میرے پاس لے آئے۔ میں نے وہ مقدمہ بقرار داد ایک ہزار فیس لیلیا۔ پانسو نقد دوسرے دن مجھکو موتی لال نے پہنچا دئے۔ بقیہ نصف بعد کامیابی دینے کا وعدہ کیا۔ اس زمانہ میں نواب

مرزا فیاض علیخاں مرحوم سے مجھے نیاز حاصل نہ تھا۔ صرف میں نام سے واقف تھا۔ بہرحال بڑے زور وشور سے مقدمہ مولوی محمدؐ زماں خاں اول ناظم فوجداری کے اجلاس پر چلا۔ نواب مرزا فیاض علیخاں کی جانب سے چند وکلا پیروی کے لئے مقرر ہوئے۔ علاوہ مولوی محمد احمد خاں وکیل مرحوم جو نواب مرحوم کے ملازم تھے۔ پہلی پیشی پر انہوں نے یہہ درخواست دی کہ تاوقتیکہ ثبوت منجانب استغاثہ پیش ہو کر یہہ ثابت نہ ہو کہ حقیقتاً نواب صاحب مرتکب ازالۂ حیثیت عرفی ہوئے اس وقت تک کے لئے بوجہ ان کی اعزاز ذاتی وخاندانی کے حاضری اجلاس سے معاف کئے جائیں۔ مجسٹریٹ نے محمد احمد خاں سے درخواست لیکر اور پڑھکر مجھکو دی اور مجھ سے دریافت کیا کہ مجھے کوئی عذر ہے۔ میں نے کہا کہ یہ امر عدالت کے امتیاز تمیزی پر منحصر ہے اور میں بذات خود عذر نہیں کرتا اور نہ میں مُصّر ہوتا ہوں کہ نواب صاحب ضرور حاضر اجلاس ہوں۔ مجھے کسی شریف کی توہین پسند نہیں ہے مگر اگر میرا مقدمہ سچا ہے تو تا کئے حاضری سے بچیں گے بہرحال سردست حاضری معاف کیجائے۔ چنانچہ مجسٹریٹ نے درخواست منظور کرلی اور مقدمہ شروع ہوا۔ غرض استغاثہ کے ساتھ نقل مراسلہ زیربحث یعنی بساط دعویٰ دستاویز پیش کردی تھی اور قبل پیشی اولین سے درخواست طلبی شہود کی نسبت ضروری تھی۔ اس کے ذریعہ سے وہ مثل طلب کی تھی جس میں وہ مراسلہ تھا اور صدر دفتر کو طلب کیا تھا جس کے نام وہ مراسلہ تھا اور یہی دو گواہ واقعہ متعلقہ کے متعلق کئے تھے۔ آخرالذکر گواہ تو حاضر ہوگئے تھے لیکن مثل متعلقہ اور صدر دفتر کے منتظم نہیں آئے۔ فریق ثانی کے وکیل نے یہہ عذر کیا کہ وہ مثل خانگی ہے اور اس کو طلب کرنے کا کوئی حق مستغیث کو نہیں اور اپنے بیان کی تائید میں قانون شہادت کی بعض دفعات پیش کیں جن کو میں نے اپنی بحث میں غیر متعلق ٹھیرایا اور اس امر پر زور دیا کہ تاوقتیکہ وہ مثل نہ آئیگی مقدمہ چل نہیں سکتا۔ مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ مثل اور منتظم صدر دفتر آئندہ پیشی پر حاضر ہوں ورنہ باضابطہ کارروائی کیجائے گی اور اس تاریخ پر مقدمہ ملتوی ہوگیا۔ دوسری تاریخ ایک ہفتہ کے فاصلہ سے مقرر کی گئی۔ القصہ پیشی مقررہ پر مثل بھی آگئی اور منتظم بھی حاضر ہوگئے تھے منتظم کو پہلے پیش کرکے وہ مراسلہ ان سے پڑھوایا اور اس کی شناخت کروائی جو نقل پیش کی تھی اس سے اصل کا تطابق کردیا اور منتظم سے پوچھا کہ مراسلہ پر دستخط نواب مرزا فیاض علیخاں کی ہے۔ اس کو مجبوراً اثبات میں جواب دینا پڑا۔ اس کے بعد دوسرے دو گواہوں کو بھی پیش کیا۔ جن سے یہہ ثابت کردیا کہ مستغیث بہت دولت مند اور باوقار شخص ہے۔ اسکی ہتک ہوئی

اس کے بعد بحث کی اور یہ ثابت کیا کہ مضمون مراسلہ سے ازالہ حیثیت عرفی ہوا اور مستغیث جو ایک معتبر و دولت مند شخص ہے۔ اس کی اس کے ہم جنسوں میں ہتک و توہین ہوئی اور اس مراسلہ کے مضمون کی کافی اشاعت و فتر والوں میں ہوئی۔ فریق ثانی کے وکیل نے بہت کچھ تاویل کی اور مستثنیات میں لانے کی کوشش کی وہ ناکام رہے اور فرد جرم مرتب ہوگئی اور حاضری سے جو مجرم کو معافی دی گئی تھی وہ حکم اٹھا لیا گیا اور مجسٹریٹ نے دوسری پیشی مقرر کرکے حکم دیا کہ آیندہ پیشی پر مجرم اصالتاً حاضر ہوں اور ان کو فرد جرم سنائی جائیگی۔ اب تو مستغاث علیہ کے وکلاء میں بڑی کھلبلی پڑی اور سب حواس باختہ ہوگئے۔ مجسٹریٹ نے مولوی محمد احمد خاں مرحوم سے مخاطب ہوکر کہا کہ مولوی صاحب اس میں آپ کے موکل کی خیر ہے کہ مستغیث کو رضامند کرے اور مستغیث سے معافی مانگیں۔ چنانچہ اسی دن بوقت مغرب محمد احمد خاں میرے پاس آئے اور مجھسے بولے کہ اسوقت ایک بڑے نامور رئیس کی عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اپنے موکل کو جس طرح ہو راضی کیجئے کہ مقدمہ سے وہ دست بردار ہو جائے۔ میں نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ موتی لال بڑی بانی کا آدمی ہے۔ وہ اس امر پر تلا ہوا ہے کہ کسی طرح مجرم کو سزا ہو اور پانچ روپیہ جرمانہ ہو مگر سزا ہو۔ غرض بہت دیر تک گفتگو کے بعد میں نے کہا کہ میں اس کو صبح کو بلواتا ہوں دیکھئے کیا کہتا ہے۔ احمد خاں مرحوم نے کہا آپ جو کہیں گے وہ کرے گا۔ میں نے کہا آپ بھی صبح کو آ جائے۔ میں نے آدمی بھیجکر دوسرے دن موتی لال کو بلوایا اور وکیل صاحب فریق ثانی بھی آئے۔ غرض ایک عرصہ تک حیلے حوالے موتی لال کرتا رہا۔ آخر میں دو ہزار روپیے پر رضامند ہوا جس میں سے ایک ہزار تو میری ہی فیس کے تھے۔ پانچسو میں لے چکا تھا اور بقیہ پانچسو مجھہ کو ملنے والے تھے۔ بقیہ ایک ہزار اپنی توہین کا معاوضہ موتی لال سمجھا۔ وہ کسی طرح دو ہزار پر بھی رضامند نہیں تھا۔ میرے جبر و اصرار پر راضی ہوگیا۔ آیندہ پیشی کے قبل ہی دو ہزار روپیے نصیر خاں مرحوم خود لیکر میرے پاس آئے اور ایک تحریری معافی نامہ لائے جو بروز پیشی مقررہ عدالت میں داخل کیا گیا اور مقدمہ بر بنائے معافی نامہ فیصل ہوا۔ نواب مرزا فیاض علی خاں مرحوم بعد انفصال مقدمہ میرے پاس میرا شکریہ ادا کرنے کیلئے آئے کہ میں نے ایسے ضدی اور ہٹی موکل کو رضامند کیا اور بروز پیشی اول ان کی حاضری پر اصرار نہیں کیا اور نہ کسی نوبت مقدمہ پر ان کی حاضری اجلاس پر ہوئی۔ جس کی وجہ سے وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر نواب فیاض علیخاں مرحوم

میرے بڑے دوست ہوئے اور ہمیشہ آنا جانا ان کے اور میرے درمیان میں رہا۔ اسی نوعیت کا ایک اور مقدمہ جس کا اوپر میں نے ذکر کیا ہے۔ اس کے واقعات یہ ہیں کہ مسٹر کاکا جو عرصۂ دراز تک لنکاشائر لائف انشیورنس کمپنی کے حیدر آباد میں ایجنٹ تھے اور جن سے حیدر آباد کے بہت لوگ واقف ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک عیسائی باورچی کو جب کہ وہ نوکری سے علیحدہ ہونے لگا اور ایک صداقت نامہ اس نے طلب کیا تو اچھا صداقت نامہ دینے کے عوض ایک کاغذ پر باورچی کی برائیاں لکھکر اس کو دیں۔ اور کہا کہ لو یہ تمہارا سرٹیفکیٹ ہے۔ اس کاغذ پر یہ لکھا تھا کہ برندہ قرطاس ہذا میرے پاس باورچی کی خدمت پر کل ایک مہینہ رہا آخر عاجز آکر اس کو علیحدہ کیا ہر وقت نشہ میں چور رہتا اور آدمیوں سے لڑتا جھگڑتا۔ مجھ سے بھی بد زبانی کرتا۔ اس کو اچھی طرح پکانا بھی نہیں آتا۔ یہ عیسائی باورچی خود پڑھ لکھ نہیں سکتا تھا وہ سمجھا کہ سرٹیفکیٹ ہے۔ اسکی تعریف کیگئی ہے۔ خوش خوش لیکر چلا گیا۔ حیدر آباد میں کچھ عرصہ تک پرتگالی نسل کے دو بھائی ڈوس سنیٹوس نامی بیارسٹری کرتے تھے۔ یہ باورچی اُن کے پاس ملازم ہونے کو گیا اور یہ صداقتنامہ دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کو دکھایا۔ وہ پڑھکر بہت ہنسے اور اس کا مضمون اس کو سنایا وہ سنکر ہکا بکا ہو گیا کہ یہ کیا آفت آگئی ہے۔ روزہ بخشوانے گئے اور گلے نماز پڑی۔ کاکا صاحب نے تو اچھا سلوک کیا۔ باورچی نے کہا جو کچھ صداقت نامہ میں لکھا ہے وہ غلط ہے۔ چونکہ وہ عیسائی تھا اور یہ دونوں بھائی بھی عیسائی تھے اوس نے ترحم اور امداد کا خواستگار ہوا۔ ان بھائیوں نے اس کو نوکر رکھ لیا اور کہا کہ گھبراؤ مت ہم مسٹر کاکا کو ٹھیک کئے دیتے ہیں۔ اس پارسی نے ایک کرسچین کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ غرض مسٹر ڈواس سنیٹوس نے ازالہ حیثیت عرفی کی عرضی استغاثہ بنام مسٹر کاکا لکھکر نظامت اول فوجداری بلدہ میں داخل کی۔ اس زمانہ میں ناظم اول مولوی سید بادشاہ حسن مرحوم تھے یعنی برادر بزرگ مولوی خواجہ حسن مرحوم جو بہت مشہور و ممتاز وکیل ہائیکورٹ تھے۔ غرض استغاثہ کو پڑھکر مجسٹریٹ یعنی ناظم اول فوجداری بلدہ نے مسٹر دوسنٹاس سے کہا کہ جس سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوی کیا جاتا ہے اس سرٹیفکیٹ کے مضمون سے جرم ثابت نہیں ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ مضمون حرف بحرف صحیح ہو۔ ایسی حالت میں لکھنے والا اس تحریر کا اس امر کا مجاز تھا کہ اصلی حالت کا اظہار کرے تاکہ دوسرے لوگ متنبہ ہوں اور ایسے شخص کو ملازم رکھکر زحمت میں نہ پڑیں۔ مسٹر دوسنٹاس اس وقت خاموش ہو گئے اور مجسٹریٹ سے کہا مجھے ایک مہلت دیجئے۔ میں اسکی

بسبت قانون متعلقہ دیکھکر آئندہ پیشی پر بحث کروں گا اور اس وقت تک مقدمہ نمبر پر نہ لیا جائے۔ مجسٹریٹ نے کانسل کی استدعا منظور کی۔ اس واقعہ کے دوسرے دن مسٹر ووسٹاکا تقریباً صبح کے آٹھ بجے میرے پاس آئے اور سرٹیفکیٹ کی ایک نقل جو اپنے دفتر کی مثل میں رکھی تھی وہ مجھکو دکھائی اور مجسٹریٹ کے بیان کا اعادہ مجھ سے کیا اور کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ مقدمہ چل سکتا ہے اور مجسٹریٹ کے خیال کی تردید کر سکتے ہو۔ پھر مجھ سے خوشامدانہ لہجہ میں کہا تم بڑے ہوشیار ہو اور وسیع معلومات قانونی رکھتے ہو۔ مجھے یقین ہے تم ضرور کوئی پہلو نکال لوگے اور ایک غریب کی امداد کروگے۔ تم بروز پیشی مجسٹریٹ کو قائل کرو۔ میں نے دریافت کیا کہ پیشی کب ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی آٹھ نو دن ہیں۔ میں اسلئے اس قدر قبل آیا کہ تم کو اگر کوئی قانون وغیرہ کی ضرورت ہو تو فراغت سے دیکھ لو اور تاریخ مقررہ پر کوئی دوسرا مقدمہ نہ رکھواؤ۔ میں نے تاریخ پیشی دریافت کر کے منشی سے کہا کہ پیشی کی کتاب میں لکھ لو اور منشی سے کہا کہ دیکھو تو اس تاریخ میں کون مقدمہ ہے اور کہاں ہیں۔ منشی نے کتاب پیشی دیکھ کر کہا۔ اس دن روز شنبہ ہے۔ ہائی کورٹ میں اس دن کوئی کام نہیں ہے وہاں تو اس دن انتظامی کام ہوتے ہیں۔ بہر حال ڈوسنٹاس سے وعدہ کر لیا کہ ان کے مقدمہ میں بحث کروں گا اور خدا نے چاہا تو ناظم کو قائل کر کے مقدمہ نمبر پر لے لوں گا۔ بروز پیشی مقررہ ڈوسنٹاس میرے پاس آئے اور اپنی گاڑی میں لیکر فوجداری گئے۔ بادشاہ حسن مرحوم کے چیمبر میں جاکر ان سے کہا کہ فلاں مقدمہ میں میں کونسل ہوا ہوں۔ وہ مقدمہ ابھی نمبر نہیں آیا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ استغاثہ جس الزام کے تحت ہے وہ الزام ملزم پر قائم نہیں ہو سکتا ہے۔ ازراہ کرم مثل منگوائیے۔ میں زیادہ وقت آپ کا نہیں لوں گا۔ مختصر سی سماعت کرونگا بادشاہ حسن مرحوم کو وہ مقدمہ یاد آگیا اور مجھ سے کہا کہ اس میں مسٹر ڈوسنٹاس کانسل ہیں انہوں نے بحث کی تھی اور ایک مہلت مجھ سے لی تھی اور کہا تھا کہ کوئی قانون اپنے دعوی کی تائید میں پیش کریں گے۔ شائد آپ کو اس لئے لائے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ بھی اس مقدمہ میں ہیں باہر کھڑے ہیں۔ ان کو بھی بلوائے لیتا ہوں۔ آپ مثل تو منگوائیے۔ چنانچہ صیغہ سے مثل طلب کی گئی جب مثل آگئی تو میں نے ایک چپراسی سے کہا کہ باہر ڈوسنٹاس صاحب کھڑے ہیں ان کو اندر بلا لو جب وہ اندر آگئے تو میں نے بحث شروع کی اور میں نے کہا کہ آپ کا جو خیال ہے کہ ملزم ممکن ہے ایسے خیالات کے ظاہر کرنے کے لئے مجاز ہوں اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ صحیح ہو۔ اس کے متعلق

میں نے کہا کہ پہلے آپ یہہ دیکھیے کہ جو مضمون سرٹیفکیٹ میں ملزم نے لکھا ہے کہ وہ دائم الخمر ہے۔ بد زبان ہے۔ اپنے کام سے ناواقف ہے۔ یہہ ایسے الفاظ ہیں کہ ان سے مستغیث کے چال چلن میں بٹا لگتا ہے یا نہیں اور اس کی نیکنامی کو نقصان پہنچتا ہے یا نہیں۔ اصول قانون شہادت کے لحاظ سے ہر شخص کی نسبت نیک گمان رکھنا چاہیے۔ تاوقتیکہ اس کے خلاف ثابت نہ کیا جائے اس سرٹیفکیٹ کے الفاظ سے علاوہ فوجداری دعوی کے دیوانی دعوی ناوان و ہرجہ بھی کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ایسے سرٹیفکیٹ سے اس کو کہیں نوکری نہیں ملیگی جس سے مالی نقصان عائد ہوسکتا ہے اور یہہ امر ثابت کرنے پر کہ وہ اپنے فن میں کس قدر ماہر اور کتنی تنخواہ پر وہ لوگوں کے ملازم رہا کیا۔ اس کے اندازہ پر سینکڑوں روپیہ وہ دعوی تاوان کے ذریعہ عدالت دیوانی سے حاصل کرسکتا ہے۔ مگر سر دست مستغیث فوجداری میں رجوع ہوا ہے۔ آپ جو کہتے ہیں کہ ملزم نے حقیقت حال لکھی ہو اس لیے جسٹفائیڈ (justified) یعنے مجاز لکھنے کا تھا یہہ امر وہ ہے کہ تاوقتیکہ ملزم ثابت نہ کرے تشنہ ثبوت ہے۔ یہہ ملزم کا فرض ہے کہ وہ ثابت کرے۔ قبل از وقت یہہ خیال لانا کہ ملزم حق بجانب تھا خلاف قانون ہے۔ آپ مقدمہ نمبر پر لیجئے۔ ملزم کو طلب کیجئے اور دریافت کیجئے کہ سرٹیفکیٹ انہیں کا لکھا ہوا اور دیا ہوا ہے۔ جب ملزم سرٹیفکیٹ کا لکھنا اور دینا قبول کرلیگا اس کے بعد دریافت طلب یہہ امر رہجاتا ہے کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے اوس کو ثابت کرسکتا ہے۔ اگر نہ ثابت کرے تو بیشک ملزم مرتکب جرم ازالہ حیثیت عرفی کا ہے۔ ممکن ہے کہ ملزم کہے کہ سرٹیفکیٹ اس کا دیا ہوا نہیں ہے۔ یا یہہ کہے کہ سرٹیفکیٹ اسی کا عطیہ ہے مگر وہ حق بجانب تھا۔ اس حالت میں مستغیث کا فرض ہوگا کہ وہ اس امر کو ثابت کرے کہ سرٹیفکیٹ ملزم کا دیا ہوا ہے۔ اور ملزم کو دوسرا جز ثابت کرنا ہوگا کہ حق بجانب تھا۔ یہہ سب سننے کے بعد مجسٹریٹ نے مجھ سے کہا کہ جرم ازالہ حیثیت عرفی کے ارتکاب کے لیے ایک جز اور بھی ہے۔ اس پر آپ نے غور کیا۔ میں نے پوچھا وہ کیا فرماے مجسٹریٹ بولے کہ کافی شہرت کا ہونا یعنی (publication) میں نے کہا انگریزی ہائی کورٹوں کے بہت سے نظائر میں یہہ طے پاچکا ہے۔ اس دفعہ کے اغراض کے لیے جس شخص کی نسبت جو کچھ مزیل حیثیت عرفی لکھا جائے۔ علاوہ اس کے شخص ثالث اس کو دیکھ لے یا دیکھنے کا احتمال ہو تو کافی شہرت ہے۔ اگر آپ کہیں تو اس قسم کے نظائر پیش کرسکتا ہوں۔ بادشاحسن صاحب بولے جب آپ کو ایسی نظیریں دیں تو مجھ کو یقین ہے کہ آپ کا بیان صحیح ہے۔ تاہم آئندہ پیشی پر

ایسی نظیریں بھی آپ لائے۔ اس وقت مقدمہ میں نمبر پر لیتا ہوں۔ اہلکار پیشی سے مجسٹریٹ نے کہا ملزم کو طلب کرو اور آیندہ پیشی کی نسبت مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کی سہولت کی جو تاریخ ہے رکھوا دیجئے۔ میں نے مجسٹریٹ کا شکریہ ادا کیا اور کمرہ کے باہر آیا۔ پھر کیا تھا چپراسیوں نے انعام کے لئے گھیر لیا اور ڈوسنٹا سوحٹ بار بار میرا شکریہ ادا کرتے رہے اور کہا کہ میں اور میرا غریب موکل تمہارے بیحد ممنون احسان ہیں جس طرح اس غریب کا ہاتھ پکڑا ہے اس مقدمہ کو تمہیں انجام ہونچاؤ۔ میں بہ حیثیت جونیر کے تمہارے ساتھ رہونگا مختصر یہ ہے کہ مسٹر کاکا آیندہ پیشی پر طلب کئے گئے اور ان سے استغاثہ کے متعلق جواب لیا گیا وہ جیسے گم ہوئے اور دل میں کہنے لگے ہوں گے کہ سرٹیفکیٹ میں چند الفاظ کیا لکھے کہ الٹی آنتیں میرے گلے میں پڑیں۔ یہ تو تل کا تاڑ سنگ اور بات کا بتنگڑ بنا۔ قبل اسکے کہ وہ جواب ادا کریں۔ انہوں نے ایک مہلت عدالت سے لی اور آیندہ پیشی کے قبل غریب باورچی کو کچھ دیکر راضی کر لیا۔ پیشی مقررہ پر باورچی حاضر نہیں ہوا۔ اور مقدمہ عدم پیروی میں خارج ہو گیا۔ مسٹر کاکا اس پیشی پر گئے مگر میں نہیں گیا۔ اور نہ مستغیث کو بھیجا۔ ایک اور مقدمہ کا ذکر کرتا ہوں۔ ڈاکٹر احمد مرزا پر جو اس زمانہ میں ہلتھ آفیسر تھے یکے بعد دیگرے دو مقدمات فوجداری دائر ہوئے اور ڈاکٹر احمد مرزا میرے پاس دوڑے ہوئے آئے۔ دونوں مقدمات میں نے خارج کروائے ڈاکٹر احمد مرزا محکمہ صفائی کے ہلتھ افسر تھے۔ اور دونوں مقدمات کے مستغیث وہاں کے ملازم تھے۔ دونوں مقدمات میں الزام یہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مارا گالیاں دیں۔ اپنے ماتحتوں سے ہمیشہ بد زبانی کرتے ہیں۔ ان دونوں مقدمات میں جو چند مہینوں کے فاصلے سے یکے بعد دیگرے۔ نظامت اول فوجداری بلدہ میں دائر ہوئے تھے۔ میں نے دونوں مقدمات کے مستغیثوں جو بڑے ہوشیار لوگ تھے سو سو یا سوا سو کے ماہوار یاب ملازم تھے۔ ان پر سوالات جرح کئے کہ بغیر اخذ شہادت عدم ثبوت میں مقدمے خارج ہو گئے۔ ڈاکٹر احمد مرزا نے بہت شکریہ ادا کیا۔ وہ میری فیس کیا دیتے ایک دعوت تک نہ دی۔ میرے قدیم دوست تھے۔ فیس ان سے کیا لیتا مگر دنیا کا قاعدہ ہے کہ ایسے موقع اور ایسی حالت میں باظہار تشکر دعوت ضرور کرتا اور بہ اظہار مسرت چند احباب کو اس دعوت میں مدعو کرتے۔ صرف یہی دو مقدمہ نہیں۔ بہت سے ایسے مقدمات فوجداری میں نے خارج کروائے کہ مجرد مستغیث پر جرح کرکے نوعیت دعویٰ کی ثابت کی یا اس قسم کے سوالات کئے

کہ مستغیث کے بیان سے یہہ ثابت کروادیا کہ اس کے پاس اس واقعہ کی شہادت نہیں ہے ۔ اور مقدمات دفعہ ۲۲۳ ضابطہ فوجداری کے تحت بغیر اخذ شہادت خارج ہوتے گئے ۔ مذکورالصدر مقدمات سنہ ۱۸۹۶ء میں فیصل پائے تھے ۔ اس سنہ کا یہہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے ۔ مسلم جنگ مرحوم جو نظم جمعیت کے عربوں کے جمعداروں میں تھے ۔ انہوں نے چنچیہ دروازہ پر اپنی جانب سے ایک پل تعمیر کرانے کا اعلان کیا ۔ اور صیغہ تعمیرات سرکار عالی کے ذریعہ تعمیر کی تکمیل کا انتظام کیا گیا ۔ صیغہ مذکور نے تعہد دینے کا اشتہار دیا ۔ بہت سی درخواستیں گزریں ۔ کریم بھائی فرزند کلاں حاجی سجن لعل مرحوم کا جو اپنی داد و دہش کے لئے مشہور تھے اور تاجر تھے ٹنڈر منظور ہوا اور کام کریم بھائی کے حوالہ کیا گیا ۔ حاجی سجن لعل تو بیشک کہتی تھے اور اس وقت زندہ بھی تھے ۔ مگر نہ معلوم کیوں اپنے بڑے فرزند کی مالی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا تھا ۔ کچھ دنوں اپنے مختصر سرمایہ سے کام کریم بھائی نے چلایا پھر روپیوں کی ضرورت داعی ہوئی ۔ میرے پاس اور طالب امداد ہوئے میں نے ان کی اعانت کا وعدہ کیا اور ایک تحریری معاہدہ کے ذریعہ میرے اور ان کے درمیان معاہدہ شراکت یوں طے پایا کہ میں ان کا فینانشیر اور بیانکر بنوں اور بذریعہ چک حسب ضرورت وہ رقم مجھ سے لیا کریں ۔ ضرورت ایک تو مال مصالحہ منگانے و فراہم کرنے کیلئے دوسرے یہہ کہ ہر اٹھواڑے میستری اور مزدوروں کو مزدوری تقسیم کرنے کے لئے روپیوں کی ضرورت ہوتی تھی میں نے روپئے دئے اور جب بل بنا کر تعہدار رقم تعمیرات سے حاصل کرتا ہے وہ اصل رقم جس قدر اس تاریخ تک مجھ سے وصول ہوئی اس کے علاوہ منافعہ میں سے چوتھائی حصہ مجھکو دیا کرے میرے دئے ہوئے نمونہ کے بموجب چک کے فارم چھپوائے گئے تھے ۔ تقریباً ایک سال کے کچھ اوپر تک یہہ معاملہ چلتا رہا ۔ بعد کو کریم بھائی جو وزرا او باش منش تھے اچھی نگرانی نہیں کر رہے تھے نہ ان کی جانب سے جو سوپروائزر تھا وہ معقول نگرانی کر رہا تھا ۔ میستریوں نے خورد برد کرنی شروع کی ۔ ظاہر ہے کہ عدم نگرانی کی وجہ سے کس طرح کا کام ہو ضرور خراب اور برباد ہو گا ۔ سرکاری انجینئروں کی رپورٹ پر کریم بھائی سے کام لیلیا گیا ۔ ہمارے معاہدوں کا بھی خاتمہ ہو گیا ۔ مگر میرا مالی نقصان کریم بھائی نے نہیں کیا ۔ مجھ سے بہت راست بازی سے معاملہ کیا اس واقعہ کے اظہار سے یہہ مطلب ہے کہ مسلم جنگ الاپل جو چنچیا دروازہ پر اس وقت قائم ہے اسکی تعمیر میں میں نے مالی امداد ابتداء میں دی اور اس کی تعمیر ابتدائی بھی میری رہین منت ہے

مولوی عبدالوہاب منطقی بہاری مرحوم بوجہ متوطن بہار ہونے کے کبھی کبھار مجھ سے ملنے آیا

کرتے تھے وہ اس زمانہ میں مدرسہ نظامیہ کے مدرس تھے۔

۱۸۹۹ء میں میرے پاس ایک صاحب کو لیکر آئے جن کا نام انہوں نے امیر الدین بتلا کر ان کا تعارف مجھ سے کرایا اور کہا کہ یہہ صاحب مظلوم ہیں۔ لائق ہمدردی اور قابل امداد ہیں۔ آپ ہمیشہ مظلوموں کی امداد کرتے ہیں۔ ان کی بھی دستگیری کیجئے میں نے پوچھا کہ ان پر کس قسم کا ظلم ہوا ہے اور مجھ سے کس قسم کی امداد کے طالب ہیں عبد الوہاب مرحوم نے ایک طولانی قصہ بیان کیا۔ جس کا خلاصہ یہہ تھا۔ کہ امیر الدین صاحب کا وطن موضع قندہار ضلع ناندیڑ ہے اور وہ مولوی انوار اللہ خاں مرحوم (بعد کو فضیلت جنگ ؒ وزر صدر الصدور محکمۂ امور مذہبی سرکار عالی) کے ہم وطن اور عزیز قریب ہیں اور مدرسہ نظامیہ کے اصل میں بانی امیر الدین ہیں۔ اور جس پر اپنا بہت سا روپیہ اور وقت صرف کیا مدرسہ قائم ہونے اور کچھ عرصہ تک رہنے کے بعد مولوی انوار اللہ خاں صاحب کو بوجہ عزیز ہونے کے اور نیز بایں وجہ کہ ان کا قیام مستقلانہ طور سے بلدہ میں ہے۔ وہ اچھی طرح مدرسہ کا انتظام اور نگرانی کر سکیں گے۔ اپنا لفٹنٹ بنایا اور ان پر اعتماد کلی کیا اور جب کہ مدرسہ چل نکلا۔ آمدنی کے ذرائع بھی پیدا ہو گئے تو انوار اللہ صاحب نے امیر الدین کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ اس لئے امیر الدین قانونی امداد لینے کے لئے آئے ہیں۔ یہہ سب کہنے کے بعد مولوی عبد الوہاب مرحوم نے جیب میں سے ایک پوٹلی نکال کر میرے سامنے رکھدی اور بولے کہ گو یہہ ناچیز رقم آپ کی فیس میں شمار ہونے کے لائق نہیں ہے۔ اس کو صرف خرچ سواری کا سمجھ کر قبول کیجئے اور بوجہ ہم وطن ہونے کے میرا کچھ حق آپ پر ضرور ہے۔ اسلئے میری استدعا قبول کیجئے اور یہہ مقدمہ لیجئے۔ اور یہہ مختصر رقم قبول کیجئے۔ بعد کامیابی اس رقم کی دو چند آپ کو دیجائیگی۔ میں نے پوچھا کہ آخر یہہ رقم ہے کتنی۔ انہوں نے دبی زبان سے کہا کل دو سو روپیہ ہیں۔ سر دست اتنی رقم بھی امیر الدین صاحب پر بار ہے میں خاموش ہو گیا۔ اور منشی سے کہا کہ روپیہ گن کر رکھ لو۔ اس زمانہ میں بھی معتمد عدالت امور عامہ صیغہ تعلیم کا بھی وہی معتمد ہوا کرتا تھا علاوہ اس کے کورٹ آف وارڈز اور محکمۂ امور مذہبی کا بھی وہی معتمد ہوتا تھا۔ مولوی عزیز مرزا ہوم سکرٹری تھے۔ صیغہ ہائے عدالت اور تعلیم انہیں کے تحت تھے۔ ہرمز جی وکیل (بعد کو ہرمز جنگ) جب شہر بدر ۱۸۹۶ء کئے گئے تو مولوی عزیز مرزا صاحب جو ہرمز جی کے مددگاروں میں سے تھے ہوم سکرٹری منصرمانہ طور سے مقرر کئے گئے تھے

تین چار سال ہوم سکرٹری کی خدمت ادا کرنے کے بعد سازشوں کا ایک شکار ہو کر پیڑ کے اول تعلقدار بنا کر بھیج دیئے گئے تھے۔ چار پانچ سال کے بعد ہائی کورٹ کی ججی پر ان کا تقرر کیا گیا۔ تقریباً دو سال ہائی کورٹ کے جج رہے۔ اس کے بعد سر بلند جنگ مرحوم جو اس وقت ہوم سکرٹری تھے وہ چیف جسٹس بنائے گئے اور مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سکرٹری ہو گئے۔ حضرت غفران مکان کے آخر زمانہ میں مولوی عزیز مرزا صاحب ۱۹۱۱ء میں شہر بدر کئے گئے۔ اور ۱۹۱۲ء میں بمقام لکھنو انتقال کر گئے۔ یہ مختصر ہسٹری مولوی عزیز مرزا کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ میں نے مولوی امیر الدین والا مقدمہ لے لیا۔ سارے واقعات متعلق بہ مدرسہ نظامیہ لکھ لئے اسی کی بناء پر ایک درخواست مرتب کی اور مولوی عزیز مرزا کے پاس پیش کی۔ مولوی انوار اللہ خاں جواب دہی کے لئے طلب کئے گئے۔ وہ خود تو حاضر اجلاس نہیں ہوئے ان کی جانب سے مولوی حسن علی طلسمی وکیل درجہ اول پیروی کے لئے اور ان کے ساتھ ایک صاحب جن کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا ہے وہ مولوی انوار اللہ خاں کے غالباً عزیز تھے اور شاگرد بھی تھے۔ مولانا کی خدمت میں ہمیشہ رہتے تھے جس وقت کہ غالباً ۱۹۱۳ء میں محی الدولہ نرخی سے امور مذہبی کی خدمت صدر الصدوری جو ان کی آبائی لیلی گئی تو مولوی انوار اللہ خاں صاحب صدر الصدور مقرر کئے گئے اور انہوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں انہیں صاحب کو جو طلسمی وکیل کیساتھ پیروی کو آتے تھے۔ گلبرگہ کے روضۂ بزرگ کی جاگیر وغیرہ کے انتظام کے لئے بتقرر ماہوار دو ڈھائی سو روپیہ منتظم مقرر کر دیا۔ ان بزرگ کو بڑی دلچسپی اس مقدمہ میں سے تھی۔ چونکہ دلی خیر خواہ مولوی انوار اللہ خاں کے تھے۔ طلسمی وکیل سے زیادہ تر دلدہی کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کرتے تھے۔ فریقین میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ مدرسہ کا قبضہ کلیتہً اسی کے حوالہ ہو۔ جزو کل سیاہ و سفید کا وہی مالک ہو۔ امیر الدین صاحب اپنے گاؤں میں مختصر سے زمیندار تھے اور بلدۂ حیدرآباد میں تو ان کا کوئی اثر و رسوخ تھا ہی نہیں برخلاف اس کے مولوی انوار اللہ خاں اس زمانہ میں بھی بمقابلہ امیر الدین کے بہت با اثر تھے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب پر مختلف ذریعوں سے اس قسم کا زور ڈالا گیا کہ مدرسہ نظامیہ مولوی انوار اللہ خاں ہی کے قبضہ میں دیدیا جائے۔ ابر جب چھا جاتا ہے یا دل منڈلانے لگتے ہیں تو اکثر مینہ بھی برسنے لگتا ہے۔ مولوی عزیز مرزا کی طرز گفتگو سے میں بھانپ گیا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا

ہے۔ اس لئے میں نے ایک درخواست اس مضمون کی دی کہ سب سے بہتر یہہ ہے کہ مدرسہ زیر نگرانی سرکار آجائے۔ انتظام و نگرانی کے لئے ایک مینجنگ بورڈ انتظامیہ انجمن قائم ہو۔ چنانچہ یہہ درخواست میری منظور ہو گئی۔ جب سے ابتک مدرسہ مذکور ایک کمیٹی کے تحت چلا آتا ہے۔ گو اس واقعہ کے بہت دنوں کے بعد جبکہ مولوی انوار اللہ خاں برسر اقتدار ہو گئے تھے تو مدرسہ مذکور کے انتظامات پر بالکل حاوی ہو گئے تھے۔ یہہ بھی میں نے سنا کہ سرکاری امداد میں بھی اضافہ کروایا تھا۔ مختصر یہہ کہ مدرسہ نظامیہ ایک کمیٹی کے تحت اب بھی ہے جس کی ابتداء میں نے کی تھی۔ اس زمانہ کا ذکر ہے کہ انور الدین مرحوم جنہوں نے مجھ سے قانون پڑھا تھا اور بعد کو وکالت کا امتحان پاس کرکے وکالت کرنے لگے تھے وہ جاگیردار بھی تھے اور یومیہ دار بھی تھے جن کا انتقال عالمگیر انفلوئنزا ۱۳۳۸ھ ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ مرتے دم تک مجھ سے بہت محبت کرتے اور اپنا بزرگ سمجھتے رہتے۔ بے حد مطیع و فرمانبردار تھے۔ ان کے مرنے کا مجھ کو بہت قلق ہے۔ انہوں نے میرے اور اپنے چند احباب کے مشورہ اور مالی امداد سے ایک کلب قائم کیا جس کا نام اسٹیٹ کلب رکھا گیا۔ اور ایک بنگلہ نام پلی اسٹیشن کے قریب جو سڑک باغ عامہ کو جاتی ہے اس کے موڑ پر پچاس روپیہ کرایہ پر لیلیا گیا جس میں اب جوزف ہے۔ فرنیچر وغیرہ راجہ رائے رایاں حال راجہ رائے رائیاں شام راج بہادر کے والد آنجہانی نے دیا۔ علاوہ اس کے جس قدر زر چندہ ماہانہ ہم لوگ دیتے تھے راجہ رائے رائیاں آنجہانی اس سے بہت زیادہ دیتے تھے۔ اس کلب میں مشاعرے بھی مہینہ دو مہینے کے بعد ہوتے تھے۔ راجہ رائے رائیاں آنجہانی تو ضرور شریک ہوتے۔ علاوہ ان کے سرکشن پرشاد بہادر جو اس وقت تک مدار المہام نہیں ہوئے تھے۔ صرف پیشکار ہی تھے کئی دفعہ شریک ہوئے۔ مدار المہام وقت نواب سرو قار الامراء تھے ان کے فرزند اکبر نواب سلطان الملک بہادر بھی شریک مشاعرہ ہوتے تھے۔ یہہ کلب بہت عمدہ قیام گاہ و تفریح کا بھی تھا اور بہت سے لوگوں نے اس میں قیام بھی کیا تھا۔ منجملہ جن کے مولوی عبد الحلیم شرر جن کا ابتدائی تقرر سرو قار الامراء نے پائیگاہ میں کرکے نواب ولی الدولہ کے ہمراہ رکاب جب بغرض تعلیم انگلستان بھیجا۔ کئی سال کی واپسی کے بعد شرر کا تقرر امور مذہبی میں کیا گیا۔ حضرت سکینہ بنت حضرت امام حسینؓ کے جھوٹے حالات جو رسالہ گداز میں لکھے تھے۔

اس کی بنا پر ملازمت سے علیحدہ کئے گئے تھے وطن چلے گئے۔ پھر ۱۹۰۱ء جب حیدرآباد آئے تھے تو اون کو اس کلب میں بطریق مہمان مقیم کیا۔ میر نادر علی برتر کچھ عرصہ تک اس کلب میں مہمان رہے اور بھی بہت سے لوگ رہے۔ افسوس کہ چار پانچ سال قائم رہنے کے بعد بوجہ قلت آمدنی و کثرت مصارف یہہ کلب معدوم ہو گیا۔ اس کلب کا ایک یادگار واقعہ یہہ بھی ہے کہ۔

نواب فصاحت جنگ کا ذکر

جب حضرت امیر مینائی یادگار منشی مظفرالدین خاں دبیر بتلاش روزگار حیدرآباد معہ اپنے شاگرد رشید حافظ سید جلیل حسن صاحب المخاطب بہ نواب فصاحت جنگ بہادر اور اپنے فرزند نواب اختر جنگ بہادر حال ناظم امور مذہبی وارد حیدرآباد ہوے تو اسٹیشن سے لاکر ہم لوگوں نے ان حضرات کو اس کلب میں مقیم کیا اور ایک چھوٹی سی ٹی پارٹی (Zee Party) جس کا انتظام پہلے سے کر لیا گیا تھا اور کچھہ لوگ اُن کے خیر مقدم کیلئے مدعو کئے گئے تھے۔ کلب میں پہونچتے ہی ان کو دی۔ یہہ واقعہ دونوں نوابوں فصاحت جنگ اور اختر جنگ کو یاد ہے۔ اس واقعہ کے کئی روز بعد بمقام افضل گنج ایک مکان بکرایہ لیکر یہہ پارٹی اس میں منتقل ہو گئی اور مہاراجہ سرکشن پرشاد ان کے اخراجات کے کفیل ہوئے۔ امیر مینائی صاحب کا چند ہی دنوں کے بعد انتقال ہو گیا۔ گویا حیدرآباد کی مٹی ان کو یہاں کھینچ لائی تھی۔ افسوس کہ انہوں نے اپنے فرزند اور شاگرد کا زمانۂ اقبال نہ دیکھا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بڑی اولالعزمی سے دو تین سال تک بعد وفات امیر مینائی صاحب اُن کے شاگرد و فرزند کے اخراجات کے کفیل رہے۔ تا اینکہ ان دونوں کو نوکریاں دلوائیں اور ہمیشہ کے لئے مستغنی کر دیا۔ سچ پوچھو تو مہاراجہ بہادر کا بڑا احسان ان دونوں پر ہے۔ جس سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

شادی کا ذکر

سنہ ۱۹۰۰ء کا سال میرے لئے بہت مبارک ہوا جس نے میری کتاب زندگی کا نیا ورق الٹا۔ متاہلانہ زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ جس میں دونوں پہلو ہوتے ہیں تکلیف و راحت کاندھے پر رکھنے کا زمانہ شروع ہونیوالا ہے۔ جب کہ پہلی نسبت سے جس کی کشش مجھے کانے کوسوں کلکتہ سے حیدرآباد کھینچکر لائی تھی۔ میں نے ہاتھ کھینچا تو کچھ عرصہ تک مجھے شادی کے نام سے تنفر سا ہو گیا تھا اور

دل میں ٹھان لیا تھا کہ مدت العمر یکہ و تنہا و آزاد رہوں گا۔ اور تجرد کی زندگی بسر کروں گا بعض قصص اور کہانیوں میں بیوی کے ستائے ہوئے مردوں کی دُکھ درد کی بپتا بھری داستانیں پڑھ پڑھ کر مجرد رہنے کا خیال اور پختہ ہو گیا تھا۔ بعض دوستوں سے اس خصوص میں لمبی لمبی بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ بعض احباب میرے ہم خیال ہو کر میری ہاں میں ہاں ملاتے اور بعض مخالفت کرتے۔ شادی شدہ زندگی کی بہت سی برکتیں بیان کرتے اور کہتے "ہر کہ زن ندارد۔ آرام تن ندارد" بعض نے کہا یہی زمانہ شادی شدہ زندگی کی بہاریں لوٹنے کا ہے۔ شباب کی اولاد بھی توانا و تندرست ہوتی ہے اور والدین کو کافی موقع بچوں کی تعلیم و تربیت کا عہد شباب ہی میں رہتا ہے۔ خصوصاً پردیس میں جہاں عزیز و اقارب بھی پاس نہوں۔ اس پر بیوی کا نہ ہونا قیامت ہے۔ بیماری دکھی میں ایک سچا ہمدرد بڑا کام دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ میرے خیالات میں تذبذب پیدا ہوا۔

زمانہ علالت میں دو تین بار مجھے ایک سچے ہمدرد کی ضرورت محسوس ہوئی یوں بھی تنہائی بہت کھلنے لگی۔ اب میں نے شادی کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس کا تذکرہ چند احباب سے کیا۔

جب میرے دوستوں کو شادی کرنے کا ارادہ معلوم ہو گیا تو چند ہی دنوں میں بہت سے پیغام آئے۔ جاگیرداروں کے طبقہ سے بھی اور اعلیٰ عہدہ داروں کے ہاں سے بھی شادی کے بارہ میں کہ میری بیوی کن صفات سے متصف ہو۔ میرے خاص خیالات تھے۔ اس لئے انتخاب نسبت میں بڑی بڑی دقتیں پیش آنے لگیں۔ انہیں اقسام کی حرکا سامنا بزمانہ قیام پٹنہ اور کلکتہ ہوا تھا۔ وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا اور انسان بھی کیا انسان تھے۔ ایسے سرشت اور خصائل کے انسان موجودہ ناہنجار زمانہ میں چراغ لیکر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ میرے دوستوں اور شناسوں کا حلقہ تو بہت وسیع تھا مگر ان میں چند اشخاص ایسے تھے جن کو میرے ساتھ سچی محبت اور ہمدردی تھی میرے نفع و نقصان میرے نیک و بد میرے بھلے وہ برے کو اپنا نفع و نقصان اپنا بھلا و برا تصور کرتے تھے۔ اس لئے میرا متاہل ہونا میرے لئے مفید و نفع بخش سمجھکر ان کو بڑی فکر اور بڑی جستجو تلاش نسبت میں تھی۔ انہیں مخلصان خاص میں خدا غریق رحمت کرے مولوی میر لطف علی صاحب سابق وکیل ہائی کورٹ جن کا تذکرہ اوپر کئی جگہ آچکا ہے۔ یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ ان سے اور ڈاکٹر صفدر علی مرزا صاحب مرحوم سے جو بعد کو میرے خسر ہوئے

قدیم دوستانہ تھا اور میر صاحب کی اہلیہ اور ڈاکٹر صاحب کے اہل خانہ سے بھی بہت دوستانہ ہی نہیں تھا بلکہ بہنا پا تھا ۔ غرض میر صاحب کی سعی و کوشش سے میری نسبت ڈاکٹر صاحب کے ہاں ٹھہری ۔ اس خصوص میں میرے قدیم دوست مولانا سید مرتضیٰ فلسفی مرحوم نے بھی میری وکالت کی اور عباس علی شریف مرحوم اور مولوی سید حسین صاحب بلگرامی مخاطب نواب عماد الملک کا بھی میں شکر گزار ہوں ۔ جب کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے نواب عماد الملک مرحوم سے میرے خاندان وغیرہ کے حالات دریافت کئے ۔ بایں خیال کہ ان کے خاندان کا تعلق بھی زمانہ دراز سے صوبہ بہار سے خصوصاً پٹنہ سے رہا تھا تو نواب صاحب مرحوم نے پر زور لفظوں میں میری سفارش کی ۔ ایک مشکل یہہ آن پڑی تھی کہ علاوہ میری نسبت کے اور کئی پیغام ڈاکٹر صاحب کے ہاں موجود تھے اور بعض کے لئے ڈاکٹر صاحب اور انکی اہلیہ پر زور ڈالا جا رہا تھا کہ میرے پیغام کے جانے کے قبل جو پیغامات جا چکے تھے ان میں سے کسی ایک کو قبول کریں ۔ میری طرف سے وکالت کرنے والوں میں میر لطف علی صاحب اور مولوی سید مرتضیٰ فلسفی تھے ۔ میر لطف علی صاحب کی اہلیہ میری نسبت کی نسبت زور دے رہی تھیں چنانچہ میری نسبت ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ان کی اہلیہ مرحومہ نے قبول کر لی مگر سات آٹھ مہینے کے رگڑے جھگڑے کے بعد قصہ مختصر یہہ کہ ۲۳ ڈسمبر ۱۹۰۱ء کو میری شادی ہوئی ۔ میرے خسر مرحوم اور میری خوشدامن صاحبہ مرحومہ نے دل کھول کر اپنے حوصلے نکالے ۔ وجہ یہہ تھی کہ میری خوشدامن مرحومہ کی میری بیوی پہلی اولاد وہ بھی بڑی منتوں مرادوں کی تھیں ۔ تاریخ شادی کے بہت دن پہلے سے زنانہ اور مردانہ میں مہمانوں میں تانتا لگ گیا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب کا کنبہ بہت وسیع تھا ۔ سب مہمانوں کی خاطر مدارات فراخ دلی سے کی جا رہی تھی ۔ شادی کے دن زنانہ اور مردانہ میں اور بھی مہمان بھر گئے بقول داغ کے "کہ گھر بھر گیا مہمان آتے آتے" ۔ تقریباً کل اعلیٰ عہدہ داروں اور ان کا زنانہ شریک دعوت تھا ۔ ڈاکٹر صاحب بہت با اثر اور با وقار تھے ۔ سارا حیدرآباد اون کی صداقت کا قایل تھا اور ان کا احترام کرتا تھا حاجی ڈاکٹر صفدر علی کے نام سے حیدرآباد کا بچہ بچہ واقف تھا ۔ میری بیوی ماں کی دلاری اور باپ کی لاڈلی تھیں ۔ چنانچہ بعد عقد نکاح جب کہ میری بیوی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ڈاکٹر صاحب نے دیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور زبان سے یہہ الفاظ کہے ۔ بجد خدا و

و پنجتن کے آپ کے سپرد اپنی لخت جگر کو کرتا ہوں۔ اس کا خیال رکھیگا کہ میں نے اسے بہت ناز و نعم سے پالا ہے۔ جہیز از قسم زیورات و سامان خانہ داری وغیرہ ڈاکٹر صاحب نے بہت کچھ دیا۔ امرائے حیدرآباد جس قدر اور جس طرح کی چیزیں جہیز میں دیتے ہیں وہی دیا اس میں کوتاہی نہیں کی۔ میری خوشدامن مرحومہ علاوہ عربی فارسی کی عالمہ ہونے کے بہت سلیقہ شعار تھیں اس لئے اور بھی اشیاء جہیز کے انتخاب میں انہوں نے سلیقہ اور عمدہ مذاق سے کام لیا۔ میری خوشدامن مرحومہ سے اور اعلیٰ عہدہ داروں کی بیویوں سے چونکہ بہت اتحاد و دوستانہ تھا اس لئے بہت نے شرکت کی اور سب نے سلامی بھی علیٰ قدر حیثیت دی۔ کسی نے دو اشرفیاں کسی نے پانچ اشرفیاں کسی نے پچاس روپیہ کسی نے سو روپیہ۔ غرض سلامی کے روپیہ ہزاروں ہو گئے تھے۔ جہیز میں سامان خانہ داری اس قدر آیا تھا کہ کئی کمرے بھر گئے۔

اللہ کے فضل و کرم سے مجھے خدا نے ایسی بیوی دی جو ظاہری وجاہت حسن صورت حسن سیرت ہنرمندی سلیقہ شعاری سے مالا مال ہے۔ بہت سے لوگوں کو رشک اس بات کا ہوا کہ ان کے ہاں نسبتیں منظور نہ ہوئیں وہ منہ دیکھتے رہ گئے اور میں بازی لیگیا ڈاکٹر مرزا کریم خاں مخاطب بہ خدیو جنگ مرحوم نے صاف لفظوں میں محبت سے کہا کہ " ہمایوں مرزا تم بہت خوش نصیب ہو کہ تم کو ایسی بیوی ملی۔ میری بیوی (بیننے طیبہ بیگم مرحومہ بنت نواب عماد الملک مرحوم) اپنے بھائی سید عقیل کیلئے بہت کوشش کر رہی تھیں مگر وہ ناکام رہیں" صرف ڈاکٹر خدیو جنگ کے برادر نسبتی سید عقیل جو اب سر عقیل جنگ ہیں۔ صدر المہام ہیں۔ بلکہ اور بھی بڑے بڑے گھرانوں کی نسبتیں آئی گئیں اور نامنظور ہوتی گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ قسمت قسمت کی بات ہے۔ اچھا جوڑا گھوڑا نصیبوں سے ملتا ہے۔ عورتوں کا تو مقولہ ہے کہ بوقت ولادت آسمان پہ اللہ میاں لڑکی کا نکاح اس لڑکے سے کر دیتے ہیں جس کا عقد دنیا میں بعد کو ہونے والا ہے۔ اصلیت و عدم اصلیت اس مقولہ کی کچھ بھی ہو۔ یہ امر ضرور ہے کہ شادی بیاہ کے معاملہ کا تعلق قسمت سے ہے اور قسمت کے مالک اور چلانے والے اللہ میاں ہی ہیں۔ انہیں کے ید قدرت میں مقدرات کی باگ ہے۔ گھر میں بیوی کے آنے کے بعد گھر کا رنگ ہی دوسرا ہو جاتا

ہے۔ رونق ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ عورت کا قدم جب گھر میں آتا ہے تو عورتیں کہتی ہیں کہ لچھمی یعنے ہندوں کے اعتقاد کے لحاظ سے دولت کی دیوتا ئن آئی۔ میرے خیال میں یہ مثل اس وقت صادق آتی ہے جب کہ نیک اور سلیقہ شعار ہو۔ یعنی ایسی خصلت کی عورت اپنی ہنرمندی سلیقہ شعاری اور عقلمندی سے انتظام خانہ داری اچھی طرح کرتی ہے۔ اور جو کچھ شوہر کی آمدنی ہوتی ہے اس میں سے پس انداز کرتی رہتی ہے لامحالہ ایک وقت میں اچھا خاصہ سرمایہ جمع ہو جاتا ہے۔ جس کی تعبیر عورت کے قدم سے یا لچھمی سے کیجاتی ہے۔ عورت کے یہ حسن انتظام و سلیقہ شعاری بڑی اعلیٰ صفتیں ہیں۔ آمدنی کے روپیئے اس طرح صرف کئے جائیں کہ صرف کرنے والے کو نہ کوئی مسرف کہے اور نہ بخیل ایک پھوڑ عورت۔ اور ایک سگھڑ عورت کا فرق انتظام خانہ داری و مہمان داری وغیرہ سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک پھوڑ بیوی جس مرد کے پاس سے باوجودیکہ اس کا شوہر دو ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ پاتا ہے یا کسی پیشہ سے اسی قدر پیدا کرتا ہے۔ بیوی سارا روپیہ صرف کرنے پر بھی شوہر کو مقروض بنا دیتی ہے۔ اور خانہ داری کا انتظام درست و آسایش دہ نہیں رکھ سکتی۔ اول تو ایسے گھر میں زنانہ یا مردانہ میں مہمان آکر رہتے نہیں۔ اگر کوئی مصیبت کا مارا یا اری اتفاقاً آ ہی گیا یا گئی تو تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ برعکس جس کے ایک سگھڑ بیوی کا مرد دو ہزار یا ہزار ماہوار پاتا ہے۔ یا اس قدر رقم کسی پیشہ سے پیدا کرتا ہے تو وہ سگھڑ بیوی گھر کو جنت کا نمونہ بنا دیتی ہے۔ فراخدلی سے صرف کرتی ہے خدا کے فضل و کرم سے ایسے با برکت گھر میں مہمان بھی ہمیشہ زنانہ مردانہ میں آتے رہتے اور مہینوں رہتے۔ اور اپنے گھر سے بڑھکر آسایش اٹھاتے۔ رخصت ہوتے وقت تحائف دیکر جاتے۔ صرف مہمانوں کی خاطر مدارت نہیں ہوتی بلکہ اپنے پرائے عزیز و اقارب و دوست و احباب سب کے ساتھ سلوک اس پر طرہ یہ کہ ہر مہینے پس انداز بھی ہو جاتا ہے اور دیکھنے والے یہ سمجھتے اور خیال کرتے ہیں کہ تین چار ہزار روپیہ ماہانہ سے کم اس گھر کا خرچ نہیں ہے۔ یہ تو دنیاوی صورت حال پھر وہی حیثیت سے خیرات و مبرات میں قومی کاموں میں جدا صرفہ اس ڈھب کی اور قماش کی عورت لچھمی کہی جاسکتی ہے۔ خدائے پاک کا شکریہ ہر بن مو زبان ہو کر ادا نہیں کر سکتا کہ میرے گھر میں آخرالذکر حالات کی بیوی کا قدم آیا جس کے حالات میری آئندہ زندگی کے حالات کے ساتھ وابستہ ہو کر

اس تالیف کے صفحوں میں آگے چل کر جلوہ گر ہوں گے۔ تقریباً دو ڈیڑھ ماہ جب تک
نئی نویلی دلہن رہیں میرے گھر کے روزمرہ کے کاروبار میں کوئی دخل نہیں دیا صرف
دیکھا کیں۔ گھر کا قرینہ کیا ہے۔ کس قسم کے مدات اخراجات ہیں۔ کس طریقہ سے اخراجات
ہوتے ہیں۔ روپیوں کا استعمال صحیح طور پر ہوتا ہے یا مسرفانہ انداز سے ہوتا ہے وغیرہ
میری خانگی زندگی اس زمانہ میں لاابالی تھی اور میں بہت مسرف تھا۔ ملازمین من مانے
طریقہ سے خرچ کرتے تھے۔ تعیشات اور جلسہ بازیوں میں بھی فضول خرچی ہوتی تھی
رفتہ رفتہ عنان انتظام میری بیوی نے اپنے ہاتھ میں لیلی۔ اور موقع موقع سے اصلاحات
صرف خانہ داری میں ہی نہیں شروع کیں بلکہ میری عادات اور روزمرہ کی زندگی کے
حالات میں بھی نہایت ہوشیاری اور عقلمندی سے نزاکت موقع و محل کا خیال رکھ کے
تاکہ مجھے گراں نہ گزرے اصلاح کرنے اور مجھے نیک مشورہ وقتاً فوقتاً دینے لگیں۔ حالانکہ
وہ خود بہت کم عمر تھیں۔ سولھواں سال تھا۔ قدرت نے انہیں ذکی و فہیم فطرتاً بنا کر
اس عالم شہود میں بھیجا ورنہ سولہا سال کی لڑکی وہ بھی جس نے دنیا نہ دیکھی ہو کسی مدرسہ
میں تعلیم نہ پائی ہو۔ اور زمانہ کے رواج کے مطابق سخت پردہ میں اپنے ایام زندگی
گزارے ہوں وہ پیچیدہ مسائل زندگی کی گتھیوں کو سمجھے ہی نہیں بلکہ سلجھائے۔ ۲۲ر دسمبر
۱۹۱۰ء کو میری شادی خانہ آبادی ہو چکنے کے بعد سے اپنی کتاب حیات کا نیا
ورق میں نے پلٹا۔ بسم اللہ کہہ کر ہتا ہلا نہ زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنی گردن
پر رکھا جس طرح ایک فہمیدہ اطاعت گزار و نیک نہاد بیوی کے فرائض گوناگوں
ہوتے ہیں اسی طرح شوہر کے فرائض بھی متعدد ہوتے ہیں۔ جس وقت بیوی کو بیاہ
کر اپنے گھر لایا کچھ رسمیں مستورات نے ادا کیں۔ مثلاً دولہا دولہن کو پلنگ پر پاؤں
لٹکا کر بٹھایا اور پاؤں کے نیچے سلابچی رکھدی گئی دودھ میں پانی شریک کر کے
دولہا دولہن کے پاؤں دھلائے گئے۔ پھر مسند پر بٹھا کر شیر برنج چٹائی گئی۔ ان ٹوٹلا
رسموں کے معنی کو دودون نہاد پوتوں پہلو جودعائیں بڑھی بڑی کمسن لڑکیوں کو دیتی
ہیں اس کے مصداق سمجھنا چاہیے۔ اور بھی کچھ رسمیں ادا کی گئیں جو مجھے اسوقت
یاد نہیں ہے۔ یہ رسمیں تو ان مستورات کی موجودگی میں جو دولہا کے سامنے
نکل سکتی تھیں ادا کی گئیں۔

مسز اگھور ناتھ صاحب۔ مسز سروجنی نائیڈو کی لڑکی میری بی بی کے ہمراہ آئی تھیں اونہوں نے اور دوسری خواتین نے یہہ رسمیں میری خوشدامن صاحبہ سے اور مسز اگھور ناتھ سے بہت دوستی تھی۔ جب سب بیبیاں الگ ہوگئیں بوقت خلوت میں نے بیوی کے دوپٹہ کے آنچل کو بچھا کر اس پر دوگانہ شکرادا کیا اور بیوی کی پاکدامن اور اطاعت گزار وغیرہ کا رہنے کی جہاں دعا مانگیں یہہ بھی خدا سے دعا مانگی کہ بہ حیثیت شوہر کے جو فرایض میرے ہیں اونکی ادائی کی توفیق مجھکو باری تعالیٰ عطا کرے اسمیں تاحیات اس شعر کے مصداق دونوں بنے رہیں۔

من جاں شدم تو تن شدی، من تن شدم تو جاں شدی

تا کس نگوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

اس بے نیاز کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جو دعائیں میں نے مانگی تھیں مستجاب الدعوات نے قبول و مستجاب کیں۔ فریقین نے ایک دوسرے کی دلدہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ہم دونوں میاں بیوی کا اتحاد و خلوص جو تعشق کی حد تک ہے ضرب المثل بن گیا ہے۔ باری تعالیٰ سے اب یہہ دعا ہے کہ بقیہ زمانۂ حیات بھی اس طرح گزارے۔ بطفیل پنج چہاردہ معصومین علیہم السلام میرے کارنامۂ حیات کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو کے متعلق لاتعد چھوٹے بڑے واقعات ہیں۔ اول تو بہ تفصیل بہت سے واقعات یاد نہیں کیونکہ مجھے سوانح حیات لکھنے کا کبھی خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ بعض اہم واقعات کو نوٹ کرلیا کرتا اور نہ کبھی میں نے ڈائری (روزنامچہ) لکھی جس طرح میری بی بی روزآنہ اپنا روزنامچہ لکھہ لیا کرتی ہیں ہر حال میں وہ اپنی ڈائری ضرور لکھہ لیتی ہیں۔ چھبیس سال کے قبل پہلی دفعہ ان کو ڈائری لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور جب سے بالالتزام روزمرہ کے حالات وہ لکھہ لیا کرتی ہیں۔ ان کے جس قدر سفرنامہ ہیں وہ انہیں ڈائریوں کی بدولت لکھے گئے۔ اے کاش میں بھی اپنا روزنامچہ لکھہ لیا کرتا تو آج تالیف زیر تحریر میں بہت سی اہم و یکار آمد باتوں اور واقعات کا اضافہ ہو جاتا۔ تاہم جسقدر امور بہ تفصیل مجھہ کو یاد ہیں اون کا ذکر خیر کچھہ کم نہیں۔ مجھے اس کا لکھنا خصوصاً حالت خرابی صحت میں اجیرن ہو گیا ہے۔ سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کیلئے۔ اس لئے آیندہ میں بہت اختصار سے کام لوں گا۔

انجمن افتخار دکن
مولانا شبلی کا ذکر

چند وکلاء نے مثلاً غلام قادر خاں مرحوم شیخ ولایت حسین مرحوم وغیرہ اور شیخ عبدالرحیم صاحب نے میرے مشورہ سے ایک انجمن موسوم بہ افتخار دکن قائم کی جس کے اغراض چند در چند تھے۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی درستی مسلمان لڑکوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنا اور اراکین کو برجستہ تقریر کرنے کی مہارت پیدا کرنی اور معاشرتی اصلاح وغیرہ میری صدارت سے اس کے جلسے پہلے تو لکڑکوٹ کی بارہ دری میں جو منیرالملک کی بارہ دری بھی مشہور ہے کچھ عرصہ تک ہوتے رہے۔ پھر شیخ ابراہیم فاروقی وکیل ہائی کورٹ بعد کو فاروق یار جنگ رکن ہائی کورٹ کے مکان میں اس کے جلسے ہوتے رہے۔ مولوی فاروقی کے مکان میں جو جلسے ہونے لگے اس کا سبب یہ تھا کہ میرے مکان کے متصل تھا اور مولوی شبلی نعمانی کے مکان کے بھی متصل تھا اور مسٹر ظفر علیخاں کے مکان کے بھی قریب تھا۔ شبلی نعمانی اس زمانہ میں ناظم محکمۂ علوم و فنون مقرر کئے گئے تھے۔ ابتداءً یہ محکمہ مولوی سید مرتضیٰ صاحب فلسفی مرحوم کے لئے قائم کیا گیا اور سید علی صاحب بلگرامی جو فلسفی صاحب کے خاص دوست اور سرپرست تھے اور اس زمانہ میں سروقارالامراء سید علی صاحب کو بہت مانتے تھے تو سید علی صاحب نے یہ محکمہ قائم کروایا۔ جب سید علی صاحب بلگرامی کو پنشن دیدی گئی تو مولوی عزیز مرزا مرحوم ہوم سکرٹری ہو گئے تھے انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے فلسفی صاحب کو وہاں سے ہٹا کر کریم نگر کی عدالت دیوانی کا ناظم بنا دیا۔ اور شبلی صاحب کو فلسفی صاحب کی جگہ مقرر کردیا گو فلسفی صاحب فلسفہ الٰہیات وغیرہ میں قابل تھے مگر بیچارے قانون سے نابلد تھے۔ یہاں موزونیت و مناسبت سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض شبلی صاحب و مسٹر ظفر علی خاں حال مولانا جو اس زمانہ میں ہوم سکرٹری کے دفتر میں مترجم تھے اور مولوی فاروقی وغیرہ ہماری انجمن کے ماہانہ جلسوں میں ضرور شریک ہوتے تھے مگر جلسہ میری صدارت سے ہوتے تھے۔ دو دفعہ ایسا بھی ہوا کہ قبل آغاز جلسہ مسٹر ظفر علی خاں نے کھڑے ہو کر کہا کہ۔

میں تحریک کرتا ہوں کہ آج کے جلسہ کی صدارت مولوی شبلی فرمائیں۔ واضح ہو کہ مسٹر ظفر علی نے جبکہ شبلی صاحب علیگڈھ کالج میں عربی پڑھاتے تھے ظفر علی خاں صاحب نے ان سے پڑھا تھا تو حق شاگردی ادا کیا مگر شبلی صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں حقاً کہتا ہوں

(میرا نام لیکر) کہ ان کی موجودگی میں میں اپنے تئیں اس کا اہل و مستحق نہیں سمجھتا ہوں کہکر بیٹھ گئے اور صدارت قبول نہیں کی۔ شبلی صاحب نے اوس زمانہ میں اپنے مکان میں اس غرض سے کئی جلسے کئے کہ انجمن ترقی اردو قائم کیجائے اور وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تحت کردی جائے۔ دو یا تین جلسے اون کے مکان میں ہوئے اور ہر بار انہوں نے مجھے صدر بنایا۔ مختصر سا جلسہ ہوتا تھا۔ شرکا میں مولوی عبدالغنی وارثی مرحوم سابق مددگار صدر محاسب عبدالغفور خاں۔ مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم اور مرزا سجاد بیگ مرحوم وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ حیدر آباد سے جب مولوی شبلی جاچکے تو مولوی عزیز مرزا ضلع بیڑ کی تعلقداری سے رکن ہائی کورٹ کئے گئے۔ اور وہ اس حیثیت سے حیدر آباد آئے۔ انہوں نے نظام کلب میں کئی جلسے انجمن ترقی اردو کے قیام کے متعلق منعقد کئے تھے نہیں معلوم انجمن پھر کیونکر قائم ہوی اور مولوی عبدالحق کے تحت کیونکر آگئی اور اس کے اراکین کون کون ہیں۔ اس کی تفصیل مجھے معلوم نہیں۔ شبلی صاحب کا ناظم محکمۂ علوم و فنون ہونا ۱۹۰۴ سنہ ع اور ۱۹۰۵ سنہ ع کا واقعہ ہے۔ ان کا محکمہ اس لئے برخواست کیا گیا کہ سر کسون واکرنے ایک کمیشن قائم کیا۔ ممبروں میں مولوی میر افضل حسین سابق چیف جسٹس و سید احمد سابق مددگار صدر محاسبی تھے۔ ان کی رپورٹ کی بنا پر کہ محکمہ بے ضرورت ہے برخواست کیا گیا۔

شبلی صاحب ۱۹۱۳ سنہ ع جب حیدر آباد آئے تو میرے مہمان رہے۔ تقریباً ایک ماہ یا اس سے کچھ زیادہ ان کا قیام میرے مکان میں رہا۔ اس زمانہ میں میرا قیام ہمایوں منزل والی کوٹھی میں تھا جس کو میں نے بکرایہ مالک نظامیہ ہوٹل کو دیا ہے۔ شبلی صاحب کو سو روپیہ منصب کے طور پر سید علی صاحب بلگرامی کی کوشش سے سر وقار الامراء نے مقرر کئے تھے۔ یہ واقعہ ۱۸۹۲ سنہ ع کا ہے۔ جب کہ شبلی صاحب سید علی صاحب کے مہمان کی حیثیت سے انہیں کے ہاں رہتے تھے۔ اسی سو روپیہ میں اور تین سو ماہانہ کا اضافہ نواب عماد الملک مرحوم نے خود حضور سے عرض کرکے کروایا۔ یہ اضافہ ۱۹۱۳ سنہ ع میں کیا گیا جب کہ شبلی صاحب کا قیام میرے مکان میں تھا وہ مکان مبارک ہوا۔ اس غرض سے یہ اضافہ ہوا تھا کہ شبلی صاحب سیرۃ النبی لکھ رہے تھے۔ بھوپال سے بھی ماہانہ پانچ سو مقرر ہوئے تھے اور سیرت النبی کتاب ایسی لکھی ہے کہ تمام فرقۂ امامیہ کو اپنا مخالف و منحرف

کر دیا۔

خان بہادر مولانا اولاد حیدر صاحب نے بعد کو آخر پانچ جلدوں میں اسوۃ الرسول کتاب لکھی۔ تاریخی حیثیت سے دونوں کا مقابلہ کرنے سے قدر و قیمت دونوں کتابوں کی معلوم ہو جاتی ہے۔ مولانا مرتضیٰ حسین صاحب مولوی شبلی کی سیرۃ النبی کے خاص مقامات کے جوابات ایک ضخیم تالیف کے ذریعہ سے دیئے ہیں وہ بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ اس کتاب کا نام التکمیل ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر بہت سے واقعات میں نے لکھدیئے جن کا تعلق میری حیات سے نہیں ہے مگر عوام کی اطلاع کے لئے مفید مطلب ضرور ہیں۔ انجمن افتخار دکن کے ایک جلسے میں جبکہ لکڑ کوٹ کی بارہ دری میں اس انجمن کے جلسے ہوتے تھے۔ غالباً ۱۹۰۳ء کا واقعہ ہے کہ میں اپنی صدارتی تقریر میں اس خیال کو ظاہر کیا تھا کہ ملک کی اور مسلمانوں کی ضرورتوں کے لحاظ سے اسلامیہ یونیورسٹی یہاں قائم ہونی چاہیئے۔ یہ خیال قیام یونیورسٹی کا پہلی دفعہ میری زبان سے حیدرآباد میں نکلا۔ مدراس کے اخبار مخبر دکن نے اسی زمانہ کے کسی نمبر میں میرے اس خیال کی تائید میں ایک مقالہ حوالہ قلم کیا تھا۔ اپنے اس خیال کو میں نے پھر اس وقت دہرایا جب کہ مرزا فیاض علی خاں کی کوٹھی میں زیر صدارت نواب عماد الملک مرحوم ایک جلسہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی تقریر اشاعت تعلیم کی نسبت منعقد ہوا تھا۔ صاحبزادہ مرحوم کی تقریر کے بعد مجھ سے صدر جلسہ نے فرمائش کی کہ میں بھی اپنے خیالات تعلیم کی نسبت بیان کروں۔ چنانچہ میں نے فلسفہ تعلیم پر چند نکات بیان کئے جو ہربرٹ اسپنسر کے فلسفۂ تعلیم سے ماخوذ تھے۔ اسی سلسلہ میں یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت پر زور دیا چونکہ عماد الملک مرحوم اس زمانہ میں ناظم تعلیمات سرکار عالی تھے اس لئے ان سے اپیل کی کہ وہ اس خصوص میں کوشش فرمائیں۔ یہ واقعہ ۱۹۰۷ء کا ہے۔ ایک اخبار علم و عمل اس زمانہ میں حیدرآباد سے نکلتا تھا۔ اس میں اس جلسہ کی کارروائی شائع ہوی تھی اور میری تقریر کا خلاصہ بھی چھپا تھا۔ اور میں نے جو قیام یونیورسٹی کے متعلق زور دیا اچھے لفظوں میں میرے خیال کی تائید کی تھی۔ قیام یونیورسٹی کے متعلق جو کچھ میرا خیال تھا اوس کو عملی جامہ پہنانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ نہ اس قدر دولت و ثروت ہی تھی کہ کروروں کا بار اپنے سر لیلوں نہ برسر حکومت تھا کہ اپنے اثرات سے کام لیتا۔ اس واقعہ کے چند سال بعد میرے گھر میں کا ایک مضمون جس کا عنوان یہہ تھا کہ ہند کے مسلمانوں کا قومی

لٹریچر اردو ہے۔ بھوپال کے زمانہ رسالہ ظل السلطان میں نکلتا تھا۔ علاوہ اردو کی اشاعت کے متعلق یہہ خیال بھی انہوں نے جاپان کی مثال دیکر ظاہر کیا تھا کہ حیدرآباد میں سرکاری طور سے ترجمہ کا دفتر قائم کیا جائے، دوسری کتابوں کا ترجمہ اردو میں ہو۔ یہہ دونوں تحریکیں بھی مفید ملک و قوم تھیں جنہوں نے عرصہ دراز کے بعد عملی جامہ پہنا۔ اس زمانہ میں اور عرصہ دراز تک اس کے بعد ادبی و تعلیمی اور پبلک جلسے عموماً میری صدارت سے ہوتے رہے اس مقام پر چند ایسے جلسوں کا تذکرہ بطور مثال ضبط قلم کرتا ہوں

صدارتی جلسے

مسٹر الماطیفی ای۔سی۔ایس۔ سابق ناظم تعلیمات حیدرآباد و حال ڈویژنل ریوینو کمشنر کرنال (پنجاب) کی مدت ملازمت میں توسیع کے لئے جلسۂ عام جو ہوا تھا وہ بھی میری صدارت سے منعقد کیا گیا۔ توسیع کی تحریک مسٹر محمد اصغر بیارسٹر (حال اصغر یار جنگ جج ہائی کورٹ حیدرآباد) نے پیش کی تھی اور تائید اس کی پنڈت کیشو راؤ وکیل بعد کو جج حیدرآباد ہائی کورٹ آنجہانی نے کی تھی اس جلسہ میں سینکڑوں اشخاص عمائد و وکلاء وغیرہ شریک تھے البتہ کوئی عہدہ دار سرکار عالی بوجہ خاص شریک جلسہ نہیں ہوا لیکن ساری پبلک حیدرآباد کی اس امر کی خواستگار تھی کہ مسٹر الماطیفی کچھ دنوں اور حیدرآباد میں رہکر صیغہ تعلیم کو سنواریں۔ کیونکہ جس قدر کام انہوں نے اُس صیغہ میں کیا تھا وہ لائق تحسین ثابت ہوا تھا۔ رزولیوشن کی ایک ایک نقل میری دستخط سے بملاحظہ خسروی و وزیر صیغہ تعلیم کے پاس بھیجی گئی تھی لیکن بوجہ خاص توسیع منظور نہیں ہوی۔ بہت سے جلسے انجمن ثمرۃ الادب کے اور مدرسہ مفید عام واقع اعتبار چوک کے اور اخبار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ریڈنگ روم کے میری صدارت سے ہوئے۔ مسٹر محمد علی جناح ایک مقدمہ میں جب حیدرآباد آئے تو اس زمانہ میں موسم گرما گزارنے کیلئے میں اپنے باغ واقع وقارآباد میں مقیم تھا۔ مسٹر عسکری حسن بیارسٹر کا خط میرے پاس اس مضمون کا آیا کہ وکلاء کی جانب سے مسٹر جناح کو ایک ڈنر بمقام نظام کلب دیا جانیوالا ہے۔ آپ اس کی صدارت ضرور کریں۔ چنانچہ میں بلدہ آیا اور ڈنر کی صدارت کی۔ دوسرے دن میرے پاس چند اشخاص کا ایک وفد آیا کہ ایک پبلک جلسہ ہونیوالا ہے جس میں مسٹر جناح تقریر کریں گے آپ اس کی صدارت منظور کریں چنانچہ بمقام درمنی تھیٹر ایک جلسہ عام کیا گیا۔ مسٹر جناح نے تقریر کی میں نے صدارت کی۔

محکمہ دارالقضاۃ یہ بھی ایک اسلامی بڑی خدمت میں نے کی کہ آخر ۱۳۱۴ف میں حسب سابق مفتی دارالقضاء نواب محبوب نوازالدولہ مرحوم نے انتقال کیا تو یہ تجویز گورنمنٹ کے زیر غور تھی کہ محکمۂ دارالقضاء عدالت العالیہ میں ضم کر دیا جائے یہ خبر پاکر مولوی حیدر علی مرحوم جو اس زمانہ میں مفتی صاحب مرحوم کے مددگار اور بعد کو ناظم دارالقضاء ہوئے۔ میرے پاس آئے۔ بہت ہی مشوش اور پریشان حال تھے۔ مذکورالصدر خبر سنا کر مجھ سے طالب امداد ہوئے۔ تاکہ میں کوئی ایسی ترکیب و کوشش کروں جس کی وجہ سے دارالقضاء کا محکمہ برقرار رہے۔ میں نے مولوی حیدر علی سے کہا کہ میں ایک ترکیب کرتا ہوں اگر کارگر ہوئی تو انشاءاللہ آپ کا محکمہ قائم رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس لئے تو آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کی رائے لوں۔ آپ برٹش انڈیا میں ایسی کارروائیاں دیکھے ہوئے ہیں۔ کوئی ترکیب آپ کو ضرور سوجھیگی۔ میں نے ان کو اطمنان دلایا اور کہا کہ خدا نے چاہا تو یہ عدالت نہیں ٹوٹنے پائے گی۔ اس دن شام کو میں چند نامور اور وہ وکلاء سے ملا۔ شلاً مولوی خواجہ حسن مرحوم مظہر معین الدین مرحوم مولوی عبدالغفور بعد کو مائیکورٹ جج مولوی میر قمرالدین بعد کو ہائی کورٹ جج سے ملکر میں نے اپنا عندیہ کہا اور یہ کہا کہ میں ایک ممورئیل (باصلاح حیدرآباد محضر) کا مسودہ کرتا ہوں۔ اس کو آپ لوگ دیکھ لیں اور اگر کوئی صورت ہو تو کچھ گھٹانے بڑھانے کے بعد اس کا مبیضہ کیا جائے اور اس پر وکلائے درجہ اول کے دستخط لینے کے بعد سرکار میں پیش کیا جائے۔ مولوی میر قمرالدین مرحوم سے میں نے اس معاملہ میں خاص طور سے امداد چاہی کیوں کہ اس زمانہ میں محمد صدیق نواب عماد جنگ اول ہوم سکرٹری تھے جن کے تحت صیغۂ عدالت تھا وہ میر قمرالدین مرحوم کے قدیم دوست تھے۔ اون سے میں نے کہا کہ آپ پہلے معتمد صاحب سے مشورہ کیجئے اور کہئے کہ وکلاء ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنا پورا زور صرف کیجئے۔ مولوی میر قمرالدین مرحوم معتمد صاحب سے مل چکنے کے بعد میرے پاس آئے اور جو گفتگو معتمد صاحب سے ہوئی تھی اوس کا اعادہ کیا۔ چنانچہ میں نے ایک مسودہ کر کے مولوی قمرالدین صاحب کے پاس بھیجا۔ انہوں نے میرے مسودہ کے ساتھ اپنا بھی ایک مسودہ بھیجا۔ ان دو مسودوں کے ساتھ ایک خط اس مضمون کا بھیجا کہ ان دو مسودوں سے جو پسند آئے اس کو رکھئے اور پھر اس کو جلد سے جلد صاف کروا کر اور وکلاء صاحبوں کے

دستخطوں سے مزین کرکے محکمۂ سرکار میں پیش کیجئے، سرکار کو اس بارہ میں جلدی ہے۔ دیر نہ ہونے پائے۔ چنانچہ میں نے اپنا مسودہ جو بہت مدلل تھا صاف کراکے وکیلوں کے دستخط لیکر پیش کر دیا۔ چونکہ معتمد صاحب ہموار ہو چکے تھے۔ کامیابی مجھکو ہوی اور دارالقضاء کا محکمہ میری کوشش کی وجہ سے ٹک گیا۔ میرا مسودہ اور میر قمر الدین مرحوم کا خط مورخۂ ۲۴م آذر ۱۳۱۳ف میرے دفتری کاغذات میں موجود ہے۔ واقعات کے اظہار میں مقدم و موخر کا خیال رکھنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ زمانہ مزید گزر چکا ہے اور میرے پاس کوئی ڈائری اس زمانہ کی نہیں ہے جس سے مدد لے سکوں اس لئے جو جو باتیں یاد آتی جاتی ہیں اون کو رقم کرتا جاتا ہوں۔ مذکور الصدر واقعہ ۱۳۱۳ف کا ہے۔ انگریزی سنہ غالباً ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۵ء ہیں

محکمۂ بلدیہ کی ممبری

میرا تقرر منو پالٹی (بلدیہ) کی ممبری پر ہوا۔ اور ۱۹۱۲ء میں میں علیحدہ ہوا۔ میں نے بحیثیت ایک میونسپل ممبر کے جو کچھ لکھا اسکی تفصیل کیلئے بھی ایک دفتر چاہیے۔ میری دلچسپی لینے کی وجہ سے میں ورکنگ کمیٹی کا ایک سال چیرمن بھی رہا۔ اور جب کسی خاص نزاعی امر کے فیصلہ کے لئے یا کسی متنازعہ فیہ مقام کے معائنہ کے لئے کوئی سب کمیٹی مقرر کی جاتی تو میں ضرور بحیثیت ایک ممبر کے شریک کیا جاتا۔ میرے ساتھ اور بھی دو ممبر شریک کئے جاتے۔ عموماً شمس العلماء نواب عزیز جنگ مرحوم سب کمیٹیوں میں میرے شریک رہتے۔ مگر تجویز مجھی کو لکھنی پڑتی۔

طغیانی رود موسیٰ ۱۹۰۸ء

۲۸م ستمبر ۱۹۰۸ء کو قیامت خیز طغیانی آئی تو میں اسپیشل مجسٹریٹ اعزازی مقرر کیا گیا اور بہت ذمہ داری کا کام میرے سپرد ہوا۔ یہ جس قدر لاوارثی مال امین باغ میں جس میں اب زچگی خانہ ہے جمع کیا جاتا اور جس کے حاصل کرنے کے لئے متعدد لوگ یہ کہکر آتے کہ میرا فلاں فلاں مال مالخانہ میں ہے مجھکو دلایا جائے اور ایک فہرست پیش کرتے۔

ایک ہی ساخت اور ایک ہی وضع کی پچیسوں چیزیں ہوتی تھیں۔ مثلاً جرمن سلور کے یا تانبے کے سیکڑوں پاندان جمع ہو گئے تھے۔ سینکڑوں دیغ، تپتیڑے، گنگال وغیرہ چھوٹی موٹی اشیاء گرے ہوے مکانات سے جو نکلتی تھیں اور جن کو اہلیان پولیس لالاکر مالخانہ میں ڈالتے جاتے تھے۔ عام طور سے ان پر کسی کا نام یا مانوگرام نہیں ہوتا۔ اس کا تصفیہ کرنا کہ فلاں شئے زید ہی کی ہے یا بکر ہی کی ہے۔ بہت دشوار امر تھا۔ کیوں کہ بہت سے جھوٹے

دعویدار بھی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس میں بڑے تجربہ اور بڑی ذہانت و تدین کی ضرورت تھی۔ غرض خدا نے میری مدد کی۔ میرے فیصلے تشفی بخش ثابت ہوئے۔ غرض چھ ماہ یہ خدمت اعزازی طور سے میں نے کی جس طرح محکمۂ صفائی کی چھ سال خدمت کی۔ شادی کے بعد تین اہم واقعات و حادثات پیش آئے۔ ان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ایک تو میری شادی کے دس مہینے بعد میری خوشدامن صاحبہ مغفورہ نے انتقال فرمایا۔

ان کے چہلم کے چار روز بعد میرے خسر حاجی ڈاکٹر صفدر علی صاحب کا انتقال یک بیک فالج سے ہوگیا۔ میرے سالے سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ ایک بچہ اکیس دن کا تھا جس کا نام مہدی علی مرزا ہے۔ کرنل ریاست علی میرزا اتیرا سال کے تھے۔ غرض سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ میری خوشدامن صاحبہ کے بچوں میں صرف میری بی بی کی شادی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں میرے خسر مرحوم کے انتقال کے چار پانچ ماہ بعد مجھے ایک لڑکی خدا نے دی تھی۔ ایک سال اس دار فانی میں رہکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس نے داغ مفارقت اپنے والدین کو دیکر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ یہ نہایت حسینہ و جمیلہ بچی تھی جس کی دائمی جدائی کا صدمہ آج تک اس کے ماں باپ کو ہے۔ اس کے بعد سے کئی دفعہ استقاط حمل ہوا۔ مگر کوئی اولاد باری تعالی نے پھر عطا نہیں کی اور اولاد کی روشنی سے میرا گھر منور نہ ہوا۔ خدا کے کارخانہ میں کس کو دخل ہے۔ انسان ہر طرح سے عاجز و قاصر ہے۔ بجز صبر و شکر کے چارہ ہی کیا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں دوراز حال میری اہلیہ ایسی علیل ہوئیں کہ معالجین نے جواب دیدیا تھا۔ شہر کے جتنے نامی گرامی ڈاکٹر اور یونانی طبیب اس زمانہ میں موجود تھے۔ تقریباً سب کا علاج ہوتا رہا۔ ہر دفعہ چار ڈاکٹروں کا مشورہ علاج ہوا۔ جب چار پانچ دن ڈاکٹری علاج سے کوئی کمی مرض میں نہ ہوئی تو ایک ڈاکٹر شامرٹ تو قائم رہے باقی تین ڈاکٹر بدل دیئے جاتے۔ ڈاکٹر شامرٹ کو اس لئے قائم رکھا جاتا کہ بیماری کی ہسٹری دوسرے نئے ڈاکٹروں سے بیان کریں۔ مرد ڈاکٹروں کے ساتھ مشورہ میں ایک لیڈی ڈاکٹر بھی شریک کرلی جاتی۔ کوئی مرض کی صحیح تشخیص نکر سکا جب ڈاکٹروں نے جواب دیدیا تو سوائے دعا کے اور چارہ ہی کیا تھا۔ صدقے روز اقسام کے دیئے جاتے۔ عملیات علیحدہ ہوتے مگر کسی قسم کی تخفیف مرض میں نہ تھی۔ آخیر میں میں نے بارگاہ حسینی سے استمداد طلب کی اور یہ منت مانی کہ جب مریضہ کو صحت بتصدق امام حسین علیہ السلام شافئ مطلق عطا فرمائیگا تو بعد صحت کل زیارت عتبات عالیات کیلئے میں

مریضہ کو بھی لیجاؤں گا۔ چنانچہ میری دعا باری تعالیٰ نے مستجاب کی اور میری اہلیہ کو صحت بخشی۔

سفر عراق عرب

سنہ ۱۹۰۶ء میں بقصد زیارات عتبات عالیات یعنی کاظمین کربلائے معلیٰ نجف اشرف سامرہ اور بغداد شریف کا سفر ہم لوگوں نے کیا۔ اس زمانہ میں میجر جنرل نواب سر افسر الملک مرحوم سابق چیف کمانڈر افواج آصفیہ بھی بغرض زیارات عتبات عالیات گئے ہوئے تھے۔ سر افسر الملک مرحوم بڑے خوش عقیدہ مومن پاک تھے۔ انہوں نے تمام مشاہد میں زیارتیں اس طرح پڑھیں جس طرح شیعہ پڑھتے ہیں۔ خدام سے باصرار کہتے کہ زیارت اسی طرح پڑھوائیے جس طرح شیعوں کو آپ پڑھاتے ہیں چنانچہ شیخ محمد کاظم مرحوم نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ میں بھی وہیں تھا۔ زیارت عتبات سے فارغ ہونے کے کئی سال بعد سر افسر الملک حج کے لئے گئے تھے۔ میرے گھر میں سے سفرنامۂ عراق میں اس مقدس سفر کے تمام و کمال حالات لکھے ہیں اور بہت دلچسپ طریقہ سے یہ کتاب لکھی ہے۔ مفید معلومات کا کافی ذخیرہ ہے۔ یہ سفرنامہ طبع و شائع ہو چکا ہے۔

میری اہلیہ کو مضمون نگاری تالیف و تصنیف و خدمات قومی کا شوق و ولولہ سنہ ۱۹۰۳ء سے پیدا ہوا۔ پہلی تصنیف مشیر نسوان سنہ ۱۹۰۴ء میں طبع و شائع ہوئی۔ اندرون و بیرون ممالک سرکار عالی بہت قدر کی نگاہوں سے یہ تصنیف دیکھی گئی۔ اخباروں نے عمدہ عمدہ ریویو لکھے۔ اور مشاہیر قوم مثلاً مولوی شبلی نعمانی اور مولوی الطاف حسین حالی مرحوم آنریبل جسٹس شرف الدین مرحوم سابق جج ہائیکورٹ کلکتہ نواب اسحٰق خاں سابق سکریٹری علی گڑھ کالج سید شاہ سلیمان صاحب پھلواروی وغیرہم نے بہت عمدہ ریویو اور تقریظیں لکھی تھیں جو کتاب کے ساتھ دوسرے ایڈیشن میں شائع ہوئی ہیں اس کے کئی ایڈیشن ابتک نکل چکے ہیں۔ مشاہیر قوم نے ایک طلائی تمغہ اس کتاب کے لکھنے پر میری بیوی کو دیا۔ مولوی عزیز مرزا صاحب سابق ہوم سکریٹری کی تحریک سے ایک کمیٹی قائم ہوئی اور اعلیٰ عہدہ داروں نے فی کس (صمہ) روپیہ چندہ جمع کرکے تین سو روپیہ کا ایک طلائی تمغہ ہیم برگ (جرمنی) سے بنوا کر منگوایا گیا اور وہ تمغہ لیڈی واکر یعنی اہلیہ سر کمیون واکر سابق صدر المہام فینانس کے حوالہ کیا گیا کہ وہ تمغہ میری اہلیہ کو دیں۔ چنانچہ لیڈی موصوف نے ایک ایٹ ہوم دیا اور متعدد مسلم اور ہندو اور پارسی اور یورپین خواتین کے مجمع میں لیڈی واکر نے ایک تقریر کرنے کے بعد میرے گھر میں کو وہ تمغہ دیا جس کا شکریہ میرے گھر میں نے ایک مختصر

تقریر کے ذریعہ ادا کیا۔ یہ ان کی سب سے پہلی تقریر تھی مسز سروجنی نائیڈو نے بھی اس موقع پر تقریر کی تھی۔ اس حوصلہ افزائی سے میرے گھر میں کو آئندہ تصنیف کیلئے ترغیب و تحریص ہوئی۔ جب سے ان کی تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب اس وقت مختلف موضوعات پر ان کی تالیفات و تصنیفات تعداد میں بہ عنایت ایزدی ۲۰ ہیں مختلف رسالوں اور اخباروں میں جو وقتاً فوقتاً مضامین شائع ہو چکے ہیں وہ مزید براں مختلف جلسوں میں جو میرے گھر میں نے تقریریں کیں ۱۹۲۵ء تک کی تقریریں مولوی سید نجم الحسن صاحب نے باجازت میری اہلیہ کے کتاب کی صورت میں شائع کر دی ہیں۔ موسوم بہ مقالات صغرا ۱۹۰۸ء کی طغیانی نے جو قیامت خیز مصیبت حیدرآباد اور حیدرآبادیوں پر ڈہائی تھی پردہ نشین مصیبت زدوں کی امداد کیلئے ایک کمیٹی چند معزز خواتین کی میرے گھر میں نے بنائی۔ پہلے ایک جلسہ خواتین کا بڑے پیمانہ پر کر کے تقریر کی اور اسی جلسے میں ایک کمیٹی سات خواتین کی بنائی گئی۔ میرے گھر میں کو سکرٹری کی خدمت دی گئی اور مسز خدیو جنگ مرحومہ بنت نواب عماد الملک مرحوم میری اہلیہ کی تحریک کی بناء پر خازن منتخب کی گئیں۔ ممبران کمیٹی نے بہت جانفشانی سے زرچندہ ہزاروں کی تعداد میں فراہم کیا اور صرف پردہ نشین خواتین کو بعد تحقیقات امداد دیجاتی تھی۔ اس وقت کے اخباروں نے میرے گھر میں کی قومی خدمت کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا۔ چونکہ میرے گھر میں کے کارنامہ ہائے خدمات قومی اور ادبی وغیرہ کے تذکرے متعدد کتابوں میں لوگوں نے لکھے ہیں۔ مثلاً شباب اردو لاہور سے جو رسالہ نکلتا ہے اس میں چھ سات سال قبل کے ایک نمبر میں چند صفحوں میں منجملہ میرے گھر میں نے جو کچھ اس زمانہ تک کیا تھا اس کا تذکرہ اس میں ہے۔ اس وقت تک نو یا دس کتابیں لکھی تھیں اب تو ماشاءاللہ سولہ کتابوں کی مصنفہ ہیں اور علمی اور قومی خدمات بے گنتی ہیں۔ مقالات صغرا کے دیباچہ میں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ سید نجم الحسن صاحب نے ان کی ادبی و علمی خدمات وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ مسٹر ایس۔ ایم۔ ایچ زیدی کلکتوی نے جن کی تصنیفات انگریزی زبان میں متعدد ہیں۔ حال میں ایک تصنیف کی ہے موسوم بہ mohammads quran and musalman یعنی "محمدؐ کا قرآن اور مسلمان" یہ کتاب میرے گھر میں کے نام پر معنون کی ہے۔ اصل کتاب کے دیباچہ کے قبل چوبیس صفحوں میں میرے گھر میں کے کارنامۂ حیات مصنف نے لکھے ہیں جس کے مطالعہ سے تھوڑے

نوٹ ۱؎ مسز خدیو جنگ طیبہ بیگم صاحبہ نے بھی تقریر کی تھی۔

تھوڑے تفصیلی حالات میری بیوی کے ادبی و قومی خدمات معلوم ہو جائیں گے۔ جو امور ان کتابوں میں درج نہیں ہوئے ہیں اس کمی کو ان کا سوانح حیات لکھنے والا انشاءاللہ پورا کریگا مجھے تو ابھی اپنا دکھڑا لکھنا باقی ہے۔

جلسۂ ٹرکی کی خلافت خلافت ال عثمان کے قیام کے متعلق جتنے جلسے دو جنوبی شہر میں ہوئے تقریباً کل کے کل میری صدارت سے ہوئے اس سلسلہ کا ایک جلسہ بہت ہی عظیم الشان وروحی تھیئٹر کے متصل زیر سماع ہوا تھا جس میں کئی ہزار آدمی شریک تھے۔ میری صدارت سے جلسہ ہوا تھا۔ صبح ہی کو بھوٹیوں کی فوج بھی اوال سے طلب کرلی گئی تھی۔ اور سولجر بھی بلا لئے گئے تھے۔ اس دن صبح کے دس بجے میرے قدیم دوست میجر نواب ممتاز یارالدولہ میرے پاس آئے۔ اور اپنی محبت سے کہا کہ آج جو جلسہ شام کو ہونیوالا ہے میں نے سنا ہے کہ اس کی صدارت تم کرو گے۔ یہ بھی میں نے سنا ہے کہ فوج بھی الوال سے طلب کرلی گئی ہے۔ میری بات مانو تو کہوں خدارا تم آج کے جلسہ میں شریک نہ ہو میں نے اون کے مشورہ کا جو مبنی بہ محبت تھا دل سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ بھائی میرے کو مرنا تو کسی دن کسی وقت ضرور ہے۔ پھر کیوں نہ کار خیر میں انسان کی جان جائے۔ اگر میرے مقدر میں یہی لکھا ہے تو اس سے مفر نہیں اور شہیدوں میں شریک ہو جاوں گا۔ میں بانیان جلسہ کو زبان دے چکا ہوں۔ ممتاز یار الدولہ کے رخصت ہونے کے بعد میرے قدیم دوست نواب قادر نواز جنگ مرحوم ٹرکی دیوڑہی سے واپسی کے وقت میرے پاس آئے اور انہوں نے بھی بخیال محبت شرکت جلسہ سے مجھکو منع کیا۔ چونکہ قادر نواز جنگ مرحوم کو شاعری کا بھی مذاق تھا۔ میں نے یہ مصرعہ پڑھا۔ جان دونگا میں پس دیوار ہونی ہو سو ہو۔

بہرحال میں اللہ کا نام لیکر شریک جلسہ ہوا اور علاوہ میری صدارتی تقریر کے اور بھی دو تین صاحبوں نے تقریریں کیں۔ منجملہ جن کے ایک مولوی مناظر احسن گیلانی اس زمانہ میں نووارد تھے۔ آجکل تو عثمانیہ یونیورسٹی کالج میں پروفیسر ہیں حقیقت میں وہ جلسہ عجیب شان کا تھا۔ چار پانچ ہزار آدمی کا مجمع تھا اور بہت سے حاضرین جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ انگریز ترکوں کے اور خلافت کے بہت خلاف تھے۔ بہ حیثیت صدر کے میری ذمہ داری بہت کچھ تھی۔ ایسے پر جوش جلسہ کو قابو میں رکھنا معمولی بات نہ تھی۔ مقام جلسہ کے قریب چند سولجر مشین گن لئے طلایہ گردانی کر رہے تھے مگر بفضل ایزدی

شب کے آٹھ بجے جلسہ بخیر خوبی انجام پایا۔ مجھے اور میری اہلیہ کو خلافت ترکی سے جو ہمدردی تھا ہے اس کے اور بھی ثبوت ہیں ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان جب ٹرکی سے چھڑی تھی سات کو سوں بینے انڈیا سے ہم کیا مدد کرسکتے تھے۔ بہر حال فراہمی چندہ کیلئے کوشش کیں۔ زنانہ سے صرف میری بیوی نے اپنے مکان میں مستورات کا ایک جلسہ کیا مسز سروجنی نائیڈو کو بھی مدعو کیا تھا۔ غرض کئی سو روپئے فراہم کرکے مولانا محمد علی صاحب مرحوم جو اس وقت دلی سے انگریزی میں کامریڈ اخبار نکال رہے تھے انکے پاس بھیجدیا اور مشیر دکن میں ایک طویل مضمون تین یا چار کالم میں بایں عنوان "کیا میری قوم کی آنکھیں اب بھی نہ کھلینگی" شائع کیا۔ یہ مضمون چونکہ دلی جذبات کے تحت میری اہلیہ نے لکھکر شائع کیا تھا۔ اس نے درحقیقت قوم کی آنکھیں کھولدیں اور اس مضمون کے شائع ہونے کے دو تین روز کے بعد دی کرسنٹ سوسائٹی ہلال احمر چند اصحاب نے قائم کی جس میں مولوی عبد الباسط فرزند ملا عبد القیوم مرحوم نے بہت دلچسپی لی۔ جا بجا جلسے کرکے چندے جمع کرتے رہے۔

انجمن ہلال احمر کا قائم کرنا

قسطنطنیہ کے قریب بمقام تشلجہ فریق مخالف کے گولے آنے لگے تو میں بہت بےچین ہوا۔ اور مولوی غلام جبار مخاطب بہ نواب جبار یار جنگ مرحوم جو بعد کو ہائی کورٹ کے جج ہوئے تھے ان کے پاس میں دوڑا گیا اور کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ ٹرکی پر کیا گزر رہی ہے اور تم خواب خرگوش میں ہو جبار یار جنگ بولے بھائی مجھ سے کیا ہوسکتا ہے جو ٹرکی کی مدد کروں۔ میں نے کہا اپنے نفس پر جہاد کرو۔ روپیہ جیب میں سے نکالو اور میں کمیٹی قائم کرنا چاہتا ہوں جو فراہمی چندہ کا کام کرے۔ انہوں نے کہا تمہارا ساتھ دینے کو ہر طرح سے موجود ہوں۔ وہ روز جمعہ کا تھا۔ دس گیارہ بجے ان کے ہاں گیا وہ گھر ہی پر تھے اس کے بعد مولوی غلام اکبر خاں وکیل۔ اکبر یار جنگ ہائی کورٹ جج کے پاس جا دھمکا۔ اون سے کہا کہ میں غلام جبار کے ہاں گیا تھا اور یہ غرض لے کے گیا تھا۔ انہوں نے میری رائے سے اتفاق کیا کہ کمیٹی فراہمی چندہ کے لئے قائم کی جائے۔ میں نے مولوی غلام اکبر خاں سے کہا کہ تم بھی ممبر بنو۔ اور ہاتھ پاؤں ہلاؤ۔ اون سے وعدہ لینے کے بعد میں نے اپنے مکان ہمایوں منزل والی کوٹھی میں ایک جلسہ کیا اور دس پندرہ آدمیوں کو مدعو کیا اور ایک کمیٹی قائم

کرلی جس کی رکنیت میں علاوہ مذکور الصدر حضرات کے اور بھی چند حضرات کو شریک کیا نواب مرزا یار جنگ بہادر ۔ نواب مرزا فیاض علی خاں مرحوم ۔ نواب علی یاور جنگ مرحوم ۔ نواب خدیو جنگ مرحوم ۔ بخشی عبدالغفار خاں مرحوم ۔ نواب محمود حسن خاں صاحب معتمد کمیٹی انتظامیہ عثمانیہ مدرسہ صنعت وحرفت میرے مکان ہی میں کئی جلسے ہوئے اور یہ طے پایا کہ عظیم الشان جلسہ باغ عامہ میں کیا جائے اور اشتہار دیدیا جائے تاکہ شہر کے چھوٹے بڑے ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوں ۔ یہ ایک تاریخی جلسہ تھا ۔ اول تو باغ عامہ میں اس سے قبل کوئی پبلک جلسہ نہیں ہوا تھا ۔ ٹاؤن ہال بنا نہ تھا ۔ یہ پہلا جلسہ تھا جس میں ہزاروں آدمی شریک ہوئے تھے ۔ یہ جلسہ زیر صدارت میجر سید حسن مرحوم برادر نواب عماد الملک مرحوم منعقد کیا گیا ۔ صدارتی تقریر میں نے کی ۔ حکیم محمد حسن صاحب نے تقریر کی ۔ ایک ایرانی صاحب جن کا نام فراموش کرتا ہوں ۔ فارسی میں بہت جوش انگیز تقریر کی ۔ بعد برخواست جلسہ چند ٹرنک بہت بڑے بڑے جو پہلے سے خرید کر منگوا کر ڈائس پر رکھدیئے گئے تھے اور دو ممبر وہاں بٹھا دیئے گئے تھے ۔ لوگوں نے جس قدر زر نقد اور از قسم زیورات و پارچہ جات وغیرہ دیئے وہیں ڈبوں میں یہ چیزیں جمع کیگئیں اور قفلوں پر چند ممبروں کی مہریں ثبت کردی گئیں ۔ بروز مقررہ سب ممبروں کے سامنے قفل کھولے گئے اور جو زیورات تھے وہ تین سنار جو پہلے سے طلب کرلئے گئے تھے یکے بعد دیگرے قیمتیں ان کو دیکر جس نے زیادہ قیمت دی اس کے ہاتھ فروخت کیگئیں دو چار ہزار نقد ٹرنکوں میں سے نکلے تھے اور زیورات و پارچہ جات کی تین ہزار سے کچھ زیادہ آئی ۔ ان سب رقم کا پاونڈز بنوا کر بنک آف بنگال حال امپیریل بنک کے ذریعہ محمود شوکت پاشا شہید کے پاس قسطنطنیہ بھیجدیا ۔ انہوں نے تار کے ذریعہ شکریہ کمیٹی والوں کا ادا کیا ۔ خلافت کے بارہ میں اور جو خدمت کی منجملہ اس کے ایک یہ بھی ہے کہ سنہ ۱۹۲۴ء میں جب معہ اپنی اہلیہ کے یورپ گیا ۔

سفر یورپ سنہ ۱۹۲۴ء

یہ وہ زمانہ ہے کہ ترکوں نے چند ماہ کیلئے سلطان عبدالمجید آفندی کو خلیفہ بنایا تھا اور پھر ترکی سے نکالدیا وہ معہ اپنے خاندان کے نہایت حسرت زدہ حالات میں بمقام ترائے جو سوئزر لینڈ کا ایک شہر ہے ایک ہوٹل میں تھے اور انگریزی اخباروں میں ان کی تکلیف وغیرہ کی کیفیت وقتاً فوقتاً شائع ہو رہی تھی ۔ اس زمانہ میں سر سید علی امام مرحوم بھی برار کے مقدمہ کی پیروی کیلئے لندن میں مقیم تھے

وہ بھی خلیفہ وقت کی حالت سُن سُن کر بہت متاثر ہوئے۔ مرحوم نے مجھے خود کہا تھا کہ اعلیحضرت خسرو دکن کو خلیفہ صاحب کی تکلیف وہ حالت کی جانب میں نے متوجہ کیا ہے۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب ہائڈ پارک کے متصل سر سید علی امام کے مکان کے بالکل قریب رہتے تھے دس بارہ منٹ کے راستے پر مکان تھا۔ امیر علی صاحب نمبر ۲ اکیڈر گاؤں پیالیس میں رہتے تھے اور سر علی امام صاحب ۲۹ چیشم پیلس میں تھے۔ اس لئے اکثر آپس میں ملتے جلتے رہتے تھے۔ امیر علی صاحب تو ہمیشہ سے ترکوں کے طرفدار و ہمدرد تھے۔ جب کوئی انگریز اور کوئی یوروپین ترکوں کی برائی یا انتظام ملک کی خرابی کسی میں لکھتا تو اس کا دندان شکن جواب دینے والے امیر علی صاحب ہوتے تھے۔ ایک اخبار.......... بڑا قدیم اور موخر اخبار لندن کا ہے۔ اس میں خوب منھ توڑ جواب عیسائیوں کو دیتے۔ گلیڈ اسٹن اور کینن میگ گور جو ترکی پر خار کھائے ہوئے تھے تو ان دونوں کے جواب ہمیشہ امیر علی صاحب مرحوم نے دیئے۔ اس زمانہ میں اول تو مسلمان انگریزی دان گنتی کے تھے۔ مگر نہ اس صلاحیت و علم و پایہ کا کوئی تھا نہ اس وقار کا اسلام کے جس قدر خدمات امیر علی نے کی کسی نے نہیں کی۔

رسول خدا کے ڈرامے ہال کینن کو سوا ان کی ذات کے کون رکوا سکتا تھا اسپیریٹ آف اسلام ولائف آف محمدؐ وغیرہ یہ سب انھیں کے زور قلم کے نتیجے ہیں۔ ترکی سے جو امیر علی صاحب کو انس و ہمدردی تھی۔ وہ صرف بخیال اسلام غرض میں بھی امیر علی صاحب کے ہاں جاتا آتا تھا اور علی امام صاحب بھی اس صحبت میں بعض وقت شریک تھے۔ ان دونوں صاحبوں کو خلیفہ عبدالمجید صاحب کی مصیبت زدہ حالت کا بڑا خیال تھا۔ میں جب لندن سے واپس ہونے لگا۔ تو ان دونوں صاحبوں کو خدا حافظ کہنے اور ان سے رخصت ہونے کی غرض سے گیا تو اثنائے گفتگو میں سید امیر علی صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ کانٹیننٹ میں کس کس مقام جانے کا ارادہ ہے۔ میں نے شہروں کے ملکوں کے نام بتلا کر کہا کہ میں سوئٹزر لینڈ میں بھی جاؤں گا۔ جہاں خلیفہ عبدالمجید صاحب کا قیام ہے وہاں بھی جانے کا قصد ہے تا کہ ان کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ اس پر امیر علی صاحب نے فرمایا یہ تو آپ کو بہت اچھی سوجھی۔ وہاں جانے کے بعد جو کچھ آپ دیکھیں وہ مجھ کو ضرور لکھ بھیجئے۔ چنانچہ برلن پایہ تخت میں جب ہم گئے اور دو ماہ

وہاں میرا قیام رہا تو وہاں ایک پارٹی ترکوں کی پائی جو خلافت کی حامی تھی ان میں سے بعض لوگوں سے ملاقات ہوگئی تھی ایک مظلوم پاشا ایک حشمت بے تھے۔ یہ اس پارٹی کے صدر تھے۔ جب میں نے ان سے اپنا قصد سوئٹزرلینڈ جانے اور خلیفہ صاحب سے ملنے کا بیان کیا تو یہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے پوچھا کہ سوئٹزرلینڈ کے کس شہر میں خلیفہ صاحب مقیم ہیں۔ انہوں نے کہا۔ تیراے اس جماعت میں ولی احمد خاں نامی افغانستان کے رہنے والے اور باوقار قابل شخص بھی شریک تھے۔ اکثر میرے پاس آتے جاتے تھے۔ انگریزی زبان میں ایک اخبار بھی نکالتے تھے۔ انڈیا میں جس کا داخلہ بند کر دیا گیا تھا۔ ہر حال ان سے بھی تیراے جانے کا اپنا مقصد بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ خلیفہ صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری کرامت بے ہے اور مجھ سے دوستانہ ہے۔ آپ جب جانے لگیں تو ایک دن قبل مجھ سے کہئے میں ایک خط ان کے نام آپ کے متعلق بھیجدونگا اور ایک آپکو دونگا۔ مسٹر حشمت بے نے بھی ایک خط مسٹر کرامت کو لکھکر بھیجا۔ میں نے بمقام لیبزک (جرمنی) سے اپنے تیراے آنیکی خبر مسٹر کرامت بے کو دی اور جواب اس کا وہیں آگیا کہ آپ لوگ ضرور آیئے سوئٹزرلینڈ میں ٹھہرنے کا مقام شہر زیورچ اس لئے پسند کیا کہ میرے قدیم دوست مصنف دی خلافت مولوی برکت اللہ (دو سال ہوئے انتقال کرگئے۔) وہیں مقیم تھے۔ میں نے سوئٹزرلینڈ آنے کی اطلاع مرحوم کو دیدی تھی۔ انہوں نے ہوٹل سیلوں میں میرے لئے پہلے سے کمرے لے لئے تھے اور اسٹیشن پر لینے کو آئے کیونکہ لیبزک سے تار ان کو دیدیا تھا۔ زیورچ (جرمن تلفظ زیورخ) میں چند روز قیام کیا اور جو مقامات دیکھنے کے تھے دیکھے۔ مولوی برکت کی وجہ سے جن سے عرصۂ دراز کے بعد ملے تھے بہت لطف رہا۔ جس روز زیورچ پہنچے اس دن شام کو ٹیلیفون کے ذریعہ سوئٹزرلینڈ پہنچنے کی اطلاع مسٹر کرامت بے خلیفہ صاحب کے سکریٹری کو دیدی انہوں نے دریافت کیا کب تیراے آئینگے ٹیلیفون کے ذریعہ سے اطلاع دی کہ کل آئینگے چنانچہ دوسرے دن صبح کی نو بجے کی ٹرین سے تیراے روانہ ہوئے اور شام کے پانچ بجے وہاں پہونچے۔ اپیلس ہوٹل میں چند کمرے خلیفہ صاحب نے لیلئے تھے۔

ہوٹل میں جس وقت پہونچے تو مینجر نے نام پوچھا اور کہا کہ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے مسٹر کرامت بے کو ٹیلیفون دیکر بلایا۔ یورپ میں اکثر ہوٹلوں

کے ہر کمرے میں ٹیلیفون ہوتا ہے۔ مسٹر کرامت بے آئے اور ڈرائنگ روم میں ہم لوگوں کو لیجا کر بٹھایا۔ اور کہا کہ ہز مجسٹی کو اطلاع دینے جاتا ہوں۔ چنانچہ دس بارہ منٹ کے بعد آئے اور ہم لوگوں کو اوپر لیگئے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں سابق خلیفہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھکر کھڑے ہوگئے۔ سینہ پر دونوں ہاتھ رکھکر میں نے کورنش کی خلیفہ صاحب نے بھی ویسا ہی کیا۔ پھر میں نے دست بوسی کی۔ میری بیوی نے بھی ایسا ہی کیا پہلے سے نشست کا انتظام یوں تھا۔

سرخ رنگ کی مخملی کرسی پر خلیفہ صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے برابر ویسی ہی کرسی رکھی تھی۔ دو کرسیاں سامنے رکھی تھیں۔ ایک پر میں بیٹھا تھا ایک میری اہلیہ۔

میری کرسی کے برابر ایک اور خالی کرسی تھی جس پر مسٹر کرامت بے سکریٹری جو انگریزی جانتے تھے مجھ سے انگریزی میں جو باتیں کرتے اس کا ترجمہ ترکی میں کرتے ہم لوگوں کے وہاں پہونچنے کے دس بارہ منٹ کے بعد خلیفہ صاحب کی ملکہ تشریف لائیں کچھ تحفہ ہماری بیوی ساتھ لیتی گئی تھیں وہ خلیفہ صاحب کو پیش کئے جس کو دیکھکر بہت خوش ہوئے۔ بار بار وہ اور ان کی ملکہ یہ کہتے جاتے تھے کہ ہم لوگ آپ کا خیر مقدم دل سے کرتے ہیں اور دل سے اس کی قدر کرتے ہیں کہ جب سے ہم لوگ جلاوطن ہوئے ہیں۔ آپ حضرات ہیں جو اتنی مسافت کر کے ہم لوگوں سے ملنے آئے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو رہی۔ اتنے میں شام ہوگئی۔ جب ہم لوگ رخصت ہونے لگے تو خلیفہ صاحب نے کہا کہ آپ زیورخ سے آئے ہیں۔ چھ سات گھنٹو کا سفر ہے۔ اول تو آپ لوگ آتے ہی خستہ ہوگئے ہیں فوراً واپس جانے میں اور تکان ہوگی بہتر ہے کہ آپ اس وقت کا کھانا ہم لوگوں کے ساتھ کھائیں اور یہیں آرام کریں۔

چنانچہ کھانے کا کمرہ بھی مختصر تھا۔ صدر میں خلیفہ صاحب کی کرسی تھی۔ داہنی جانب میری بیوی کی کرسی اون کے بعد ملکہ صاحبہ کی کرسی تھی۔ بائیں جانب میری کرسی اور میرے بازو میں مسٹر کرامت بے کی جو گفتگو ہوتی اس کا ترجمہ مسٹر کرامت بے کرتے جاتے تھے۔ کھانے سے فرصت کے بعد پھر نشست کے کمرے میں آئے تھوڑی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد مسٹر کرامت بے خوابگاہ کے کمرے میں لیگئے جو پہلے سے ہم لوگوں کے لئے لیا گیا تھا۔ صبح کو خلیفہ صاحب آرام کر رہے تھے۔ جب ہم لوگ چائے

سے فارغ ہوئے۔ مسٹر کرامت بے سے رخصت ہونے لگے تو انہوں نے کہا کہ ہز مجسٹی آرام کے لیے جس وقت جا رہے تھے مجھے حکم دیا کہ میں آپ صاحبوں کو لنچ تک روکے رکھوں۔ خلیفہ صاحب کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور ٹھہر گئے۔ مسٹر کرامت بے ہم لوگوں کے ساتھ ہوئے۔ اور باہر سیر کو نکلے۔ ایک بجے تک واپس آ گئے۔ میز تیار تھا۔ جو طریقہ نشست کا شب کو تھا وہی اس وقت بھی تھا۔ وہ روز جمعہ کا تھا۔ خلیفہ صاحب نے کہا کہ آج کا جمعہ کیا مبارک ہے کہ ایک مسلم بھائی اور ایک مسلمہ بہن کے ساتھ کھا رہے ہیں۔ ملکہ صاحبہ بار بار میری بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائی جاتیں اور کہتی جاتیں آپ صاحبوں کی میں دل سے قدر کرتی ہوں جو اس قدر مسافت طے کر کے ہم غریب الوطنوں سے ملنے آئے اور آپکی محبت ہمیشہ قائم رہے گی۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب چلے تو خلیفہ صاحب تو تیزی سے چل کر آگے بڑھ گئے۔ اور نشست کے کمرہ کا دروازہ کھولکر اس کا ایک پٹ پکڑے ہوئے کھڑے رہے میری بیوی اور ملکہ ہاتھ میں ہاتھ ملا کر خراماں خراماں جا رہی تھیں۔ ان دونوں کے پیچھے میں اور کرامت بے چل رہے تھے۔ نشست کے کمرہ میں داخل ہونے کے وقت میری بیوی کی ساڑی کی بیل کارچوبی کی چکی میں ملکہ کی پوشاک کا کونا اٹک گیا تو وہ میری بیوی سے بولیں کہ اب دوستی پکی ہو گئی۔ پھر نشست کے کمرے میں تھوڑی دیر بیٹھے۔ ملکہ نے اپنی صاحبزادی شہزادی درشہوار سلطانہ کو جو اب ہز ہائینس پرنس آف برار ہیں اسوقت انکی عمر دس گیارہ سال کی ہو گی طلب کیا اور میری بیوی سے ملایا۔ میری بیوی نے پیشانی کا بوسہ لیکر دعائیں دیں۔ ریل کا وقت تنگ تھا اسلئے رخصت ہوئے چلتے وقت خلیفہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ حیدر آباد جب پہونچیں تو ہز ہائینس دی نظام کو میرا سلام پہونچائیں۔ چنانچہ حیدر آباد آنے کے بعد میں نے خلیفہ صاحب کا سلام حضور خسرو دکن کو پہونچا دیا تھا۔ ایورپ پہونچنے کے بعد میری بیوی نے ہر لیٹ ہائینس سلطان جہاں بیگم صاحبہ سابق فرمانروائے بھوپال کو ایک خط طول طویل ہوٹل سلون سے خلیفہ صاحب کی رقمی امداد کیلئے لکھا تا کہ ماہانہ بھوپال سے کچھ مقرر ہو۔ بعد کو سنا کہ سلطان جہاں بیگم صاحبہ نے ماہانہ سو پاونڈ مقرر کر دئیے تھے۔ ایک خط میں نے رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کو لکھا اور خلیفہ سے ملاقات کے حالات لکھے اور کس طرح رہتے ہیں کیا حالت ہے۔ سید امیر علی صاحب نے تاکید کی تھی۔ خلیفہ سے ملنے کے بعد وہاں کی حالت لکھو۔ ان کو بہت دلچسپی ٹرکی سے اور ٹرکی کے سابق خلیفہ سے تھی۔ سید امیر علی صاحب مرحوم

نے جو اس خط کا جواب دیا وہ مجھ کو حیدرآباد میں ملا۔ وہ خط مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۲۵ء کا انگریزی زبان میں ہے اور میرے پاس موجود ہے۔ سید امیر علی صاحب لکھتے ہیں میں جانتا ہوں کہ آپ کو خلیفہ سلطان عبدالمجید صاحب کے معاملہ میں گہری دلچسپی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بہ حیثیت روحانی پیشوا ہونے کے ان کا وقار برقرار رہے۔ لہٰذا مہربانی کر کے آپ ان کو مشورہ دیجئے۔ اور لکھئے وہ بھی ہر ماہ رجب میں ایک اپلوکیشن Allocution جاری کیا کریں جس کے معنی ایک قسم کا مذہبی فرمان مثل اس کے جیساکہ پوپ ہر سال جاری کرتا ہے۔ روحانی رنگ کا ہو۔ سیاسیات سے بالکل معرا نہ ہو۔ ایسا کرنے سے خلیفہ صاحب کی یاد مسلمانوں میں ہمیشہ تازہ رہیگی۔ ورنہ بالکل محو ہو جائیگی۔ خلیفہ صاحب کو آپ بھی لکھدیجئے۔ کہ میرا مشورہ ہے۔

آپ کا مخلص امیر علی

چنانچہ میں نے حسبہ خلیفہ صاحب کو لکھدیا تھا۔ سید امیر علی صاحب کا مذہب باوجودیکہ شیعہ تھا اور سوا حضرت علی کی خلافت کے کسی کو جائز نہیں سمجھتے تھے وہی حالت سر علی امام کی تھی۔ مگر خلیفہ صاحب کے ہوا خواہوں میں تھے۔ سید امیر علی صاحب کو تو اسلام سے عشق تھا۔ ترکوں کے معاملہ میں ہمیشہ سینہ سپر رہتے۔ کیا مجال کہ ترکوں یا اور کسی قوم کے مسلمان کو کوئی عیسائی وغیرہ برا کہے۔ پھر تو امیر علی صاحب کا قلم اس زور سے چلتا کہ پناہ بہ خدا دھجیاں اڑا دیتے۔

یوں تو شادی کے پیشتر میں نے بہت سے سفر کئے جن کی تفصیل وقتاً فوقتاً میری بیوی نے مختلف سفرناموں میں لکھی ہے۔ ان سفرناموں میں شادی کے بعد کے بھی سفر کے حالات ہیں۔ مجھے اس وقت جو یاد آئے ہیں تھوڑے اور ضبط قلم کرتا ہوں۔ میری بیوی کے ہمراہ جو میرا پہلا سفر ہوا۔ وہ ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ چھوٹی لین پر ایک قصبہ ہے منوہر آباد جو جاگیر راجہ مرلی منوہر آنجہانی کی ہے۔ وہاں ہم لوگ گئے۔ میری بیوی اور میاں اور ریاست علی مرزا سلمہ میرے سالے حال کرنل۔ یہ اس وقت میں چھ دس برس کے تھے۔ راجہ مرلی منوہر راجہ اندر کرن کے والد کو یہ خبط ہو گیا تھا کہ جیسے وقار آباد بڑی لین پر ہے۔ اور وہ سر وقار الامراء کی جاگیر ہے۔ وہی حیثیت منوہر آباد کی بھی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ریفرشمنٹ روم وغیرہ کا انتظام ہو گیا۔ گاڑی وہاں ٹھہرنے لگی

میرے ان کا بہت دوستانہ تھا مجھکو وہ ترغیب دیتے تھے کہ تم بھی یہاں کوئی بنگلہ بناؤ جس طرح کہ وقار آباد میں اور امرائے بنایا ہے۔ تاکہ وہ بھی ویسا ہی آباد ہو جیسے وقار آباد ہے۔ بلدہ کے بہت سے امراء نے وہاں باغات بھی بنائے ہیں اور یہہ کہتے تھے کہ ایک دفعہ جاکر دیکھہ لیجئے۔ اس جگہ کو ہم لوگوں کو جانیکی اطلاع انہوں نے منوہرآباد کے مقامی عہدہ داروں کو بھیجدی۔ جب ہم لوگ پہونچے تو وہاں کے اعلیٰ عہدہ دار اسٹیشن پر حاضر تھے ان کا نام تھا معصوم علی۔ یہہ تحصیلداری کا کام کرتے تھے۔ دیگر راجہ صاحب ان کو عملدار بولتے تھے۔ ان میں راجہ صاحب میں ایک قسم کی عادت تھی۔ کھانوں کا بھی نام عجیب عجیب رکھتے تھے اس طرح مکانات کے نام بھی عجیب غریب رکھتے تھے جس مکان میں ہم لوگ ٹہرائے گئے اس کا نام منوہر گلشن تھا۔

چنانچہ جب ہم وہاں پہونچے معصوم علی صاحب کھڑے تھے۔ اور بھوئیوں کو بلایا اور کہا کہ چوڈنڈا لاؤ۔ اسکی شکل شامیانہ کی تھی مگر چاروں طرف بہت نیچے تک جھالر لٹک رہی تھی تاکہ آدمی معلوم نہ ہو۔ راجہ صاحب کایستھ تھے اس لئے ان کو پردہ کا بڑا خیال تھا۔ اپنے ہاں کے رانیوں کے ساتھ بھی ان کا یہی برتاؤ تھا میری بیوی چونڈے کے اندر آگئیں۔ اور چاروں ڈنڈوں کو چاروں بھوئیوں نے پکڑلیا جیسے شامیانوں کی چوبیں۔ اسٹیشن سے جو ہمارا مسکن ہونے والا تھا بہت قریب تھا۔ دو فرلانگ بھی نہیں ہوگا بہرحال یہہ وقت منسوب تھا۔ چوڈنڈے کے ساتھ شکرم تک گئیں۔ شکرم میں سوار ہونیکے بعد مکان پہونچے۔ وہاں جو پہونچے تو مکان بالکل انگریزی ترکیب آراستہ تھا۔ نشست کا کمرہ بھی مثل ڈرائنگ روم کے تھا۔ اور کھانے کے کمرے کی سجاوٹ مثل ڈرائنگ روم کے۔ چنانچہ ہمارے جانے کے تھوڑی دیر کے بعد عملدار صاحب آئے اور عرض کی کہ بیگم صاحبہ روبرو کمرے میں تشریف لے جائیں۔ جب بازو کے کمرے میں ہماری بیوی چلی گئیں تو ایک خوان میں بہت سے کھانے جوڑ کر آئے۔ ایک بٹلر ساتھ تھا جس نے میز چن دیا۔ صبح کو پھر وہی اہتمام ہوا کہ کھانے کے کمرے میں سارا برکفاسٹ کا سامان ہوا۔ اور چار روز ہم لوگ بہت آرام سے رہے۔ صبح کو جب معصوم علی صاحب آئے تو وہ بھی کہتے کہ آپ تھوڑی زمین یہاں لیجئے۔ اور ایک بنگلہ بنائیے۔ میں کہتا انشاءاللہ دیکھوں گا۔

پانچویں دن ہم لوگ وہاں سے رخصت ہوئے۔ چونکہ میں نے ایک ڈبہ پہلے سے روک رکھا تھا۔ جب ٹرین آئی حیدر آباد جانیوالی تو میں نے اپنی بیوی سے کہا چلو اور وہی جو ڈنڈا منگا یا گیا۔ جو ڈبہ سیکنڈ خانہ ہم نے پہلے سے رزرو مخصوص کر لیا تھا۔ اس میں ہم لوگ سوار ہو گئے۔ وہ زمانہ بارش کا تھا۔ پانی پڑنے لگا۔ تو ہماری بیوی کھڑکی سے جھانک رہی تھیں۔ کیا دیکھا کہ کوئی سایہ دار درخت نہیں ہے اور نہ اسٹیشن کے علاقہ کا کوئی چھپر یا کمرہ ہے جس میں مسافر پناہ لے سکیں حالانکہ منوہر آباد کے قریب کے موضعوں کے لوگ یہیں سے سوار ہوتے تھے۔

ریلوے کے عہدہ دار بالکل غافل تھے تو ہماری بیوی نے کہاکہ راجہ صاحب کہتے ہیں کہ یہاں ایک بنگلہ بناؤ۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ یہاں کوئی سرائے کیوں نہ بنا دی جائے اور یہہ بھی انہوں نے کہاکہ میں نے یہہ نیت کی ہے کہ جب تک خدا کی راہ میں کوئی مکان نہ بناؤں گی اپنے لئے کوئی مکان نہ بناؤں گی۔ چنانچہ حیدر آباد آنکر میں نے اپنے دوست راجہ صاحب کو خط لکھا۔ تھوڑی زمین لی اور اپنی نیت سے اون کو آگاہ کیا۔ وہیں پر اسٹیشن کے قریب ایک بنگلہ مولوی خواجہ حسن مرحوم وکیل اپنا مکان تعمیر کر رہے تھے۔ میں نے اس میں سہولت دیکھی کہ ان کے ذریعہ سے سرائے بنوادوں۔ چنانچہ ایک دن چار بجے میں اون کے پاس گیا۔ اور اون سے اپنا عندیہ کہا۔

چونکہ یہہ کار خیر تھا اور وہ مجسم خیر تھے۔ اونہوں نے قبول کر لیا اور کہا تم روپئے مجھہ کو دیا کرو اور نقشہ دو۔ چنانچہ میں نے پنسل سے وہیں اسکیچ کر دیا اور گھر آ کے پانچسو روپیہ بھیجدیا۔ نہ اسٹیمیٹ نہ کچھ۔ میں اندازہ کر لیا تھا کہ پانچہزار روپیہ کی سرائے ہوگی۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً وہ روپیہ منگاتے جاتے اور تعمیر شروع کر دیئے۔ جب مکان بن گیا تو اب یہہ ضرورت ہوئی کہ وہاں ایک کنواں بھی ہو جس سے مسافر سیراب ہوں۔ چنانچہ اس سرائے کے سامنے ایک جگہ مشخص کرکے باؤلی بنائی گئی۔ خوش قسمتی سے پانی نکل آیا اور بہت ہی شیریں۔ اس کی بسید میں اپنے مکان کے واسطے راجہ صاحب نے باؤلی کھدوائی۔ لیکن پانی نہیں نکلا۔ اس کا ذکر آغا سید علی شوستری مرحوم سے کیا اور ان سے کہاکہ ایک قطعہ لکھے۔ چنانچہ انہوں نے قلم برداشتہ ایک قطعہ کہا۔ جس کا مادۂ تاریخ یہہ تھا۔

"صغرا سرا ہمیشہ آباد باد"

ایک پتھر پر یہ قطعہ کندہ کر کے سرائے کے پھاٹک پر نصب کروا دیا۔

دوسرا سفر ۱۹۰۶ء میں عتبات عالیہ کا ہوا۔ اس سفر کے تفصیلی حالات سفر نامہ عراق میں موجود ہیں۔ وہ سفر بھی عنایت الٰہی سے بہت کامیاب رہا۔ حالات بہت دلچسپ ہیں۔

بھوپال پٹنہ وغیرہ کا سفر ۱۹۰۸ء میں ہم اپنی بی بی کے ساتھ بھوپال گئے۔ اور وہاں سے دلی اور آگرہ گئے۔ اس سفر کے حالات تفصیل وار روزنامچہ بھوپال دلی و آگرہ میں ہماری بیوی نے لکھے ہیں۔

۱۹۱۰ء میں میں اپنے وطن عظیم آباد۔ پٹنہ۔ اپنی بی بی کو لیکر گیا۔ راستہ میں بنارس دیکھا پھر کلکتہ گئے۔ اس سفر کا حال ہماری بیوی نے سیاحت بہار و بنگالہ کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں موجود ہے۔ اور ۱۹۱۲ء میں اورنگ آباد اور ایلورہ دیکھنے گئے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ مرحوم فصیح الدین المخاطب بہ فصیح جنگ وہاں کے اول تعلقدار تھے۔ ہمارے رہنے کے واسطے اورنگ آباد میں ایک سرکاری مکان دیا۔ اور ایلورہ دیکھنے کے لئے بڑا اہتمام کیا۔ ایلورہ کے اوپر خلد آباد ہے جہاں عالمگیر کا مزار ہے۔ اور بہت سے اولیا اکرام ہیں۔ مثلاً حضرت زر زری زر بخش اور حضرت راجو قتال ہیں گلبرگہ میں حضرت گیسو دراز ہیں۔ ان کے چچا اور تانا شاہ کی بھی وہیں قبر ہے۔ دلی سے جو چوبیس پالکیاں آئی تھیں یعنی دکن میں تبلیغ کریں۔ تبلیغ اسلام ان میں سے بہت سے حضرات صوفیائے کرام کے مزار ہیں۔

جب ہم لوگ کیو دیکھنے گئے اس سے قبل اول تعلقدار فصیح جنگ نے یہ اہتمام کیا تھا کہ سارے کیو ان میں ایک مرد نہ رہے۔ نیچے جانے کو ڈھالوان ہے۔ تعلقدار صاحب نے یہ کہا کہ ٹانگوں کے گھوڑے لگا دیئے جس پر ہم سوار تھے۔ اور مذکوری یعنے پیادوں سے کہا کہ تم گاڑی آہستہ آہستہ لیکر جاؤ۔ چنانچہ جب ہم خلد آباد آنے لگے۔ تو راستہ میں دولت آباد کا قلعہ اور پہاڑ ملتا ہے۔ وہاں بھی گھاٹ روڈ بہت خوفناک ہے تو چوبیس تحصیل کے مذکوری ہمارے ٹانگے کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ ہم لوگ ٹانگوں میں تھے۔ ایک میں اسباب اور آدمی تھے اور ایک میں میں اور میری بیوی۔

خلد آباد عجیب جگہ ہے اور حقیقت اسم بامسمیٰ ہے۔ نہایت پرفضا اور مسرور مقام ہے یہاں گرمیوں میں جب حیدرآباد میں پارہ ایک سو بارہ رہتا ہے وہاں سو سے بڑھتا نہیں۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ بنگلور ٹمپریچر رہتا ہے۔ حیدرآبادیوں کو گرمیوں میں وہیں جاکر رہنا چاہیے بعوض اس کے کہ بنگلور جائیں اور پیسہ حیدرآباد کا وہاں صرف کریں۔ حیدرآباد کے دولتمند بنگلو چاہیے کہ وہاں چھوٹے چھوٹے بنگلہ بنوائیں۔ خلدآباد کے قریب ایک اور پہاڑی ہے جس کی سڑک کے واسطے مہاراجہ کشن پرشاد نے چوبیس ہزار روپیہ خرچ کیا ہے اور اس پر ایک مکان بھی بنایا ہے۔ اس پہاڑی کا نام میں اس وقت بھولتا ہوں۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں جب ہم لوگ اورنگ آباد گئے تھے تو اس وقت جو اول تعلقدار غلام احمد خاں تھے اور اب صوبہ دار ورنگل ہیں وہ ہم کو لیگئے۔ انہوں نے وہ پہاڑی مجھکو دکھائی۔ مجھ کو حیرت ہوی۔ جس وقت میں اورنگ آباد سے خلدآباد جا رہا تھا راستہ میں وہ گھاٹ روڈ ملی مگر وہ گھاٹ روڈ نہیں تھی بلکہ عجیب غریب عقل سے کام لیا ہے۔ کئی میل کا راستہ یکساں مسطح ہو گیا ہے اور انجنیرنگ کا کام میرے بھتیجے سید عطا حسین کے فرزند سید یونس نے کیا ہے۔ چنانچہ لارڈ ریڈنگ وہاں سے گزرے تو اونہوں نے ریمارک پاس کیا کہ میں نے ایسا گھاٹ روڈ نہیں دیکھا۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں اپنی بیوی کو والیٹر لیگیا۔ اس سفر کا حال میری بیوی نے سفرنامہ پونہ و والیٹر میں لکھا ہے۔ اس سفر میں ہم لوگ وقارآباد سے چلے چونکہ پلیگ حیدرآباد میں تھا۔ اس لئے ہم لوگ وقارآباد چلے گئے تھے اور وہاں میرے دوست ڈاکٹر اشرف جو مثل بھائی کے ہیں۔ ان کا بنگلہ بھی وقارآباد میں ہے۔ وقارآباد میں بھی پلیگ کا جب ایک کیس ہوا تو ہم لوگ گھبرا گئے اور یہہ مشورہ آپس میں ہوا کہ وقارآباد کو چھوڑ دیں اور کہیں چلیں چنانچہ ڈاکٹر اشرف کی اہلیہ ان کی لڑکی اور ان کے دو بچے اور ڈاکٹر صاحب کی بہن کے تین بچے سب کا ایک قافلہ بنا اور ٹرین کی ایک پوری گاڑی کرلی۔ کیونکہ اس میں مردانہ اور زنانہ دو خانے تھے۔ چنانچہ زنانہ خانہ میں مستورات تھیں جن میں ڈاکٹر اشرف صاحب کی بیوی اور ان کی بہن اور لڑکی اور میری بیوی یہہ سب شامل تھیں اور مردانہ خانہ میں ڈاکٹر صاحب ان کے بہنوئی فیضی الحسن مرحوم جو ورنگل کے صوبہ دار ہوے تھے اور ہم لوگ تھے۔ چنانچہ ہم لوگ جس دن وقارآباد سے چار بجے شام کو نکلے تھے اور دوسرے دن والیٹر رات کے آٹھ بجے پہونچے۔ والیٹر میں پہلے سے ڈاکٹر حسن

کے والد نواب وقار نواز جنگ مرحوم مصنف وحید اللغات اقامت گزین تھے۔ ان کو لکھ دیا گیا تھا کہ ہم لوگ آتے ہیں باوجودیکہ بہت بڈھے تھے مگر جذبہ محبت پدری اور ہم لوگوں کے ساتھ جو خصوصیت تھی۔ کیونکہ میرے خسر مرحوم ڈاکٹر صفدر علی صاحب اور وقار نواز جنگ مرحوم سے برادرانہ تھا۔ میری بیوی کو اپنی بیٹی سمجھتے تھے۔ باوجودیکہ رات ہو چکی تھی مگر وہ اسٹیشن پر موجود تھے اور اپنے ہمراہ والیٹر کے ایک صاحب کو لینے آئے۔ ان کا نام ابراہیم خاں صوبہ دار تھا۔ ہم لوگوں کو لیجا کر اپنے مکان مسکونہ کے ایک قطعہ میں اُتارا اور صبح سے ہم لوگ مکان کی تلاش میں نکلے جس میں تینوں خاندان ایک ہی جگہ رہے اور آرام سے رہے چنانچہ والٹیر کی ایک پہاڑی کے اوپر ایک بنگلہ لیا جس میں پہلے گورنمنٹ کا ایک ٹیلگراف آفس تھا اور اس سے متصل اسپنسر کمپنی کی برانچ آفس تھی۔ اصل دوکان اسپنسر کی مدراس میں تھی اور ایک شاخ سکندرآباد میں تھی اور ایک شاخ والیٹر میں تھی۔ بہرحال بہت لطف سے ایک مہینہ گزرا۔ وہاں سمندر کے کنارے آنے کے واسطے مسافت بعید تھی تو تین گاڑیاں ہم تینوں خاندان والوں نے کرایہ کی رکھ لی تھیں جو شکرام کی وضع کی تھی اور اس زمانہ میں وہاں موٹر نہیں تھی۔

ہر روز چار بجے ہم لوگ اپنے گھر سے نکلتے اور سمندر کے کنارے پہونچتے۔ وہاں کا دستور یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی شکرام نمایاں گجراتی کارٹ کی وضع کی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بیل ہوتے ہیں اور وہ اس قدر دوڑتے ہیں کہ کیا گھوڑا دوڑے۔ خصوصاً پہاڑ کی چڑھائی اس وضع کی گاڑیاں میں نے بحوالہ میں دیکھی تھیں۔ والیٹر میں چند روز رہنے کے بعد اشرف حیدرآباد مع متعلقین آ گئے مگر ہم لوگ مدراس چلے گئے۔ وہاں پہلے سے رہنے کا انتظام ہو گیا تھا۔ میرے ایک دوست تھے مجھ سے والیٹر میں کئی آدمیوں سے دوستی ہو گئی تھی۔ منجملہ ان کے ایک تو مسٹر کاظم علی پولیس سپرنٹنڈنٹ اور ایک خواجہ محمد اسلم سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس نے وہاں مدراس میں رہنے کے لئے وکٹوریہ ہوٹل کا بندوبست کیا۔ وکٹوریہ ہوٹل بہت بڑی بلڈنگ میں تھا جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ زمانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کمانڈران چیف دکن کا اس میں رہتا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ اس طرح سے نہیں رہے جیسے انگریز رہتے تھے کہ کھانا بھی ہوٹل کا کھائیں۔ کیونکہ ہوٹل کا کھانا جو پکتا ہے اس میں پرہیزگاری نہیں ہوتی ہے اس لئے چند کمرے لئے تھے۔ کھانے کا انتظام خود کیا۔ ہمارے ساتھ باورچی تھا اور بیگم صاحبہ کے ساتھ خادمہ تھی۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ بیگم صاحبہ میری مرضی کے موافق کھانے پکواتی تھیں۔ وہ زمانہ تھا کہ سر عبدالرحیم

مدراس ہائی کورٹ کے منصرم چیف جسٹس تھے وہ برابر مجھ سے ملنے کو آیا کرتے تھے۔ چونکہ حیدرآباد میں پلیگ تھا اور حیدرآباد کے اکثر امراء حیدرآباد سے باہر چلے گئے تھے۔ چنانچہ نواب صارم جنگ اعتصام الملک بھی مدراس میں مقیم تھے اور نواب بہرام الدولہ بھی وہیں مقیم تھے اور نواب سعد علیخاں مرحوم رئیس بنگن پلی بھی وہیں مقیم تھے۔ اتفاق سے اس زمانہ میں ندوۃ العلماء کا ایک جلسہ قرار پایا جس کے صدر سید شاہ سلیمان پھلواری تھے اور سر عبدالرحیم نے سب جوڈیشیل ندوۃ العلماء کے ممبر وغیرہ آئے تھے ان سب کو ایٹ ہوم دیا۔ جب ندوۃ العلماء کا جلسہ ہوا تو لوگوں کا خیال تھا کہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی آئینگے مگر وہ نہیں آئے تو سید سلیمان صاحب پھلواری سے کہا گیا کہ آپ صدارت کیجئے۔ میں نے بھی حاضرین جلسہ کے کہنے سے ایک تقریر کی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ندوہ نے بڑی اچھی خدمت کی ہے۔ مسلمانوں کی اور یہ ترکیب اچھی ہے کہ مختلف شہروں میں اس کے جلسے ہوتے ہیں۔ اس سے اتحاد باہمی مسلمانوں میں ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

مسٹر رحیم کی وجہ سے اور نواب اسعد علیخاں کے سبب سے دوران قیام مدراس کا اچھا لطف رہا۔ ہماری بیوی کو بھی مشغولیت بہت تھی۔ وہاں ایک خاندان ایرانیوں کا ہے یعنی مرزا مہدی اصفہانی یہ ایران کی جانب سے یہاں کانسل تھے ان کے مرنے کے بعد ان کے چچازاد بھائی سر عبدالحسین ہوئے۔ ان کی مستورات سے اور ہماری بیوی سے ملاقات تھی تو آنا جانا رہتا اور لیڈی رحیم سے اور صارم جنگ کی بیگم صاحبہ سے آمد و رفت رہتی تھی۔ صارم جنگ بہادر نے جو مکان لیا تھا وہ سیدا پیٹھ میں تھا۔ نواب رضا خاں کا مکان تھا جو کرایہ پر لیا تھا۔ نواب رضا خاں اس زمانہ میں کرنول کے کلکٹر تھے۔ اوس زمانہ میں کلکٹر ہونا گویا معراج کا رتبہ تھا۔ سارے مدراس کے احاطہ میں دو مسلمان کلکٹر تھے۔ ایک تو نواب رضا خاں جن کا تعلق نوابان آرکاٹ کے خاندان سے تھا۔ دوسرے قادر نواز خاں تھے ان کے دادا اکرم جنگ تھے۔ نواب ارکاٹ کی فوج کے بخشی تھے ہم لوگوں کا قیام مدراس میں تین مہینے رہا۔

یہ سنہ ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد بھی مدراس دو دفعہ ہم اپنی بیوی کو لیگئے۔ ایک دفعہ سنہ ۱۹۳۲ء میں گئے اور کرایہ کے بنگلہ میں رہے پہلے تو راجہ بابلی کے مہمان رہے۔ نارائن باغ میں رہے اور پھر کرایہ کا مکان لیا۔ سیانتھوم میں اور ان سفروں سے بیشتر سنہ ۱۹۲۸ء میں کشمیر گئے اور سر البین بیانرجی وزیر اعظم کشمیر کے مہمان تھے جس کا ذکر رہبر کشمیر میں تفصیل سے میری بیوی نے کیا ہے اور اس سے بیشتر سنہ ۱۹۲۴ء انگلستان بیوی کو لیگئے جس میں جرمنی اٹلی فرانس وغیرہ تمام پھرے۔

دو جلدوں میں سفر نامہ یورپ میری بیوی نے لکھا ہے اور مدراس میں پھر ۱۹۳۱ء میں گئے اور عبداللہ صاحب کے مہمان رہے۔ چٹ پیٹ میں پھر وہاں سے کولمبو گئے۔ کچھ دنوں تو گراون ہوٹل میں رہے اور کچھ دنوں مسٹر محمد ملک التجار نے اپنا مہمان بنایا۔ پھر وہاں سے کینڈی گئے وہاں ایک ہوٹل میں رہے۔ کینڈی نہایت پر فضا مقام ہے۔ یوں تو سارا جزیرہ کولمبو کا ایک خدا داد چمن ہے۔ یعنی وہاں کی سڑکوں پر چلنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باغوں میں ٹہل رہے ہیں۔

جس زمانہ میں ہم کولمبو میں پہنچے ہیں چیچک کا متعدد مرض زوروں سے شائع ہوا تھا۔ علاوہ ساکنین کے مسافروں کو چیچک کے ٹیکے دینا لازمی قرار پایا۔ مجھ سے اور بیگم صاحبہ سے کہا گیا کہ آپ لوگ بھی ٹیکے نکلوائیے۔ مگر میں نے اس عذر پر کہ دس برس پہلے میں نے حیدرآباد میں ٹیکہ لیا تھا۔ اب ہم چند روز کے لئے آئے ہیں ٹیکا نہیں لے سکتے۔ مگر میرے ملازم عبدالرشید کو ٹیکہ لینا پڑا وہاں ہم گراون ہوٹل میں ٹھہرے وہاں ایک شخص مسٹر محمد بڑے تاجر ہیں۔ ان کو نہیں معلوم۔ ہمارے آنے کی کس طرح خبر ہوئی وہ اپنے مکان میں لے گئے اور بیگم صاحبہ کے حالات اخباروں کے ذریعہ سے ان کو معلوم تھے۔ چنانچہ وہاں کا ایک مشہور اخبار انگریزی ہے۔ سلون آبزرور ریس میں ان کے حالات سوشل سرویس کے جو جو کام انہوں نے کیا ہے بہ تصریح نکلے اور تصویر بھی بیگم صاحبہ کی نکلی پھر وہاں سے ہم لوگ کینڈی گئے جو بہترین حصہ ہے۔ کولمبو کا وہاں ایک ٹینک ہے اور اس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں اور بنگلے ہیں وہ بالکل ایک منظر سوئزرلینڈ کا معلوم ہوتا ہے وہاں پر ایک ہوٹل بھی ہے اس میں ہم لوگ دو روز رہے۔ کالجوں میں ایک مسلمانوں کا کالج ہے جامعہ ازہر وہاں کے پرنسپل آئے اور بیگم صاحبہ سے کہا آج آپ تقریر کیجئے۔ انہوں نے تقریر کی اگرچہ وہاں کے عام لوگ اردو نہیں سمجھتے ہیں مگر ان کی تقریر کا ترجمہ پرنسپل نے انگریزی میں کیا پرنسپل جو تھے وہ سنگاپور کے رہنے والے۔ سنگاپور وہاں سے قریب ہے۔ ان کی ٹوپی عجیب و غریب ہوتی ہے ان کا نام عبدالرحیم ہے۔ اس صحبت میں ایک شخص اسماعیل بھی تھے وہ اپنی بیوی سے ملانے کیلئے بیگم صاحبہ کو اور مجھکو لیگئے اور یہ اصرار کرنے لگے کہ آپ لوگ ہمارے مہمان رہیے جیسا کہ آپ مسٹر محمد کے رہے۔ چونکہ وقت قلیل تھا اس لئے معذرت کی۔ چلتے وقت انہوں نے سیلون کی چائے ہمارے ساتھ تحفۃً دی۔ چونکہ بہت زیادہ مقدار میں تھی اس لئے ہم نے بہت دنوں تک وہ چائے پی۔ پھر وہاں سے تین ہفتہ رہنے کے بعد سیلون کو خدا حافظ کہا۔

چند سالوں کے وقفہ سے ہم نے مدراس کا سفر چار دفعہ کیا۔ ایک دفعہ ۱۹۱۶ء میں پھر

سنہ ۱۹۳۳ء میں۔ یہہ سفر جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے سنہ ۱۹۳۱ء کاٹھیواڑ کے سفر سے واپس آنیکے بعد کا ہے
کاٹھیواڑ میں ہم سنہ ۱۹۲۹ء میں مانا وادر گئے تھے۔ اس کا سبب یہہ ہوا کہ ہز ہائینس سابق فرمانروائے
مانا وادر فاطمہ صدیقہ صاحبہ جن سے ہماری بیوی سے بہنیا پا ہے انہوں نے باصرار بلایا تھا اور دعوت
دی تھی۔ ان کے فرزند کی مسند نشینی کی تقریب ہونیوالی تھی یعنی حال نواب مانا وادر انہوں نے بڑا اہتمام
کیا تھا اور اس موقع پر دل کھولکر پیسہ خرچ کیا تھا۔ بہت تکلفات کئے تھے۔ چار روز تک تو رقص
وسرود کی محفلیں ہوتی رہیں۔ مختلف مقامات سے گانے والی رنڈیاں آئی تھیں۔ پھر سینما بھی دکھایا
گیا اور انگریزی ڈنر کی دعوتیں ہوئیں۔ وہاں سے ہم لوگ مانا وادر میں کوئی دس روز رہے وہاں
اور بھی شہروں کے مہمان تھے اور ان لوگوں کی سکونت کے واسطے اعلیٰ قدر حیثیت انتظام تھا۔ وہ
قصر جس میں مانا وادر کی فرمارواں خود رہتی تھیں۔ اس کا نام تھا امیر منزل اور وہ بہت وسیع باغ میں
واقع تھا اور بیچ میں تھا اور چار کونوں پر چار اور قصر تھے۔ بہرحال ہم لوگ جس مکان میں اتارے
گئے اس کا نام تھا چمن منزل۔ وہاں سے مانا وادر کی بیگم صاحبہ کی موٹر پر ہم بغرض سیاحت ایلدن
جونا گڑھ گئے اور ایک دن راجکوٹ گئے پھر وہاں سے نواب صاحب منگرول کی دعوت پر منگرول
گئے۔ اونہوں نے اپنے ولی عہد کو مانا وادر بھیجکر ہمکو بلایا۔

جب ہم لوگ مانا وادر میں تھے تو گورنمنٹ کے ایجنٹ کی
دعوت تھی۔ اس دعوت میں مہاراجہ جام صاحب سابق رنجیت سنگھہ جی کے بھتیجے کیپٹن دلیپ سنگھ
سے ملاقات ہوی انہوں نے اپنے چچا کو جام نگر لکھہ بھیجا کہ ہمایوں مرزا آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ مہاراجہ
کا تار آیا کہ حیدرآباد مت جاؤ بغیر جام نگر آئے ہوئے۔ میں نے بھی جام نگر کی بہت تعریف سنی تھی۔
سابق مہاراجہ جام صاحب بڑے روشن خیال تھے انہوں نے جام نگر کو جو ان کا دارالسلطنت
تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کو خوبصورتی میں پیارس بنایا ہے۔ اسلئے مجھہ کو بھی جام نگر کے دیکھنے کا شوق
تھا۔ مانگرول میں ہم لوگ بارہ دن رہے۔ نواب صاحب مانگرول نے بڑی خاطر تواضع کی پھر وہاں
سے ہم جام نگر گئے۔ وہاں جیسی اونہوں نے شاہانہ مہمانداری کی بائیس دن رہے اور میری سواری کے
واسطے رولس رائیس ۴۰ ہزار کی کار متعین تھی اور ایک اردلی افسر انگریز کپتان ہماری مصاحبت
کے لئے اور شہر دکھانے کے لئے مہاراجہ نے بھیجدیا تھا۔ مہاراجہ عجیب غریب آدمی تھے جام نگر کا تھوڑا
حصہ سمندر کے کنارے ہے اور ہم لوگ سمندر کی سیر کو جاتے۔ مہاراجہ نے بڑی دھوم سے ہماری
دعوتیں کیں۔

ایک دعوت میں اپنے عزیزوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کو بُلا کر بلایا۔ جام نگر میں بائیس دن قیام رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ والا شان پرنس آف برار اعظم جاہ بہادر انگلستان میں تھے اور یورپ فرانس میں ان کی شادی شہزادی درشہوار صاحبہ دام اقبالہا اور والا شان معظم جاہ بہادر کی شادی شہزادی نیلوفر صاحبہ سے ہوی۔ وہاں سے ہم بڑودہ میں آئے جو گجرات میں واقع ہے۔ کاٹھواڑ کے قریب وہاں بھی میری دعوتیں بہت دھوم سے اور تکلفات سے ہوئیں۔ ایک دعوت میں مہاراجہ کی طرف سے ڈنر تھا اس میں کل واعیان بڑودہ شریک تھے۔ اس دعوت میں بڑودہ میں جو انگریزی رزیڈنٹ تھا وہ بھی بلایا گیا۔ اس کا نام تھا کرنل کراسویٹ اس زمانہ میں حیدرآباد میں کرنل کیز رزیڈنٹ تھا۔ اب وہاں سے یعنے بڑودہ سے ہم بمبئی آئے بمبئی میں چھ دن رہے۔ ریلوے ہوٹل میں ٹھہرے اور وہیں اپنے پیارے دوست محمد شفیع کے انتقال کی خبر سنی جس کا مجھے بیحد صدمہ ہوا کیونکہ شفیع اور ہم۔ ہم مکتب تھے (ولایت میں) سفر کاٹھواڑ۔ گجرات و بمبئی کا تین مہینے میں ختم ہوا۔ اور الحمد للہ ہنسی اور خوشی سے مع الخیر حیدرآباد آئے۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں ہم پھر بمبئی گئے۔ میری طبیعت خراب رہتی تھی۔ علاج کیلئے گیا تھا۔ ایک ماہ نرسنگ ہوم میں رہا۔ جرمنی ڈاکٹر کا علاج کیا گر فائدہ نہ ہوا۔ اور وہاں سے ایک مقام سمندر کے کنارے ہے جس کا نام باندرا ہے وہاں ایک ماہ رہے۔

بمبئی میں ہم سب رنجیت ہوٹل میں ٹھہرے اور باندرا میں ایک مکان بہ کرایہ لیا۔ بہت ہی مختصر نہایت پر فضا۔ وہاں سے خط ہماری بیوی نے اپنے عزیزوں کو پونہ لکھا تھا۔ وہاں سے جواب آیا کہ تم لوگ جب حیدرآباد جاؤ تو پونہ سے ہوتے جاؤ۔ ہماری بیوی کی نانی کی ہمشیر ہیں جو ہز ہائنیس آغاخاں کی قریبی رشتہ دار ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ جب پونہ پہونچے خاطر مدارات ہوی چند روز وہاں رہے اس کے بعد حیدرآباد آئے۔

میں ان چند معززین کا ذکر کروں گا جو وقتاً فوقتاً میرے ہاں مہمان رہے۔ مثلاً نواب نصیر حسین خیال مرحوم سابق رئیس پٹنہ و کلکتہ۔ مولانا شبلی نعمانی ۱۹۱۳ء دیگر مولانا سید ہادی خادم نجف اشرف بہمراہی سید حسین خادم کربلائے معلیٰ ۱۹۱۲ء نواب مرزا وزیر حسین خاں بہادر سابق رئیس پٹنہ ۱۹۱۰ء کیپٹن سید ہادی علیخاں ۱۹۲۵ء مولوی محبوب عالم مرحوم سابق ایڈیٹر و مالک پیسہ اخبار وغیرہ مہمان رہے ایک دفعہ ۱۹۱۵ء میں جس زمانہ میں جنگ بڑے زوروں پر تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ یہ انگریزوں کی تائید میں خط لکھا۔ سر اکبر حیدری اور گلانسی کو سابق وزیر فنیانس حیدرآباد بہ دیں مضمون کہ سرکار نظام سے ان کو الونس دیا جائے۔ محض وظیفہ دو سو روپیہ ماہانہ۔ پھر کچھ دنوں کے بعد یہ وظیفہ بند ہو گیا تھا تو اس کی فکر میں

لہ ہم نے جام نگر سے مبارک باد کا تار بھیجا تھا۔ جسکا جواب بھی ملا تھا۔

آے تھے میرے ہاں ٹھیرے ۱۹۲۶ء میں آنریبل سر رفیع الدین سابق پریسیڈنٹ۔ گورنمنٹ بمبئی
ہمارے ہاں ایک مہینہ مہمان رہے۔ مولوی محب الحق برادر مولانا عبدالحق آزاد بہار بھی اس غرض سے حیدرآباد
آئے تھے کہ ان کا کچھ وظیفہ مصنفین کے سلسلہ میں کیا جائے۔ یہ ۱۹۱۴ء میں آئے تھے۔ چنانچہ سر اکبر حیدری
سے کہکر سو روپیہ ماہانہ کروالیا۔ اور سر ہدایت اللہ غلام حسین سابق منسٹر بمبئی گورنمنٹ بہار ایک شادی کی
تقریب میں حیدرآباد آئے تھے ۱۹۲۴ء میں۔ میرے اور ان کے چونکہ بہت ربط تھا تو چند روز میرے پاس
بھی رہے۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی ۱۹۲۲ء میں میرے ہاں مہمان رہے اور دیپ نارائن سنگھ سابق رئیس
بھاگلپور ۱۹۲۳ء میں میرے ہاں مہمان رہے اور ایک دفعہ سابق میں بھی آئے تھے یعنی ۱۹۰۵ء میں۔
معہ اپنی رانی صاحبہ کے معہ خدم حشم آئے یعنی پرائیوٹ سکرٹری اور پرنسپل اسسٹنٹ ساتھ تھے۔ مسٹر
سید حسن مرحوم سابق سب جج علاقہ بہار ۱۹۲۳ء میں آئے تھے وغیرہ وغیرہ۔

سر فضل اللہ سابق پریسیڈنٹ انڈین سیول سروس کمیشن مدراس ممبر بورٹ آف مینو معہ اپنی
اہلیہ و دختران کے میرے ہاں اپنے لڑکے کرامت اللہ آئی۔ سی۔ یس کی شادی میجر ممتاز یار الدولہ بہادر
کی صاحبزادی سے کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ ہمارے گھر میں شادی ہوئی۔ میری بی بی نے
سب انتظام کیا۔ شمس العلما نواب سید امداد امام جب حیدرآباد آئے اور اپنے نامی گرامی فرزند سر
علی امام کے ہاں ٹھیرے تھے مگر بوجہ عزیزداری میں نے بھی چار دن اپنے ہاں رکھا تھا۔

مستورات میں مشہور و معروف عطیہ بیگم صاحبہ فیضی ساکن بمبئی وہ ایک مہینہ میرے ہاں
۱۹۲۲ء میں مہمان رہیں اور مسز یعقوب حسن منسٹر مدراس ۱۹۳۴ء میں اور مس ڈاکٹر داس گپتا مشہور
لیبر پارٹی کی ممبر ہے کلکتہ میں ۱۹۲۶ء آئی تھیں ایک مہینہ رہیں۔

۱۹۱۱ء میں میں نے معہ اہلیہ کے سفر کیا تھا۔ کلکتہ و پٹنہ کا بنارس ہوتے ہوئے گیا۔
بنارس میں راجہ للن جی فرزند مہاراجہ نرسنگ داس کا مہمان رہا۔

۱۹۱۶ء میں گلبرگہ گیا تھا۔ معہ اہلیہ کے وہاں سابق اول تعلقدار مولوی ضیاءالحق نے اپنا مہمان
بنایا۔ سینہ سلطانہ وحیدالدین سابق سلطان ٹرکی کی اہلیہ معہ اپنی بھانجی کے ہمارے ہاں آ کر چار مہینے مہمان
رہیں اور ان کی خاطر مدارت شاہانہ طریقہ پر کی اور چلتے وقت میری اہلیہ نے کچھ تو اپنے پاس سے
اور کچھ تو اپنے عزیزوں اور دوستوں سے چندہ کر کے تین ہزار روپیہ دئے اور سرکار سے پانچ ہزار
دلوائے۔ اسطرح آٹھ ہزار روپیہ ان کو دلوائے۔ اگرچہ وہ سلطانہ تھیں اور ایک بڑے خلیفہ کی
بیوی مگر حیدرآباد آئیں تو بہت حاجتمند تھیں۔ ان کو ہماری اہلیہ سے بہت اُنس

ہو گیا تھا۔ جاتے وقت بہت گریا وزاری کیں۔ یہی حالت عطیہ بیگم صاحبہ کی بھی ہوئی تھی۔ ان کو بھی ہماری اہلیہ سے بہت انس ہو گیا تھا اور یہہ دلیل ہماری اہلیہ کے اخلاق کی ہے۔

کشمیر سے واپسی میں دہلی جب آئے تو اجمیر شریف کا سفر بھی کیا اور علی گڈھ بھی گئے تھے۔ شیخ عبداللہ صاحب کے ہاں دو روز مہمان رہے۔

ڈاکٹر ٹیگور بھی ہمارے ہاں آئے تھے ان کو چندہ جمع کر کے میری بی بی نے دیا۔ اور جواہر لال نہرو کی دعوت بھی ہمارے ہاں ہوئی مع بی بی لڑکی کے وہ آئے تھے۔

۱۹۳۴ء میں جالنہ کا سفر کیا، جالنہ میں میری بی بی نے جلسۂ میلادالنبی کیا۔ انجمن خواتین دکن کی شاخ قائم کی، وہاں سے اورنگ آباد گئے۔ وہاں بھی ایک شاخ انجمن خواتین دکن کی قائم کی، اورنگ آباد سے ناندیڑ کا سفر کیا۔ اسی سنہ میں میری یہ سوانح عمری ختم ہوئی۔

اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں پھر دوبارہ ہم جالنہ گئے وہاں مجھے فالج گرا۔ ایسا علیل ہوا کہ بستر پر سے نہیں اُٹھ سکتا ہوں فقط

سید ہمایون مرزا تخلص حقیر

بیرسٹر ایٹ لا

صغرا منزل ہمایون نگر حیدر آباد دکن ۱۹۳۴ء

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
الف	۸	ایک بیک	یک بیک	۲۴	۱۲	گارو	گارڈ
ج	۲۰	تیگ	تیک	۲۷	۱۴	بہجا	بھیجا
د	۵	درجنت	جانب جنت	۳۰	۳	چیریں	چیزیں
۹	۹	دسہزار	دس ہزار	۳۱	۱۲	تیس	تیئس
۱۱	۲۰	بیں	بیس	۳۳	۱۸	شففف	شغف
۱۴	۱۲	ترین	ٹرین	〃	۲۴	خوشگور	خوشگوار
۱۶	۱۹	تتبع	بہ تتبع	۳۵	۳	احوی	اخوی
〃	۲۰	مبطع	منطبع	۳۸	۱۷	نفاسب	نفاست
۱۷	۶	نیابم	نیا یم	۳۹	۱۲	سارندے	سازندے
〃	۲۶	نصرالدین	نصیرالدین	۴۱	۶	مفرق	مغرق
۱۹	۱	تازمانہ	زمانہ	۴۳	۸	سواران	سواریاں
〃	۲۳	میتھی	میٹھی	〃	۱۸	ہسرے	ہرے
۲۱	۲۵	دلے	دبلے	〃	۲۱	مٹھائی یاں	مٹھائیاں
۲۳	۷	نیسرے	تیسرے	۴۴	۱۰	بگڑی	پگڑی
۲۴	۵	کہتا	کہیتا	〃	۱۴	رسد	اسد

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۴	۱۲	منکنت	من کنت
۴۵	۲۳	زن	اسپ وزن
۴۶	۸	چاندات	چاندرات
۴۸	۱۹	متعلب	منقلب
۵۱	۲۵	لذیز	لذیذ
۵۵	۱۷	ٹوٹ تا	ٹوٹتا
۶۲	۱۱	لذیز	لذیذ
۶۷	۷	بازش	بارش
۶۹	۲۴	لے تے	لیتے
۷۰	۱	بتاتے	بناتے
۷۲	۹	کپڑہ	کپڑے
″	۱۳	خمے	خیمے
۷۳	۴	لذیز	لذیذ
۷۵	۷	تعزبے	تعزیے
۷۸	۲۴	ضاعیان	صناعیان
۷۹	۱۵	دیکھائی	دکھائی
۸۲	۲۲	فرستت	فرصت
۸۵	۶	القق	الفق

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸۵	۲۳	تعزبے	تعزیے
۸۷	۱۴	غنفوان	عنفوان
″	۱۹	خمزے	غمزے
۸۹	۵	مجاست	مجالست
۹۰	۱۲	عوامص	غوامض
۹۱	۲۳	جنگ	جنگ
۹۲	۷	influencial	influential
۹۳	۶	ایکے	یکے
۹۶	۱۷	ذبل	ڈبل
۹۸	۲۱	وخواست	درخواست
۱۰۴	۳	ہمصفرو	ہمصفیرو
۱۰۵	۹	باب المذب	باب المندب
″	۲۵	ماکدا	ماکدر
۱۰۶	۱	تکلیف	تکلف
″	۵	جسے	جیسے
۱۰۷	۲۳	نکلکر	نکل کر
۱۱۰	۲۳	طبقہ لے	طبقہ کی
۱۱۱	۲۰	arovrarium	Honorarium

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱۴	۴	نگیشن	لگیشن
۱۱۵	۶	کٹنر	لائٹنر
۱۱۸	۱۵	منجوس	منحوس
۱۲۰	۴	باوچی	باورچی
〃	۱۸	سالیسری	سالیبری
۱۲۲	۴	may	my
〃	〃	will	well
۱۲۸	۴	ریپشن	اسپیشن
۱۲۹	۱۰	پریجنٹ	ریجنٹ
〃	۱۲	حید	حیدر
۱۳۳	۱۱	لے ربیہ	لا بیہ
۱۳۶	۱۸	ہوسنگ	ہوشنگ
۱۳۹	۲۱	دیکھایا	دکھایا
۱۴۰	۹	orientalials	orientalist
۱۴۸	۲	پروٹسنٹ	پروٹسٹنٹ
۱۴۹	۲۵	ڈلیموکراٹ	ڈیموکراٹ
۱۵۳	۲۱	سے نے	لینے
۱۵۷	۱۳	جبلی	حنبلی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۵۷	۱۵	بتہ	بنہ
۱۶۴	۱۳	الفسٹون	الفنسٹون
۱۶۵	۱۵	اٹھوں	آٹھوں
۱۶۸	۲۰	تحیٹر	تھیٹر
۱۸۲	۱۰	دعامہ	دعائیہ
۱۸۶	۲۵	باتھ	ہاتھ
۱۹۱	۳	امیرست	امریست
۱۹۴	۸	دریاقت	دریافت
۱۹۷	۲۵	الیوسیش	الیوسیئش
۲۰۱	۱۸	ریویذ	ریویز
۲۰۷	۷	پییٹ	بیٹھ
۲۱۱	۲۵	اسپیشن	رسپشن
۲۱۶	۲۳	جب	جیب
۲۱۸	۱۵	علی اللہ	اعلی اللہ
〃	۲۱	پاچھیں	باچھیں
۲۱۹	۳	ہیں	میں
〃	۸	سیٔ	سی
۲۲۰	۲۰	ابوالحسن خاں	الوالحسن خاں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲۱	۱۸	عذا	غذا
〃	۲۴	تشکیل	شکیل
۲۲۲	۲۱	سووے	سودا
۲۳۰	۲۲	واقفیت	واقعیت
۲۳۲	۱۴	ربوط	مربوط
۲۴۱	۱۶	الیفرشمنٹ	یفرشمنٹ
〃	۱۸	لگی	دلگی
۲۴۹	۷	دہانت	ذہانت
۲۵۸	۲	محازی	مجازی
۲۶۰	۶	ڈیڑ	ڈیڑھ
۲۶۱	۵	یوریننگ	ایوینٹنگ
۲۶۷	۸	پیٹ	پیٹھ
۲۶۹	۲	circums taltial	circumstan-tial
〃	۱۵	بینس	بتیس
۲۷۳	۱۷	واقعہ	واقع
۲۸۴	۱۰	تاکئے	تاکے
۲۹۴	۱۷	اوالعزمی	اولوالعزمی
۲۹۵	۱۸	دھونڈنے	ڈھونڈنے
۳۰۳	۱۷	اسپنر	اسپنسر
۳۰۴	۸	رولینو	رو یو
۳۰۶	۸	۱۹۲۰	۱۹۰۴
۳۱۵	۱۷	زبورخ	زیورچ
۳۱۷	۵	mlocution	Allocution
۳۲۰	۷	پٹنہ	پٹنہ
〃	۸	زنامچہ	روزنامچہ
۳۲۷	۱۰	مینو	ریویو
۳۲۸	۱	گریا	گریہ
-	-	-	-

۷۸۶
۴۹۲

اپنے مذاق کے موافق

کتب بینی کا شوق ہر لکھے پڑھے شخص کو ہوتا ہے اسی طرح کتابیں جمع کرنے اور اس کو اچھی حالت میں رکھنے کا لیکن اس کی تنظیم اور حفاظت کیلئے کسی ماہر فن کے مشورہ کی ضرورت ضرور ہوا کرتی ہے جو آپ کو ارزاں سے ارزاں جلد سازی کے ساتھ تنظیم و حفاظت کا بھی مشورہ دے سکے۔ اسلئے ایک دفعہ آپ **محبوبیہ کارخانہ جلد سازی** کے خدمات حاصل فرما کر ہمیشہ کیلئے مطمئن ہو سکتے ہیں اور اسی سلسلہ میں کارخانہ ہذا کی شائع کردہ کتاب (**انتظام کتب خانہ**) جس کو ہندوستان کے رسائل نے اردو میں پہلی کتاب تسلیم کیا ہے جسکی ایک جلد ہر کتب خانہ میں رہنا ضروری ہے۔

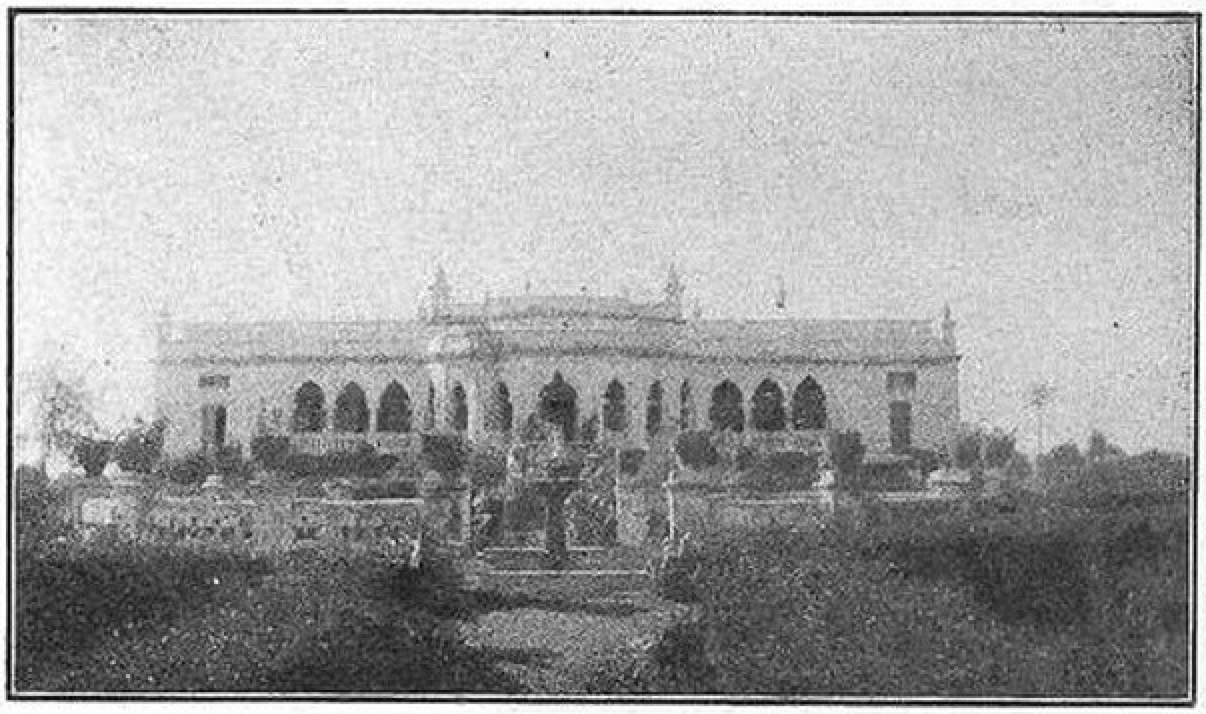
قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ

محبوبیہ کارخانہ جلد سازی رجسٹر شدہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

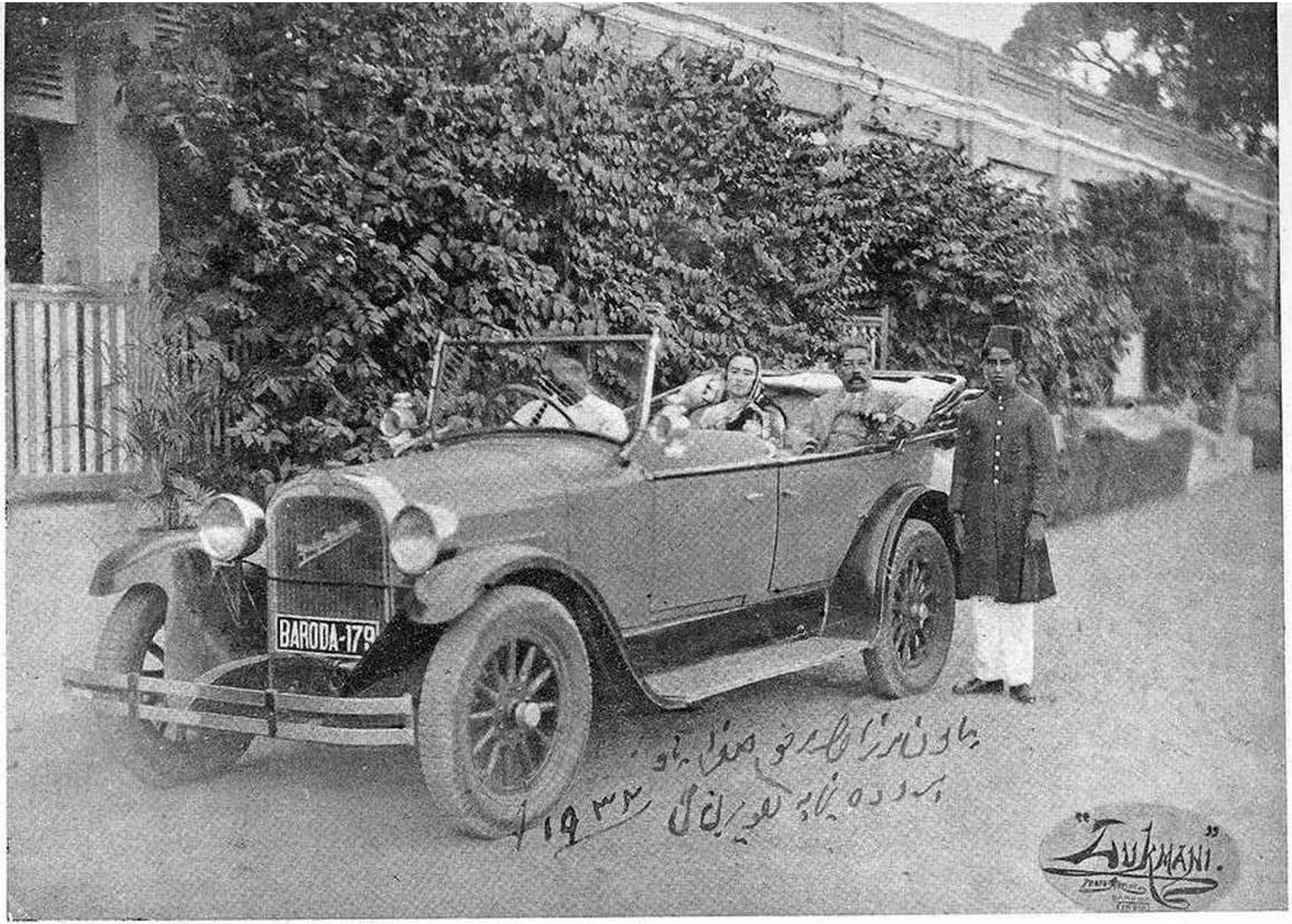
(نوٹ) اپنے مقامی کتب فروشوں سے بھی طلب فرمائیے

مکان سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم بیرسٹر ایٹ لاء

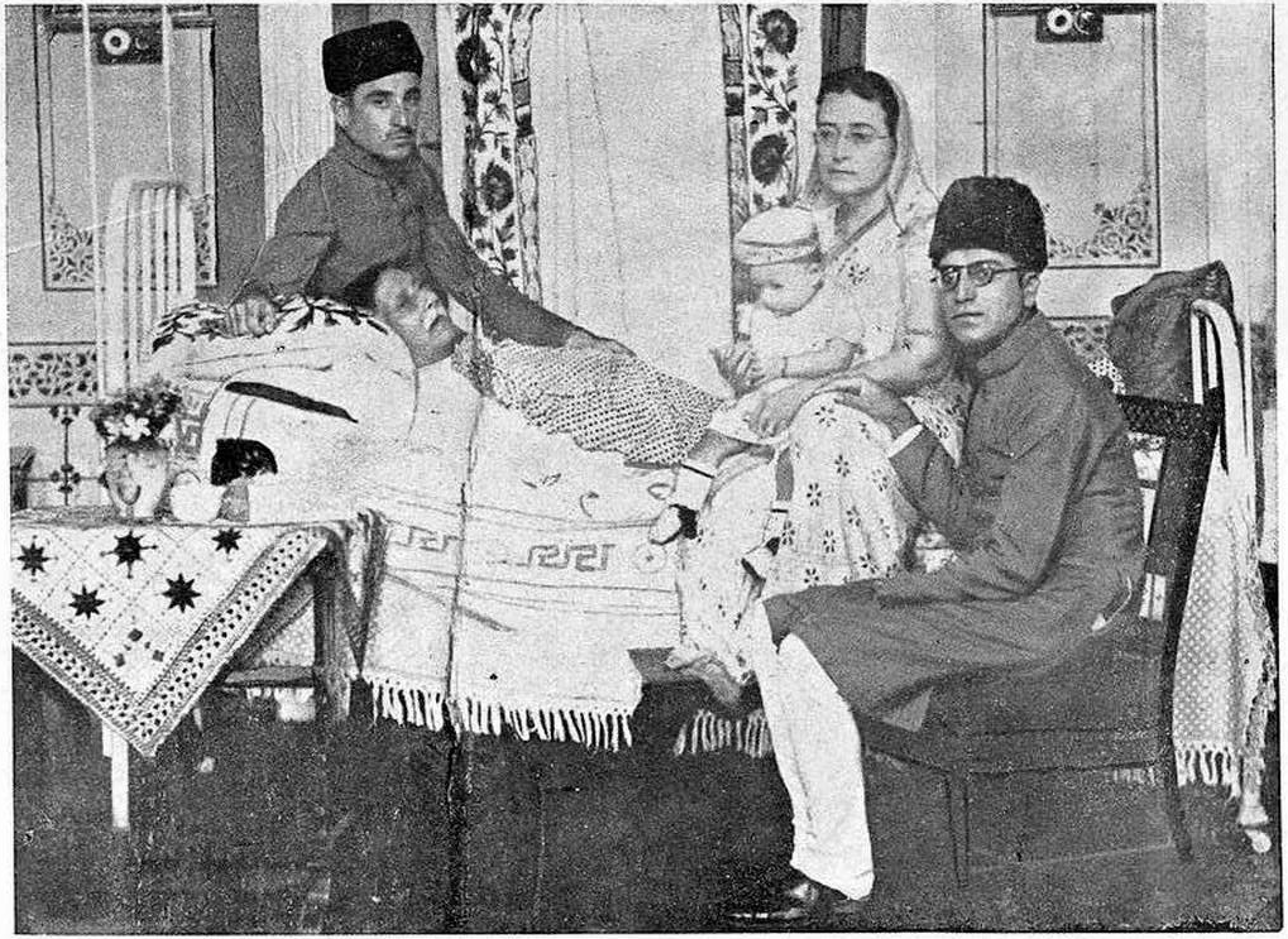


"صغرا منزل"

قصر ہمایوں صغرا منزل - ۱۹۲۸ء

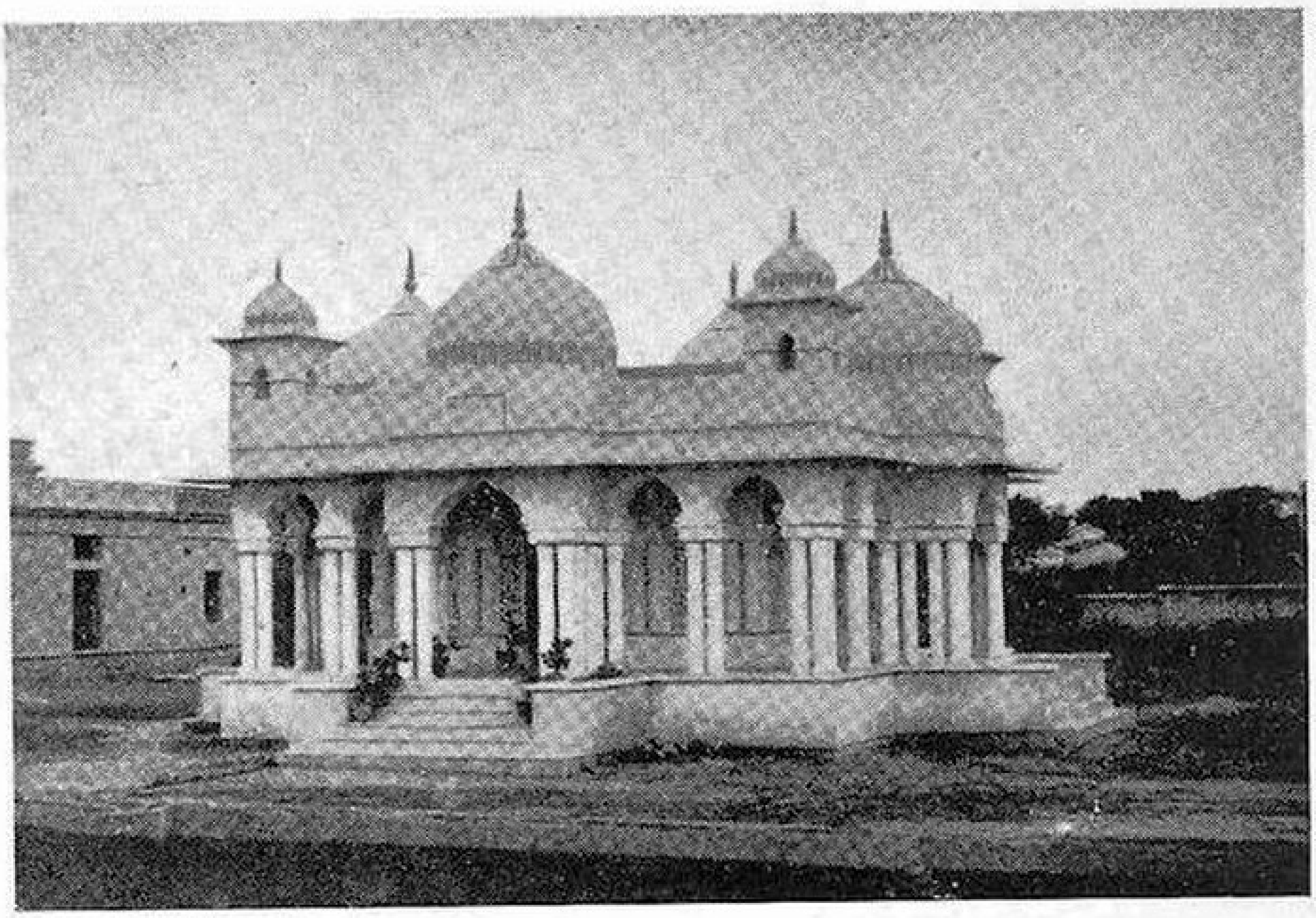


عالیجناب سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم مغفور اور صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ بروده میں



داہنے سے بائیں: باقرعلی مرزا صاحب' بی۔ اے۔ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ۔ حیدرعلی مرزا صاحب لفٹیننٹ۔
عالیجناب سید مرزا صاحب مرحوم مغفور بستر علالت پر

مقبرہ سید ہمایوں مرزا صاحب علیہ الرحمۃ



اس مقبرے کو ایک سو چار کھم اور پچاس کمانیں ہیں



شبیہ جناب سید ہمایوں مرزا صاحب

مطبوعہ

شمس المطابع مشین پریس نظام شاہی روڈ

حیدرآباد دکن

۱۳۴۰ف

تعداد (۲۵۰۰)